# THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

بابت

ماہ جمادی الاول

سنہ ۱۳۰۹ نبوی مطابق سنہ ۱۲۹۹ ہجری

مادہ تاریخ بحساب سال نبوی

## کتب احکمت اینہ

۱۳۰۹

علیگڈہ

مطبع علیگڈہ انسٹیٹیوٹ میں باہتمام شیخ علیم اللہ چھپا

سنہ ۱۸۸۲ع

# مسلمانوں کی افسوس ناک حالت

ہماری مخالفت پر جسقدر زیادہ کوشش ہوتی ہی اسیقدر ہمکو زیادہ خوشی حاصل ہونی ہی عام مثل مشہور ہی کہ " سانچ کو آنچ نہیں " اِسکے لفظ کہنے ہی گنواری ہوں مگر اُصول نہایت صحیح ہیں سچ میں جو خوبی ہی وہ یہی ہی کہ اُسکو کسیکی مخالفت اور کسی امتحان کا اندیشہ نہیں ◆

تہذیب الاخلاق اور اُس کے خیالات کی مخالفت بہت لوگوں نے کی جو السابقون السابقون اولئک ھم المقربون کے درجہ عالی کو پہونچ گئے اب نئے نئے مخالف اُسکے پیدا ہوئے ہیں — مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری ہر مہینہ ایک رسالہ نکالتے ہیں جسکا نام اشاعۃالسنۃ ہی — یہہ رسالہ در اصل اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کی خدمت گذاری کے لئے نکالا تھا یعنی اس زمانہ میں جنکو لوگ وہابی کہتے ہیں دو فرقوں میں منقسم ہوگئے ہیں ایک وہابی مقلد اور دوسرے وہابی لامذھب یا غیر مقلد جو اپنے تئیں موحد یا اہل حدیث کے نام سے موسوم ہونا پسند کرتے ہیں — اور لوگ جو بدعتی کہلاتے ہیں پہلے فرقہ کو چھوٹے بھائی اور دوسرے فرقہ کو بڑے بھائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں مگر اب مولانائے ممدوح نے ہمکو بلقب نیچری ملقب کیا ہی اور ہماری طرف توجہہ کو زیادہ تر مقدم سمجھا ہی — وہ اپنے رسالہ نمبر چہارم جلد دوم کے ضمیمہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ " ہمارے خیال میں الزام مقلدین ائمہ فروع کی نسبت الزام اہل نیچر جو فلسفہ یا [illegible] کے مقلد ہیں اہم اور مقدم ہی اور ضرر تقلید ائمہ فروع سے ضرر تقلید فلاسفہ ملاحدہ بڑھکر — مقلدین تقلید آئمہ میں مبتلا ہوکر فروع اسلام کو بگاڑ رہے ہیں حضرات نیچریہ بہ تقلید فلاسفہ اُصول اِسلام کی بیخ کنی کررہے ہیں لہذا میں الزام اہل نیچر کو مقدم سمجھتا ہوں " ◆

ہم اُنکی اس ہمت اور اُولی العزمی اور دینداری کی نہایت ستایش کرتے ہیں اور اُنکی اس توجہہ کا جو اُنہوں نے ہمارے خیالات کی تردید کی طرف مایل کی ہی دلی شکر ادا کرتے ہیں ◆ ( بیت )

خوش بود گر محک تجربہ اید بمیاں ◆ تا سیہ روے بود ہرکہ دروغش باشد

مگر ہمکو مسلمانوں کی حالت پر نہایت افسوس ہی کہ ایسے عمدہ کام میں بھی جسکی بنیاد محض دینداری و حقانیت پر بتلائی جاتی ہی اور وعظ سے تحریر پر تاثیر اور تقریر دلپذیر سے اور قیامت میں حزن و قصور کے [illegible] سے اُسپر ترغیب دلائی جاتی ہی تب بھی کسی مسلمان کا دل نرم نہیں ہوتا اور کافی طور سے جناب مولانا کی مدد نہیں کرتا اُنہوں نے

جو مضمون بعنوان شکایت لکھا ھی ' و اوفو بالعہد ان العہد کان مسئولا ' کا بھی ترجمہ دکھایا ھی اُس سے معلوم ھوتا ھی کہ رسالہ اشاعۃالسنۃ کا آٹھہ آنہ ماھواري چندہ ھی مگر مسلمانوں کي ایسي افسوس ناک حالت ھی کہ باوصف اقرار وعدہ بہت سے لوگ ھیں جنہوں نے زر چندہ نہیں دیا — شکایت عدم اداے چندہ کے بعد وہ ارشاد فرماتے ھیں کہ " شاید بعض لوبالي مزاج یہہ بھي سمجھتے ھونگے یا آیندہ ملاحظہ اشتہار شرح قیمت رسالہ سے سمجھنے لگیں کہ یہہ نفلي و خیراتي چندہ ھی بطور ملکي اخبار تھوڑا ( نھوڑا بمعني نفي استعمال فرمایا ھی ) ھي ھی جس میں نادھندگي پر نالش کا خوف ھو یا داروگیر کا اندیشہ پس دیا تو دیا ندیا تو کیا حرج ھوا ولیکن یہہ سمجھنا اُنکا صحیح نہیں اور نہ اشتہار شرح قیمت رسالہ اس سمجھہ کا منشاء ھی یہہ چندہ بعد وعدہ دینے کے نفلي نہیں رھتا بلکہ بحکم نصوص صریحہ مثل زکوۃ و نذر معین واجب ھوجاتا ھی جسکو حاکم اسلام جبراً دلا سکتا ھی اور اُسکے ندینے پر خلاف وعدگي کا جرم عظیم و گناہ جسیم دامنگیر ھوتا ھی — رھا جواب عدم اندیشہ نالش سو یہہ ھی کہ اگرچہ ھم نادھندگان پر نالش نکرینگے اور محکمہ ڈپٹي کمشنر یا ججي میں ھرگز نجائینگے مگر ان سب سے حاکم اعلی ( جو احکم الحاکمین اور شہنشاہ کہلاتا ھی ) کے پاس تو کچھہ شکایت ان حضرات کي پیش کرینگے شاید اس حاکم حقیقي کي طرف سے معافي نہو — اور کچھہ نہ کچھہ یہاں نہ سہي بروز جزا ھي اُنکو دینا پڑے " *

افسوس مسلمانوں کي حالت پر کہ جناب مولانا صاحب نے اُس چندہ کو جو نہایت قلیل المقدار ھی نصوص صریحہ سے واجب قرار دیا خدا کے سامنے نالش کا ڈر دکھایا یہہ بھي بتلادیا کہ جیسے شرک معاف نہوگا یہہ گناہ بھي معاف نہوگا پھر بھي مسلمانوں کي حمیت جوش میں نہیں آتي اور چندہ نہیں دیتے نہ قیامت سے ڈرتے ھیں نہ سزا سے پس اس سے زیادہ کیا افسوس ناک حالت ھوسکتي ھی — بھائیوں براے خدا مولانا کي مدد کرو قیامت کے عذاب سے ڈرو نیچریوں کي ' چھوٹے بھائیوں کي ' اُن کو تردید کرنے دو تمکو بہت بڑا ثواب ملیگا حوریں ملینگي غلمان ملینگے شرابیں پیوگے موتي کے محلوں میں رھوگے دنیا چند روز است و آخر کار با خداوند ذرا تو خوف کرو خدا سے تو ڈرو نہ نقد نہ تیرہ اُدھار کے مسئلہ کو چھوڑو ' و اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولا ' کي قمچي سے خوف کرو *

# اطلاع

احباب کي خواهش سے همنے پھر تہذیب الاخلاق جاري کیا هی مگر اِسکے پرچے قریب قریب خریدارون کي تعداد کے برابر چھپینگے اور خریداران مابعد کو پرچہ‌هاے مقدم ملنے نہایت دشوار هونگے *

همنے طرز سابق تہذیب الاخلاق کو بدل دیا هی ضروري اطلاعون اور مضامین زاید کے لئے یہہ دو ورقہ جدا گانہ قرار دیا هی اور اصلي مضامین کو اس طرح پر چھاپنے کا ارادہ کیا هی کہ جب اِس دو ورقہ کو خارج کرکر جلد بندي کیجاوے تو تمام پرچے مثل کتاب کے مجلد بندي میں آجاوین *

سابق میں تہذیب الاخلاق کے حروف نہایت باریک تھے اُنکو ترک کردیا هی اور جلي حرفون میں چھاپنا شروع کیا هی اُنہي اسباب سے جو اوپر بیان هوئے اُسکے کالمون میں بھي تبدیل کي هی مقصود اس سے یہہ هی کہ تصانیف احمدیہ جو چھپ رهي هی اُسي تقطیع اور اُسي وضع پر تہذیب الاخلاق بھي چھپے تاکہ رفتہ رفتہ یہہ بھي تصانیف احمدیہ کي جلدون میں بطور ایک جلد کے شامل هوسکے *

پہلے تہذیب الاخلاق بھي بعد حذف اشتہارات و مضامین غیر مقصودہ اسي تقطیع وضع پر ازسرنو چھاپے جاوینگے اور وہ سب تصانیف احمدیہ کي جلدون میں شامل هونگے اسلیئے ضرور تھا کہ اسبات کا خیال رکھا جاوے کہ آیندہ جسقدر تہذیب الاخلاق چھپے اُسي کي مناسبت سے چھپے جو صاحب اس پرچہ کا خریدنا چاهیں اُنکو چاهیئے کہ دس روپیہ کا کرنسي نوٹ پیشگي بھیجدیں اور وہ دس روپیہ ڈیڑ برس کي قیمت متصور هونگے *

راقـــــــم

سید احمد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

بابت

ہ جمادي الثاني

ب مطابق سنہ ۱۲۹۶ ھجري

اریخ بحساب سال نبوي

کتب احکمت ایتہ

۱۳۰۹

علیگڈہ

مطبع علیگڈہ انسٹیٹیوٹ میں باہتمام شیخ علیم‌اللہ چھپا
سنہ ۱۸۷۹ع ۔

# رسالہ اشاعة السنة

جناب مولوي ابو سعيد محمد حسين صاحب نے اپنے رسالہ ماہ مئي ميں جو کچھہ هماري نسبت ارقام فرمايا هى اُسکا شکر ادا کرتے هيں *

مگر هماري دانست ميں امام غزالي يا ابن تيميہ اگر کسي کے کفر کا فتوى ديں تو اُنکے فتوے سے وہ کافر نهيں هوجاتا اور نہ وہ لوگ جنکے کفر کا آپ فتوے دے رهے هيں آپ کے فتوے سے کافر هوسکتے هيں *

امام غزالي رحمة الله عليہ کو هم واجب التقليد نهيں سمجهتے بلکہ همارا عمل اِن دو کلموں پر هى *

کلمة حکم من سفيه فاقبلوها ، و کلمة سفه من حکيم فاغفروها ،

امام غزالي کے ديگر رسالوں سے ثابت هوتا هى کہ اُنکا يهہ اعتقاد نهيں رها تها جو اُنهوں نے المنقذ من الضلال ميں لکها هى اور نہ وہ راے اُنکي قايم رهي تهي جو اُنهوں نے اپني ايک مهمل کتاب مسمى تهافة الفلاسفہ ميں لکهي هى *

پس جو بات اچهي هى امام غزالي کي هو يا ابن تيميہ کي يا آپ کي اُسکو ضرور هم قبول کرتے هيں *

مگر يهہ هم نهيں قبول کرسکتے کہ اسلام عقل سے خارج اُمور يا احکام کے مجمع کا نام هى ، اور اگر هم اُسکو تسليم کرليں تو کوئي وجهہ نهيں هى کہ هم اَوْر مذهبوں ميں جو لغو و بيهودہ باتيں مذکور هيں اُن سے اِنکار کريں *

اگر هم اس پر يقين کريں کہ بني اسرائيل کے سر پر خدا کے حکم سے ايک فرشتہ پهاڑ اُٹها لايا تها تاکہ اُن پر ڈالدے تو همکو اسبات سے کہ خدا کي مرضي سے هنومان جي لنکا کي لڑائي ميں پهاڑ اُٹها لائے تهے اِنکار کرنے کي کوئي وجهہ نهيں هى *

همارے ايک نهايت قابل اور لايق عيسائي دوست نے هم سے ايک مرتبہ کها کہ " مجهکو تثليث کے مسئلہ پر نهايت شبهہ هوا اور جهاں تک غور کي مجهے يقين کها کہ يهہ مسئلہ صحيح نهيں هى اور ناسمجهي کي بات هى — پهر مجهے خيال هوا کہ يوني ٹيرين (يعني موحد عيسائي) ٹهيک بات کهتے هيں اور مجهکو بهي مناسب هى کہ ميں يوني ٹيرين هوجاؤں چنانچہ ميں ايک بهت بڑے عالم يوني ٹيرين پادري پاس گيا اور اُس سے کها کہ ميں تثليث کے مسئلہ کو صحيح نهيں جانتا اور اِس لئے يوني ٹيرين هونا چاهتا هوں آپ مجهکو يوني ٹيرين کے عقايد بتلا ديجئے — پادري صاحب نهايت خوش

هوئے اور فرمایا کہ یونی ٹیرین مذهب میں کوئی بات نہیں هی صرف اتني بات هی کہ خدا کو وحدہ لاشریک جاننا چاهئیے اور ایک یہہ بات هی ده حضرت مسیح کو تمام دنیا کے لوگوں سے اعلیٰ اور افضل یقین کرنا چاهیئے پہلی بات کو تو میںنے دل سے قبول کرلیا — دوسري بات پر مجھکو ذرا تامل هوا کہ تمام دنیا کے لوگوں کا حال هم نہیں جانتے یہہ تو هم قبول کرسکتے هیں کہ حضرت مسیح نہایت مقدس اور بزرگ اور انسانوں میں ایک عمدہ انسان تھے مگر یہہ کیونکر مان لیں کہ تمام دنیا کے انسانوں سے افضل اور اعلیٰ تھے کیونکہ هم تمام دنیا کے انسانوں کا حال نہیں جانتے مگر پھر میںنے غور کیا اور دل میں کہا کہ یہہ کچھہ بڑي بات نہیں هی جس سے انکار کیا جاوے اور جہاں تک کہ هم جانتے هیں بلا شبہہ حضرت مسیح عمدہ سے عمدہ انسان تھے — یہہ سوچکر میںنے کہا کہ بہتر میں ان دونوں باتوں کو قبول کرتا هوں اِسکے سوا اور اگر کچھہ هو تو وہ بھي فرمائیئے — پادري صاحب نے فرمایا کہ صرف ایک بات اور ماننی چاهیئے اور وہ یہہ هی کہ حضرت مسیح تمام انسانوں کے گناهوں کے بدلے فدیہ هوگئے جب پادري صاحب نے یہہ بات کہي تو میں اپني ٹوپي اور چھتري اُٹھاکر کھڑا هوگیا اور کہا کہ گُڈبائي یعني رخصت هوا — پادري صاحب نے کہا کیوں کیوں میںنے کہا کہ اگر مجھکو یونی ٹیرین مذهب میں ایک بےعقلي کي بات پر یقین کرنا ضرور هی تو کچھہ فرق نہیں هی کہ دوسرے مذهب کي دس بے عقلي کي باتوں پر یقین کروں " *

پس اگر اسلام میں بھي کچھہ بے عقلي کي باتوں پر یقین کرنا ضرور هی تو اُس میں اور اَوْر مذهبوں میں جن میں بہت سي بے عقلي کي باتوں پر یقین کرنا لازم هی کچھہ فرق نہیں هی *

همارے عقاید کي نسبت جو نتایج جناب مولوي صاحب نے نکالے هیں وہ صحیح هوں یا غلط مگر ایک بات جناب ممدوح نے ٹھیک لکھي هی — بلا شبہہ همارا اعتقاد هی کہ " من شهدان لااله الا الله مستیقناً بهاقلبه فدخل الجنة و ان زنی و ان سرق علی رغم انف ابي ذرّ " *

پس بہشت میں جانے کو رادها کشن یا سید احمد نام هونا دونوں برابر هیں *

یہہ بھي خیال رهے کہ میں حضرت عمر کو آنحضرت صلعم کي برابر نہیں جانتا کہ یہہ اعتقاد رکھوں کہ حضرت عمر کے اِنکار کرنے سے یہہ وحي غیر متلو اور یہہ عمدہ و سچّا اُصول منسوخ هوگیا — اور یہي سبب هی کہ هم توحید ثلاثہ کے موحد کو ناجي جانتے هیں *

راقـــــــم
سید احمد

# اطلاع

احباب کي خواهش سے همنے پهر تهذيب‌الاخلاق جاري کيا هى مگر اِسکے پرچے قريب قريب خريداروں کي تعداد کے برابر چهپينگے اور خريداران مابعد کو پرچه‌هاے مقدم ملنے نهايت دشوار هونگے *

همنے طرز سابق تهذيب‌الاخلاق کو بدل ديا هى ضروري اطلاعوں اور مضامين زايد کے لئے يهه دو ورقه جدا گانه قرار ديا هى اور اصلي مضامين کو اس طرح پر چهاپنے کا اراده کيا هى که جب اِس دو ورقه کو خارج کرکر جلد بندي کيجاوے تو تمام پرچے مثل کتاب کے جلد بندي ميں آجاويں *

سابق ميں تهذيب‌الاخلاق کے حروف نهايت باريک تهے اُنکو ترک کرديا هى اور جلي حرفوں ميں چهاپنا شروع کيا هى اُنهي اسباب سے جو اوپر بيان هوئے اُسکے کالموں ميں بهي تبديل کي هى مقصود اس سے يهه هى که تصانيف احمديه جو چهپ رهي هى اُسي تقطيع اور اُسي وضع پر تهذيب‌الاخلاق بهي چهپے تاکه رفته رفته يهه بهي تصانيف احمديه کي جلدوں ميں بطور ايک جلد کے شامل هوسکے *

پهلے تهذيب‌الاخلاق بهي بعد حذف اشتهارات و مضامين غير مقصوده اسي تقطيع و وضع پر ازسرنو چهاپے جاوينگے اور وه سب تصانيف احمديه کي جلدوں ميں شامل هونگے اسلئے ضرور تها که اسبات کا خيال رکها جاوے که آينده جسقدر تهذيب‌الاخلاق چهپے اُسي کي مناسبت سے چهپے جو صاحب اس پرچه کا خريدنا چاهيں اُنکو چاهئے که دس روپيه کا کرنسي نوٹ پيشگي بهيجديں اور وه دس روپيه ڈيڑ برس کي قيمت متصور هونگے *

راقــــــم

سيد احمد

# THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

بابت

ماہ رجب

سنہ ۱۳۰۹ نبوی مطابق سنہ ۱۲۹۶ ہجری

مادہ تاریخ بحساب سال نبوی

## کتب اُحکمت اٰیٰتہٗ

۱۳۰۹

---

علیگڈہ

مطبع علیگڈہ انسٹیٹیوٹ میں باہتمام شیخ علیم اللہ چھپا

سنہ ۱۸۷۹ع

# تہذیب الاخلاق

اور

## اُسکے دوبارہ جاری ہونے کی خوشی

یہہ جمادی الاولٰی کیسا مبارک مہینہ ہی۔ کہ جس میں تہذیب الاخلاق پھر جاری کیا گیا آج کیسا خوشی کا روز ہی کہ وہ ہمارا ہمدم جو ایک مدت سے ہم سے جدا ہوگیا تھا اپنے نورانی چہرے سے ہماری آنکھوں کی پتلیوں کو تجلی بخشا اللہ اللہ یہہ کیسی نیک ساعت ہی کہ وہ ہمارا معزز مہمان جسکی آمد آمد کے ہم کچھہ عرصہ سے منتظر تھے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہمارے لکھنے پڑھنے کے کمروں کو از حد زینت بخشا اور وہ ہمارا ناصح شفیق جسکی نصیحت عبرت انگیز سے ہم محروم ہوگئے تھے اپنے نصایح دل پزیر کی اُمیدوں سے ہمارے دلی مطالب کو از حد افزوں کیا الغرض جس گھڑی پرچہ تہذیب بابت ماہ مذکور میرے ہاتہہ آیا میں نے بے اختیار اُسکو اول سر و آنکھوں کو لگایا اور پھر حافظ کا ایک قطعہ اُسکی نسبت زبان پر لایا — قطعہ

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب * کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

چو دیدم روے خوبش سجدہ کردم * بحمداللہ نکو کردارم امشب

جو مضامین اس پرچہ اول میں شایع ہوئے ہیں اُنکا دلچسپ و باحق ہونا اہل انصاف پر بخوبی روشن ہی اور علی ہذا القیاس جو عمدہ آرٹیکل متعدد پرچوں میں آیندہ درج ہوا کرینگے ضرور بالضرور موافقوں کے لیئے ایک جلد تحفہ اور مخالفوں کے لیئے ایک بیاض نوحہ کے ہونگے اس میں کچھہ شک نہیں کہ تہذیب کے نہونے سے ہماری قومی ضعیف کشتی ادبار کے گرداب میں تباہ ہوجاتی جسکے ثبوت میں مسلمانان ہند کی پست حالی کی شہادت کافی ہی پس برادران اہل اسلام کو لازم بلکہ واجب ہی کہ تہذیب الاخلاق کی ویسی ہی قدر کریں جسکا کہ وہ مستحق ہی اور اُسکے واجب التعظیم بانی مبانی کے حق میں دعاے خیر کیا کریں تاکہ ہم اُنکی بیش بہا معلومات کی برکت اور لاانتہا تجربہ کی بدولت اپنے منزل مقصود کو پہنچ جاویں *

اخیر پر مجھکو اس امر کا اظہار کرنا بہی ضروریات سے ہی کہ ہماری خواہش کے مطابق پرچہ ہذا کے مکرر اجراء پانے سے ہمکو اس بات کی قوی اُمید ہوتی ہی کہ یہہ پرچہ اُس قوم میں جسکی خیر خواہی اُسکی اصل غرض ہی اپنا پورا پورا اثر پیدا کیئے بغیر پھر موقوف نہوگا *

راقم

محمد امیر خاں

# تہذیب الاخلاق

نہایت خوشی کا مقام ہی کہ اخبار تہذیب الاخلاق جسکے مکرر جاری ہونے کی نسبت علیگڈہ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں کئی مضامین لکھے جاچکے ہیں جمادی الاول سنہ ۱۳۰۹ نبوی سے پھر جاری ہوگیا اور دو پرچہ نکل چکے جو اسوقت ہمارے روبرو رکھے ہوئے ہیں — اگرچہ دو تین پرچہ دیکھکر ہم کسی اخبار کی نسبت ایک مستقل راے قایم نہیں کرسکتے الا جیسا شوق ہمکو اس بات کا تھا کہ یہہ اخبار مکرر جاری کیا جاوے ویسا ہی شوق ہمکو اس بات کا بھی ہی کہ انہیں دو پرچوں سے جو خیالات ہمکو ہوئے وہ بذریعہ اخبار اپنے ہمخیال احباب و دیگر اصحاب پر ظاہر کیئے جاویں — گو وہ ریویو نہ سہی الا اس سے کسیقدر یہہ بات تو ظاہر ہوجاویگی کہ ہمکو کس قسم کے مضامین کی ضرورت ہی اور تہذیب الاخلاق میں اسی قسم کے مضامین شایع ہوتے ہیں یا نہیں — اس اخبار کے جاری کرنے سے جیسا سب جانتے ہیں بجز صلاح و فلاح قوم اور کچھہ غرض نہیں اور یہی باعث ہی کہ اس پرچہ کو اخبار امصار و دیار سے کچھہ واسطہ نہیں — نہ یہہ اخبار کسی کی موت پر رنج کرتا ہی نہ کسی کے موقع خوشی پر خوشی ظاہر کرتا ہی — ہاں قوم کے ہمدردوں اور دلسوز اور سچے خیر خواہوں کے رنج میں اسکو رنج ہی اور انکی عزت اور خوشی میں اسکی عزت اور خوشی *

ہماری قوم کی حسن معاشرت اور اعلی درجہ کی تہذیب کے واسطے تین باتیں نہایت ضروری ہیں — اور انکا ادا کرنا ہر ایک ایسے اخبار کا جسے اصلاح ملک و قوم مقصود ہو فرض ہی *

اول لوگوں کے دلوں سے اوہام باطلہ کا دور کرنا اور انکے برے نتائج سے لوگوں کو بچانا اور انکے خیالات کا صاف کرنا اور بیہودہ رسوم و عادات سے جو بالکل اخلاق کے برخلاف ہیں اور غلط اوہام پر مبنی ہیں ہٹنے کی ترغیب دینا — اچھے عادات و اطوار کے اختیار کرنے کے لیئے قوم کو آمادہ کرنا اور ان عادات و رسومات قبیحہ کو جو بمنزلہ طبیعت ثانی کے ہوگئی ہیں اور ہمکو خود نظر نہیں آتیں ظاہر کرنا *

دوم ملک کی بہتری کے واسطے جو تجاویز ترقی ہوسکیں ان سے سب کو آگاہ کرنا اور لوگوں کو اُن پر راغب کرنا — علوم و فنون مفیدہ کی اشاعت پر لوگوں کو متوجہہ کرنا اور اپنی آسودگی اور بہبودگی کی تدابیر سوچنا *

سوم اپنی زبان کو جو ہم روز مرہ بولتے ہیں شستہ کرنا اور بھدے اور انگھڑ الفاظ سے زبان کو صاف کرنا اور اسیطرح اپنی مادری زبان کی لٹریچر کو ترقی دینا — گو تہذیب الاخلاق کے ابھی صرف دو پرچے نکلے ہیں مگر ابتداہی سے ان میں ہر سہ امور کا خیال رکھہ لیا

گیا ہی — اور اپنا فرض نہایت امانت‌داری اور عمدگی سے ادا کیا گیا ہی — چنانچہ منصہ ذیل عنوان کے مضامین اُن دونوں نمبروں میں چھپے ہیں — نیچر — نیچری — انشاء اللہ — انتم اعلم بامور دنیا کم — معجزہ و کرامت — اسلام کی واجب‌الرّحم حالت — مسلمانوں کی افسوس ناک حالت — صحیفۂ فطرت — اشاعۃالسُّنۃ — فضیلت کی پگڑی طالب علموں کی تلخ زندگانی — ان میں سے سب مضمون بجز آخری مضمون کے حصول اور مقصد اول کے لیئے نہایت مناسب اور مفید ہیں — اور آخری مضمون حصول مقصد ثانی کے لیئے اور مقصد ثالث ضمناً سب میں مطلوب ہی *

مسلمانوں میں اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں ہزاروں رسوم بیہودہ جاری ہیں جنکی بنا صرف کسی وہم باطل و تعصب پر ہی — اور جو ہماری ترقی علم اور درستی اخلاق و اصلاح طریق معاشرت کی سخت سد راہ ہیں — اور جنکے سبب ہم شایستہ قوموں میں نہایت بے سلیقہ اور نیم وحشی شمار ہوتے ہیں اور حقیقت میں ہم اگر اپنی حالت پر انصاف سے غور کریں اور اور اقوام یورپ سے مقابلہ کریں تو جو طعنہ وہ قومیں ہمکو دیتی ہیں — ہماری قوم اُس سے بھی زیادہ کی سزاوار ہی — ہمارے بہت سے معزز ہموطن اس بات کے شاکی ہیں کہ جناب آنریبل سید احمد خاں صاحب بہادر کو ہرایک دیسی شی سے کچھہ نفرت ہوگئی ہی — اور وہ خواہ کیسی ہی عمدہ شی کیوں نہو اُنکی رائے میں کچھہ وقعت نہیں رکھتی — ہم اسبات کو تسلیم نہیں کرسکتے اور یہہ اُنکی شکایت بالکل بیجا ہی — فی‌الواقع ہم میں کونسی ایسی خوبی ہی جس میں یورپ کی قوموں سے ہم اپنا مقابلہ کرسکیں — اس بات کے سننے سے تو ہر ایک کو حیرت ہوتی ہی کہ کیا ہم میں کوئی بھی خوبی نہیں ہی اور کیا سارے جہان کی خوبیاں اور فضل و کمال اور علوم و فنون اور تہذیب و شایستگی اقوام یورپ کو ہی مل گئیں ہیں — کیسی ہی تعجب اور حیرت کی یہہ بات کیوں نہو مگر جب ہم اپنے گریبان میں مُنہہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ جو تو رہا ہی ایسا ہی — اور در اصل دیکھو تو کچھہ تعجب کی بھی بات نہیں — کیونکہ ہمارے علماء کا خیال ہی کہ دنیا اور دنیا کے عیش و نشاط سب کفار کے واسطے ہیں اور مومنوں کے واسطے تو جنت اور جنت کی خوشیاں ہیں — بجسقدر ہماری قوم ذلیل و خوار اور رسوا و بدنام ہو اُسیقدر پختگی ایمان و ترقی اسلام کی علامت ہی — ہمارے علماء کا یہہ بھی خیال ہی کہ اسلام کی ابتدا جیسی غریبوں سے ہوئی ہی ویسے ہی اُسکا خاتمہ بھی غریبوں پر ہوگا — جس قوم کا اس قسم کا اعتقاد ہو اور یہی اُنکا دین و ایمان ہو کیا اُن سے کسی قسم کی عزت اور ترقی بہبودی اور ہمت اور جرات کی اُمید ہوسکتی ہی — نہیں ہرگز نہیں — پس اگر کسی کو مطلوب ہی کہ یہہ قوم بھی دنیا میں ترقی حاصل کرے تو اول اُسے اسی بات کی کوشش لازم ہی کہ اُن غلط خیالات کی بُرائی ظاہر

کرے اور یہہ بھی ثابت کردے کہ اُنکا علاقہ مذہب سے بھی نہیں نہ وہ خواہ مخواہ اُسکے ماننے پر مجبور ہوں — ( بلکہ ہمارے نزدیک تو مذہب بھی ایک ایسی شی نہیں کہ اُسکو خواہ نخواہ بلا سمجھے بوجھے مان لیا جاوے -- مذہب کے ہر ایک مسئلہ کی صداقت پر بھی اسی قسم کا یقین کامل ہونا چاہیئے جیسا ہمیں تحریر اقلیدس کی شکلوں پر ہوتا ہی ) — تہذیب الاخلاق میں اس پر نہایت زور دیا گیا ہی اور انشاءاللہ اور سحر و کرامت و معجزہ کی نسبت جو مضامین نکلے ہیں وہ نہایت ہی مفید ہیں اور ہماری سوسئیٹی کی حالت کے عین مناسب — اس قسم کے مضامین کی از بس ضرورت ہی کیونکہ بے تعداد رسوم واہیہ ہماری قوم میں جاری ہیں جنکی بُرائی کا ایک لحظہ بھی کسی کو خیال نہیں آتا — جھوت پر جھوت بولنا — متواتر قسمیں کھانی — اثناء کلام میں غیر مہذب الفاظ استعمال کرنا بلکہ بعض اوقات فحش دشنام اثناء گفتگو میں بکنا — غیبت کرنا -- بُغض اور کینہ سے دلوں کو بھرا رکھنا — اپنے ہمرتبہ اور ہمسروں کی عزت اور ترقی پر حسد کرنا اور جلنا — ظاہری تکلف کمال درجہ کا کرنا یہہ سب باتیں ایسی معمولی ہوگئی ہیں جنکی بُرائی کا کوئی مطلق خیال بھی نہیں کرتا *

میرے ایک معزز عیسائی دوست کا ایک صاحبزادہ چند اور شریف ہندوستانی لڑکوں کے ساتھہ کھیل رہا تھا — ایک لڑکا اُن میں سے کسی کونے میں چھپ گیا اور اُس عیسائی لڑکے کو اشارہ کیا کہ وہ کسی کو نہ بتاوے بلکہ یہہ کہدے کہ وہ کہیں اَور طرف چلا گیا ہی — اُس لڑکے نے جسکی عمر ابھی آٹھہ برس سے کم ہوگی جواب دیا کہ " ہماری کتاب میں لکھا ہی کہ جھوت نہ بولو " !! *

لیکن ہمارے مقدس سے مقدس مولوی کو دیکھہ لو کہ صبح سے شام تک کسقدر جھوت بولتا ہی کتنوں کو کافر کتنوں کو مومن بتاتا ہی — کسی کو دوزخی کسی کو جنتی ٹہراتا ہی — پس تہذیب الاخلاق کی توجہہ اِن اُمور اخلاق کی طرف جنکی اصلاح کے واسطے خصوصاً یہہ پرچہ موضوع ہی نہایت ہی قابل تعریف ہی اور بہت فوائد کی اس سے توقع ہوسکتی ہی — اس قسم کے مضامین سے بہت سے اُمور کا جو بالکل اخلاق کے برخلاف ہیں انسداد ہوجاویگا *

دوسرے مقصد کے حصول کے واسطے مولوی مشتاق حسین صاحب کا مضمون طالبعلموں کی تلخ زندگانی پر چھپا ہی جسنے پرانے فیشن کی تعلیم کا نقشہ ہماری آنکھوں کے آگے کھینچکر دکھا دیا اور جو جو مضرتیں اُس سے متصور ہیں اور جو آجکل زیادہ تر نمایاں ہوتی جاتی ہیں وہ خوب تشریح سے بیان کردی ہیں — اور آخر کار مدلل طور سے یہہ بات ثابت کردی کہ جو طریقہ تعلیم کمیٹی مدرسۃالعلوم مسلمانان نے ہماری قوم کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے واسطے تجویز کیا ہی وہی ایک ایسا طریقہ ہی جس سے ہماری قوم

اپني گئي هوئي عزت اور ناموري حاصل کرسکتي هی — اور اپنے آپ کو مهذب بناسکتي هی قریباً تمام لغو رسوم و عادات اور طرح طرح کے تعصبات اور هر ایک قسم کا تنزل جو هماري قوم میں هو رها هی ان سب آفات کي جڑ عمدہ تعلیم کا نه هونا هی — میري عمدہ کي ناحق قید لگاتي - مطلق تعلیم کا پهیلنا هي ان سب بدیوں کو رفع کرسکتا هی - جبتک هماري قوم کا هرایک فرد بشر جولاها - تیلي - سقه - درزي اسقدر علم نه رکهتا هوگا که وہ عام اُردو اخبارات پڑهسکے اور آسان آسان علم فهم کتابیں سمجه سکے تب تک ان سب لغو اور بیهودہ رسوم و عادات کا انسداد نه هوگا - پس سب سے مقدم علاج هماري قوم کے مرض موجودہ کا یهه هی که جسقدر هوسکے تعلیم عام کي جاوے - همارے بهت سے ملک کے همدردوں کو آجکل مستورات کي حالت زار پر خیال هوا هی اور وہ اُنکي اصلاح کے درپے هو رهے هیں اور کسي قدر کامیابي بهي حاصل کي هی - یهه اُنکا نهایت نیک اور منصفانه ارادہ هی خدا اُنهیں اس میں کامیاب کرے همیں خود اس بات کا بهت خیال هی اور عورتوں کي حالت بیکسي اور جهالت پر نهایت هي افسوس آتا هی لیکن اس میں کلي کامیابي تب هي حاصل هوگي جب هماري قوم کے سب مرد خواندہ هونگے اور جس دن هماري قوم کا هرایک شخص یهه چاهیگا که مستورات کي حالت کي اصلاح هو - مردوں کي تعلیم ایک زینه هی یا ایک پل هی جس پر سے گذر کر مستورات کي تعلیم حاصل هوسکتي هی — پس جهاں تک هوسکے اول مردوں کي تعلیم کا فکر چاهیئے — جب هماري قوم خواندہ هوگي تو جو هم اُسکو کهینگے وہ سنینگي اور جو هم اُسکو سمجهاوینگے وہ سمجهیگي پس اس امر پر جو توجهه تهذیب الاخلاق نے کي هی وہ نهایت هي ضروري تهي باقي رها تیسرا مقصد - سو سب جانتے هیں که جب تک کسي زبان کا مستقل لٹریچر یعني علم ادب موجود نهو تو اُس قوم کي بهي ترقي مشکل هی جو وہ زبان بولتي هی — کیونکه جب تک هماري مادري زبان کو اسقدر وسعت نهو که اُس میں هر ایک قسم کے مضامین لکهے جاسکیں اور هر ایک علم کي کتاب موجود هو تب تک هم اُس زبان سے وہ تمام فوائد نهیں اُٹهاسکتے جو زبان سے متصور هیں — همارا اُردو زبان کا علم ادب بهي ایسي هي پست حالت میں هی جیسے هماري قوم — اگر علوم جدیدہ کي کوئي کتاب هم اُردو میں ڈهونڈهیں تو نهایت مشکل سے دستیاب هوتي هی بلکه هوتي هي نهیں — کوئي کتاب جیالوجي — زوالوجي — کیمستري فلاسفي کي اُردو زبان میں موجود نهیں هی — پس اس زبان کو جب تک وسعت نه دیجاوے ان علوم کا اُردو میں ترجمه کرنا محال هی — غیر اقوام اور بعض همارے انگریزي خواں هموطن تو یهه سمجهتے هیں (اور یهه اُنکي سمجهه کسیقدر صحیح هی ) که علوم تو درکنار اور اقسام کے مضامین بهي جو انگریزي زبان کے وسیله سے ظاهر هوسکتے تهیں وہ اُردو میں نهیں ظاهر هوسکتے مگر همارے فخر هند

مولانا سید احمد خان صاحب نے اس طرف بھی کچھہ کم توجهہ نهیں فرمائی — آپ نے هر ایک مضمون اور هر ایک تحریر میں اُسی سادگی اور پاکیزگی کو ملحوظ فرمایا هی کہ وہ عبارت خود بخود دلوں پر موثر هوتی هی — اور پڑهنے والوں کے دلوں پر ایک سحر کا سا کام کرتی هی *

جسطرح خط و کتابت اور مختلف زبان کی کتابوں کے پڑهنے اور هر ایک قوم کے محاورات و رسوم سے واقف هونے سے خیالات کی ترقی هوتی هی اور وہ ادل بدل هوتے هیں اسیطرح آپس کے نقل حول سے الفاظ بھی ادل بدل هوتے هیں اور اسیطرح زبان وسیع هوتی جاتی هی — مگر همارے قوم کے علماء غیر زبانوں کے الفاظ اختیار کرتے بھی ڈرتے هیں اور معصیت جانتے هیں — همارے قوم کے علماء و فضلاء ابتک یهہ نهیں سمجھے کہ نیچر اور قوانین قدرت کیا شی هی اور قوانین قدرت کیسے باقاعدہ اور مستحکم هیں کہ اُن میں بلا برباد هونے تمام نظام دنیا کے کسی قسم کی تبدیل و تحویل ممکن نهیں — همارے علماء نے قوانین قدرت کو ایسا بودا سمجھہ رکھا تھا جو هر ایک فقیر اور ولی کے کہے سے ٹوٹ جاویں — جسیے یهہ بڑی بھاری غلطی همارے علماء نے کی تھی ویسے هی بُرے نتایج اُس سے عاید هوئے هیں — مذهب میں — امور معاشرت میں — بول چال میں — غرضکہ سب کاموں میں جو خرابی اور بیهودگی اور بے تهذیبی پائی جاتی هی وہ سب اسی غلطی پر مبنی هی — جسدن همارے علماء قوانین قدرت اور انکے استحکام کو سمجھینگے اسدن هم اپنی قوم کی اصلاح کی پختہ اُمید کرسکینگے — اس مطلب کے سمجھانے کے لیئے سید صاحب نے دو مضمون بعنوان نیچر و نیچری دیئے هیں — جن میں یهہ بات دکھائی هی کہ هم قوانین قدرت سے کیسے جکڑے هوئے هیں — جو کام هم کرتے هیں اور جو کچھہ هم کهتے هیں بلکہ وہ لعن و طعن اور کفر کے فتوی بھی جو لوگ سید صاحب کو دیتے هیں عین قوانین قدرت کے موافق هیں — " نیچر " والے مضمون میں قران شریف کی چند آیات یکجا جمع کر کر دکھایا هی کہ اُس میں بھی کسقدر " نیچرل تھیا لوجی " بھری هوئی هی اور نیچر سے وجود صانع پر کیا عمدہ استدلال کلام مجید میں کیا گیا هی — جناب منشی ذکاءالله صاحب نے بھی ' نیچر ' کے باب میں ایک فصیح و بلیغ مضمون لکھنا شروع کیا هی جسکا عنوان " صحیفہ فطرت هی " اور جو ایک عالمانہ اور محققانہ تحریر هی یهہ کئی ارتیکلوں میں ختم هوگا *

اس مضمون کے ختم کرنے سے پهلے یهہ عرض کرنا بھی مناسب هی کہ اگرچہ تهذیب الاخلاق کے جاری کرنے سے همارے قوم کی حالت معاشرت کی اصلاح مقصود و مطلوب هی اور اسی واسطے سوشل ریفارمر یعنی تهذیب الاخلاق اسکا نام هی مگر اپنے مروجہ مذهب کا کوئی بھی مسئلہ ایسا نہوگا جسکا کچھہ نہ کچھہ اثر همارے دنیوی امور پر نہ پڑتا هو یا جس میں بهت کچھہ حشو و زواید نہ مل گیا هو — پس جو غلط توهمات مذهب کے نام سے موسوم اور اُس میں داخل هوگئے هیں اُن سے اسلام کو پاک کرنا بھی نهایت ضروری هی — هزاروں بدعات مذهب کی اوٹ میں دن رات هوتی هیں جنکی بُرائی کبھی نظر نهیں آتی اور اور هزاروں قومی ترقی اور انسانی همدردی کے کام مذهب کے کسی غلط یا مختلفہ مسئلہ کے برخلاف هونے کے باعث ترک کیئے جاتے هیں — اس قسم کے کسی مسئلہ کی نسبت صرف یهہ کهدینا بھی کافی نهیں هوتا کہ اسکا تعلق مذهب سے نهیں — تاوقتیکہ اُن تمام وجوہ کا جن کے باعث وہ مسئلہ متعلق مذهب سمجھا جاتا هی ابطال نہ کیا جاوے — پس اس اخبار میں اُن تمام اعتراضات اور شکوک پر جو مانع ترقی سمجھے جاتے هیں ضرور بحث هونی چاهیئے اور جو داغ ناحق اسلام پر لگائے جاتے هیں اُن کا رفع

کرنا اس اخبار کا فرض ہی — میری راے میں اُسی مطلب کے واسطے سید صاحب نے تفسیر القران لکھنی شروع کی ہی اور وہ اسطرف نہایت توجہہ فرما رہے ہیں مگر ہماری قوم کے اور عالی دماغوں اور عالموں کو بھی تو اسطرف متوجہ ہونا چاہیئے — ہمیں اس بات کے دیکھنے سے کمال افسوس ہی کہ جو صاحب تہذیب‌الاخلاق کے ارکان اور اُسکے بڑے حامی سمجھے جاتے ہیں اُنہوں نے کچھہ التفات اسطرف نہیں فرمایا — یہہ اس اخبار کے کچھہ مدت بند رہنے کا ہی اثر ہی کہ جو اصحاب قومی ہمدردی کے کاموں میں رات دن مصروف رہا کرتے تھے اور جنکی مساعی جمیلہ سے بہت سے اعتراضات اسلام پر سے رفع ہوگئے ہیں اُنہوں نے بالکل اس نیک کام سے بظاہر پہلو تہی کردیا ہی — ہمارے مخدوم و مکرم مولانا چراغ علی صاحب کا کوئی اور مضمون بعد تحقیق قصۂ سلیمان کے نہیں چھپا — ہمارے مکرم معظم مولوی مہدی علی صاحب نے مقدمۂ ابن خلدون پر ریویو لکھکر ایسا دم بند کیا کہ گویا آیندہ کے لیئے لکھنے کی قسم کہالی ہیں — پس جب تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے حامی اور مددگار خاموش ہوگئے تو اوروں سے کیا اُمید ہوسکتی ہی ؟ *

یہہ تمام کارعظیم جسکی تحریک ہورہی ہی اور جو شاید کسی زمانہ کی تاریخوں میں محمدن ریفارمیشن کے نام سے لکھا جاویگا کچھہ تھوڑا سا کام نہیں اور نہ ایک آدمی کا کام ہی — جبتک مل جل کر سب کوشش نکرینگے تو اُس کا انجام ہونا دشوار ہی *

پہلے تہذیب الاخلاق کی مخالفت ہندوستان میں محدود تھی اب پنجاب میں اسکا چرچا ہوا ہی جو اس بات کی علامت ہی کہ اب پنجاب کے مسلمانوں نے بھی تہذیب‌الاخلاق کو پڑھنا اور اُسکی نصیحتوں پر عمل کرنا شروع کردیا ہی — بہت سے لوگ اُسکے مضامین کو ناپسند بھی کرتے ہیں اور مخالف مذہب اسلام جانتے ہیں اور اُنکی تردید کی کوشش کر رہے ہیں — اس کار خیر کے بانی مبانی مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری ہیں جو مخالفین تہذیب الاخلاق کے گویا امام ہیں — مگر ہمیں اس بات کا سخت افسوس ہی کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کے سمجھنے میں اکثر لوگ غلطی کرتے ہیں — اور ناحق محض تعصب سے مخالفت پر آمادہ ہوتے ہیں — چنانچہ ایک مولوی صاحب جن کا نام بیان کرنا مناسب نہیں میرے پاس اس بات کا شکوہ لائے کہ سید صاحب کے مضمون " وانتم اعلم بامور دنیا کم " کے پچھلے حصہ سے مفہوم ہوتا ہی کہ وہ قرآن شریف کے ایک جزو اعظم سے منکر ہیں - ایک اور صاحب کیا عمدہ شکایت لائے جو اُنکی خوش فہمی پر دلالت کرتی ہی کہ سید صاحب تثلیث کو پسند فرماتے ہیں اور اپنے قول کے ثبوت میں سید صاحب کا یہہ فقرہ دیکھایا کہ ہم توحید ثلاثہ کے قائل کو نا جی سمجھتے ہیں " !!! جب یہہ ہی سمجھہ ہو تو کیوں نہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کی تردید کریں اسی واسطے ہم ضروری نہیں سمجھتے کہ ایسی واہیات اعتراضات اور ایسے ہی اُن لغو باتوں کا جو رسالہ اشاعۃالسنۃالنبویہ میں مندرج ہوا کرتے ہیں کوئی صاحب تہذیب‌الاخلاق میں جواب لکھے اور ایک جدل قایم کرے — اخیر میں ہم خداوند تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ جس اخبار سے ہماری قوم کی دینی اور دنیوی بہبودی اور بہلائی متصور ہی اُسکی روز بروز ترقی ہو اور اُسکے معزز حامیوں کی ہمت میں برکت ہو — آمین *

الراقـــــــم

ممتاز علی - لاہور - پنجاب

---

† مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب جو سید صاحب کے مضمون کالفلس کی تردید کررہے ہیں اُس مضمون کو بالکل نہیں سمجھے - اُنہوں نے کالفلس اور عقل انسانی کو مرادف سمجھا ہی حالانکہ اُن میں بڑا فرق ہی -

# معذرت

رسالہ اشاعۃ السنۃ کے دیکھنے سے جو بابت ماہ جون چھپا ہی ہمکو نہایت افسوس ہی کہ جناب مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب ہمارے اُن لفظوں سے جس میں ہمنے وہابیوں کی تقسیم مقلد و غیر مقلد میں کی تھی آزردہ ہوئے ہیں ہم نہایت ادب سے اُسکا عفو چاہتے ہیں *

ہمنے بتا دیا تھا کہ وہابی وہ ہی " جو خالصۃ خدا کی عبادت کرتا ہو اور موحد ہو اور اُسکا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو " جیسیکہ جناب مولوی صاحب نے بھی صفحہ ۹ ضمیمہ میں اُسکو نقل کیا ہی پس انہی معنوں میں جو علانیہ ہم بتا چکے ہیں دو نوں قسم یعنی مقلد و لامذہب وہابیوں پر اور خود اپنے پر وہابی کا لفظ اطلاق کرتے ہیں مگر توبہ ہی آیندہ سے اس مراد تمہیں بھی اس لفظ کو استعمال نکرینگے *

مقلد وہابیوں کو موحد کا اور لامذہب وہابیوں کو اہل حدیث کا خطاب ہمارا دیا ہوا ہی جیسیکہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب کے رسالہ کے جواب میں ہمنے کہا ہی پس ہم نہایت خوش ہیں کہ جو خطاب ہمنے دیا ہی اُنکا وہی خطاب لیاکریں *

ہمنے تو معذرت بھی کرلی اور بتا بھی دیا کہ وہابی کا لفظ کن معنوں میں ہم مستعمل کرتے ہیں اگر جناب مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب موحد و اہل حدیث ہمکو بتادیں کہ جناب ممدوح ہم لوگوں کو کن معنوں میں نیچری فرماتے ہیں تو ہم نہایت خوش ہونگے *

راقـــــم
سید احمد
اڈیٹر تہذیب الاخلاق

# اطلاع

پچھلے تہذیب الاخلاق کے صفحات ۳۵ و ۳۶ و ۳۷ و ۳۸ و ۳۹ و ۴۰ میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں اس لیئے وہ صفحات مکرر چھاپے گئے ہیں وہ ہمراہ تہذیب الاخبار ہذا مرسل ہیں پس صفحات سابق خارج کردیئے جاویں اور اُنکی جگہہ صفحات مرسلہ لگا دیئے جاویں *

راقـــــم
سید احمد

# اطلاع

احباب کي خواهش سے همنے پهر تهذيب‌الاخلاق جاري کيا هی مگر اسکے پرچه قريب قريب خريداروں کي تعداد کے برابر چهپينگے اور خريداران مابعد کو پرچهاے مقدم ملنے نهايت دشوار هونگے *

همنے طرز سابق تهذيب‌الاخلاق کو بدل ديا هی ضروري اطلاعوں اور مضامين زايد کے ليئے يهه دو ورقه جدا گانه قرار ديا هی اور اصلي مضامين کو اس طرح پر چهاپنے کا ارادہ کيا هی که جب اس دو ورقه کو خارج کرکر جلد بندي کيجاوے تو تمام پرچے مثل کتاب کے جلد بندي ميں آجاويں *

سابق ميں تهذيب‌الاخلاق کے حروف نهايت باريک تهے اُنکو ترک کرديا هی اور جلي حرفوں ميں چهاپنا شروع کيا هی اُنهي اسباب سے جو اوپر بيان هوئے اُسکے کالموں ميں بهي تبديل کي هی مقصود اس سے يهه هی که تصانيف احمديه جو چهپ رهي هی اُسي تقطيع اور اُسي وضع پر تهذيب‌الاخلاق بهي چهپے تاکه رفته رفته يهه بهي تصانيف احمديه کي جلدوں ميں بطور ايک جلد کے شامل هوسکے *

پهلے تهذيب‌الاخلاق بهي بعد حذف اشتهارات و مضامين غير مقصودہ اسي تقطيع وضع پر ازسرنو چهاپے جاوينگے اور وہ سب تصانيف احمديه کي جلدوں ميں شامل هونگے اسليئے ضرور تها که اسبات کا خيال رکها جاوے که آيندہ جسقدر تهذيب‌الاخلاق چهپے اُسي کي مناسبت سے چهپے جو صاحب اس پرچه کا خريدنا چاهيں اُنکو چاهيئے که دس روپيه کا کرنسي نوٹ پيشگي بهيجديں اور وہ دس روپيه ڈيڑه برس کي قيمت متصور هونگے *

راقم

سيد احمد

# THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

بابت

ماہ شعبان

سنہ ۱۳۰۹ نبوی مطابق سنہ ۱۲۹۶ ہجری

مادہ تاریخ بحساب سال نبوی

## كُتِبَ أُحْكِمَتْ آيٰتُهُ

۱۳۰۹

---

علیگڈھ

مطبع علیگڈھ انسٹیٹیوٹ میں باہتمام شیخ علیم‌الله چھپا
سنہ ۱۸۷۹ع

# ریویو

## رسالہ مؤلفہ جناب مولوی سید الطاف حسین صاحب

اندنوں ہمنے ایک چھوٹے رسالے جناب مولوی سید الطاف حسین صاحب کا تصنیف کیا ہوا ہماری نظر سے گذرے جنکو ہمنے نہایت شوق سے پڑھا مولوی صاحب ممدوح شیعی ہیں لیکن اگر انکی نسبت یہہ کہا جاوے جیسا کہ ایک مشہور قول ہی کہ "سنی بے تعصب اور شیعی بے تبرا" تو زیادہ تر مناسب ہی مولوی صاحب ممدوح نے نہایت عمدہ و نیک کام پر سعی شروع کی ہی اور مقصد انکی تمام کوشش کا یہہ ہی کہ شیعہ اور سنی دونوں میں ارتباط برادرانہ قایم ہو اور تعصب و جہالت و عداوت جو فریقین میں ہی وہ جاتی رہے درحقیقت یہہ نہایت عمدہ و قابل تعریف کے کوشش ہی اور قومی ہمدردی اور قومی دلسوزی پر دلالت کرتی ہی مولوی صاحب کی نصیحت یہہ ہی کہ کچھہ یہہ چھوڑیں اور کچھہ وہ چھوڑیں کچھہ یہہ ڈھیلے ہوں کچھہ وہ ڈھیلے ہوں اور آپس میں مل جاویں اس طریقہ سے کامیابی ہونے میں ہمکو شبہہ ہی ' ہمارا یہہ خیال ہی کہ کسیکو کسیکے مذہب سے کیا تعلق ہی ہمکو اس سے کیا مطلب ہی کہ فلاں شخص سنی ہی یا وہابی ' خارجی ہی یا شیعی عیسائی ہی یا موسائی ہندو ہی یا پارسی ہمارا کام یہہ ہی کہ ہم اپنے بنی نوع سے محبت و اخلاص دوستی و ہمدردی سے ملیں اپنے بنی نوع کی بھلائی و بہتری میں کوشش کریں اور اس خیال ہی کو جو ہمکو اختلاف مذہب کے سبب مخالفت و معاندت پر لیجاتا ہی دل سے نکال دیں ہمارا دل ہی ایسا ہونا چاہیئے جس میں مخالفت و معاندت کی جگہہ ہی نہو *

انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک خدا کے ساتھہ ایک بنی نوع انسان کے ساتھہ خدا کے ساتھہ جو پہلو ہی اُس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہی نہ بیٹے کا نہ بھائی کا نہ دوست کا نہ آشنا کا پس جس میں ہمارا کچھہ حصہ ہی نہیں ہی اُسکے سبب کسی سے عداوت اور دشمنی رکھنے کے کیا معنی ہیں ' انسان کا اپنے بنی نوع کے ساتھہ جو پہلو ہی اُس میں بلاشبہہ ہم سب حصہ دار ہیں پس اُس میں ہم سب کو شریک ہونا اور ایک کو دوسرے کی بھلائی اور ہمدردی کرنا چاہیئے ' آپسکی معاشرت اور دل کے خیال سے جسکو مذہب کہتے ہیں کچھہ تعلق رکھنا نہیں چاہیئے ' اس زمانہ کی مہذب قوموں کا یہہ حال ہی کہ آپس میں ملتی ہیں اور ایک دوسرے سے نہایت دوستی رکھتی ہیں برسوں ایک جگہہ رہتی ہیں اور کبھی مذہب کا ذکر تک نہیں آتا وہ نہیں جانتا کہ اسکا مذہبی خیال کیا ہی اور یہہ نہیں جانتا کہ اُسکا مذہبی خیال کیا ہی ' اگر معلوم ہو کہ ہم دونوں کے مذہبی خیال میں تفاوت ہی تو دونوں کو لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ایسا موقع

نہ آنے دیں جس میں ایک دوسرے کو رنج پہنچے جبکہ شیعہ معاویۃ ابن ابی سفیان کا بہ لفظ حضرت نام لینے سے چڑتے ہیں تو ہمکو کیوں ایسا موقع آنے دینا چاہئیے جس میں ہمکو حضرت معاویہ کہنے کی ضرورت پڑے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ سنی خلفاے ثلثہ کی طعن سے ناراض ہوتے ہیں تو ہمکو کیا مطلب ہی کہ ہم ایسا کریں *

یہہ طریقہ کچھہ اُس طریقہ سے زیادہ نہیں ہی جو ہم دوستوں سے بطور علم اخلاق کے برتنے میں برتتے ہیں اگر ہمارے کسی دوست کی ' کوڑھی ' چڑ ہو تو ہم اُسکو کوڑھی کوڑھی کہکر نہیں چڑاتے ' ہم اپنے کانڑے دوست کو کانڑا کہہ کر نہیں پکارتے پس مذہبی خیالات کے اختلاف سے کیوں ایک دوسرے کو چڑاویں *

خود ہمکو چند سال تک اپنے ایک شیعہ دوست کے ساتھہ جو شیعہ غالی مشہور تھے ایک جگہہ رہنے کا اتفاق ہوا اکثر ایسا اتفاق ہوا ہی کہ ہمنے اور اُنہوں نے ایک جاء نماز پر نماز پڑھی ہی اُنہوں نے خاک شفا کی ایک ٹکیہ ماتھا ٹیکنے کو رکھہ لی ہمنے اُسی جاء نماز پر سجدہ کیا کبھی آپس میں نہیں پوچھا کہ تمنے ٹکیہ کیوں رکھی اور تمنے جانماز پر سجدہ کیوں کیا تمنے ہاتھہ باندھکر نماز کیوں پڑھی اور تمنے ہاتھہ کھولکر کیوں پس مذہب دوسری چیز ہی اور معاشرت دوسری چیز ہی ' یہی طریقہ ہمکو باہمی معاشرت میں اختیار کرنا اور اسیکی نصیحت کرنا چاہئیے تاکہ مذہبی خیالات سے جو بغض و عداوت آپس میں ہی وہ دور ہوجاوے اور اس بات پر کوشش کرنا کہ کچھہ سنی اپنے عقاید میں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط کم کردیں اور کچھہ شیعہ اپنے عقاید میں سے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط کم کردیں بیہودہ معلوم ہوتا ہی ہمنے جناب سر ولیم میور صاحب کی کتاب کی تردید میں کتاب لکھی جن سے ہماری نہایت دوستی تھی لیکن باہمی ملاقات میں کبھی ذکر نہیں آیا اور نہ اُس دوستی میں جو تھی کبھی فرق ہوا ہم دونوں جانتے تھے کہ وہ اپنے اپنے خیالات ہیں ' ماسٹر رام چندر صاحب حد اعتدال سے بڑہ کر اسلام کے برخلاف کتابیں لکھتے ہیں اور ہم بدستور اُنکو اپنا دوست سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ اُنکے خیالات ہیں غایت مافی الباب یہہ ہی کہ اُن خیالات کو غلط جانتے ہیں ہم سے آج تک کسی غیر مذہب کے شخص سے باہمی دوستانہ ملاقات میں مذہبی گفتگو نہیں آئی یہہ خود ایک نا تہذیبی میں داخل ہی کہ باوجود اس علم کے کہ باہمی خیالات مختلف ہیں اور پھر باہمی معاشرت میں اُنکا تذکرہ ہو بہر حال کچھہ ہو یا نہو ہم جناب مولوی سید الفت حسین کا اس سعی کے لیئے دلی شکر ادا کرتے ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں کہ اُنکی سعی سود مند ہو *

راقـــــــم
سید احمد

# نماز میں قرأت قرآن

اخبار عام لاهور میں چهپا هی که ارکات میں مولوی محمد عزیزالدین صاحب کهتاله نے اعلان کیا هی که نماز میں ترجمه قرآن اپنی زبان میں پڑهنا چاهیئے عربی زبان میں پڑهنا درست نهیں اور جو شخص فقط ترجمه قرآن پڑهنے پر اکتفا نکرے اُسکی نماز ادا نهیں هوتی *

همارے نزدیک اس بیان میں کچهه زیادتی هی بعض متقدمین فقها وائمه کی راے تهی که نماز میں ترجمه قرآن اپنی زبان میں پڑهنا درست هی غالباً مولوی صاحب ممدوح نے بهی یهی فرمایا هوگا زاید سے زاید یهه که اُسکو اولی بیان کیا هوگا ـــ مگر همارا خیال ان سب باتوں سے مختلف هی نماز درحقیقت حضور قلب الی الباری اور خشوع و خضوع هی اور اُسکے ارکان جو فرض هیں وه اُس حضور قلب کے معین و مددکار اور کامل کرنے والے هیں قرأت بهی منجمله اُنهی ارکان کے هی ـــ نماز میں قرأت قرآن سے مقصود تدبر اُسکے معنی میں هی هی نهیں کیا نتیجه هی " مدهامتان " دو برگ سبز یا دو سبز پتے اِلکے معنی پر نماز میں تدبر کرنے سے نماز میں وه ارکان هونے چاهیئیں جو حضور قلب الی الباری پر مؤید هوں اور یهه حضور قلب اُس حالت میں زیاده تر هوتا هی جبکه نماز کے پڑهنے والے کے دل پر اسکا یقین کامل هو که یهه الفاظ جو خدا کے سامنے میرے منهه سے نکلتے هیں خاص خدا کا کلام هی ' شاید اس سے کوئی انکار نکریگا که اس تصور صادق سے نماز کی بقلبصمیما اور خدا کی عظمت دل میں زیاده نقش پذیر هوتی هی اور حضور قلب الی الله اور خضوع و خشوع میں زیاده کاملیت هونی هی اور یهی اصل مقصد نماز کا هی پس اِسی تصور کے قایم و مستقل هونے کے لیئے ضرور هی که هر عالم و عامی نماز میں اصل کلام خدا کا بدون اِسکے که کسی زبان کے ترجمه میں تبدیل کرے پڑها کرے تاکه مقصد نماز کامل طور پر حاصل هو ـــ باقی یهه بات که قرآن کا ترجمه پڑه لینے سے نماز هوجاتی هی یا نهیں دوسرا مسئله هی جس پر قدیم سے اختلاف هی *

اگر غور کیا جاوے که نماز میں کهڑے هوکر چند لفظ کهدینے سے خواه وه قرآن کے هوں یا ترجمه کے یا علاوه اسکے کیا نتیجه هی کیونکه اُن لفظوں کا کهدینا کچهه مقصود نهیں هی بلکه مقصود نماز هی اور وه درحقیقت اصل قرآن پڑهنے سے کامل هوتی هی *

همنے بهت سے جاهل آدمیوں کو نماز میں علی الخصوص تراویح میں اور بعضا دفعه پنج آیت پڑهے جانے میں جو بزرگوں کی فاتحه کے ختم میں پڑهی جاتی هیں دیکها هی که قرآن کے ایک حرف کے معنی بهی نهیں سمجها مگر اُسکے اس صادق خیال نے که یهه خدا کا کلام پڑها جاتا هی اُسکے دل پر ایسا اثر کیا که وه بیتاب هوکر زار زار رونے لگا یهه

اتو جو اُسکے خیال کا تھا ترجمہ سے حاصل ہونا غیر ممکن تھا پس یہہ کافی دلیل اِسبات کی ہی کہ نماز میں اصل قرآن کا پڑھنا نہایت ضرور ہی *

ہاں جو مولا بعد نماز خطبہ عربی میں پڑھتے ہیں جیسےکہ رومن کیتھلک یونانی میں وہ بلاشبہہ نامناسب ہی قرآن میں اور انجیل میں بڑا فرق یہہ ہی کہ جس طرح ہم مسلمان قرآن کے الفاظ کو خدا کے لفظ سمجھتے ہیں پیغمبر کے نہیں سمجھتے اس طرح عیسائی انجیل کو نہیں سمجھتے گو وہ اُسکو خدا کا کلام کہتے ہیں اُسکے الفاظ کو وہی لفظ جانتے ہیں جو حضرت یوحنا و متی و لوقا و مارکس نے بولے تھے پس اگر وہ اُنکا ترجمہ پڑھیں یو چنداں مضایقہ نہیں لیکن اگر وہ بھی نماز سے وہی مقصد لیں جو ہملے لیا ہی اور صرف دعا ہی کا مقصد نہ لیں تو اُنکو بھی وہی لفظ پڑھنے اولیٰ ہیں جو حواریوں کی زبان سے نکلے تھے لیکن عیسائیوں کے ہاں نماز و دعا ایک چیز ہی اور ہم مسلمانوں کے ہاں نماز ایک جدا شی مستقل ہی اور دعا جدا شی ہی اور ہم اس میں بالکل متفق ہیں کہ دعا ہمیشہ اپنی زبان میں ہونی چاہیئے حتی کہ جو لوگ نماز میں قنوت پڑھتے ہیں وہ قنوت بھی اپنی زبان میں ہونا چاہیئے *

راقم

سید احمد

---

## غلط فہمی

اِس زمانہ میں سنی و شیعہ وہابی و بدعتی موحد و اہلِ حدیث جو اپنے تئیں بڑا دیندار سمجھتے ہیں یہہ خیال رکھتے ہیں کہ آپس میں مختلف خیالات کے لوگوں میں دوستی اور ہمدردی اور اتفاق اور محبت و یگانگت ہوہی نہیں سکتی اُنکا دل خود تعصبات اور بدی و بد اخلاقی سے بھرا ہوا ہوتا ہی اور اُنکے دل میں بجز اپنے ہم مشرب کے اور کسی کی جگہہ نہیں رہتی اس واسطے وہ سوایے اپنے ہم مشرب کے اور سب سے عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں اور اُسکو نہایت ثواب اور دینداری میں اپنا کمال سمجھتے ہیں مگر ہماری سمجھہ میں انسان میں اِس سے زیادہ کوئی بدی نہیں ہی *

یہی سبب ہی جو اکثر لوگ یہہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق میں جو ہمارے دوست مضامین لکھتے ہیں وہ سب ہمارے ہی مشرب کے ہیں اور اسی خیال سے جناب موحد مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری کسی کو ہمارا خلیفہ اور کسی کو ہمارا پیرو تعبیر کرتے ہیں مگر یہہ اُنکی اور جو ایسا سمجھتے ہیں اُنکی محض غلطی ہی ہمارے دوست ہمارے سچے محبوب اور ہمارے سچے محب ہیں اور میں بلاشبہہ خدا کا نہایت

شکر کرتا هوں اور بجاے فخر و ناز کرتا هوں که خدا نے مجهکو اپنے دوست ایسے دئیے هیں که اِس زمانه میں ایسے دوست ملنے عجایبات سے هیں مگر یهه سمجهنا که هم سب کے خیالات بهي ایک سے هیں محض غلط فهمي هی بلکه همارا مقصود یهه هی که اِجتهاد میں کوشش کرنا که لوگ همارے هم مشرب هوجاویں نهایت کم ظرفي اور کمینه خصلت هی جب جو شخص که اپنے تئیں محقق سمجهتا هی گو که اُسنے غلطي سے اور باوجود ناا‌هلي کے اپنے تئیں اُسکا اهل سمجها هو اُسکے دل میں کبهي اِسبات کا خیال بهي نهیں آتا که لوگ میري پیروي کریں اُسکي خوشي صرف اِس میں هوتي هی که جو مشکل اُسکو پیش آئي تهي اُس مشکل کو اُسنے اپني دانست میں حل کرلیا بس یهي اُسکي معراج هی لوگوں سے پیروي کي خواهش کرنا انبیا علیهم‌السلام کا کام تها جو گذر گئے اور اِس زمانه میں اُس شخص کا حق هی جو اپنے تئیں پیر معان بنانا اور مرجع جهال ٹهرانا اور خواه نخواه مرد آدمي بنا چاهتا هو توکل کو اور مریدوں اور پیروں کي خدمت کو ذریعه معاش قرار دینا اُسکا دلي مقصد هو ٭

اِس میں کچهه شک نهیں که مولوي صاحب اور پیرجي صاحب بنے سے جو خوشي دلکو حاصل هوتي هی اور تکبّر و فخر و غرور وانا مقدس کے خیال سے دل کو بالیدگي هوتي هی وه بادشاه کو بادشاهت میں بهي نصیب نهیں هوتي اور جسکو اُسکا مزا پڑجاتا هی وه کبهي چهوڑتا هي نهیں مگر یهه طریقه اور اُس میں فخر کرنا اُنهي لوگوں کا کام هی جنکو خدا نے اسي کام کے لیئے پیدا کیا هی — هم ایک دنیادار آدمي هیں همارے پیرو کیسے اور همارے خلیفه کیسے — جو که اکثر لوگوں کا یقین تها که سید احمد صاحب زنده هیں اور مثل امام مهدي کے غایب هوگئے هیں شاید همارے مخدوم موحد و اهل حدیث مولوي ابوسعید محمد حسین صاحب لاهوري کو یهه شبهه هوا هوگا که میں وهي اُس فرقه ناجیه کا سرگروه هوں اے حضرت میں وه نهیں هوں اور سرگروه بنے سے نفرت کرتا هوں ٭

همارے دوست اپنے اپنے خیالات کے مالک هیں وه جوکچهه تهذیب‌الاخلاق میں لکهتے هیں وه اُنهي کے خیالات هیں — همارے دوست مولوي محمد مشتاق حسین صاحب خدا پناه میں رکهے وه کتنے صاحب اِتقا هیں که شاید دوسرا کوئي هوگا — هم اُنهي کو سرمنڈے تخنا کهلے گتے پڑے بهائي کهتے هیں اور شاید همارے اِن طعنوں کے لفظوں سے اُنکے دل میں بےانتها محبت کا اثر پیدا هوتا هوگا — بورڈنگ هوس مدرسة‌العلوم میں جس بات کا اُنکو سب سے بڑا اهتمام هی وه یهه هی که تمام طالب علم نماز جماعت میں حاضر هوں نماز کے بعد حاضري لي جاتي هی اور غیر حاضري جرم قرار پاتا هی اُنکے خیالات اِس زمانه کے کتنے مسلمانوں کے سے خیالات هیں اور شاید همارے ایک مسئله کو بهي نهیں مانتے مگر میاه درون نویں اور یهي بزرگ تهذیب‌الاخلاق میں سب سے زیاده مضامین لکهتے هیں ٭

ایک اور همارے دوست اُن سے بهي زیاده کٹے حاجي حافظ مولوي محمد اکبر صاحب بیٹے جناب مولانا و مرشدنا حاجي حافظ مولوي محمد نورالحسن صاحب مرحوم نوراللہ مرقدہ هیں جو مجهه کو مجهه سے بزرگوار کهتے هیں مگر حقیقت میں هندي محاورہ میں چهوٹا بناتے هیں اور مدرسةالعلوم میں مدرس اور بورڈنگ هوس کے مهتمم هیں یهه تو میں نهیں کهتا که وہ مجهکو کافر جانتے هونگے مگر میرے حال پر افسوس تو بهت کرتے هونگے اُن سے کهتا هوں که اجي مولوي جي کوئي مضمون تو تم بهي تهذیب الاخلاق کے لیئے لکهدو وہ کچهه اچها تو هونے کا نهیں مولویانه خیال کا هوگا بهلا تهذیب الاخلاق میں برکت تو هوگي هاں هوں کرتے هیں خدا نے چاها کبهي اُنکا مضمون بهي چهپیگا *

او ایک اور همارے دوست مولوي خواجه محمد یوسف صاحب کا حال سنو جو اب سنڈروں مدرسةالعلوم کي تمام کتابوں کے هیں بهه وهي هیں جو نماز کے بعد کچهه پڑهکر اور مٹهي میں پهونک بند کرکر آگے پیچهے چهوڑتے هیں همارے خیالات سے اسقدر مختلف هیں که لوگوں کو نصیحت کرتے هیں که هماري تحریروں کو نه پڑهیں کیونکه اُس میں جادو هوتا هے اور دل میں اُسي تحریر کا یقین آجاتا هے جب میں نے اُنکو ایک آیت بتائي اور کها یهه کون کهتے تهے جب سے چهوڑا هے *

همارے دلي محبوب مولوي سید مهدي علي صاحب جنکو همنے کسي آرٹکل میں لطفاً لطفي کرکے تعبیر کیا هے گو نهایت روشن ضمیر هیں مگر اُسي ایشائي مولویت میں مبتلا هیں اُنهوں نے نهایت عمدہ عمدہ اور بڑے زور شور کے آرٹکل تهذیب الاخلاق میں لکهے هیں جو بےمثل و بےنظیر هیں مگر کوئي حرف اُنهوں نے ایسا نهیں لکها جسکي سند کسي نه کسي کي اگلے علماء میں سے نه نکال لي هو بهت سے همارے خیالات هیں جنکو وہ تسلیم نهیں کرتے *

همارے دوست مولوي چراغ علي صاحب اور هي خیالات کے هیں وہ اپنے علم و فضل اور متعدد زبان داني کے خیال سے عبري یوناني سریاني انگریزي عربي فارسي کي فلوالجي کي تحقیق میں مصروف رهتے هیں اور جب تک اُسکي سند اُنکو نه مل جاوے تنکا بهي نهیں توڑتے بهت سے خیالوں میں هم سے متفق اور بهت سوں میں مختلف هیں *

ایک همارے دوست همارے دلي والے بهائي منشي محمد ذکاءالله صاحب هیں جو هماري قوم کے لیئے اپنے اُن کمالات ذاتي و صفاتي و علمي کے لیئے جو اُن میں خدا نے جمع کیئے هیں باعث افتخار هیں اُنکے خیالات همارے خیالات سے جدا هي هیں وہ تمام چیزوں پر علوم کو اعلی سمجهتے هیں اور تمام چیزوں کو علم هي کي روشني سے روشن کرنا چاهتے هیں *

ایک همارے دوست مولوي الطاف حسین صاحب حالي هیں جنکي مثنوي بےمثل و بےمثال ابهي چهپ چکي هے فرشته صفت فرشته صورت فرشته جسم اسلام پر آنکهه بند کرکر

یقین کرنے والے تھا ہم نہیں یقین کرسکتے کہ سواے خطبہ بشارت کے اور ہماری کسی تحریر پر وہ یقین کرتے ہوں *

ایک ہمارے نوجوان دوست مولوی ممتاز علی صاحب ہیں خدا اُنکو زیادہ ترقی نصیب کرے شاید ہمارے بہت سے خیالات کو پسند کرتے ہیں مگر بہت سوں کو ناپسند بھی کرتے ہونگے *

ہمارے اخ مخدوم و افتخار برادران مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب ہیں جو بانی و حامی اور عقل کل مدرسۃ العلوم کے ہیں اگر کہا جا سکتا ہی کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص ہی جسنے حتی المقدور کوئی کام خلاف شرع نہیں کیا تو غالباً وہی ہونگے اُنکی ذاتی صفات اور دلی نیکی سے جو واقف ہی وہی اُنکی قدر کرسکتا ہی باایںہمہ محبت و یگانگت شاید ہمارے ایک خیال کو بھی صحیح نہ سمجھتے ہونگے ایسے سخت متعصب ہیں کہ ایک بھی آرٹکل تہذیب الاخلاق میں نہیں لکھا اُنسے کہا کہ بھائی یہی لکھو کہ خدا ایک ہی یہہ لکھنا بھی گناہ سمجھا نعوذ باللہ منہا *

ہمارے مخدوم مولانا سید فریدالدین احمد خاں بہادر کی ایک لہر ہوتی ہی کبھی تو ہمکو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں اور کبھی جہنم واصل کرتے ہیں *

باقی ہمارے دوست جیسے جناب مولوی سید زین العابدین خاں بہادر جناب مولوی محمد کریم صاحب میر سید ظہور حسین صاحب مرزا محمد رحمت اللہ بیگ صاحب چودھری محمد عارف صاحب ایسے ہیں جنکو اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کہتا ہی اور کیا بکتا ہی اپنی محبت و دوستی کے برتنے سے کام رکھتے ہیں جو کچھ کہو کرنے کو موجود خفا ہو تو اُسکی برداشت کرنے کو حاضر ہاں اِن سب میں پھر بھی محمد عارف صاحب کو قومی بھلائی اور قومی ہمدردی کا زیادہ چسکا ہی *

باوصف خیالات کے اسقدر اختلاف کے ہم سب آپس میں نہایت دوست ہیں اور ایک بات پر یعنی قومی بھلائی اور قومی ہمدردی اور قوم کی ترقی کی تدبیر کرنے میں سب متفق ہیں اور ہر ایک بقدر اپنی طاقت اور مطابق اپنے خیال کے قومی بھلائی میں کوشش کرتا ہی کوئی تہذیب الاخلاق میں آرٹکل لکھتا ہی کوئی مدرسۃ العلوم میں سعی کرتا ہی پس لوگوں کی نہایت غلط فہمی ہی جو کسی کو کسی کا پیرو اور کسی کو خلیفہ سمجھتے ہیں *

لوگ یہہ خیال کرتے ہونگے کہ جناب مولوی حاجی سید امداد العلی خاں بہادر سی ایس آئی ہمارے بڑے مخالف ہیں مگر اُنکو جاننا چاہیئے کہ باوصف اسقدر اختلاف خیالات کے وہ ہمارے ویسے ہی دوست ہیں جیسے کہ ایک مدت دراز سے تھے ہمارے خیالات کے وہ کیسے ہی مخالف ہوں مگر مدرسۃ العلوم کے قیام کو نہایت عمدہ سمجھتے

هیں ــــ افسوس هی که کئی دفعه هم اُنکی خدمت میں حاضر هوئے اِدهر اُدهر بہت دیکها کہیں روپیه اُنکی تهیلی نظر نہیں پڑی ابکی دفعه ایسے وقت پر جاوینگے جبکه چپراسی تنخواه خزانه سے لاتا هوگا اور لوگوں کو دکهاوینگے که کس طرح اُنکی پوری تنخواه مدرسة العلوم کے چنده میں داخل هوئی *

راقم

سید احمد

---

# اشتهار

## تصانیف احمدیه

جسمیں

## تفسیر القرآن بهي شامل هی

یهه مجموعه چهپ رها هی کل مسائل مذهبی به ترتیب رسائل تصنیف چهاپے جاتے هیں اور تفسیر قرآن مجید بهی چهپتی جاتی هی جسقدر اوراق چهپ جاتے هیں خریداروں کے پاس بهیجدیئے جاتے هیں ــــ اُنکی تقسیم کا کوئی خاص زمانه معین نہیں هی جس وقت ایک مقدار مناسب چهپ چکتی هیں بهیجدیئے جاتے هیں *

قیمت اِس مجموعه کی جس میں تفسیر قرآن بهی شامل هی فی روپیه تین جزو مقرر هی اور سو روپیه پیشگی لیئے جاتے هیں اور شرط یهه هی که بعد اختتام مجموعه مذکوره کے حساب کیا جاویگا اگر تین سو جزو سے کم هونگے تو بقدر کمی قیمت واپس هوگی اگر تین سو جزو سے زاید هونگے تو بقدر اجزاے زاید قیمت لیجاویگی *

جو لوگ صرف تفسیر قرآن لینا چاهتے هیں اُنکو تنها تفسیر قرآن نہیں مل سکتی کیونکه تفسیر قرآن کل مجموعه تصانیف احمدیه میں شامل هی *

اِس مجموعه کے صرف سو نسخے چهاپے جاتے هیں اور اسی سبب سے قیمت نهایت گراں هی جب سو خریدار پورے هوجاوینگے تو پهر کسی کی درخواست خریداری نہیں لیجاویگی *

راقم

سید احمد

# اطلاع

احباب کی خواہش سے ہمنے پھر تہذیب الاخلاق جاری کیا ہی مگر اسکے پرچے قریب قریب خریداروں کی تعداد کے برابر چھپینگے اور خریداران مابعد کو پرچہاے مقدم ملنے نہایت دشوار ہونگے ۔

ہمنے طرز سابق تہذیب الاخلاق کو بدل دیا ہی ضروری اطلاعوں اور مضامین زاید کے لئیے یہہ دو ورقہ جدا گانہ قرار دیا ہی اور اصلی مضامین کو اس طرح پر چھاپنے کا ارادہ کیا ہی کہ جب اس دو ورقہ کو خارج کرکر جلد بندی کیجاوے تو تمام پرچے مثل کتاب کے جلد بندی میں آجاویں ۔

سابق میں تہذیب الاخلاق کے حروف نہایت باریک تھے انکو ترک کردیا ہی اور جلی حرفوں میں چھاپنا شروع کیا ہی انہی اسباب سے جو اوپر بیان ہوئے اسکے کالموں میں بھی تبدیل کی ہی مقصود اس سے یہہ ہی کہ تصانیف احمدیہ جو چھپ رہی ہی اسی تقطیع اور اسی وضع پر تہذیب الاخلاق بھی چھپے تاکہ رفتہ رفتہ یہہ بھی تصانیف احمدیہ کی جلدوں میں بطور ایک جلد کے شامل ہوسکے ۔

پہلے تہذیب الاخلاق بھی بعد حذف اشتہارات و مضامین غیر مقصودہ اسی تقطیع وضع پر ازسرنو چھاپے جاوینگے اور وہ سب تصانیف احمدیہ کی جلدوں میں شامل ہونگے اسلئے ضرور تہا کہ اسبات کا خیال رکھا جاوے کہ آیندہ جسقدر تہذیب الاخلاق چھپے اسی کی مناسبت سے چھپے جو صاحب اس پرچہ کا خریدنا چاہیں انکو چاہیئے کہ دس روپیہ کا کرنسی نوٹ پیشگی بھیجدیں اور وہ دس روپیہ ڈیڑہ برس کی قیمت متصور ہونگے ۔

راقم

سید احمد

# THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

# تہذیب الاخلاق

بابت

ماہ رمضان

سنہ ۱۳۰۹ نبوی مطابق سنہ ۱۲۹۶ ہجری

مادہ تاریخ بحساب سال نبوی

## کُتُبٌ اُحْکِمَتْ آیٰتُہٗ

۱۳۰۹

---

علیگڈہ

مطبع علیگڈہ انسٹیٹیوٹ میں باہتمام شیخ علیم اللہ چھپا

سنہ ۱۸۷۹ع

# اطلاع

احباب کی خواہش سے ہمنے پھر تہذیب الاخلاق جاری کیا ہی مگر اِسکے پرچے قریب قریب خریداروں کی تعداد کے برابر چھپینگے اور خریداران مابعد کو پرچہاے مقدم ملنے نہایت دشوار ہونگے ●

ہمنے طرز سابق تہذیب الاخلاق کو بدل دیا ہی ضروری اطلاعوں اور مضامین زاید کے لیئے یہہ دو ورقہ جدا گانہ قرار دیا ہی اور اصلی مضامین کو اس طرح پر چھاپنے کا ارادہ کیا ہی کہ جب اِس دو ورقہ کو خارج کرکر جلد بندی کیجاوے تو تمام پرچے مثل کتاب کے جلد بندی میں آجاویں ●

سابق میں تہذیب الاخلاق کے حروف نہایت باریک تھے اُنکو ترک کردیا ہی اور جلی حرفوں میں چھاپنا شروع کیا ہی اُنہی اسباب سے جو اوپر بیان ہوئے اُسکے کالموں میں بھی تبدیل کی ہی مقصود اس سے یہہ ہی کہ تصانیف احمدیہ جو چھپ رہی ہی اُسی تقطیع اور اُسی وضع پر تہذیب الاخلاق بھی چھپے تاکہ رفتہ رفتہ یہہ بھی تصانیف احمدیہ کی جلدوں میں بطور ایک جلد کے شامل ہوسکے ●

پہلے تہذیب الاخلاق بھی بعد حذف اشتہارات و مضامین غیر مقصودہ اسی تقطیع وضع پر ازسرنو چھاپے جاوینگے اور وہ سب تصانیف احمدیہ کی جلدوں میں شامل ہونگے اسلیئے ضرور تہا کہ اسبات کا خیال رکہا جاوے کہ آیندہ جسقدر تہذیب الاخلاق چھپے اُسی کی مناسبت سے چھپے جو صاحب اس پرچہ کا خریدنا چاہیں اُنکو چاہیئے کہ دس روپیہ کا کرنسی نوٹ پیشگی بھیجدیں اور وہ دس روپیہ ڈیڑہ برس کی قیمت متصور ہونگے ●

راقم
سید احمد

# تهذیب الاخلاق

من ابتداے

ماہ جمادي الاول لغایت ماہ رمضان

سنہ ۱۳۰۹ نبوي مطابق سنہ ۱۲۹۶ ھجري

مادہ تاریخ بحساب سال نبوي

## کِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰیَاتُهٗ

۱۳۰۹


علیگدہ

مطبع علیگدہ انسٹیٹیوٹ میں باھتمام لالہ گلاب راے چھپا

سنہ ۱۸۷۹ ع

# فہرست مضامین

# تہذیب الاخلاق

سنہ ۱۳۰۹ نبوي　　　　سنہ ۱۲۹۶ هجري


## کتٰب اُحکمت اٰیٰتہٗ

## نیچر

اچھے لفظ بھي جب بري نیت سے استعمال کیئے جاویں تو برے ھوجاتے ھیں ' آپ بڑے عالم ھیں ' کہنے والے کي نیت سے بڑے جاھل کے معنوں میں ھوجاتا ھی ' مگر ھم کیوں کسي کي نیت کو بد قرار دیں ' ھمکو تعجب ھی کہوہ لوگ † جو آئمہ اربع کے مذھب پر نہیں چلتے غیر مقلد یا لامذھب کہنے کو کیوں گالي سمجھتے ھیں حالانکہ در حقیقت وہ آئمہ اربع کي تقلید نہیں کرتے اور اُنکے مذھب پر نہیں چلتے پھر سچ بات سے کیوں برا مانتے ھیں اور اوروں کي نیت کو کیوں برائي پر لیجاتے ھیں ' وھي لوگ اور اور اُن کے چھوٹے بڑے بھائي ھمکو " حضرات نیچریہ " کہتے ھیں ھم تو نہ اُنکے کہنے سے برا مانتے ھیں نہ اُنکي نیت میں برائي لگاتے ھیں ' بلکہ اُنکا احسان مانتے ھیں کہ سچ بات کہتے ھیں ' اور جس مذھب کو خدا نے اپنا مذھب بنایا ھی نہایت نیک نیتي سے اُسي مذھب کي طرف ھمکو منسوب کرتے ھیں ' خدا کہتا ھی '

فاقم وجھک للدین حنیفا ' فطرت اللہ التي فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ' ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون ( سورۃ الم الروم )

سیدھا کر اپنا مونھہ خالص دین کے لیئے جو نیچر خدا کا ھی جس پر لوگوں کو بنایا ھی ' خدا کي پیدایش میں کچھہ تبدیل نہیں ھی ' یہي مستحکم دین ھی ' ولیکن اکثر لوگ نہیں جانتے *

شاہ ولي اللہ صاحب نے ' صاحب تفسیر ابن عباس نے " فطرت اللہ " کا ترجمہ دین خدا کیا ھی ' پس جو ھمارے خدا کا مذھب ھی وھي ھمارا مذھب ھی ' خدا نہ ھندو ھی نہ عرفي مسلمان نہ مقلد نہ لامذھب نہ یہودي نہ عیسائي وہ تو پکا چھٹا ھوا نیچري ھی وہ خود اپنے کو نیچري کہتا ھی ' پھر اگر ھم بھي نیچري ھیں تو اس سے زیادہ ھمکو کیا فخر ھی ' لاتبدیل لخلق اللہ ' کي تفسیر میں قاضي بیضاوي نے لکھا ھی " لایقدر احد ان یغیرہ "

---

† جناب مولوي محمد حسین صاحب نے رسالہ اشاعتہ السنۃ میں لکھا ھی کہ ' عاملین بالحدیث لفظ غیر مقلد یا لامذھب کہنے کو گالي سمجھتے ھیں *

یعنی دیکھنا مقدور نہیں ھی کہ اُسکو بدل دے پس یہہ خدا کا دین ضرور پھیلیگا نہ میرے روکنے سے روکیگا نہ تمہارے روکنے سے ' نہ نورالافاق کی تحریریں اُسکو مٹا سکیں نہ اشاعۃ السنہ کی تحریریں اُسکو مٹا سکینگی 'اور نہ تیرھویں صدی اُسکو نقصان پھونچاریگی' نیچر خدا کا دین ھمیشہ سے ھی اور ھمیشہ رھیگا *

مذھب اسلام اُن بندشوں کے توڑنے کو آیا تھا جو فطرت یا نیچر پر لوگوں نے باندھی تھیں وہ کوئی نئی بندش نیچر یا خدا کے دین پر باندھنے نہیں آیا اُسنے قیدوں کی ھتکڑیوں کو توڑا ھی اور کوئی نئی بیڑی یا ھتکڑی نہیں ڈالی ھی' اُسنے پورا حق آزادی کا فطرت ' نیچر کے مطابق لوگوں کو دیا ھی اور اُسیکو اُنکا دین بلکہ خدا کا دین بتلایا ھی ' پس اوپر کی بندشوں کو توڑنے دو اور بےعیب مذھب اسلام کو ' نیچر کو ' خدا کے دین کو ' خدا کے مذھب کو ' چمکنے دو ' وہ چمکیگا اور کسیکے چھپائے سے نہیں چھپنے کا *

دسینے خدا کو اوؔر کسیطرح نہیں جانا 'اگرجانا تو نیچر ھی سے جانا ' موسی نے رب ارنی کے جواب میں کیا سنا ' لن ترانی ولکن انظرالی الجبل ' پہاڑ پر کیا تھا ؟ وھی نیچر قانون قدرت کا نمونہ تھا ' خود خدا بھی اپنے آپ کو کچھہ نہیں بتلا سکا اور جو بتلایا تو نیچر ھی کو بتلایا -- بولا کہ جسنے زمیں کو تمہارے لیئے بچھونا اور آسمان کو ڈیرہ بنایا اور آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہارے کہانے کے لیئے طرح طرح کے میووں کو اُگایا وھی خدا ھی —— بولا کہ " سمجھہ داروں کے لیئے آسمان و زمین کے پیدا کرنے ' رات دن کے مختلف ھونے ' کشتی کے دریا میں چلنے ' اسمان سے پانی برسنے ' زمین کے مرکر زندہ ھونے ' اُس پر چلنے والوں کے پھیلنے ' ھواؤں کے اِدھر اُدھر چلنے ' بادلوں کے آسمان و زمین میں ادھر ھونے ھی میں نشانیاں ھیں *

جب پوچھو کہ تو کون ھی ؟ اُسکا جواب تو کچھہ ندے اور اپنے قانون قدرت کو بتاوے اور بولے ' کہ وہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں ادل بدل کردیتا ھی ' زندہ سے مردہ مردہ سے زندہ نکالتا ھی *

وہ وہ ھی کہ جسنے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا ' تمہارے لیئے جوڑا بنایا ' اُن سے عورت مرد پھیلا دیئے' خدا کون ھی ؟ بیجوں اور گٹھلیوں کو پھوڑکو اُس میں سے ھری تھنی اُگانے والا ' رات کو پھاڑکر دن نکالنے والا' رات کو آرام سے سونے کے لیئے بنانے والا ' چاند سورج سے حساب کا اندازہ سکھانے والا ' ستاروں سے جنگلوں اور دریاؤں میں اندھیری رات کو رستہ بنانے والا ' اسمان سے مینہہ برسا کر ھر چیز کو اور ھری ھری گھانس کو اُگانے والا ' اُن میں دانوں سے بھری ھوئی بالیں ' کھجوروں میں لدے ھوئے زمین پر جھکے ھوئے خوشے ' پیدا کرنے والا ' انگور زیتون اور انار کے باغ لگانے والا ' کہ جب وہ پھلتے ھیں اور پکنے پر آتے ھیں تو دیکھنے کے قابل ھوتے ھیں ' یہہ خدا ھی جو آنکھوں سے نہیں دکھائی دے سکتا *

خدا وهي تو هی جو مینهه سے پہلے ٹهنڈي هوا لاتا هی ، جو مینهه آنے کي خوشخبري دیتي هی ، جب وه بادلوں کے دل کو هنکا لاتي هی تو مرده زمین پر برستی هی جس مین سے هر طرح کے میوے نکلتے هیں *

کیا آسمان و زمین میں اور هر چیز میں جسکو خدا نے پیدا کیا اُسکي قدرت کا انتظام مضبوط کو نهیں دیکهتے ؟ پهر اُس کے بعد کونسي بات هی جس پر ایمان لاؤگے *

کون آسمان سے رزق پهونچاتا هی ، کون زمین سے رزق اُگاتا هی ، کون کان اور آنکه کا مالک هی ، کون مرده میں سے زنده اور زنده میں سے مرده نکالتا هی ، کون ان تمام کاموں کو سنوارے رکهتا هی ، تم بهي کهه اُٹهوگے که ، الله ، بے شک وهي خدا هی *

جسنے آسمانوں کو بغیر دکهائي دینے ستونوں کے اونچا کر رکها هی ، چاند سورج کو اپنا تابعدار کیا هی ، زمین کو پهیلایا هی ، پهاڑوں کو اُس میں بنایا هی ، نهروں کو اُس میں بہایا هی ، هر قسم کے میووں کو اُس میں اُگایا هی ، دن کو رات سے ڈهانکا هی ، ایک زمین میں طرح طرح کے ٹکڑوں کو بنایا هی ، کهیں انگور کے باغ هیں کهیں کهجوروں کے کهیت ، کسي میں کئي شاخیں هیں کسي میں اکهری ، کهانے میں ایک دوسرے سے مزیدار هی ، سمجهه داروں کے لیئے خدا کے جاننے کي اسي میں تو نشانیاں هیں ، *

وهي تو خدا هی جو بجلي کي چمک سے ڈراتا هی اور مینهه سے لالچ دلاتا هی ، بهاري بهاري بادل اُٹهاتا هی ، رعد سے تسبیح پڑهواتا هی ، جس پر چاهتا هی اُس پر بجلي گراتا هی ، اور پهر خدا پر جهگڑا کرتے هو *

آسمان و زمین کو ٹهیک پیدا کیا ، نطفه سے آدمي بنایا ، چوپاؤں کو تمهارے لیئے پیدا کیا ، اُن سے فائده اُٹهاتے هو ، اُن کي پوستینیں پہنتے هو ، اُنکا گوشت کهاتے هو ، جب صبح کو چرنے جاتے هیں اور شام کو چرکر آتے هیں تو اُن سے تمهاري شان و شوکت معلوم هوتي هی ، ایک شهر سے دوسرے شهر کو تمهارا اسباب پهونچا دیتے هیں ، گهوڑے اور خچر اور گدهے تمهاري سواري کے لیئے هیں ، *

آسمان سے پاني برساتا هی جسکو تم پیتے هو ، درخت سینچے جاتے هیں ، کهیتیں اور زیتون اور کهجور اور انگور اور هر قسم کے پهل پیدا هوتے هیں ، چاند سورج ستارے سب تمکو کام دیتے هیں ، رنگ برنگ کي چیزیں زمین سے پیدا هوتي هیں ، *

وهی تو خدا هی جسنے تمهارے لیئے مچهلیوں کا مزیدار گوشت کهانے کو ، اور بے بہا موتي نکال کر زیور بنانے کو ، دریا پیدا کیا ، تم دیکهتے هو که کسطرح کشتیاں اُس کا پاني چیرتي هوئي چلتي هیں ، زمین کے مرکز ثقل پر تلے رهنے کو پهاڑ بنائے ، اور تمهارے چلنے کو نهریں اور رستے نکالے ، نشان بنائے که ستاروں کو دیکهکر تم چلتے هو *

بھینسوں اور گایوں پر غور کرو ' اُن کے پیٹ میں خون اور گوبر کے سوا کیا ھی ' مگر ... کیا مزیدار دودھ پلاتی ھیں ' کھجوروں اور انگوروں سے کسطرح پیٹ بھرتے ھو ' اور نشہ دار شرابیں بناتے ھو ' *

خدا ھي نے مکھي کو سکھایا کہ پہاڑوں میں ' درختوں میں ' اونچے مکانوں میں ' اپنے گھر بنائے ' اور ھر قسم کے میووں کو چوسے ' اور پھر اپنے پیٹ میں سے رنگ برنگ کے شھد نکالے '' اور خداھي نے تمکو بھي تو پیدا کیا ھی پھر تمکو مارڈالیگا ' تم میں سے کسیکو نہایت بڈھا کردیا ھی ' *

خدانے تمکو تمھاري ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا ' کان دیئے ' آنکھیں دیں ' دل دیا ' تاکہ تم شکرکرو ' پرند جانوروں کو نہیں دیکھتے جو آکاس میں اُدھر تھمے ھوئے ھیں ' کوئي اُنکو نہیں تھامتا ' بجز خدا کے ' اسي میں تو ایمان والوں کے لیئے نشانیاں ھیں ' خدا ھي نے تمھارے رھنے کے گھر اور جانوروں کي کھال کے ڈیرے ' اُنکي اُون سے اور اُنکے بالوں سے اسباب ' گرمي سے بچنے لڑائي میں زخموں سے محفوظ رھنے کا لباس بنایا ھی ' اِسپر بھي اگر وہ پھرجاویں تو اے پیغمبر انھي ( یعني نیچر کے ) پیغاموں کا پہونچادینا تیرا کام ھی *

خدا ھي حباب سے بادلوں کو ھنکاتا ھی ' پھر اُنکو اکھٹا کرتا ھی ' پھر تہ بتہ جماتا ھی ' پھر اُن میں سے بوندیں گرتي ھیں ' آسماني کالے پہاڑوں میں سے سفید سفید اولے پڑتے ھیں ' بجلي چمکر آنکھوں میں چکاچوند کردیتي ھی ' خداھي رات کو دن کردیتا ھی '' انھي باتوں میں عقلمندوں کے لیئے نصیحت ھی *

خدا کي یہہ نشاني ھی کہ ' تمکو مٹي سے پیدا کیا پھر تم چلتے پھرتے آدمي ھو ' خدا کي یہہ نشاني ھی کہ ' تمھیں میں سے تمھارا جوڑا بنایا اور اُن میں محبت ڈالي ' خدا کي یہہ نشاني ھی کہ ' آسمان پیدا کیئے تمھاري بولیاں اور تمھارے رنگ جدا جدا بنائے ' خدا کي یہہ نشاني ھی کہ رات کو تم سورھتے ھو اور دن کو روزي ڈھونڈتے پھرتے ھو ' *

خدا نے آسمان سے مینھہ برسا ' پھر اُس سے رنگ برنگ کے میوے پیدا کیئے پہاڑ میں سے سفید سرخ چمکیرے کالے بھنور پتھر کے ٹکڑے نکالے ' آدمیوں اور جانوروں کے بھي طرح طرح کے رنگ بنائے *

فرعون نے موسی سے پوچھا کہ خدا کون ھی ؟ موسی نے نیچر ھي سے سمجھایا اور کہا کہ آسمانوں کا اور زمین کا اور جوکچھہ کہ اُن میں ھی اُنکا خدا ' فرعون نے اپنے ھالي موالي سے کہا کہ تم سنتے ھو یہہ کیا کہتا ھی ' موسی نے کہا کہ ' تمھارا اور تمھارے باپ دادا کا خدا فرعون بولا کہ ' یہہ پیغمبر جسکو ھمارے پاس بھیجا ھی یہہ تو کچھہ دیوانہ ھی *

موسی پر کیا موقوف ھی جتنے پیغمبر گذرے ھیں سب نیچري تھے — خدا خود نیچري ھی جب لوگوں نے نیچر کے قوانین کو چھوڑا تب ھي اُس نے پیغمبر بھیجا ' جو

پیغمبر آیا اُس نے کیا کیا — پھر لوگوں نے نیچر کا رستہ بنایا اور جتنا بگاڑا تھا اُتنے کو پھر سنوارا ' جب موسیٰ سے نیچرلسٹ کو لوگوں نے مجنون کہا ' تو پھر ہم کس گنتی میں ہیں ہمکو جو چاہیں کہیں *

خدا نے ہمکو ' ہماری جان کو ' ہماری سمجھہ کو ' ہمارے قیاس کو ' ہمارے دل و دماغ کو ' ہمارے رونئیں رونئیں کو ' نیچر سے جکڑ دیا ہی ' ہمارے چاروں طرف نیچر ہي نیچر پھیلادیا ہی ' نیچر ہي کو ہم دیکھتے ہیں ' نیچر ہي کو ہم سمجھتے ہیں ' نیچر سے خدا کو پہچانتے ہیں ' پھر نیچري نہوں تو کون ہوں ' کوئي کیسا ہي مسلمان ہو ہم تو بلاشبہہ فطرتي مسلمان ہیں ' ہمارے باپ دادا بھي کبچھہ کرشمہ و کرامات دیکھہ کر ایمان نہیں لائے تھے وہ بھي فطرتي مسلمان تھے ' ہمارا ہي دادا تھا جس کے دل میں فطرتي ایمان نے جب جوش کیا تو تھبرا گیا ' اور نیچر کو ' فطرت کو ' خدا کے دین کو ' ڈھونڈنے لگا ' خدا ہي نے اُس کو " ملکوت السموات والارض " دکھلادی ' وہ ملکوت کیا تھي وھي نیچر ' فطرت ' خدا کا دین تھا ' رات کے اندھیرے میں ایک روشن ستارہ نیچر کا پرکالہ دیکھا جانا کہ یہي خدا ہی ' چاند کو نور کا ٹکرا پایا اُسي پر خدا ہونے کا دھوکا کھایا ' سورج کو سب سے زیادہ چمکیلا دیکھا اُسي پر خدا ہونے کا گمان کیا ' مگر جب دیکھا کہ یہہ سب تو ڈوب جاتے ہیں تو بول اُٹھا ' کہ میں اُس پر ایمان لایا جسنے فطرت نیچر کو بنایا ' اور پکا فطرتي مسلمان ہوا ' پس جب ہمارا دادا ابراہیم نیچري تھا تو ہم اُسکي ناخلف اولاد نہیں ہیں جو نیچري نہوں ' نیچر ہمارے خدا کا ' ہمارے باپ دادا کا ' تمغہ ہی ' ہم نیچري ' ہمارا خدا نیچري ' ہمارے باپ دادا نیچري ' اگر کوئي اس مقدس لفظ کو بري نیت سے استعمال کرتا ہی ' وہ جانے اور اُسکا دین ایمان ' وہ صرف ہم ہی کو نہیں کہتا ' بلکہ خدا کو پیغمبر کو ابراہیم کو سب کو کہتا ہی ' پھر لوگوں کو جو وہ چاہیں کہنے دو ' ہمکو اُنکي نسبت بھي حسن ظن رکھنے دو ' اُنکو اُن کي راہ پر ' ہمکو اپني راہ پر ' اپنے خدا کي راہ پر ' اپنے باپ دادا کي راہ پر ' پیغمبروں کي راہ پر ' رسولوں کي راہ پر ' آزر کے بیتے ابراہیم کي راہ پر ' چلنے دو * ( بیت )

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار * فکر ہرکس بقدر ہمت اوست

راقـــــــم

سید احمد

# فضیلت کي پگڑي

اور

# طالب علموں کي تلخ زندگاني

فضیلت کي پگڑي بلاشبهه ایک هر دل عزیز چیز هی — هر ایک وقت میں اور هر ایک ملک اور هر ایک قوم میں جسقدر تهذیب کو ترقي هوتي گئي اُسیقدر اِس پگڑي کي خواهش اور اُسکي قدر و منزلت بڑهتي رهي هی' یہاں تک که اب اس گئے گذرے وقت میں بهي هر ایک مسلمان بچه جو میزان الصرف شروع کرتا هی اُسکے مربیوں اور سرپرستوں کي یهي دلي تمنا هوتي هی که وہ اپنے سلسله تعلیم کو پورا پورا تمام کرے اور اُس کے سر پر فضیلت کي پگڑي باندهي جاوے — گذشته زمانوں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے دارالعلوم اور مدرسةالعلوم صرف اسي وجهه سے نامي تهے که وہ اپنے طالب علموں کے سروں پر فضیلت کي پگڑیاں باندهتے تهے' اور آج بهي بڑے بڑے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو اگر فخر هی تو اسي بات کا هی — بي اے اور ایم اے اور ایل ایل ڈي وغیرہ کے معزز خطاب اور ڈگریاں جو آج کل کے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے دیئے جاتے هیں اور عالم و فاضل کے معزز خطاب اور فضیلت کي پگڑیاں جو پہلے وقتوں کے مدارس اور دارالعلوموں کے تمغے تهے ان سب مختلف لفظوں کا مفهوم واحد هی — قدیم زمانه کي وہ بهاري بهرکم سفید پگڑیاں اور زمانه حال کے یهه نیچے نیچے سیاہ چغے دونوں ایک هي کارگاہ کي ساخت هیں اور دونوں کے تانے بانے میں ایک هي رشته کام میں آیا هی *

مگر افسوس هی که جس طرح پر یهه چیزیں قیمتي اور هر دل عزیز اور عام پسند هیں اُسي طرح آج کل همارے ملک اور خاصکر هماري قوم کے واسطے وہ کمیاب بلکه نایاب هیں بہت سے لوگوں نے اُس کي وجوہ پر غور کیا هی اور مسلمانوں کي طرز تعلیم میں بہت سے نقص ثابت کیئے هیں اور هر ایک نقص پر بہت تفصیل کے ساتهه بحث کي هی اور اُس کے دفع کرنے کي تدبیریں بتلائي هیں — یهه مباحثے ابهي جاري هیں اور آینده بهي جاري رهینگے لیکن میں اسوقت صرف اُس ایک بہت بڑے زبردست اُصول سے بحث کروں گا جسکو گذشته زمانه میں هماري قوم نے تحصیل علم کا همیشه ایک بہت بڑا ذریعه خیال کیا هی — جسکي بدولت فضیلت کي پگڑیوں کے نهان کے تهان هماري قوم نے حاصل کرلیئے اور جس کے فیضان سے بڑے بڑے علامه شخص قوم میں پیدا هوئے — جس نے صدها اور هزارها عملي نظیریں اپني واجبیت کے ثبوت میں صفحه عالم پر ظاهر کردیں — اور

جس اُصول کو اب تک بھي ھماري قوم کے پرانے خیالات کے لوگ ویسا ھي مفید اور باعظمت خیال کرتے ھیں جیسا وہ ابتدا سے تسلیم ھوتا چلا آتا ھی *

وہ اُصول جس کي تمہید میں اسقدر مبالغہ کیا جاتا ھی یہہ ھی کہ " ایک تلخ زندگاني اختیار کیئے بغیر علم حاصل نہیں ھوتا " تلخ زندگاني سے وہ طریق عمل مراد ھی جس سے بڑے عالموں اور فاضلوں کي سرگذشت معمور ھی -- ھر ایک حصہ ملک میں اور عام بڑے بڑے شہروں میں بلکہ ھر ایک قصبہ میں اور اکثر اُن مسلمان خاندانوں میں جن میں عالم و فاضل ھوتے رھے ھیں متواتر یہہ بات ثابت ھوتي ھی کہ اکثر نوجوان تحصیل علم کے شوق میں اپنے تمام گھر بار اور دنیا کے عیشوں اور لذتوں کو چھوڑکر بہت دور دور کے شہروں میں چلے چلے گئے اور وھاں ایک گمنام شخص کي مانند متوکلانہ اپني زندگي بسر کي اور کسي مدرسہ یا مسجد یا خانقاہ میں یا اور جہاں کہیں اُن کو ایک بستر کي جگہہ مل گئي وھیں اُنھوں نے اپني طالب علمي کا زمانہ بسر کردیا اور جوکچھہ روکھي سوکھي کہیں سے مل گئي اُسکو صبر و شکر سے کھا لیا اور اپنے مطالعہ کتب میں مشغول ھوگئے -- کسي دن اگر کسي قدر قوت لایموت سے زیادہ مل گیا تو اُسے دوسرے وقت کے لیئے اُٹھا رکھا — روٹیوں کے وہ بچے کُچھے ٹکڑے جو کتوں کے سامنے ڈال دیئے جاتے ھیں اس لیئے سکھاکر اُٹھا رکھے جاتے تھے کہ جب کسي وقت اُور کچھہ نہ مل سکیگا تو اُنھیں کو پاني میں بھگو بھگو کر کام میں لایا جاوے گا -- تمام تر خوشي اور عیش ان شایقین علم کا اِس پر منحصر ھوتا تھا کہ مردوں کي فاتحوں کا کھانا کہیں سے آجاوے — یا جب کسیکو مصلیوں کي ضرورت ھوتي تھي تو اُس وقت ان طالبعلموں کا استحقاق اور اَردیسي پردیسیوں سے مرجح ھوتا تھا -- رات کو مطالعہ کتب کے واسطے تیل کا بہم پہونچ جانا ایک ایسي نعمت تھي کہ جو طالب علم اُس سے بے فکر ھوتے تھے وہ بڑے خوش قسمت خیال کیئے جاتے تھے — ایک ایسي پتلي بتي جس کي اندھي روشني میں ذرا کوئي ڈاکٹر کسي کاغذ کے پڑھنے کو جایز نرکھے اُس کے گرد دو دو اور تین تین طالب علم بیٹھکر نہایت تسکین خاطر کے ساتھہ رات کا بہت برا حصہ مطالعہ کتب میں صرف کردیتے تھے اور جب اپنے تنگ حجروں کي گرمي سے بالکل بدحواس ھوجاتے تھے تو مسجدوں کے ٹوٹے پھوٹے مٹي کے گھڑے باھر صحن میں اُن کے نیم جان چراغ کو ھوا سے محفوظ رکھنے کے لیئے فانوس کا کام دیتے تھے -- اسي طرح لباس اور تمام دیگر ضروریات کي سر انجام دھي میں جو جو تکلیفیں اور ذلتیں یہہ طالب علم برداشت کرتے تھے وہ اُن مذکورہ بالا مصیبتوں سے بھي بدرجہا زاید تھیں جنکو مفصل بیان کرتے ھوئے شرم آتي ھی *

الغرض یہہ ھی وہ تلخ زندگاني جسکي نسبت بیان کیا جاتا ھی کہ تحصیل علوم میں وہ اکسیر کا حکم رکھتي تھي اور ھم بھي تسلیم کرتے ھیں کہ بلاشبہہ ایسا ھي تھا اور بلاشبہہ

سینکڑوں بلکه ھزاروں شخص جنھوں نے اس تلخ زندگاني میں اپني طالب علمي کا زمانه بسر کیا وہ فضیلت کي معزز دستار حاصل کرنے میں کامیاب ھوئے — لیکن یہاں ایک بہت بڑي بھاري غلطي ھورھي ھی جسپر اکثر لوگوں نے غور نہیں کیا ھی — حقیقت یهه ھی که ایک تریاقي معجون کا استعمال ھوا جسمیں لوگوں نے ناداني سے تھوڑا سا زھر بھي ملادیا تھا لیکن تریاقیت کا جز اُس میں اس قدر غالب تھا که اُس نے اُس مرض کو کھو دیا جسکے واسطے اُس کا استعمال کیا گیا تھا مگر تاھم چونکه اُس میں زھرؔ بھي شامل ھوگیا تھا لہذا طبیعت اُس سمیت کے اثر سے بھي محفوظ نه رھسکي اور جوں‌جوں نوبل معیت ھوتے گئے ووں ووں اُس زھر کا اثر بھي زیادہ ھوتا گیا اور تادم مرگ اُس سے رستگاري نه ھوئي --- یہاں تک که اُس کے دوامي اثر کي وجهه سے مرض طبیعت ثاني بن‌گیا اور طبایع میں یهه صلاحیت ھي باقي نرھي که صحت اور مرض میں تمیز کرسکتیں *

لوگوں نے نہایت غلطي سے اُسي زھر یعني ایک تلخ زندگاني کو جسنے یهه دوامي روگ اُن میں لگادیا تھا تریاق اور اُس نافع معجون کا جزو اعظم خیال کیا اور اصل تریاق کي طرف کبھي دھن منتقل نه ھوا — ورنه درحقیقت وہ تریاق اعظم جسنے جہالت کے مہلک مرض کو زائل کردیا یهه تھا که ان طالب علموں نے اپنا گھر اور اپنا وطن چھوڑدیا تھا نه وہ تلخ زندگاني جسنے اُس اصل تریاق کي خوبي کو بھي برباد کردیا — جس نے ایک ایسا بد اور متعدي اثر طبیعتوں میں پیدا کردیا که تادم مرگ اُس سے نجات نملي جس نے شریف نسلوں میں سے اور ایک اشراف قوم میں سے حیا اور عزت اور علو ھمت کو جو اُس قوم اور اُن نسلوں کا ذاتي جوھر تھا کہیں ضعیف اور کہیں بالکل ضعیف کردیا اور کہیں اُس سمیت کے غلبه سے وہ عمدہ جوھر جو قومي عزت کے لیئے بمنزله روح کے تھا بالکل فنا ھوگیا — نتیجے جو اِس تلخ زندگاني کي بدولت پیدا ھوئے وہ اسقدر بدیہي تھے که اُن کے تسلیم کرنے کے واسطے زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں ھی — ظاھر ھی که جب کسي انسان کي عمر کا اسقدر بڑا حصه اور خاصکر وہ زمانه جس میں انسان کي استعداد اور قابلیت بدیوں اور نیکیوں کے رد و قبول کي طرف بہت زیادہ متوجهه ھوتي ھی یعني طالب علمي کا ایک گراں بہا زمانه ایسي ذلتوں اور اَوْر رسوائیوں میں بسر ھوا ھو جو خدا دشمن کو بھي نصیب نه کرے تو ضرور اُس تلخ اور مبتذل زندگاني کا ویسا ھي اثر اخلاق پر بھي ھوگا نه اشرافوں کي سي غیرت اور حمیت مزاج میں باقي رہ سکتي ھی اور نه عمدہ نسلوں کي سي شجاعت اور فیاضي — صحیح صحیح نتیجے جو اس تلخ زندگاني سے نکل سکتے ھیں وہ دنائت اور دون ھمتي اور پست حوصلگي اور بے غیرتي اور بے شرمي اور جھوتي شیخي اور خود غرضي اور باھمي مضرت رساني کا ایک ایسا نامتناھي سلسله ھوتا ھی که جہاں تک نظر ڈالي جاوے ان بد خصلتوں کے سوا اور کوئي چیز نظر نہیں آتي — بچوں نے اپني

ناسمجھی ھی کے زمانه سے وھی عادتیں دیکھیں اور ویسی ھی صحبت پائی — شاگرد اُسی بد آب و ھوا میں پرورش پاکر اُستاد بنے اور پھر اور شاگردوں کو اُنھیں اُستادوں سے پالا پڑا اور وھی تلخ زندگانی نصیب ھوئی — عوام‌الناس جنکو تعلیم سے کچھه غرض نهیں رھی ھی اُنھوں نے اُنھی بزرگواروں کو اپنا مذھبی پیشوا سمجھا اور اُن سے رجوع لائے — دولتمندوں اور امیروں کی امارت کا لازمه یهه ھی تھا که ایک نه ایک اس قسم کے مولوی کو لگائے رکھیں جو اُن سے ایک روپیه لیکر دس روپیه کا وعدہ تو یهیں کرلیں اور سو روپیه کا چک جنت کے بنک پر اُنکو حواله کردیں اور اس طرح پر اپنی دنیا اور اُنکی عقبی درست کرتے رھیں *

قصه کوتاہ تمام قوم کی قوم کسی نه کسی حیله اور کسی نه کسی ضرورت سے اُس عام وبا میں مبتلا ھوگئی جو طالب علموں کی اُس تلخ زندگانی سے شروع ھوئی تھی آج بھی هم اور ھماری قوم اُسی وبا میں مبتلا ھی اور ایک نقطه کا بھی اُس میں کهیں فرق نهیں ھوا ھی — جدھر دیکھو ایک عام تاریکی چھائی ھوئی ھی — اُس عام طوفان نے نه حاکم میں کچھه امتیاز باقی چھوڑی ھی نه محکوم میں — نه امیر ھی اُس سے مستثنی رھے ھیں نه غریب ھی نه رذیلوں ھی کو اُس سے نجات مل سکی اور نه شریفوں ھی کو — نه عالم ھی اُس سے محفوظ رہ سکے اور نه جاھل ھی ' جو ھمارے بڈھوں کی پخته دماغی کا آج منتہا ھی وھی ھمارے بچوں کی کچی طبیعت کا اس وقت مبتدا — جس فرقه اور جس گروہ پر زیادہ غور کرتے جاؤ اُسی میں سب سے زیادہ خرابیاں دکھلائی دیتی ھیں — بھلا لعنت بر دنیا و اھل دنیا اُنکو اُنکے حال میں چھوڑو دیںداروں میں آؤ اور اول علماء رحمت الله علیهم اجمعین ھی کی خدمت میں تھوڑی دیر بیٹھو جهاں قال الله او قال رسول‌الله کے سوا اور کوئی شغل ھی نهیں ھیں جهاں دنیا ھیچ ست و کار دنیا همه ھیچ — جنکی پولیٹکل ایکونمی ( علم انتظام مدن ) میں روپیه سے بدتر آجتک خدا کی خدائی میں کوئی بےسود اور بے قدر چیز پیدا ھی نهیں ھوئی پھر وھاں دیکھو که قدم قدم پر طمع کے جال کس باریکی سے جابجا بچھے ھیں خیر اِس ناپسندیدہ ذکر کو بھی چھوڑو اور الضرورات تبیح‌المحذورات کی وسعت سے گو اپنے محل پر ھو یا نهو اُن کو متمتع ھونے دو - اُن کے دوسرے عام اخلاق کو دیکھو ؟ جی دیکھا اور خدا پھر نه دکھلائے — ایک بستی میں دو عالم بھی ایسے نه ملے جنکے آپس میں سچی ھوئے محبت اور ھمدردی پائی جاتی ھو — جو باھم ایک دوسرے کو لطف و کرم کی نگاہ سے دیکھتے ھوں — اور اِس کا تو اُن میں لوٹے لون ھوگیا ھی که جب دو بھلے آدمیوں نے دو مختلف اُستادوں سے یا دو مختلف مدرسوں میں تعلیم پائی ھو تو اُن میں علمی تعلقات کے لحاظ سے کبھی وہ سلوک مرعی نهوگا جو دو انسانوں میں باھم ھونا چاھیئے — جهاں دیکھو حسد کا زور جدھر نگاہ پھیرو رقابت موجود — پھر ذاتی رنجوں اور رنجشوں کو

مذهبي تعصبات كے پيرايه ميں لے آنا ايسا اندها دهند جاري هوا هى كه نعوذ بالله منها - فضيلت كي پگڑي سر پر بندهي اور اُنهوں نے بهشت و دوزخ كي پرتاليان بنوائيں — قومي بهلائي كے كام ميں جسميں وه اپني منفعت بالفعل كو نه ديكهه ليں كبهي ايك ٹكا نه خرچيں برخلاف اس كے قوم كے واسطے كفر و الحاد كے فتوے جتنے چاهو اُن سے ليلو -- مگر پهر جب يهه سوال كيا جاتا هى كه ايسي افسوس ناک حالت كيوں هوگئي تو اُس كا يهي جواب ديا جاتا هى كه يهه سب كچهه اُسي خراب اور تلخ زندگاني كا ثمره هى جس ميں قوم كے عالموں نے پرورش پائي — آپ ڈوبے اور اپنے ساتهه قوم كو ڈبويا — آپ تباه هوئے اور اور اپنے اثر سے قوم كي قوم كا ستياناس كرديا بلاشبهه ميرے اس عام بيان پر بعض لوگ اعتراض كرينگے — ليكن ميرے وه معزز معترض ( اگر كوئي هوں ) اول مجهكو اُنگليوں هي پر گن كر يهه تو بتلاويں كه اپني اس تمام عمر ميں اور اِن لاكهوں كروڑوں مسلمانوں ميں سے آپ ايسے كتنے شخصوں كو اپنے نزديک مستثنى سمجهتے هيں اور يهه كه پهر وه معدودے چند كہاں كہاں بهٹكتي لگاتے پهرينگے *

قومي ڈاكٹروں نے يعني اُن لوگوں نے جو اپني قوم كي اصلاح احوال اور قومي ترقي پر اُدهار كهائے بيٹهے هيں اِس عام وبا كے دفع كرنے ميں بهت سے خيال دوڑائے هيں اور بهت سي فكريں كي هيں — اُنهوں نے يهه سمجهكر كه اب اِن پراني فضيلت كي ميلي كُچيلي پگڑيوں كو جنكے هر ايک بل ميں هزاروں پيچيدگياں اور جنكے هر ايک پيچ ميں هزاروں اُلجهيڑے پڑگئے هيں اُدهيڑنا اور صاف كرنا اور موجوده زمانه كي وضع و قطع پر ازسرنو اُنكو درست كرنا اب امكان سے خارج هى يهه تجويز كي هى كه اُنكو تو اب خدا كے رحم هي پر چهوڑو اور نئي پود كو جنكي طبيعتوں ميں ابهي اُس كسافت نے پورا پورا اثر نهيں كيا هى جس طرح ممكن هو بچالو — اسي خيال سے اُنهوں نے عليگڈه ميں جو ايک خوش آب و هوا مقام هى ايک مدرسه قايم كيا هى جس كا نام هى " مدرسةالعلوم للمسلمين " اور جسكا خاص مقصد يهه هى كه بچے تهوڑي هي عمر سے اس مدرسه ميں آكر رهيں يهيں پرورش پاويں — اور يهيں اُنكي تعليم هو — اور يهيں سب سے زياده اُن كے اخلاق كي درستي پر توجهه كي جاوے -- اور جهاں تک ممكن هو اُن معصوموں كو اُس تلخ زندگاني كے زهريلے اثر سے بچايا جاوے جس نے گهر كے گهر اور خاندان كے خاندان تباه كرديئے — يهاں اُن لڑكوں كے مربيوں سے يهه خواهش كي جاتي هى كه وه اپنے بچوں كے اخراجات كي كفالت خود كافي طور سے كريں اور يهه گوارا نهيں كيا جاتا كه اشراف اور معزز خاندانوں كے لڑكے چار پائے برو صاحب چند بن جانے كي طمع ميں ايک ذليل محتاجي كي حالت اختيار كريں اور غيرت اور حميت اور عام فياضي اور عام همدردي كي عمده خاصيتوں كو برباد كرديں كه شرافت انساني كا اصل جوهر اور شريفوں كي زندگي كا سب سے زياده معزز تمغه هى *

کسي ایک مقام پر بھي میرا یہه منشا نہیں ھی کہ جو مسلمان طالب علم فی الحقیقت اپني ناداري کي وجهه سے اپني ضروريات کو اطمینان خاطر کے ساتهه سرانجام نہيں دے سکتے هيں اُن کي نسبت کوئي تحقیر آمیز کنایه یا اشارہ کیا جاوے - وہ طالب علم جو باوجود اپني ایسي اضطراري حالت کے خالص حصول علم کي نیت سے بقدر استقلال کو کام فرماتے هیں وہ میرے نزدیک بے انتہا تعریف کے مستحق هیں اور زبان نہیں که اُن کے عالي رتبه کے مناسب اُن کي تعریف کي جاسکے - ایسے طالب علموں کي امداد اور خدمت قوم کي طرف سے جسقدر هو وہ کم هی --- مگر اب تک جو سلوک همارے طرف سے اپنے مفلس مگر اشراف بھائیوں کي نسبت مرعي هوتا هی اُس کے لحاظ سے هم هي بے انتہا ملامت اور نفرت کے مستحق هیں همنے اپني نالایقی سے اِن معزز طالب علموں میں اور نہایت ذلیل اور بے غیرت پیٹ مانگنے فقیروں میں کوئي فرق باقي نہیں چھوڑا هی اور ایک لمحته بھي اس بات کا خوف نہیں کیا هی که کل کو خدا کے سامنے اپني اِن نالایقیوں کا کیا جواب دینگے --- مجھکو کسي زمانه میں ایک مدرسه اسلامیه کي نیم مہتممي کي حیثیت سے مدرسه کے مفلس طالب علموں سے کچهه تعلق تها اُس تعلق کے لحاظ سے میںنے ایک مرتبه اُن بزرگواروں سے جو اپني سخاوتوں کا روزانه کچا چٹهه موتیوں کے سخاوں اور اچھوتي حوروں کے فراق میں نہیں توبه توبه خداے ذوالجلال کي خالص رضامندي حاصل کرنے کي نیت سے هر روز کي ڈاک سے محاسب قیامت کے دفتر میں بلا ناغه بهیجتے رهتے هیں نہایت التجا سے یہه عرض کیا که صاحبو یہه جو دستور هورها هی که فلاں طالب علم فلاں رئیس کي سرکار سے اور فلاں فلاں شخص فلاں سرکار سے وظیفه پاویں اور هر مهینے وہ بیچارے هر ایک موسم کي سختي برداشت کر کر اور چند چند روز تک اپنے اپنے سبقوں کو معطل کر کر دس دس بارہ بارہ کوس کي منزلیں طے کرتے هیں اور تب اسم نویسي کے بعد دو دو روپیه مهینه اُن غریبوں کو آپ کي سرکاروں سے عنایت هوتا هی لله اس طریقه کو موقوف کیجیئے --- جتنے طالب علموں کي مدد آپ کرتے هیں اُن کا وظیفه بلا تعین شخص آپ مہتممان مدرسه کو اُسي طرح پر دیجیئے جس طرح مدرسه کا ماهواري چنده آپ اُن کو دیتے هیں --- مہتممان موصوف بطور خود اُس میں مفلس طالب علموں کے کهانے پینے کا یکجائي بندوبست کرینگے اُس میں طالب علموں کي زحمت اور تکلیف سب بچ جاویگي اور سب سے زیادہ فائدہ یہه هوگا که اُن کي شرمگیں آنکھیں جو اُس سخت احتیاج کي وجهه سے جو شیروں کو بھي روباہ مزاج بنا دیتي هی آپ کے سامنے نیچي نهونگي اور اُن کي غیرت اور حمیت جو اُن کي شرافت کا تمغه هی آپ کے اس فیاضانه طریقه سے اُن میں باقي رہ سکیگي --- لیکن وهاں ایسي کون سنتا تها - - اُن کو اگر طالب علموں کے ذاتي مقاصد سے کچهه سروکار هوتا تو بلا شبهه وہ اس صلاح کو قبول فرماتے --- لیکن وهاں تو نہایت خود غرضانه طور سے اور هي لو لگي هوئي تهي ایک

طرف جنت کا یہہ شوق که چاهیے تمام دنیا کي عزت اور حرمت خاک میں مل جاوے مگر یہہ کسي طرح جنت میں جا چکیں — دوسري طرف میدان قیامت کا جہاں بال کي بھي کھال نکالي جاویگي وہ خوف که هر ایک بات میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا هی اس احتیاط سے طالب علموں کا نه صرف نام بلکه ولدیت و قومیت و سکونت تک لکھني پڑتي هی تاکه وقت پر اُن کي نشاندهي میں کچھه مشکل پیش نه آوے — غرضکه ایک ایسے بڑے اور مشکل مقدمه کو کامیابي سے فیصل کرانے کي نیت سے جیسا جنت اور دوزخ کا مقدمه هی یہه دو دو روپیه کے گواہ بہم پہونچائے گئے جن میں سے قیامت کے دن ایک خدا کے سامنے کھڑے هوکر گواهي دیگا که صاحب اُنہوں نے پانچ چھه مہینه تک برابر همکو میري راہ میں دو روپیه مہینه دیا هی — دوسرا کہیگا که جب کبھي هم اپني تنخواہ لینے اُن کے گانؤں میں گئے تو تنخواہ کے علاوہ میري راہ میں برابر دو دو وقت دال روٹي اُن کے باورچي خانه سے همکو ملتي تھي جس میں سے اگر هم کچھه بچا نه سکتے تھے تو زیادہ بھوکے بھي نه رهتے تھے — تیسرا اپني باري میں اُس میں کچھه اور نمک مرچ لگاویگا و علی هذالقیاس — یہه هی هماري سخاوت اور فیاضي جو آج کے دن هم اپني قوم کے مفلس طالب علموں کے ساتھه محض حسبة لله کام میں لا رهے هیں ٭

مدرسةالعلوم کے مہتمموں نے بھي مسلمان مفلس طالب علموں کے حال پر توجهه کي هی — گذشته سال سنه ۱۸۷۸ ع کي سالانه رپورٹ کے ملاحظه سے واضح هوتا هی که هر ایک ایسے طالب علم کا خرچ خوراک جس کا اهتمام کمیٹي نے کیا بدرجه اوسط في ماہ صعہ ۲ ام ۴ پائي تھا — طالب علموں نے نه ایک دن کسي کے سامنے هاتھه پھیلایا نه ایک دن کسي کے سامنے آنکھه نیچي کي نه اُنہوں نے یہه جانا که یہه روپیه جو همارے اوپر خرچ هوتا هی کس سے وصول هوتا هی نه دینے والوں نے کبھي یہه جانا که کون سے شخص کو همنے اپني سخاوت سے عمر بھر کے لیئے ممنون بنایا مہتمموں نے اپنے طور سے بہت سرمایه جمع کیا اور اپنے هي اهتمام سے اس طرح پر ملواں جلواں اُس کو خرچ کیا که هردم پاس رهنے والے طالب علم بھي اس بات کو اچھي طرح نه جان سکے که اُن میں کون کون مفلس هی اور کس کس شخص کو کمیٹي کي طرف سے کھانا ملتا هی اور اسی نظر سے کمیٹي نے ان مفلس طالب علموں کا خرچ همیشه اُن طالب علموں کي برابر برابر رکھا هی جو کم سے کم اپنا خرچ خود اپنے پاس سے ادا کرتے هیں تاکه غریب اشرافوں کو اپنے هم چشموں میں خفت نهو اور هر ایک کي غیرت اور حمیت جیسے که اُس کي شرافت کا مقتضا هونا چاهیئے بدستور قایم رهے کمیٹي منتظم مدرسةالعلوم نے درحقیقت عام طور سے یہه معلوم هي نہیں هونے دیا که اُن بہت سے طالب علموں میں جنکے کھانے کا اهتمام کمیٹي کو کرنا پڑتا هی کون کون ایسے هیں جو اپنا خرچ خود نہیں

ادا کرسکتے ھیں — حقیقت میں بڑے تھوکنے کی بات ھی کہ ایک اشراف نسل کا آدمی محتاج بنکر بغیر کسی حق یا معاوضہ کے دوسروں کے سامنے ھاتھہ پھیلاوے اور قیامت ھی جب کہ کسی اشراف کی وہ محتاجی نشست از بام ھو اب انصاف سے اُس طریقہ کو بھی دیکھو جو مدرسۃالعلوم نے اختیار کیا ھی اور اُس طریقہ کو بھی جو دوسرے قال اور قال مدارس اسلامیہ میں ہوتا جارھا ھی اور پھر انصاف سے کہو کہ اُن دونوں طریقوں میں سے کس پر خدا کی رحمت برستی ھی اور کس پر خدا کی لعنت — حقیقت یہہ ھی کہ جب تک ھم میں یہہ ذاتی خود غرضی اور خود مطلبی یعنی حور و قصور کی ھوس اس درجہ بڑھی ھوئی ھی کہ اُس کے آگے ھمکو نہایت نادانی کی راہ سے اشرافوں کی عزت کا بھی کچھہ پاس لحاظ نہیں ھی اور جب تک ھماری ھرایک سخاوت کی کنٹرکٹ میں اپنی ذات کے لیئے ثواب کا معاوضہ سب سے پہلے داخل کیا جاتا ھی تب تک قومی ترقی اور قومی عزت کا جوش ھم میں پیدا ھی نہیں ھوسکتا — قومی اقبالمندی اور قومی ھمدردی کا دن وہ ھوگا جب کہ قوم میں بہت سے ایسے لوگ موجود ھوں کہ اگر اُن کو یقین ھوجاوے کہ کسی ایک شخص کے دوزخ میں جانے سے تمام قوم کی نجات ھوسکتی ھی تو اُن میں کا ھر ایک شخص نہایت خوشی اور جوش محبت کے ساتھہ جنت پر لات مارکر دوزخ میں جانے کے لیئے تیار ھوجاوے — ورنہ ایسی حالت میں جیسی کہ اب ھی جبکہ خدا کے مقرر کیئے ھوئے فرایض بھی جنت ملنے کی اُمید کے بغیر انجام نہیں دیئے جاتے قوم قوم پکارنا اور قومی محبت اور قومی ھمدردی کے مضامین سے کاغذ کے رم کے رم سیاہ کردینا بھنڈیلوں کی نقلوں سے شاید کچھہ ھی درجہ میں زیادہ ھو تو ھو اور نہیں تو نہیں *

خیر بار آمدم برسر مطلب — جو زمانہ بچوں کی تعلیم کا زمانہ خیال کیا جاتا ھی یہی وہ زمانہ ھی جس میں بچوں کی حیا اور غیرت نہیں نہیں بلکہ کل قوم کی غیرت اور حمیت کے جہاز کا ایک طوفانی طلاطم سے سامنا ھوتا ھی — جس میں ذراسی ناموافق ھوا اھل جہاز کی پوری تباھی کا سامان مہیا کردیتی ھی — اسی عمر میں اگر شرافت کے اُن ضروری ارکان کی حفاظت نہ کی جاوے تو پھر ممکن نہیں کہ قوم میں غیرت اور حمیت کا جوش اور ولولہ پیدا ھوسکے — یہی وجہہ ھی جو مدرسۃالعلوم میں سب سے بڑا ضروری اُصول یہہ تسلیم کیا گیا ھی کہ حتی‌الامکان لڑکے اپنے گھروں کو چھوڑکر مدرسہ میں سکونت اختیار کریں تاکہ اُن بد صحبتوں کے اثر سے جو ھر ایک گھر میں وبائے متعدی کے طور پر موجود ھیں اُن کا دل و دماغ محفوظ رھے — اسی طرح ایک عزت کے ساتھہ طالب علمی کا زمانہ بسر ھونے کے لئے جن جن چیزوں کی اور جس جس قسم کے برتاؤ کی ضرورت ھی اُس میں حتی‌الامکان وسعت دیجاتی ھی تاکہ طالب علموں کا دل

سکا رہے اور سب سے زیادہ یہہ کہ کسی وقت کوئی ایسا خیال اُن کے دل میں متمکن نہو جس سے ہمت اور حوصلہ پستی کی طرف مائل ہو بلکہ برخلاف اُسکے اسی عمر سے وہ خیالات پیدا ہرنے شروع ہوجاویں جن سے غیرت اور حمیت کو ترقی ہو اور وہی خیالات رفتہ رفتہ عام فیاضی اور قومی ہمدردی کی ڈگری حاصل کرسکیں یہہ اُصول ہیں جن پر اسوقت مدرسۃالعلوم میں طالب علموں کی تعلیم و تربیت ہورہی ہی اور خدا سے اُمید ہی کہ جو لڑکے اس طور سے تعلیم پاکر اور تربیت سے بہرہور ہوکر مدرسہ سے نکلینگے اُن سے ہماری قوم کو بہت زیادہ فائدہ پہونچیگا یہہ نوجوان اپنے بزرگوں کی روحوں کو خوش کردینگے وہ اپنے عمدہ کاموں سے اپنی قوم کے حق میں احیاء موتی کا معجزہ ظاہر کرینگے — وہ اچھی طرح سے سمجھینگے کہ اصلی عزت کیا چیز ہی اور کن وسائل سے حاصل ہوتی ہی اور کونسی عمدہ خصلتوں سے انسان اُس میں ترقی کرسکتا ہی اور کون سی مذموم صفتیں اُس کو خاک میں ملا دیتی ہیں اُنہی میں سے کچھہ ایسے عالی دماغ بھی نکلینگے جو اپنی ذاتی نام آوری اور اپنے ذاتی فائدوں پر قومی نیک نامی اور قومی ترقی کو ترجیح دینگے اور اُنہیں میں کچھہ ایسے بھی ہوسکینگے جو اپنا مال اپنا عیش اپنا آرام یہانتک کہ اپنی جان بھی اپنی قوم پر تصدق کردینے کو اپنا فخر اور اپنی زندگی کا نہایت عمدہ اور سب سے بڑا ثمرہ تصور کرینگے *

واللہ علی کل شیء قدیر

راقـــــم
مشتاق حسین

---

# صحیفہ فطرت

## آرتکل — نمبر ۱

## دیباچہ بزرگوں کے لیئے اور کتاب بچوں کے لیئے

خدا نے عالم بنایا — عالم میں انسان پیدا کیا — انسان کے دل میں عالم کا گھر بنایا — انسان کو یہہ اختیار دیا کہ وہ دل کو دولہا اور عالم کو دولہن بنائے — اور اُس میں بیاہ رچائے شادیانے بجائے — اُنکے پیار اخلاص کی باتیں دیکھے — بچپنے میں اُنکی اولاد کے کھیل تماشے اور شوخی کی باتوں سے دل خوش کرے — بڑے ہونے پر اُنکی خوبیوں اور نیکیوں سے آنکھوں کو سکھہ اور دل کو چین پہونچائے — اور اِس کا بھی اختیار دیا کہ اِس پیاری دولہن کو وہ جھونٹے پکڑکر گھر سے باہر نکال دے اور وہ بانواؤں کی طرح بےنوا منہہ چھپا کے کسی گوشہ میں ہو بیٹھے اور دولہا خدائی خوار ادھر اُدھر جھک مارتا پھرے غرض اِن بنا بنی میں خدا نے عجیب سنجوگ بنایا ہی اور وہ خود اُن کے نکاح کے لیئے قاضی بنا ہی اور اپنے ید قدرت سے ایک عجیب طرح کا آرسی مصحف اُن کے درمیان رکھا

ہی --- یہہ آرسی وہ نہیں ھی کہ پانچ روپیہ کا سونا اور ٹکے کا آئینہ نہ یہہ وہ مصحف ھی کہ جلد کے شکنجے میں پھنسا ہوا ھو بلکہ خود دولہا ھی دولہن کی آرسی ھی کہ اُس میں وہ پئے جوبن کی بہار نت نئی دیکھتی ھی --- مصحف خود دولہن ھی جو دولہا میاں کے سامنے ھروقت تلاوت کے لیئے رکھا ہوا ھی — تعجب یہہ ھی کہ اِس مصحف کے پڑھنے کا قاعدہ بھی وھی مقرر کرے جو اور صحائف کے پڑھنے کے لیئے ھی یعنی اول آدمی بچہ ھو تو بچہ بنے اور ابتدا میں الف بے پڑھے اور جب اِن مفردات سے انفراغ ھو تو مرکبات کا آغاز کرے اور اسی طرح بتدریج اپنی استعداد میں ترقی دے --- مگر اِس مصحف کے مفردات یعنی الف بے تے یہہ نہیں ھی کہ سفید کاغذ پر آڑی و ترچھی کالی کالی لکیریں کھنچی ہوں نہ اُس کے مرکبات ایسے ھیں کہ دو چشمی سے اور اُس کے آگے پے بلکہ مفردات اُس کے خود فرداً فرداً اشیاء ھیں اول اُن سے واقفیت پیدا کرے اور جب اُن کو علیحدہ علیحدہ پہچان نے لگے تو اُنکو ترکیب دیکر مرکبات شروع کرے مثلاً اول یہہ تحقیق کرے کہ چاندی کیا ھی اور کندھک کیا ھی اور پھر اُن دونوں کو ملاکر دیکھے کہ زرد کندھک سپید چاندی کا کیونکر منہہ کالا کرتی ھی غرض اسیطرح سے جب بچپنے میں مصحف کے پڑھنے کا سامان کیا جاے تو بڑی عمر میں ایک ملکہ اور استعداد اُس کے سمجھنے کا حاصل ہوتا ھی — یہہ مصحف اور صحائف مقدسہ کی طرح کسی قوم اور زبان سے مخصوص نہیں ھی بلکہ وہ سارے عالم کے لیئے ایک ھی ھی اور سب میں صلاحیت اور قابلیت اُس کے سمجھنے اور پڑھنے کی ھی اور ایک ھی سی قدرت بھی عطا ہوتی ھی — اب اِس کی ضرورت ھی کہ اِس مصحف کے پڑھنے کے لیئے اُستاد مقرر کیا جاے - مگر اُستاد مقرر کرنا لڑکوں کا خود کام تو نہیں ھی یہہ بزرگوں کے اختیار میں ھی اسلیئے مجھے ضرور ھی کہ اِن بزرگوں کی خدمت میں دست بستہ کھڑا ہوکر کچھہ عرض کروں --- میری بزرگوں سے مراد اُن بزرگوں سے ھی جو بالفعل کی نسل اطفال کے آبا و اجداد زندہ موجود ھیں جب اُن پر نظر اُٹھاکر دیکھتا ھوں تو ایک طرف ہزاروں کیا لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے ھیں کہ اُن پر جہالت کی کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ھیں کہ کہیں سے آفتاب علم کی شعاعوں کو نکلنے ھی نہیں دیتیں — دوسری طرف کچھہ بزرگ زباندان کچھہ حرف آشنا معلوم ہوتے ھیں اُن میں سے اکثر کو خط لکھنے میں شد بد ھی بعض اُن میں سے نظم و نثر خوب لکھتے ھیں الفاظ کے پھولوں میں دس پانچ معمولی کنٹھے گُندھہ لیتے ھیں — کوئی بدھی اچھی بناتا ھی کوئی گجرا — کوئی ھار — کوئی سہرا — مگر یہہ پھول خیالات کی رشتہ بندی سے پکسے جاتے ھیں اور بہت جلد سڑ اُبس کر پھینک دینے کے قابل ہوئے جاتے ھیں — بعض اُن میں سے ایسے بھی ھیں کہ جب بات کرتے ھیں تو اُن کے منہہ سے پھول جھڑتے ھیں مگر اِن پھولوں کے ساتھہ کانٹے بھی ایسے غضب کے ہوتے ھیں کہ جو شوق سے پھولوں کے لینے

کے لیئے دامن پهیلاتے هیں اُنکا جسم خار در پیرهن اور عقل آغشته بخون هوجاتي هی — دس پانچ اُن میں ایسے بهي آنکهوں کے سامنے آجاتے هیں که علوم عربیه کا عمامه اُن کے سر پر بندها هوا هی اور فلسفه یونانیه کا طره عجیب انداز سے اُس پر لگا هوا هی یا مخترعات وهمیه و خیال پرستي کا قشقه ماتهے پر بهت صفائي سے چندن کا کهنچا هوا هی اور علوم هندیه کي کهڑاؤں بهي اُن کے پیر میں هی - اب اگر جاهلوں کي طرف مخاطب هوتا هوں تو وه کب میري سنتے هیں اور سنتے بهي هیں تو سمجهتے کب هیں اس لیئے مختصر سي گذارش اُن کي خدمت میں فقط اتني هي کیئے دیتا هوں که اگر وه اپني اولاد کو حیوان سے انسان بنانا چاهیں تو اس کتاب فطرت کے پڑهانے کي تدبیر کسي نکسي طرح سے کریں — اب میں اگر اُن کي خدمت میں عرض کرتا هوں جو انجمن سخن کے صدر اور اپنے زمانه کے فخر هیں اور مطالب غیبي کے بیان کرنے میں اپنے تئیں هاتف غیب اور اپنے طرز معاشرت کو بے عیب جانتے هیں تو فرمائینگے که هم باغ انبساط میں بساط کو بچهائے بیٹهے هیں نازک خیالوں کي صراحي اور مینا همارے آگے رکهي هی رنگین الفاظ کے گلدستے چُنے هوئے هیں کسي شیشه سے پند و نصایح کے شربت پیتے هیں کسي صراحي سے عشق و محبت کي شراب نکالکر اُڑاتے هیں کبهي گلدستوں سے دماغ کو طراوت اور آنکهوں کو فرحت پهونچاتے هیں تمهاري بساندي بساندي باتیں فطرت کي سنکر کیوں اپنے دماغ کو خراب کریں — اور آپ کے نیچر کي کیچڑ میں کیوں پهنسیں ناحق آپ هماري سامعه خراشي کے لیئے تکلیف نفرمائیئے — اور چپ کے چلے جائیئے مبادا کهیں اَوْر کچهه خدمت آپ کي نه کرني پڑے میں یهه سنکر ایک آه سرد کهینچکر فقط اتني هي عرض کرونگا خواه وه مجهه سے کسي طور سے پیش آئیں که اب آپکے باغ پر خزاں آن پهونچي هی وه بالکل اُجڑ جاویگا اُس کي زمین کو کلر لگ جاویگا نه نئے پهول اُس میں پیدا هونگے نه اُس کے پرانے پهولوں کا عطر آپ کے دماغ کو معطر کرسکیگا بهار هی که باغ فطرت میں میرے ساتهه چلے آئیئے اُس کي هري بهري ٹهنیوں اور پهولے پهلے درختوں سے متمتع هوجیئے اور آنکهوں کو کهولکر دیکهیئے که جو اِس باغ کي هوا کهانے والے اور پهول سونگنے والے هیں اُنکو اِس دنیا میں بهشت سے زیاده راحت اور جنت سے بهشتر فرحت ملتي هی — اب رهے وه عمامه و دستار والے اُنکي خدمت میں مجهکو بهت کچهه عرض کرنا هی گو جانتا هوں که اُن کا تخته عقل وذهن علوم قدیمه کے نقش و نگار سے پر هی اور اُس میں علوم جدیده کے فوٹوگراف اُتار نے کے لیئے کوئي جگهه باقي نهیں هی آنکهوں پر اُنکے پرده تعصب پڑا هوا هی جو علوم جدیده کي جنبا مدار فطرت پر هی خوبصورت تصویر کو دیکهنے نهیں دیتا - کانوں میں هٹدهرمي کي روئي ٹهوسي هوئي هی جو زمانه حال کے تحقیقات فطرت کي سریلي آوازوں کو سننے نهیں دیتي نهایت مشکل و دشوار هی که اُن کي آنکهوں پر سے پرده اٹهے اور اُنکے پرده گوش تک

اِس نغمه کا آوازه پهنچے -- اِس تعصب کے هونے کا کچهه متعجب نهیں هی - مقتضاے بشري هی که ایسي حالت میں انسان کو ایسي صورتیں پیش آیا کرتي هیں -- فطرت کے تحقیقات نے تمام علوم قدیمه کي کیفیت اور حقیقت کو ظاهر اور ثابت کردیا هی که اُن علوم میں بهت سے مسائل ایسے تهے که اُن کے باب میں جو مباحثے هونے اُن سے کوئي نتیجه مفید نهیں پیدا هوا اور نه کچهه انسان کو اُس سے فائده هوا -- دوم بهت سے مسئلے ایسے هیں که زمانه حال کي تحقیقات نے جنکو بالکل غلط و باطل کردیا -- سوم کچهه ایسے مسائل هیں که جو ناقص اور ناتمام تهے اب اُنکي تکمیل کي گئي -- چهارم بعض وه مسائل بهي هیں جو در حقیقت صحیح تهے اور اب اُنکو علوم جدیده نے شیر و شکر کي طرح اپنے میں ملا لیا هی مکهي کي طرح اُنکو نکال کر نهیں پهینک دیا پس علوم جدیده علوم قدیمه پر محیط هیں -- سارے اِن مطالب کے بیان کرنے سے پہلے ایک اَور عرض کیئے دیتا هوں که علوم طبعیه جو فطرت پر مبني هیں اُنکے دشمن قوي مخترعات وهمیه و مسائل مذهبیه یا یوں کهو که مسائل مخترعه مذهبیه چلے آتے هیں -- اب تک یهه حال رها هی که علوم عقلیه کے ستارے جهاں چمکے وهیں تهوڑي دور میں اُسکي دهندلي سي روشني هوگئي اور جب مذهب کا آفتاب طلوع هوا تو وه ساري اُنکي روشني غایب هوگئي مگر اب انشاءالله زمانه آیده میں اِس سے بالعکس حال هونے والا هی که مذهب کو فطرت سے اور فطرت کو مذهب سے دوچند چمک هونیوالي هی اِن مسائل فطرت کے بیان کرنے میں کسي مذهب کي تائید اور تردید کے درپے نهیں هونگا بلکه جو سچے مسائل هیں اور جنکي صداقت کو عقل سلیم نے باور کیا هی اُنکو بیان کرتا هوں خواه وه کسي مذهب کے مطابق هوں خواه مخالف هوں مجهکو اِس سے کچهه غرض نهیں هی خدا کبهي جهوٹ نهیں بولتا اس لیئے جو مذهب اُس نے بنایا هوگا تو اُس میں کوئي جهوٹا مسئله نهوگا اب علوم طبعیه کا کوئي مسئله موافق فطرت کے کسي مذهب کے مسئله کو بالبداهت جهوٹا ثابت کردے تو وه مذهب خدا کي طرف سے نهیں هوسکتا اسلیئے جنکو اپنا مذهب سچّا ثابت کرنا هو وه یهه ثابت کریں که اُنکے مذهب میں کوئي ایسا مسئله نهیں هی -- میں مسائل مذهبي سے کچهه غرض نهیں رکهتا خواه وه کیساهي مذهب هو خدا کو اُس نے آدمي بنایا هو یا آدمي کو خدا بنایا یاخدا کو خدا اور بنده کو بنده هي رهنے دیا هو - میں اس باب میں کوشش کرني نهیں چاهتا که کسي مذهب رحماني میں جهگڑے ڈالکر شیطاني نتیجے پیدا کروں بلکه اُن مسائل کو جنکا مدار فطرت کي تحقیقات پر هی اُنکو بیان کرتا هوں اور دلائل یقینیه اور براهین قطعیه سے ثابت کرتا هوں که اُنکا جهوٹا هونا نا ممکن هی خواه یهه کسي مذهب کے مطابق هو خواه مخالف اِس سے بحث نهیں هی -- یهه کوئي نه سمجهے که میں جب کوئي مسئله کسي مذهب کے خلاف بیان کررها هوں تو میري غرض اُس

مذهب پر اعتراض کرنے سے هی هرگز هرگز نهیں — میں اِس مسلک میں ندم هي نهیں رکھتا — اُس سے میں کوسوں بھاگتا هوں — سچي باتوں کے بیان کرنے پر مرتا هوں خواہ وہ مذهبي هوں یا نهوں پهر تو صرف یهیں نهي اگلے آرتیکل میں بیان کرونگا که فطرت کیا چیز هی پہلے حکماء نے اُس کے باب میں کیا کیا اور اب کیا هورها هی *

راقـــــم

ذکاءالله

پروفیسر میور کالج الهآباد

---

# نیچري

همارے دوست هم سے کہتے هیں که ' نیچري ' اور ' دهریه ' مرادف الفاظ هیں پهر همنے اپني طرف اُسکا منسوب هونا کیوں گوارا کیا ' اور کیوں اُسکو مقدس لفظ کہا ' اور جس لفظ کے معني هي اچھے نهیں هیں ' اُس کے استعمال میں اچھي و بري نیت کو کیا دخل هی *

مگر سمجھنا چاهیئے که ' نیچر لست ' کا لفظ جب وضع هوا تو اُسکو مذهب سے کچھه لگاؤ نه تہا ' وہ ایک علمي اصطلاح تهي ' اور نیچر لست اُس شخص کو کہتے تھے جو نیچر کی اور اُس کے توانین کي چھان بین کرتا تها ' اور علم نیچر کے عالم کو بهي نیچر لست کہتے تھے ' جسنے حیوانات نباتات معدنیات کي پیدایش کے قوانین کو جانا هو ' اور مادہ کے قوانین اور اُسکي صورتوں کي تبدیل کے اُصول کو تحقیق کیا هو — ابتدا میں یهه علم محدود تها ' مگر جسقدر زیادہ تحقیقات هوتي گئي ' اُسیقدر زیادہ وسیع هوتا گیا ' اور ثابت هوگیا که جسقدر چیزیں دکھائي دیتي هیں یا جاني گئي هیں ' یہاں تک که انسان کے کام اور انسان کے خیالات اور اُسکے اعتقادات ' سب کے سب نیچر کے قوانین کي زنجیر میں جکڑے هوئے هیں *

جس طرح که تمام انسان اُس خیال سے جسکو کبهي مذهب سے ' اور کبهي لا مذهب سے تعبیر کرتے هیں ' خالي نهیں هیں ' اسي طرح اس علم کے عالم بهي اُس خیال سے خالی نه تھے — بعض لوگوں کو یهه خیال هوا که جب هم نیچر هي کو تمام چیزوں میں ' اُن کے پیدا هونے میں ' اُن کي بقا میں ' اُن کي فنا میں ' پاتے هیں تو جو کچھه هی نیچر هي نیچر هی اور اُس کے سوا اَور کچھه نهیں ' اُنهوں نے اُسکا بهي جس کو هم تم خدا کہتے هیں انکار کیا ' اور کہا که یهه دنیا آپ هي آپ هوئي اور آپ هي آپ قایم هی اور همیشه سے هی اور همیشه رهیگي ' بعضوں نے کہا که وہ جس کو هم تم خدا کہتے هیں

شاید ہو یا نہو کچھہ ٹھیک نہیں ہی — شاید انہی کے مشابہ وہ لوگ ہونگے جنکو ہمارے علماء اسلام نے ' دہریہ ' کا خطاب دیا ہی *

انہی عالموں میں ایسے لوگ بہی ہیں کہ اُنہوں نے جسقدر زیادہ نیچر کی اور اُس کے قوانین کی تحقیقات کی' اُسیقدر اُسکو ایسی ترتیب اور ایسی مناسبت اور ایسے انتظام سے پایا ' جس سے وہ حیران ہوگئے اور اُنہوں نے یقین کیا کہ یہہ سب چیزیں آپ ہی آپ ایسی عمدگی سے نہیں ہوسکتیں ' بے شک اُنکو کسی بڑے کاریگر نے سمجھہ بوجھہ کر بنایا ہی ' اُنہوں نے اُس علۃالعلل کا جس کی یہہ سب چیزیں معلول ہیں ' یا نیچر کے قوانین بنانے والیکا ' یا ان سب چیزوں کے پیدا کرنے والیکا ' یا اُس کا جسکو ہم نے خدا کہتے ہیں اقرار کیا ' اور ٹھیک وہی رستہ چلے جو ' اور کلدانیاں ' کے رہنے والے ایک نوجوان نے جسکو ابراہیم کہتے ہیں اختیار کیا تہا — یہی لوگ مذہبی خیال سے نیچرسٹ ہیں ' وہ خود بہی مقدس ہیں ' اور وہ لفظ بہی مقدس ہی ' اسی لیئے میںنے اُسکو مقدس کہا اور نیچر لسٹ ہونا اپنا فخر سمجھا ' اور یہہ کہا کہ " اگر کوئی اس مقدس لفظ کو بری نیت سے استعمال کرتا ہی وہ جانے اور اُسکا دین ایمان " *

خدا کی شان اور خدا کی عظمت اور اُسکا جاہ و جلال ' اور انبیا کی شان اور اُن کی قدر و منزلت بہی بغیر نیچر لسٹ کے کوئی نہیں جان سکتا ' تہوڑی دیر کے لیئے خدا کا اور انبیا کا اُس طریقہ پر جیسا کہ علماء اسلام نے قرار دیا ہی تصور باندھو ' اگر مجسمہ ہو تو اُسکو ایک نہایت قوی ہیکل گراں ڈیل لنبے لنبے ہات پاؤں بلور کی سی پنڈلیاں انسان کی سی صورت گوری گوری رنگت نورانی چہرہ سفید ڈاڑھی سر پر تاج یا لال پھندھنے دار ٹوپی تخت پر بیٹھا ہوا اِرد گرد حالی موالی دست بستہ کہڑے ہوئے خیال کرو — اگر اُن کو گمراہ سمجھو تو اتنا تو ضرور یقین کرو کہ قیامت میں ضرور اُسکو دیکھنگے گو صورت شکل نہ معلوم ہونے سے پہچاننے میں مشکل پڑے — اُس کا دربار لگا ہوا ہوگا ' وہ تخت پر بیٹھا ہوا ایک خوشی و غرور سے کہتا ہوگا " لمن‌الملک الیوم " اُسکے حالی موالی کہتے ہونگے " للہ‌الواحدالقہار " عدالت لگی ہوگی ' انصاف ہورہا ہوگا ' مجرم پیش ہورہے ہونگے ' گواہ گواہی دے رہے ہونگے ' ہر ایک کا اعمالنامہ پڑھا جاتا ہوگا ' ترازو میں کچھہ تل رہا ہوگا ' ایک طرف کالے کالے بد ہیئت ڈراونی صورت دوزخ کے فرشتے ' اور دوسری طرف گورے گورے جنت کے فرشتے صف باندھے کہڑے ہونگے ' اِدھر دوزخ جوش مار رہی ہوگی ' اُسکی آتشیں زبانیں ' ہل من مزید ' ہل من مزید ' کہہ کر چلا رہی ہونگی اُدھر جنت میں میوے لٹک رہے ہونگے ' پہول کہلے ہوئے ہونگے ' دودھ و شراب کی نہریں بہہ رہی ہونگی ' حوریں اور غلمان اپنے اپنے دوستوں کے انتظار میں ٹہل رہے ہونگے — انصاف بہی بیمثل ہوگا ' تقدیر کا مسئلہ اگر صحیح ہو تو جو کام خود حضرت نے کیئے ہیں

اُسکي سزا دوسروں کو دي جاویگي ' چھوٹے بچّوں کو اس لیئے سزا ملیگي کہ تم کافروں کے هاں کیوں پیدا هوئے - غرضکه آخرکار فیصدي دوتین † بہشت میں جاوینگے باقي سب دوزخ میں بلکه اُن میں سے بهي کچهه کسي الزام سے کچهه کسي الزام سے ' کچهه نیچري هونیکے الزام سے' چهنٹ جاوینگے صرف دوچار اهل حدیث ' یا دس پانچ مقلد وهابي' بہشت میں جاوینگے ' دوزخ بهربور اور بہشت خالي ویران رہ جاویگي ' نیچري اُس وقت بهي پکارینگے که بہشت میں جانا نه یهودي هونے پر موقوف هی' نه عیساني هونے پر' نه وهابي هونے پر' موقوف هی نه اَور کچهه هونے پر' بلکه اصل یهه هی که " من اسلم وجهه لله و هو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف علیهم ولاهم یحزنون " پهر دیکهیئے اُنکي یهه صدا سني جاتي هی یا نهیں ' همکو تو یقین هی که ضرور سني جاویگي ' اگر سنی گئي تو پهر نیچریوں هي کي بدولت سب کا بیڑا پار هی *

انبیاء کو اُنهوں نے ایک ایسا شخص سمجها جو اپني بهادري سے ' یا اتفاق سے سلطنت کو پهونچ گیا هو ' اپنے هي سے ایک گروہ پر حکومت کرتا هو ' اور کہتا هو که یهه کرو اور یهه مت کرو' یا وہ خود کچهه نہو بلکه بانسلي کي طرح صرف بجانے والے کي اُس میں سے آواز نکلتي هو ' مگر نیچریوں نے انبیاء کي قدر و منزلت اس سے بہت زیادہ سمجهي هی' اُنهوں نے انبیاء کو انسان' مگر دوسرے نیچر کا سمجها هی' اُنهوں نے خود اُس بانسلي هي کو بولنے والي جانا هی' مگر اُنهیں لفظوں کي جو بانسلي بنانے والے کے لفظ تهے نه اَور کسي کے *

مسلمانوں نے اُس سیدهے سادهے مذهب کو دیو پري کا قصه بنادیا ' عجائبات و کرشمه و کرامات سے بهردیا ' اور جو خوبي اُسکي تهي اُسیکو مٹا دیا — یهه کاٹ کي هنڈیاں بہت دنوں سے جل چُکي هوتي' مگر علماء کے اقتدار اور سلاطین وقت کو اپنا تابعدار کرلینے سے اُس پر خاک پڑتي گئي' سچائي پر اُنهوں نے خاک ڈالي اور مثل آتش زیر خاک اُسکو چهپادیا ' متعدد طرح سے کبهي کبهي اُسنے خاک کے نیچے سے سر نکالا ' مگر جس سوراخ سے سر نکلا پهر اُسیکو خاک سے بهردیا ' کفر کے فتوی دیئے گئے ' قتل کیئے گئے ' کتابیں جلائي گئیں' ایذائیں دیگئیں ' جو کچهه هوسکا سب کچهه کیا گیا ' اسرار اسلام کے سمجهانے والے سب مٹ گئے' اور صرف اسلام کا بهجن گاکر روٹي کمانے والے ' اور اپنا دوزخ بهرنے کو تمام دنیا کو دوزخ میں بهیجنے والے باقي رہ گئے ' جو بہشت کو خاص اپني جاگیر سمجهتے هیں' کفر کے خزانے کے مالک هیں' اُس میں سے هر ایک کو جتنا جتنا مناسب سمجهتے هیں تحفه دیتے هیں *

یهه حالت کسي وقت ظاهر میں سلطنت کے مناسب معلوم هوتي تهي' مگر درحقیقت ایک دق کي بیماري تهي ' جس کا اثر بہت دیر بعد ظاهر هوتا هی — اس حالت کا قدرتي نتیجه قومي همدردي کا زوال' آپس میں عداوت ' اور ایک دوسرے کي حسد تها' جو

† اس زمانه میں دنیا کي مردم شماري بهي مسلمانوں کے اور مذهب کے لوگوں کے ساتهه یهي نسبت نکالتي هی *

مسلمانوں میں پیدا ہوا ' اور اس زمانہ میں مذہب اسلام کا خاصہ سمجھا جاتا ہے ' اسی نئی پیداوار کا لازمی نتیجہ زوال سلطنت و اقتدار تھا ' جو تاریخ کی کتابوں میں اور زندہ نمونہ میں بھی موجود ہے ' جس سے میری مراد سلطنت عثمانیہ ترکی ہے — ایسی حالت میں اُس کاٹ کی ہنڈیا کو کوئی بچانے والا نہ تھا ' اور علوم و فنون کے شعلہ عالم افروز نے اُسکو جلانا شروع کیا — اُن لوگوں نے جن کے باپ دادا اُسکو فولاد یا اسبات کی ہنڈیا سمجھتے تھے اپنی آنکھ سے جلتے ہوئے دیکھا ' اور بعضوں نے ہاتھ سے اور بعضوں نے دل سے اُسکو پھینک دیا ' اور الگ کھڑے ہوگئے ' مگر وہ یہہ نہ سمجھے کہ یہہ تو جعلی ہنڈیا تھی ' اصلی ہنڈیا تو فولاد اور اسبات سے بھی زیادہ مستحکم ہے — ہمارا مطلب نہ کسی ملکی معاملہ سے ہے ' نہ کسی مذہبی جھگڑے سے ' بلکہ ہمکو صرف یہہ دیکھنا ہے کہ ہماری موروثی ہنڈیا کونسی تھی ' وہی کاٹ کی جو جل رہی ہے ' یا اور کوئی ' اُس کی شناخت کو وہی قانون قدرت ہماری آنکھ کے سامنے ہے ' اُس سے ہم اُس کو پہچانتے جاتے ہیں ' اور خوش ہوکر کہتے ہیں ' کہ وہ کاٹ کی ہنڈیا جو جل رہی ہے ' اور جسنے ہمارے دین کو ' ہماری دنیا کو ' ہماری معاشرت کو ' ہمارے اخلاق کو ' ہماری عزت کو ' ہمارے علم کو ' ہمارے ہنر کو ' ہمارے بزرگوں کے نام کو ' خاک میں ملایا ہماری موروثی نہیں ہے ' اُسکو جلنے دو — جبکہ ہمارے پاس نیچر ہی سچّائی کی معیار ہے ' تو ہم نیچری ہونا کیوں نہ گوارا کریں ' اور کیوں علماء زمانہ کی طرح لوگوں سے التجا کریں ' کہ ہمکو وہابی مت کہو ' حنفی کہو ' ہمکو لامذہب و غیر مقلد مت کہو ' موحد و اہل حدیث کہو — ہم تو سب کو اجازت دیتے ہیں کہ ہمکو جو چاہو سو کہو ' پھر نیچری ہونے میں کیا برائی ہے جسکو ہم گوارا نکریں *

راقــــــم
سید احمد

---

# مذہب و معاشرت

## و انتم اعلم بامور دنیا کم

ہمارے بانی اسلام علیہ السلام کی اُن نصیحتوں میں سے جن پر اُسکی اُمت نے کچھہ نہیں یا بہت کم توجہہ کی ' ایک یہہ مسئلہ بھی ہے جسکو ہمنے مختصر الفاظ میں عنوان پر لکھا ہے — بانی مذہب جسکو درحقیقت روحانی اصلاح مقصود ہوتی ہے ' کبھی کبھی اپنے منصب اعلیٰ سے فروتر درجہ اختیار کرکر ' دنیوی باتوں میں بھی صلاح

دینے لگتا هی — یهه ایک قدرتي بات هی ' که جو شخص کسي ایک بات میں درجه امتیاز رکهتا هی ۔ اور اُس کي نیکي اور دیانت داري اور عقلمندي اور لیاقت مشهور هوجاتي هی ' تو هر ایک شخص هر ایک بات اُسکے سامنے لاتا هی ' اور هدایت چاهتا هی ' انبیاء علیهم السلام ' جو ان بعض ایسي دنیوي باتوں کے کرنے و نه کرنے کي بهي هدایت کرتے تهے ' جنکا اثر روحاني اور اخلاقي تربیت پر پهنچتا تها ' اس لیئے لوگوں کو هر ایک دنیاوي باتوں میں بهي انبیاء کي هدایت کي رغبت هوتي تهي *

جسقدر کتابیں جو الهامي مشهور هیں ' اور انبیاء پر اُنکا نازل هونا تسلیم کیا جاتا هی ' یا بیان کیا جاتا هی ' اُن میں صرف ایک توریت هی جس میں دنیاوي احکام بهي بکثرت پائے جاتے هیں ' مگر اُنکا الهامي هونا نهایت هي مشتبه هی — موسیٰ کے حال پر خیال کرو که بني اسرائیل کے ایک گروه کثیر کو ' جنکے اخلاق و عادات ایک مدت دراز تک غلامي کي حالت میں رهنے سے خراب هوگئے تهے ' اور تمام بد عادتیں اُن میں بطور طبیعت ثاني کے هوگئي تهیں ' رامسس دارالخلافه مصر سے نکال کر ' ایک ایسے جنگل میں لے کیا ' جہاں مثل ' نه پاے رفتن و نه جاے ماندن ' صادق آتي تهي اُس انبوه کثیر میں هر قسم کے دنیاوي جهگڑے پیش اتے تهے ' اور اُس مجمع میں سوائے موسیٰ علیه السلام کے کون تها جس کے سامنے وه جهگڑے پیش هوتے ' حضرت موسیٰ کو مجبوري اُن جهگڑوں کا بطور ایک سردار قوم کے فیصله کرنا پڑتا تها ' اور اس امر کے ثبوت کے لیئے که وه تمام احکام دنیاوي معاملات کے ' رباني الهام سے تهے ' همکو کوئي وجهه معلوم نهیں هی — موجوده توریت کے پڑهنے سے ثابت هوتا هی ' که حضرت موسیٰ کے تمام دنیوي احکام ' مثل ایک انسان کے احکام کے هیں ' جو بصلاح بعض دانشمندوں کے ' اور بطور انتظام مناسب وقت و حالات قوم کے دیئے گئے هوں ' *

کچهه ثبوت اسبات کا نهیں هی ' که سوائے احکام عشره کے ' جو پتهر کي تختیوں پر کهودے گئے تهے ' اور تمام واقعات جو گذرے تهے اور تمام احکام جو حضرت موسیٰ نے صادر کیئے تهے ' حضرت موسیٰ کے وقت میں لکهے گئے تهے ' مگر اِس پر یقین کرنے کي وجوه هیں ' که اُن میں سے بهت کچهه معبد بیت المقدس میں تها ' جو سب کا سب معه اُس کے جس پر توریت کا اطلاق هوتا هی ' بخت نصر کے زمانه میں بیت المقدس کے ساتهه تباه و برباد هوگیا ' اور ایک ٹکڑه بهي نهیں بچا — یهه ایک لازمي نتیجه تها ' که انبیاء نے جو کچهه کیا یا جوکچهه کها ' وه بطور ایک رباني حکم کے سمجها جاوے ' اس لیئے حضرت موسیٰ کے تمام دنیوي احکام بهي بطور رباني احکام کے سمجهے جاتے هونگے ' *

جبکه بني اسرائیل بابل کي قید سے چهوٹے ' تو صرف یادداشت اور رباني روایتوں کے مطابق توریت لکهي گئي ' جو پانچ کتابوں پر مشتمل هی ' اور تمام واقعات تاریخي اور

حکام دنیوی ' جو پہلے هي سے بطور زباني احکام کے مانے جاتے تھے ' اُس میں بطور زباني احکام کے مندرج هوئے ' *

اکثر مقام میں جہاں لکھا هی ' که موسی بخدا گفت ' و خدا بموسی گفت ' و موسی فرمود که خدا چنیں میفرماید ' اُسي خیال پر لکھا گیا هی -- نتیجه اس کا یہه هوا ' که بني اسرائیل نے تمام دنیوي احکام کو جو درحقیقت مذهب سے کچھه علاقه نهیں رکھتے تھے مذهب میں شامل کرلیا ' اور پھر اُس نے مقاصد کو چھوڑ کر صرف لفظي معنوں کی پیروی کو نہایت یہودي مذهب قرار دیا *

یہودیوں کي عادت تھي ' که میٹھه بوسنے کے لیئے یہه ٹوٹکا کرتے تھے ' که بکري کے بچے کو اُسي کي ماں کے دودھ میں پکاکر کھیتوں کے کونو پر رکھدیتے تھے ' حضرت موسی نے منع کیا که بکري کے بچے کو اُسکي ماں کے دودھ میں مت پکاؤ ' جسکا مقصود یہه تھا که ٹوٹکا مت کرو ' جو ایک قسم کا شرک بالله هی ' علماء یہود نے اُسکے لفظوں کي پیروي کے خیال سے یہه قرار دیا ' که چوپایه کے گوشت کو دودھ میں پکانا منع هی ' پھر اُس پر یہه تفریع کی که گھي بھي دودھ کا جزو هی ' اس لیئے گوشت کو گھي میں بھی پکانا حرام هی ' چنانچه اس مسئله پر اب تک یہودي مستحکم هیں ' اور کسي چوپایه کے گوشت کو گھی میں نہیں پکاتے ' *

جبکه رسول خدا صلعم نے ' عرب میں خداے واحد کي عبادت کا غلغله ڈالا ' تو حضرت کي اُمت میں عرب کے بدو تھے ' جو بدبي ' و بد اخلاقي ' و تعصب ' و عداوت ' اور جہالت ' اور چوري ' قضاقي ' خونریزي میں ' بني اسرائیل سے بھي کئي درجه بڑھے هوئے تھے ' حضرت موسی کو تو صرف اس وجهه سے که وه بني اسرائیل کے نکال لیجانے میں بطور افسر کے بنے تھے ' اُنکي دنیوي سرداري بھي اختیار کرني پڑتي تھي ' مگر آنحضرت صلعم کو اُس سے بھي زیادہ سخت مجبوري دنیاوي اُمور میں بھي سرداري اختیار کرنے کو پیش آئی تھي ' جسکو منصب نبوت سے کچھه تعلق نه تھا — عرب کي تمام قوموں کا یہه طریقه تھا ' که جسکو شیخ یا سردار قوم قرار دیتے تھے ' تمام دنیاوي اُمور میں بھي اُسي کي اطاعت کرتے تھے ' اور اُسي کے حکم پر چلتے تھے ' پس بطور قدرتي امر کے ضرور تھا که تمام قوم عرب آنحضرت صلعم کو اپنا دنیوي سردار بھي قرار دیں ' اور آنحضرت صلعم کو بھي مجبوراً دنیاوي سرداري اختیار کرني بھي لازم تھي ' مگر جس طرح که حضرت موسی میں دو منصب جدا جدا جمع هوگئے تھے ' اسي طرح آنحضرت صلعم میں بھي ' دو جداگانه منصب جمع تھے *

دنیاوي سرداري کے متعلق آنحضرت صلعم بھي مثل حضرت موسی کے اپنے صحابه کے مشورہ سے ' اور ضرورت و مصلحت وقت کے لحاظ سے ' احکام صادر فرماتے تھے ' اور یا تو

یہودیوں کي پیروي سے ' یا اُسي لازمي نتیجه سے جسکا میںنے اوپر ذکر کیا ' آنحضرت صلعم نے بھي دنیاوي امور کي نسبت جوکچھه کیا ' یا فرمایا ' بطور رباني احکام کے سمجھا گیا ' اور لوگوں نے " و انتم اعلم بامور دنیاکم " کو یکلخت بھلادیا *

مسلمان عالموں نے قدم بقدم یہودیوں کي پیروي کي ' اور تمام دنیاوي احکام کو جو درحقیقت مذهب سے کچھه علاقه نہیں رکھتے تھے ' مذهب میں شامل کرلیا ' اور پھر یہودیوں کي تقلید سے اُس کے مقاصد کو چھوڑکر صرف لفظي معنوں کي پیروي کرنا ثبوت مذهب اسلام قرار دیا — عرب میں رواج تھا که متمول اور سردار ' بنظر افتخار و تکبر و غرور کے ' اِزار کو ٹخنے سے نیچے زمین پر گھسٹتي هوئي پہنا کرتے تھے ' اور یہه امر گویا نشان اُنکے تکبر و غرور کا تھا ' آنحضرت صلعم نے ٹخنے سے نیچي اِزار پہننے کو منع فرمایا ' جسکا مقصود تکبر و غرور کو منع کرنا تھا ' همارے هاں کے علماء نے ٹھیک یہودیوں کي طرح بکري کے دیچه کي مانند لفظي پیروي کرکر ' ٹخنے سے نیچي اِزار پہننے والے کو ' گو وہ کیساهي مسکین و بےغرور و منکسر هو ' اور گو وہ امر نشان غرور و تکبر باقي هي نرها هو ' جهنم میں ڈالدیا ' اور لوگوں کو تعجب میں ڈالا ' که یہه کیسا مذهب هی ' که دو اُنگل اونچي اِزار پہننے سے بہشت ملتي هی ' اور دو اُنگل نیچي پہننے سے ' دوزخ میں ڈالا جاتا هی — اگر وہ حدیث صحیح هو ' اور سچ پوچھو تو موافق مراد اُس حدیث کے ' اس زمانه کے ٹخنه کُھلي اِزار پہنے والے هي دوزخ میں تشریف لیجاوینگے — کون شخص اسبات سے انکار کرسکتا هی ' که یہه ملّانے مسجدوں میں وعظ کہنے والے ' سر منڈے ' ٹخنا کُھلے ' نرے وهابي ' یا نیم چڑھے وهابي ' جسقدر ٹخنه کُھلي اِزار پہننے سے ' متکبر و مغرور معلوم هوتے هیں ' اور یہودیوں سے بھي بڑھکر " الّا ایاما معدودۃ " کو بھي حذف کرکر " لن تمسناالنار " هي کا کلمه پڑھتے هیں ' اُسکا کروڑواں حصه بھي نیچي اِزار پہننے والوں میں تکبر و غرور نہیں هی ' یہه هردم اپني باتوں پر نادم هیں ' اور وہ اپني پندار میں هردم بہشت کے ایک اعلی درجه پر چڑھتے جاتے هیں ' فاعتبروا یا اولی‌الابصار ' *

غرضکه انسانوں کي بد بختي کي جڑ ' دنیوي مسائل کو دیني مسائل میں ' جو نا قابل تغیر و تبدیل هیں ' شامل کرلینا هی — همارے اِس قول کي دلیل ' دنیا کي تمام قوموں کي تاریخ میں پائي جاتي هی ' عیسائي قومیں ' جو اب دنیا میں نہایت اعلی درجه کي خیال کي جاتي هیں ' جب تک اِسی خیال میں مبتلا رهیں ' روز بروز نکبت کو پہنچتي گئیں ' جیساکه اُس زمانه کي تاریخوں سے ثابت هوتا هی ' هندو جو ایک زمانه میں دنیا کي لایق قوموں میں تھے ' اسي آفت سے تباہ و برباد هوگئے ' مسلمان جو ایک زمانه میں سب سے سربرآوردہ تھے ' اسي بد بختي کي ذلت میں مبتلا هوئے ' اخیر نتیجه اُنکي بربادي کا جو ابھي سلطنت عثمانیه ترکي پر گذرا ' همنے اپني آنکھه سے دیکھه لیا *

تمام چھوٹي بڑي مسلماني سلطنتیں ، اور ریاستیں ، جو اِسوقت موجود ھیں ، اسي وبال میں مبتلا ھیں ، *

هم خدا خواهي و هم دنیاے دوں * این خیال است و محال است و جنوں

گو مولانا روم کا مطلب اس شعر سے کچھہ اَور ھو ، لیکن اگر اسکو سچے اور واقعي معنوں پر محمول کریں ، تو زیادہ مناسب معني یہي ھیں ، کہ دنیاوي معاملات کو ، مذھبي معاملات میں ملالیناجنوں ھی ، *

لوگوں کو یہہ خیال پیدا ھونا ھی ، کہ اُمور معاشرت کو جو عمدہ ھوں ، بطور مذھبي مسائل کے مذھب میں شامل کرلینا ، اُنکے دوامي استحکام اوردوامي عمل درآمد کا باعث ھوتا ھی ، مگر اس خیال میں اُنھوں نے غلطي کي ھی ، دیني احکام کا نیچر ، دنیاوي احکام معاشرت کے نیچر سے ، بالکل مختلف ھی ، دیني احکام جو روحاني اخلاق اور روحاني تہذیب سے علاقہ رکھتے ھیں ، دوامي و ناقابل تبدیل ھوتے ھیں ، کیونکہ خدانے انسان کي روح کو جس نیچر پر پیدا کیا ھی ، جب تک انسان دنیا میں ھی اُسکو تغیر و تبدیل نہیں ، برخلاف اُمور معاشرت و تمدن کے ، جو روز بروز تبدیل ھوتے جاتے ھیں ، پس وہ داخل احکام مذھبي جو ناقابل تبدیل ھیں ، نہیں ھوسکتے ، اُنکو مذھبي احکام میں داخل کرنا ھي ، بربادي کا باعث ھی ، دنیا آگے بڑھي چلي جاتي ھی ، اور ھم اُسي پراني لکیر کے فقیر بنے رھتے ھیں ، اور ذلت و ادبار کو پہنچتے ھیں ، خدا کي کبھي یہہ مرضي نہیں ھوسکتي ، کہ انسان علم اور اُسکے صنایع سے جو وہ روز بروز انسان پر ظاھر کرتا جاتا ھی منتفع نہو — کبھي خدا کي یہہ مرضي نہیں ھوسکتي کہ جب ھم پتوں کا لباس پہنتے تھے ، تو جب ھمکو جانوروں کي کھال کا لباس پہنے کي قدرت ھوئي ، تو اُسکو نہ پہنیں ، اور جب سوتي اور اوني اور ریشمي لباس بنانا ھمکو آیا ، تو اُسکو استعمال نکریں ، جب ھم سینا نہیں جانتے تھے ، اور بن سیا کپڑا پہنتے تھے ، تو جب ھمکو کپڑا سینا آیا ، تو سیا ھوا کپڑا نہ پہنیں ، پہلے ھمکو کپڑے کي وضع و قطع اچھي طرح نہیں آتي تھي ، صرف سیدھا سادا کُرتہ سي لینا آتا تھا ، تو جب ھمکو عمدہ قطع کي قبا اور عبا اور صدري سیني آئي ، جس میں اقسام کے ریشمي و سوتي گھنڈیوں دار ساز لگانے لگے ، تو اُسکو استعمال نکریں ، یا جب ھمکو عمدہ قطع کے کوٹ و پتلون سینے آگئے ، تو جو لوگ اُسکو پسند کرتے ھیں وہ اُسکو نہ پہنیں ، اور پہنیں تو کافر ھوں ، یہہ اُصول ایسے ھیں جن سے کسیکا دل انکار نہیں کرسکتا ، گو زبان انکار کرے ، اور جو اسکے برخلاف ھیں وہ ان اُصولوں کو برباد نہیں کرسکتے ، بلکہ اگر ان اُصولوں کي مخالفت کو اپنے مذھب کا جزو قرار دیتے ھیں ، تو خود اپنے مذھب کو برباد کرتے ھیں ، جسکا وبال اُنھي پر ھی ، اسي قسم کے لوگوں کي بدولت مذھب اسلام کي یہہ ذلت ھوئي ھی ، کہ بجاے روحاني مذھب کے جسماني

منصب [illegible] سلسلوں میں علوم و صنایع و عقل و خیال و [illegible]
کو [illegible] مستعد ہوگئی ہیں ۔

بعض لوگوں کا یہه خیال هی ، که قرآن مجید میں بھی بہت سی باتیں ایسی [illegible] جو صرف دنیاوی امور سے ، جو پیش آئے تھے ، علاقه رکھتی هیں ، اور انکا وحی [illegible] من الله هونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ، پس اگر دنیاوی امور مذهب میں [illegible] نہیں ، تو قرآن مجید میں انکا آنا کیونکر صحیح تصور هوسکتا هی ، همارے [illegible] مذهب نے اس لیے بھی زیاده الزام لگایا هیں ، اور لڑائی کی نسبت ، اور حضرت [illegible] حضرت زینب کی ، نسبت جو آیتیں هیں انکو نعوذ بالله هوائے نفس کی جانب منسوب کیا هی ، مگر یہه سب انکی غلطی و نا سمجھی هی ، حقیقت یہه هی که وه لوگ وحی کی حقیقت نہیں جانتے ، اور یہه نہیں سمجھتے که وحی کا ملکه کس طرح [illegible] میں آتا هی ، اور کسطرح پر وحی کا نزول هوتا هی ، همارے علماء نے وحی کی [illegible] کو جو کچھه سمجھا هی ، اور جسطرح بیان کیا هی ، اسی سے اس قسم کے [illegible] مذهب پر اور قرآن مجید پر وارد کیا هی ، مگر جب حقیقت وحی سمجھه میں [illegible] یہه بھی سمجھا جاوے ، که کیا امر اس ملکه کی تحریک کا باعث هوتا هی [illegible] وحی لانے والا هی ، تو اسوقت انکے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا نہونگے ، میں [illegible] نے یہه بات کہتا هوں ، که اگر قرآن مجید میں عایشه و زینب کی آیتیں نہوتیں [illegible] امورات دینی و دنیوی کے پیش آجانے کے بعد انکی نسبت وحی کا آنا قرآن سے نه پایا [illegible] تو میں اسکو هرگز الهامی اور خدا کا کلام نه سمجھتا ، اور اسکو ایک معمولی کتاب [illegible] قرآن مجید کے سچے اور الهامی اور من الله هونے کی بڑی دلیل یہی هی ، که اس [illegible] ان تمام باتوں کی نسبت وحی کا آنا بیان هوا هی ، جو در پیش آئی تھیں [illegible] درحقیقت اس ملکه کی محرک تہیں ، جسکو ملکه نبوت ، یا [illegible] اسمی ، تعبیر کیا جاتا هی ، قرآن کا هر ایک [illegible] احکام منقسم هی [illegible] میں اپنے همنام ملا احمد جونپوری کی تفسیرات [illegible] احکام هی کو تسلیم کرلوں [illegible] پانسو آیات احکام اس میں هیں ، اور [illegible] بھی نہیں ، [illegible] قرآن مجید میں ذکر هونا ، اسباب کی داخل [illegible] که [illegible] میں داخل هیں ۔

## انشاء اللہ

[illegible] کہیں حضرت [illegible] نے کہا " انا مومن انشاء اللہ
[illegible] انا مومن حقا " یعنی [illegible] انشاء اللہ کا لفظ نہیں رکھتے ‛ ایسے موقع
پر [illegible] پھر حضرت کس [illegible] کہتے ہیں ؟ قسم سے بچتے ‛ وعدہ پورا کرنے
[illegible] ‛ جھوٹ بولنے اور [illegible] حضرت پھر تو ‛ انشاء اللہ ‛ خوب
[illegible] ہیں ‛ کیا مسلمانوں کا [illegible] مسئلہ یہ ہی ؟ [illegible] پرہیزگار ‛ مولوی ‛ عالم ‛ شرع
پر [illegible] والے ہیں ‛ گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں ‛ [illegible] اِس پر خیال رکھتے ہیں ‛
حضرت میں تو نہیں سمجھا ‛ [illegible] ہو ‛ اُصول فقہ کو جانتا ہو ‛ عالموں کی صحبت
اٹھاتی ہو ‛ تو جانو ‛ جاہل [illegible] ‛ نہ پڑھے نہ لکھے ‛ [illegible] یہہ کچھہ ‛ جانو تو کیا
جانو ‛ حضرت آپ ہی سمجھا [illegible] ‛ ارے میاں ‛ اِن ‛ کے معنی تو اگر ‛ شاء ‛ کے معنی
چاہا ‛ اللہ ‛ کے معنی تو اللہ کے [illegible] ہی ‛ مگر وہ فاعل واقع ہوا ہی جسکے معنی ‛ نے ‛
کے ہوتے ہیں ‛ ایسا سبکو ملاؤ تو یہہ معنی ہوئے " اگر چاہا اللہ نے " اب دو مسئلے فقہہ کے
[illegible] سمجھہ لو ‛ اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو اور [illegible] نہ پورے ہونے شرط کے ادا نکیا
جاوے تو کچھہ گناہ لازم نہیں آتا " اذا فات الشرط فات المشروط " ایک مسئلہ ہوا ‛ دوسرا
مسئلہ یہہ ہی ‛ کہ خالق جمیع افعال عباد کا خدا ہی ‛ پس جب اِن دونو مسئلوں کو ملاکر
‛ انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو پھر انشاء اللہ کہنے کے [illegible] کچھہ گناہ نہیں رہتا ‛ حضرت
میں مسئلے تو بخوبی سمجھہ گیا ‛ مگر اب تک میری سمجھہ میں یہہ نہیں آیا کہ گناہ
کیونکر نہیں رہتا ‛ کیا وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے اُلٹ جاتا ہی ‛ جاہل ‛ اور کیا ‛ ہماری
جیب میں ایک گھڑی ہی ‛ ہمارے دوست کو اُسکی ضرورت ہی ‛ جب اُسنے ہم سے
مانگی ‛ ہمنے کہا کہ ‛ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں ‛ اُسنے کہا ‛ قسم تو کھاؤ ‛
ہمنے کہا ‛ خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہیں – ہمارے گھر میں ایک اشرفی
[illegible] ‛ ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی ‛ ہمنے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اشرفی
[illegible] اُسنے کہا ‛ قسم تو کھاؤ ‛ ہمنے کہا کہ خدا کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں ‛
[illegible] کہ نہیں ‛ بات ہی بات میں گناہ اُلٹ گیا کہ نہیں ‛ یہہ تو باتوں
ہی باتوں [illegible] ‛ کے معاملہ میں بھی لفظوں ہی کے اُلٹ پھیر سے
گناہ اُلٹ جاتا ہی ‛ [illegible] سولہ روپیہ کی قیمت کا ہم سے قرض لو [illegible] کو
[illegible] تولہ چاندی [illegible] سولہ تولہ چاندی میں [illegible] تولہ [illegible] اور چار تولہ
[illegible] میں [illegible] نہوتی ‛ [illegible] میں [illegible] کا مال ہو
[illegible] کھرا سونا لیلو ‛ [illegible] کا [illegible] کہا ‛ [illegible]

[illegible]

[illegible] کا [illegible] مسال [illegible]

[illegible] تعلقدار [illegible]

[illegible] کر لفظوں کے [illegible] پھر سے کلمہ [illegible]

[illegible] روپیہ [illegible] مستطیع ہوں [illegible]

[illegible] کی سال تمام [illegible] ہم [illegible]

[illegible] ، باتیں ہی تو تھیں [illegible] لڑکیوں کے سمجھنے [illegible]

[illegible] بہہ تو ہوا ، انعام اللہ [illegible] رہ ہی گئی ، [illegible]

[illegible] بھائی [illegible] سمجھو کہ [illegible] تمہارا دل خوش [illegible]

ہم کو [illegible] ان شاء اللہ ، [illegible] آنے والے کا [illegible]

کہدیا تھا [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] نہیں جاتا ، [illegible]

کہا تھا ، انا [illegible] الشروط ، [illegible] میں گناہ [illegible]

[illegible] ہو ، ہاں صاحب [illegible] کیا تھا ، [illegible]

[illegible] مقدمے [illegible] میں کیا کرتا [illegible] کالی مخمل کی [illegible]

[illegible] رکھ [illegible] مولوی [illegible] ہوا تھا ، [illegible]

[illegible] سچ کہدیا ، ہاں [illegible] سے [illegible]

[illegible] ارے جب اس [illegible] قسم [illegible]

ہوتا کا [illegible] قسم سے [illegible] کا انعقاد [illegible] گر وہ [illegible]

[illegible] ان شاء اللہ کہدیا ہوتا ، [illegible]

[illegible] تو ، پکار کر کہا ہوتا کہ [illegible] قسم سے [illegible]

میں کہہ [illegible] ہوتا ان شاء اللہ ، مگر خیال [illegible]

[illegible] پھر جو چاہتے وہ کہتے [illegible]

[illegible] نے خوب بتلائیں [illegible]

[illegible] تحقیق کر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہم سے [illegible]

[illegible] ہوئی [illegible]

[illegible]

[illegible] کی [illegible] ہیں۔

[illegible] چالاک [illegible]

[illegible] آپ نے [illegible] ہیں، انہوں نے کہا کہ

[illegible] حضرت ملا صاحب [illegible] ہیں، انہوں نے کہا

[illegible] سمجھ سے اور [illegible] کے پوچھنے پر [illegible]

[illegible] اس میں [illegible] بہت [illegible] میں [illegible]

[illegible] وہاں [illegible] کے [illegible] وہاں [illegible]

[illegible] حضرت میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا [illegible] آپ کا نام بھی اور بہت [illegible]

[illegible] شیطان کا نام تو سمجھتے ہیں بھی زیادہ [illegible] شہوت [illegible]

[illegible] نہیں [illegible] ہوں [illegible] سمجھ سے [illegible]

[illegible] مطلب ہے [illegible] ہوگی تو [illegible] آئی [illegible]

[illegible] کا [illegible] پھر آپ [illegible] کے [illegible]

[illegible] کے واسطے [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] مگر میں [illegible] کو نہیں [illegible]

[illegible] خدا کے [illegible] کی [illegible] ہوا ہی جاتا [illegible]

[illegible] بہت اچھا آپ [illegible] میں پوچھتا ہوں کہ آپ

[illegible] ہوں [illegible]

[illegible] اشعار [illegible] کے الفاظ میں [illegible]

[illegible]

[illegible] رسول [illegible]

[illegible] تصور [illegible]

[illegible] بہت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہوا ' مکان گروي رکھو ' راهن سے کھوالو که سکونت مینے ' بعوض کي ' کرایه کا فائدہ ہوا
اور سود نہوا ' گانو گروي لو مثلاً ہزار روپیه کو جس میں دو سو روپیه سالانه کا فائدہ ہو '
راہن سے اُسي روپیه سال دینے کے اقرار پر پٹه لکھوالو ' اور گانوں پر قبضه کرلو کل منافع
تحصیل کرو ایک سو بیس روپیه سال سود کے پٹه کے نام سے بچے که نہیں ' اور سود نہوا '
حضرت کیا یہه ہوتا ہی ؟ خدا کي قسم سب کرتے ہیں جتنے مقدس خدا پرست وہابي
نیم وہابي مقلد حنفي زمیندار تعلقدار ہیں سب کرتے ہیں ' بڑے بڑے مولویوں نے فتوی
دیدیئے ہیں ' اب سمجھے که لفظوں کے اُلٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا که نہیں -- اجي ابھي
ہمارے پاس کوئي زکواۃ کا روپیه لوے اور ہم مستطیع ہوں ' ابھي گھر میں جاکر بیوي سے
کہه آویں که ہمنے اپنا کُل مال تمکو ہبه کیا اب ہم مفلس ہوگئے که نہیں ؟ باہر آویں اور
زکواۃ کا روپیه لے لیں ' باتیں ہي تو ہیں اِن باریکیوں کے سمجھنے کو علم درکار ہی ' ٭

بھلا حضرت یہه تو ہوا ' انشاء الله ' والي بات رہ ہي گئي ' اُسکو بھي کسي مثال سے
سمجھادیو ' ارے میاں یوں سمجھو که ' ہمنے تمہارا دل خوش کرنے کو تم سے کہدیا که
ہم کل تمہارے ہاں آوینگے انشاء الله ' ہمارا ارادہ آنے وانے کا کچھه نہیں تھا ' یوں ہي
کہدیا تھا ' جب نه گئے ' تو معلوم ہوا که خدانے نہیں چاہا ' اُسي پر وعدے کو مشروط
کیا تھا ' اذا فات الشرط فات المشروط ' بات کي بات میں گناہ پلٹ گیا - کبھي تم عدالت
میں گواہي دینے گئے ہو ' ہاں صاحب ایک دفعه گیا تھا ' مینے تو جو سچ تھا وہ کہدیا مگر
میرا بھائي مقدمه ہار گیا ' میں کیا کرتا وہاں ایک کالي مخمل کي گول چُغت دار ٹوپي
پہنے ہوئے گوري رنگت کا مسلمان مولوي کرسي پر بیٹھا ہوا تھا ' اُسنے قسم دي که سچ کہنا ' میں
جھوٹ بولنے سے ڈر گیا سچ کہدیا ' ہاں فقہه نجاننے سے عالموں کي صحبت نه اُٹھانے سے '
یہي تو نتیجه ہوتا ہی ' ارے جب اُس مولوي جج نے قسم دي تھي که سچ بولنا ' تونے کہا
ہوتا که خدا کي قسم سچ بولوں گا انشاء الله ' اگر وہ جج نام کا مولوي ہو اور فقہه نجانتا
ہو تو تو پکار ہي کر انشاء الله کہدیا ہوتا ' اور اگر وہ بھي مولوي ہو اور ٹھٹھیرے ٹھٹھیرے
بدلائي آن پڑے تو ' پکار کر کہا ہوتا که ' خدا کي قسم سچ بولوں گا ' اور جھٹ پٹ دل
میں کہه لیا ہوتا انشاء الله ' مگر خیال رکھا ہوتا که سانس نه ٹوٹنے پائے ' ورنه انشاء الله
کا جوڑ ٹوٹ جاتا ' پھر جو چاہتے وہ کہدیتے ' ذرا بھي جھوٹي قسم کھانے کا گناہ نہوتا ' ٭

حضرت باتیں تو آپ نے خوب بتائیں ' مگر میں تو حیرت میں ہوگیا ' ابتو رخصت
ہوتا ہوں اَور کسي سے بھي تحقیق کرونگا ' میرا دل دُھکڑ پکڑ کررہا ہی ' تم جس مولوي
سے چاہنا پوچھنا ' یہي بتاویگا ' کہو میں ابھي ہدایه شرع وقایه درمختار بحرالرایق
نہرالفایق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے ہر ایک جزئي کي روایت نکالدوں ' اور تمنے ایک
فتاوی بھي دیکھا ہی بجو پرانے خانداني مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہی ' میں اسوقت

اُسکا نام بھول گیا یاد آجاویگا تو بتادوں گا اُس میں ہر ایک مسئلہ کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں ' ایک میں جایز حلال اور دوسرے میں ناجایز حرام لکھہ رکھا ہی ' پھر جونسی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لیلیا' بہت ہوا روپیہ دو روپیہ ' فتوے کے نام سے نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے ' کیوں بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا کہ نہیں -- مگر اِس زمانہ میں جو کمبخت مقلدین فلسفہ ملاحدہ نکلے ہیں اور جنکو ہمارے پیشواؤں نے نیچریہ کا خطاب دیا ہی اُن سے کچھہ مَت پوچھنا وہ تو مذہب اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں -- یا اللہ کیا مشکل پڑی ہی ' *

تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک پیر مرد متبرک صورت سفید ریش ملے ' جانا کہ یہہ بھی کوئی مولوی ہیں ' پکار کر کہنے لگے کہ مجھے آپ سے کچھہ پوچھنا ہی ' اُنہوں نے کہا کہ بھائی کیا کوئی مذہبی مسئلہ ہی ' بولے حضرت ہاں مذہب کا مسئلہ ہی ' اُنہوں نے کہا کہ بھائی نہ میں مولوی نہ مولوی کی دُم مجھہ سے اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا واسطہ 'کسی مولوی صاحب سے جاکر پوچھو ' اسی شہر میں بہت سے مولوی ہیں یہاں سے دس اور پندرہ کوس پر نامی نامی قصبے ہیں وہاں مولویوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں وہاں جاکر پوچھو ' نہیں حضرت میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں ' آپ کا نام بھی تو بہت مشہور ہی' ارے میاں شیطان کا نام تو مجھہ سے بھی زیادہ مشہور ہی ایسی ویسی شہرت تو مجھکو ہوئی بھی نہیں ' میں نیچری مشہور ہوں مولوی ملاّ نہیں ہوں مجھہ سے مت پوچھو ' حضرت اگر مولوی ملّاؤں سے دل کو تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں آتے ' جب دل ہی کو تسکین نہو تو مولوی ملّاؤں کو کیا کریں ' پھر آپ نیچری ہوں یا پینچری بے پوچھے تو دل مانتا نہیں خدا کے واسطے بتا ہی دو ' *

اچھا صاحب ' پوچھو کیا پوچھتے ہو ' مگر میں کسی فتاوے وتاوے کو نہیں جانتا خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوے کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کُھلا ہوا ہی جانتا ہوں ' جو کہونگا اُسی سے کہونگا ' بہت اچھا آپ اُسی سے فرمائیےگا ' میں پوچھتا ہوں کہ آپ ' انشاء اللہ ' کو جانتے ہیں ' خوب جانتا ہوں ہماری دلی کے رہنے والے تھے بڑے شاعر تھے ذرا مزاج میں ظرافت تھی اُنکے یہہ اشعار مجھے یاد ہیں پہلے مصرعہ کے الفاظ میں شاید کچھہ لفظ ادل بدل ہوگئے ہیں *

مولوی کہتے ہیں ' ہمکو تونے کیوں رسوا کیا
کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر مینے کیا کیا
واسطہ باعث سبب موجب جہت کچھہ بات بھی
راز وہ کمبخت کیا تھا مینے جو افشا کیا
کیا کہا کس سے کہا کسنے سنا کب کس گھڑی
کس جگہہ کس وقت کس دم آپ کا چرچا کیا

حضرت میں آپ سے انشاءالله خاں شاعر کا حال نہیں پوچھتا ' انشاء الله ' کے لفظ کي نسبت حکم شرع کا پوچھتا ھوں ' که کس مراد اور کس مطلب سے اور کس مقام پر اِس لفظ کا استعمال ھوتا هی ' یهه کہو ' ذرا مجھکو خدائي فتاوائے نیچر دیکھه لینے دو ' اُس میں تو یهه لکھا هی که " تمکو کسي کام کي نسبت یهه نه کہنا چاهیئے که میں کل کرونگا ' بلکه یوں کہنا چاهیئے که ' اگر خدا چاهے تو میں کل کرونگا ' خدا بسبب علة العلل ھونے کے هر کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان اپني طرف منسوب کرتا هی ' اس لیئے انسان کو بهي لازم هی که هر چیز کو خدا سے متعلق کرے ' پس جس جس بات پر انشاء الله کا لفظ کہا جاتا هی تو ' انشاء الله ' کے لفظ سے اُس بات پر تعلیق هوتي هی ' اور وعدہ کو زیادہ استحکام هونا هی ' سننے والے کو کامل یقین هوجاتا هی که ' وعدہ کرنے والے نے خدا پر اس وعدہ کي تعلیق کي هی ' تو ضرور اُسکو پورا کریگا ' اگر تمنے کسي سے وعدہ کیا که میں کل تمہارے گہر آؤنگا ' اور اُسکے ساتهه انشاء الله نہیں کہا ' اور نہیں گئے ' تو صرف وعدہ خلافي کا گناہ ھوا ' اور اگر اُسکے ساتهه انشاء الله بهي کہا ' اور پهر نگئے ' تو تین گناہ هوئے ' ایک وعدہ خلافي کا ' دوسرا اسبات کا جس سے وعدہ کیا تها اُسکو وعدہ پورا کرنے پر زیادہ یقین دلایا اور وعدہ پورا نکیا ' تیسرے اسبات کا که خدا کو ضامن دیا ' اور اُسکے نام کي عزت کا بهي کچهه ادب نہیں کیا ' اگر کسي بات پر قسم کهاکر انشاء الله کہا هو ' تو قسم توڑنے پر گناہ سے نہیں بچتے ' بلکه دُگنا گناہ هوتا هی قسم توڑنیکا ' خدا کے ساتهه تعلیق کرکر اُسکا ادب نکرنے کا ' جب قسم کهائي که سچ کہونگا ' اور ظاهر میں یا دل میں انشاءالله کهه لیا ' اور پهر جهوٹ بولے تو تین گناہ هوئے ' جهوٹ بولنے کا ' قسم توڑنے کا ' خدا پر تعلیق کرکے اُسکا ادب نکرنے کا ' جس بات کا وعدہ کیا جاتا هی ' جب مصمم اور نہایت مضبوطي اور سچّي نیت سے اُسکے پورا کرنے کا ارادہ هوتا هی ' اسوقت اُسکے ساتهه انشاء الله کا لفظ استعمال کیا جاتا هی ' تمنے ایک مولوي سے کہا که ' میں انشاء الله تمکو دس روپیهه دونگا تو اُسکے یهه معني هوئے که ضرور بے شک تمکو دس روپیهه دونگا *

حضرت اپنے وعدوں کي نسبت تو مولوي بهي یهي معني بتاتے هیں ' اور کہتے هیں که " یهه وعدہ نفلي نہیں رهتا بلکه بحکم نصوص صریحه مثل زکواۃ و نذر معین واجب هوجاتا هی " مگر اور جگهه کہتے هیں که نه وعدہ خلافي کا گناہ هوتا هی ' نه قسم توڑنے کا گناہ هوتا هی ' اور انشاء الله کو ایک سپر بتاتے هیں جو هر ایک حربه سے بچا لیتي هی — حضرت خدا مارے یا چهوڑے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکها هی اگر وهي اسلام هی تو میرا سلام ' اس سے نیچریے هي اچهے جو سچّائي کو اسلام بتاتے هیں ' *

راقـــــــم

سید احمد

## کرامت اور معجزہ

هم اُس امر کا ذکر نہیں کرتے جسکا وقوع اتفاقیہ نیچر کے قواعد کے موافق کسي دوسرے امر کے مقارن ہوا ہو ' اور جسکو ہم کرامت اور معجزہ تصور کرتے ہیں — بلکہ اُسکا ذکر کرنا چاہتے ہیں ' جسکو لوگ کرامت اور معجزہ کہتے ہیں ' اور گویا سپر نیچرل ہونا اُسکي ذاتیات میں سے ہی *

انسان کے دین اور دنیا اور تمدن و معاشرت بلکہ زندگي کي حالت کو کرامت اور معجزہ پر یقین یا اعتقاد رکھنے سے زیادہ خراب کرنے والي کوئي چیز نہیں ہی ' کرامت اور معجزہ پر اعتقاد رکھنے والا بعض ایسے انسانوں پر جو مثل دیگر انسانوں کے ہیں کرامانی ہونے کا یقین کرتا ہی ' اور اُنکا بیجا خوف اُسکي طبیعت پر غالب ہوتا ہی ' اور اُنکي بدي و بد اخلاقي کو نظر انداز کرتا ہی ' اوراُنکي پر فریب و مکر امیز باتوں کے دھوکے میں آتا ہی ' اور دین و دنیا سب کو برباد کرتا ہی ' نہیت مذہب اسلام میں جو سب سے زیادہ خوبي ہی وہ یہي ہی کہ ' اُسنے اپني سچّائي کے ثبوت میں کسي معجزے یا کرامت کا حیلہ و بہانہ نہیں کیا — گو کہ بعد کو اُسکے پیروں نے اپني غلطي اور کم فہمي سے ' اُسکے ساتھہ کرامت اور معجزہ کا ایسا لا انتہا سلسلہ باندہ دیا ' اور ایسي باتیں اُسکي نسبت بیان کیں ' جنکو خود مذہب اسلام نتجانتا تھا *

آنحضرت صلعم کے بعد ' خود اسلام کے پیروں میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے ' اُسکي ابتدا بہي ہوئي کہ ایک شخص اُس فرقہ کا سرگروہ پیدا ہوا ' اور صاحب کرامت و صاحب معجزہ ہونیکا دعوي کیا ' اور جو لوگ معجزہ و کرامت پر اعتقاد رکھنے والے تھے وہ اُسکے معتقد اور پیرو ہوگئے ' اور تہہت اسلام کو چھوڑ دیا ' اور اپنے دین و مذہب کو برباد کیا ' *

هم بطور تمثیل کے اس قسم کے دو تین فرقوں کا ذکر کرتے ہیں ' اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ اُس فرقہ کا سرگروہ یا اُس فرقے والے درحقیقت گمراہ تھے یا نہیں ' اور واقع میں اُنکے اقوال اور اعتقادات کیا تھے ' کیونکہ اُنکے اصلي اقوال ہم تک نہیں پہنچے ہیں ' اور جو کچھہ پہنچے ہیں اُنکے دشمنوں اور اُنکے مخالفوں کي تحریرات کے ذریعہ سے پہنچے ہیں ' جو اعتماد کے لایق نہیں ہیں ' مگر اس بیان سے ہمکو اسقدر ثابت کرنا ہی ' کہ اگر وہ فرقہ درحقیقت اُس فرقہ کے سرگروہ کي پیروي کے سبب گمراہ ہوا تھا ' تو اُسکا باعث بہي کرامت و معجزہ پر اعتقاد رکھنا تھا *

ابتداء زمانہ اسلام یعني دوسري صدي میں خلیفہ مہدي کے وقت میں ایک شخص ظاہر ہوا جو ' ابن مقنع ' کے لقب سے مشہور ہی ' وہ ہمیشہ منہہ پر مقنع ڈالے رہتا تھا ' اِس لیئے کہ دنیا کو اُسکے چہرہ کے نور دیکھنے کي طاقت نہیں ہی ' حالانکہ حد سے زیادہ

نہ صورت تھا ، اُسنے طرح طرح کے معجزوں اور کرامتوں کا دعوی کیا ہزاروں آدمی اُسکے معتقد ہوگئے ، اصل بناء اعتقاد کی یہی تھی ، کہ وہ لوگ معجزوں اور کرامات کے حق ہونیکا یقین رکھتے تھے ، کہتے ہیں کہ آخرکار اُسنے نبوت کا دعوی کیا ، اور اسلام میں بڑی خرابیاں ڈالیں ، اُسکے معتقدوں کو لوگ مرتد سمجھتے تھے ، اور خلیفہ مہدی کو اُس سے متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں ۔ جن میں آخرکار ابن مقنع کو شکست ہوئی ، *

اُسکے بعد یعنی سنہ ۲۷۷ ہجری میں ایک شخص عرب ، کوفہ کے قریب کے رہنے والے " قرامط " نام نے شہرت پائی ، کہتے ہیں کہ اُسنے عجیب لقب اختیار کئے تھے ، اپنے تئیں بالقاب ، ہادی ، مرشد ، برہان ، کلمۃاللہ ، روح‌القدس ، ناقہ صالح ، منادی مسیح ، ملقب کیا تھا اور اپنے تئیں محمد بن حنفیہ ، حواری یوحنا ، اور جبرئیل امین کا وکیل مطلق کہتا تھا ، ہزاروں آدمی اُسکو صاحب معجزہ و صاحب کرامات اعتقاد کرکر اُس پر ایمان لے آئے ، اُسنے خلفاے عباسیہ کو زیر کردیا ، مکہ معظمہ کو جالوٹا ، اور قتل عام کرڈالا ، چاہ زمزم خون سے اُبل گیا حرم میں لاشوں کے تودے لگ گئے ، غلاف کعبہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے حجر اسود کو وہاں سے اُکھاڑ لیا ، اور فخریہ اپنے دارالخلافہ کو لیگیا *

اسی طرح ہر زمانہ میں اسی کرامت و معجزہ کے اعتقاد کے لوگ ، ہمیشہ ایسے شخص کے جسنے کرامت و معجزہ کا دھوکا دیا ، معتقد ہوتے رہے ہیں ، اکبر کے وقت میں روشنیہ فرقہ ، اور قریب عہد فرخ سیر کے حسینیہ فرقہ ، جو میر محمد حسین کے پیرو تھے اور جسنے اپنے پر ایک کتاب آسمانی کے اُترنیکا بھی دعوی کیا تھا ، اور اپنے تئیں بارھواں ، بیکوک ، کہتا تھا اسی اعتقاد کے سبب اُنکے معتقد ہوگئے تھے *

پچھلی باتوں کو جانے دو ، اسی زمانہ میں ہماری سوسئیٹی کا حال دیکھو ، کسقدر لوگ فقیروں کے ، اور مشایخوں کے ، پیچھے اسی کرامت کے اعتقاد کے سبب خراب ہیں ، — حماقت سے دعائیں منگواتے پھرتے ہیں ، مرے ہوئے بزرگوں کی قبروں پر اُنکے صاحب کرامات ہونے کے اعتقاد سے چلے باندھتے ہیں مُنتیں مانتے ہیں ، بیماروں کو لیجاتے ہیں ، چوکھٹ پر ڈالدیتے ہیں ، درخت سے باندھ دیتے ہیں ، کیا کیا کچھ ذلت و خواری ہی جو نہیں بھگتے *

شریفوں کے بچّوں کے گلوں میں ، جوانوں کے بازؤں پر ، اسی اعتقاد کے سبب ، تعویذوں کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں ، امراض کے لئے ، مرادیں حاصل ہونیکے لیئے ، عمل پڑھے جاتے ہیں — ہمارے شہر میں ایک بڑے خاندانی بزرگ تھے اپنی بواسیر کی بیماری پر ، اپنے پیر سے دم ڈلوانے جاتے تھے — ہمارے ایک دوست ہیں ، وہ نماز کے بعد کچھہ پڑھتے ہیں ، اور اپنی پھونک اپنی ہی مٹھی میں بند کرتے ہیں ، اور آگے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں ، ہرچند کہتے ہیں کہ ، یہہ تو باد بہشت پھوکنی کی مثل ہی مگر وہی اعتقاد معجزہ

و کرامت کا اِس لغو حرکت کا باعث هی — فقیر کي دعا سے مرد کا عورت اور عورت کا مرد هوجانا یقین کرتے هیں ٭

اسي تماش کے وہ لوگ هیں جو سحر پر یقین رکھتے هیں ' صرف اتنا فرق جانتے هیں ' که اعمال پاک اور سحر ناپاک هی ' مگر دونوں کا نتیجه واحد هی ' — هندوستاني عدالتوں میں سحر کے مقدمات دایر هوتے هیں — یهه دعوی کیا جاتا هی ' که فلاں شخص مدعاعلیه نے سحر سے میرے بیٹے کو بیٹي بنادیا هی ' اچھے اچھے مقدس آدمي گواهی دیتے هیں ' که همنے اسي حاضر هذا کو جو اب بیٹي هی بیٹا دیکھا تھا — یهه تمام برائیاں مذهبي اور تمدني جو مسلمانوں میں پھیل رهي هیں ' اُنکا اصلي سبب وهي کرامات اور معجزہ پر اعتقاد کا هونا هی ٭

تمام جاهل و وحشي ناتربیت یافته ملک و قوم میں معجزے و کرامات کے خیال هوتے هیں ' مگر جب علم کي روشني سے ملک و قوم روشن هوجاتي هی تو یهه باتیں سب مٹتي جاتي هیں ' فرنگستان بھي جب تک جہالت کي تاریکي میں ڈوبا هوا تھا ' اُسوقت وهاں بھي هزاروں آدمي صاحب کرامات و صاحب معجزات تھے ' مگر اب کسیکا نام و نشان بھي نهیں پایا جاتا ' بلکه اب هزاروں آدمي ایسے پیدا هوگئے جنکے کاموں سے معجزہ و کرامت بھي متحیر هی ٭

یهه اعتقاد مسلمانوں کي تهذیب کا بهت بڑا اور قوي مانع هی ' اور نیز ٹھیٹ مذهب اسلام کے بالکل برخلاف هی ' خود مذهب اسلام اُس امر کا جسکو لوگ معجزہ و کرامت کهتے هیں سخت مخالف هی ' قران مجید میں بهت سے معجزوں کا ذکر هی ' مگر وہ کیا هیں انسان کا پیدا کرنا ' مینهه کا برسانا ' اناج کا میووں کا اُگانا ' سورج چاند ستاروں کا پیدا کرنا ' اور یهي درحقیقت حقیقي معجزے هیں ' بس جب تک که مسلمانوں میں سے معجزے و کرامت کا اعتقاد نهیں جاتا ' اُنکا کامل طور پر مهذب هونا محالات سے هی ' ٭

راقم

سید احمد

---

# اسلام کي واجب الرحم حالت

اس پاک اور سچے مذهب کے صحیح صحیح اصول پر اُسکے باني کے ایام حیات اور بعض خلفاے راشدین کے عهد خلافت تک پورا پورا عملدرآمد هوتا رها اور اسي وجهه سے اُسي زمانه کو اُس کے کمال عروج و ترقي کا زمانه تصور کرنا چاهیئے — اُس وقت نه تو علم فقه کا

وجود تھا نه اصول فقه کا اور نه کوئي تجربي قواعد بجز اُنکے جو قران مجید میں مندرج تھے مسلمانوں کي سوشیل پولیٹکل اور مذهبي هدایت کے واسطے ضروري خیال کئے جاتے تھے — اسي زمانه کے مسلمانوں پر پکے دینداروں کا اطلاق کماحقه هوتا هی — اُن کو نه تو اسلام کے ذریعه سے کسي ملکي مقصد کا حاصل کرنا منظور تھا اور نه کسي خواهش نفساني اور ذاتي غرض کا پورا کرنا مد نظر تھا — یہي لوگ تھے که حق بات کي حمایت میں نه تو موت سے ڈرتے تھے نه عذاب سے نه تو دولت کي اُنکي نظر میں وقعت تھی اور نه قوت کي اُنکے دلمیں هیبت - - یہي لوگ تھے جنھوں نے یزدجرد اور هرقل روم کے درباروں میں سفارت پر جاکر اُس تمام جاه و حشمت اور شان و شوکت کو جو اُنکے گرد و پیش تھي نظر حقارت سے دیکھه کر بیباکانه سوال و جواب کیئے تھے — یہي لوگ تھے جنکے سردار نے اِس شریفانه خیال سے که دین اسلام پر عهد شکني کا ( گو وه کافروں هي کے ساتھه کیوں نهو ) دهبه نه لگے ایک سنگدین مورت کي آنکھه کے عوض میں جوکسي مسلمان سے نادانسته ٹوٹ گئي تھي اپني آنکھه نکال لینے کے واسطے پیش کردي تھي - الغرض اس سچے اسلام اور اصلي اصول کي پیروي میں جسقدر کوتاهي واقع هوتي گئي اُسیقدر اهل اسلام کا تنزل شروع هوتا گیا - شیوع اسلام کو صدي کا ایک ربع بھی نه گذرا تھا که مسلمانوں میں دنیوي معاملات کي وجهه سے مگر مذهب کے پیرایه میں تفرقه پیدا هوا اور خلفاء کے قتل اور هزاروں مسلمانوں کي خونریزي اور اُس ترقي کے رک جانے پر جو اسلام حاصل کر رها تھا منتج هوا — اِن آپس کے فسادوں اور تنازعوں کي وجهه سے اسلام کے مختلف شعبے هوگئے اور هر فرقه ایک نئي ملت کے نام سے موسوم هوا — جب تلوار اسلام کي بربادي اور بیخ کني کے واسطے کافي نه سمجھي گئي تو حضرات فقہا و مفسرین و محدثین نے اپنے علم و قلم سے اُسکو مدد دي اور اُن مختلف ٹکروں میں سے بھي جو اب هوگئے تھے ایک ایک کے چار چار کرنے شروع کیئے — کسیکو خارجي ٹھیرایا کسي کو معتزلي کسیکو رافضي ٹھیرایا کسیکو ناصبي — غرضکه اسلام کي وه قوت جو اوایل میں اتفاق کے ساتھه غیر قوموں کے مقابله میں استعمال کي جاتي تھي اب ایک دوسرے فرقه کے استیصال اور باهمي جنگ و جدال میں کام آنے لگي — اسي وجهه سے جو فتوحات که پہلے زمانه میں هوچکي تھیں وه بند هي نهیں هوگئیں بلکه اُن میں زوال شروع هوگیا عباسیوں کي سلطنت کا زمانه جو سب سے زیاده عروج کا خیال کیا جاتا هی اُس میں بھي مخالف دعویداران سلطنت کے خروج اور وقتاً فوقتاً مختلف فرقوں کے بانیوں کے ظهور سے اسلام کو ایک نه ایک صدمه ضرور پہنچتا رها هی — اور مسلمانوں کے باهمي بغض و عداوت اور وحشیانه حرکتوں کي بے انتہا نظیریں موجود هیں — کهیں سفاح نے ایک خوشامدي شاعر کے شعر پڑھنے پر هزاروں مسلمان قیدیوں کے گلے پر چھري پھروادي اور کهیں مسلمان اور کلمه گو مقتولوں کي نعشوں کا جن میں ابھي خون نکل رها تھا چبوتره بنواکر اور

أسكے اوپر دسترخوان بچھواكر باطمينان تمام كھانا كھايا — كسي خليفه نے بني فاطمه كے قتل عام كا حكم ديديا كسي نے خاندان برمكيه كا استيصال كيا - اِن بادشاهوں نے خانداني عداوتوں اور ملكي مصلحتوں كے واسطے اسلام كا كھوج كھويا اور أنكے چھوٹے بھائيوں يعني عالموں اور فقيهوں نے دنيوي شهرت بيهوده تعصب اور نفسانيت كے سبب سے أسكو مختلف ملتوں اور فرقوں پر منقسم كرديا اور اِس عاليشان عمارت كو جسكو أسكے بانيوں نے اپني محنتوں اور جان و مال كے صرف سے قايم كيا تھا منهدم كرنا شروع كيا — خلفاے عباسيه كے عهد ميں اگرچه مسلمانوں نے علوم و فنون ميں بهت ترقي حاصل كرلي تهي ليكن ان علوم و فنون سے بجاے إسكے كه اپنے مذهب كو مستحكم كريں أسكے ضعيف كرنے ميں زياده كام ليا — اكثر مغربي مصنف اسلام كے أصول كے عمده هونے پر حرف ركھتے هيں اور يهه كهتے هيں كه اگر يهه مذهب درحقيقت اچھا هوتا تو أس سے يهه خراب نتايج كيوں پيدا هوتے جنكي نظيروں سے تاريخيں بھري پڑي هيں— إن مصنفوں كي راے ميں تكبر كينه پيروي تعصب اور جبر قوم عرب كے چال چلن كا خاصه هي اور اسي وجهه سے مسلمانوں نے هر زمانه ميں اور هر جگهه إن خراب خصلتوں كو ظاهر كيا هي اور إن عيوب كو صرف اپني هي ذات پر محدود نهيں ركھا هي بلكه جهاں كهيں گئے هيں اور جن قوموں كو مغلوب اور مطيع كيا هي أن پر بهي إن عيبوں اور خصلتوں كا رنگ جماكر اپنا هي سا كرليا هي كيونكه جس ملك اور جس قوم كے مسلمان كو ديكھوگے إن عيبوں سے بهت كم مبرّا پاؤگے — نهايت افسوس كي بات هي كه جب غير قوميں ميں أن برائيوں كو جو لوگوں كي جهالت اور نفساني خواهشوں كا نتيجه هيں مذهب اسلام كے أصول كي طرف منسوب كريں — تهمت اسلام جسكا نام هي أسكے أصول ميں كسي طرح نقصان نهيں هي اور نه كوئي ايسي بات هي جو قابل گرفت هو مگر إن حضرات علماء كا خدا بھلا كرے جنهوں نے اسلام كي قدرتي اور ساده شكل كو بد نما اور مصنوعي رنگ سے چھپا ديا هي جس سے أسكے ديكھنے والوں كو بجاے اسكے كه أسكي خوبصورتي نظر آئے اكثر نفرت هوتي هي — ليكن چونكه إس زمانه ميں بعض مسلمان خواب غفلت سے چونكے هيں اور اپنے دين كے دريا كو أسكے اصلي بهاؤ پر پھير ليجانے كي كوشش كر رهے هيں اس سے كسيقدر توقع هوتي هي كه شايد اسلام اس مصنوعي لوث سے پاك هوكر اپني اصلي صورت اور قدرتي سادگي حاصل كرے - ليكن دو چار شخصوں كي كوششوں سے كيا هوسكتا هي جبتك كه كُل قوم اپنے خيالات كو ( اگر اسلام كے اوپر نهيں تو خود اپني حالت پر رحم كركے ) اس طرف نه رجوع كريں كه حق كو باطل سے اور باطل كو حق سے پهچانيں اللهم اهدنا الى صراط مستقيم *

راقـــــم

ابوالحسن

# تحقیقات مذہب

من یوتی الحکمة فقد اوتي خیراً کثیراً

میں علی‌العموم تحقیقات مذہبي کا ذکر کرتا ہوں — کسي خاص ملت و دین اور مشرب کي طرف مخاطب نہیں ہونا — گو میں خود دادار بے ہمال پر دل سے یقین کرتا ہوں اور اُس کا کسیکو انباز اور شریک نہیں جانتا — سواے اُس کي عبادت کے کسي اَوْر کي پرستش کو حرام جانتا ہوں - کسي پیکر عنصري کو خواہ وہ انساني ہو یا غیر انساني ہو خدا یا مثل خدا نہیں جانتا اور اُس میں الوہیت کے حلول ہونے کو محال جانتا ہوں مگر اِس مضمون کے لکھنے میں کسي مخلوق اور کسي شی کو جسکو کوئي فرقہ مذہب اور گروہ ملت اپنا معبود جانتا ہی یا جانتا تھا اور اُس کے آگے سجدہ کرتا ہی یا کرتا تھا میں اُس کي تضحیک اور تحقیر کا کلمہ منہہ سے نہ نکالونگا بلکہ میں اُنکو بھي جھک کر سلام کرونگا اور سوء ادبي کبھي نکرونگا — گو میرا اعتقاد الہام رباني کي نسبت کچھہ ہي ہو مگر کسي کتاب کو جو کسي دین اور مذہب میں مقدس اور کلام رباني اورآسماني سمجھي جاتي ہی تذلیل نہیں کرونگا — میري زبان چلے جو ایک کلمہ بھي گستاخي کا اُس کي نسبت اشارتاً یا صراحتاً کہوں — غرض جہانتک ممکن ہی میں اِس مضمون کو اِس طرز و انداز سے ادا کرونگا کہ کوئي ہندو مسلمان گبر و عیسائي پڑھکر یا سنکر اُس سے رنجیدہ خاطر اور آزردہ دل نہوگا — مگر میں اِس سے لاچار ہوں کہ جن شخصوں کے سر پر تعصب مذہبي کا جن چڑھا ہوا ہی اور وہ اُس سے جنون زدہ ہوکر میرے اِس مضمون کو دیکھتے ہي جامہ سے باہر ہوں اور مجھے گالیان دینے اور پتھر مارنے لگیں — میں یہہ گالیاں بھي سنکر اور پتھر کھاکر اُنسے یہي عرض کرونگا کہ اے جناب یہي وہ جنون ہی کہ جس سے وہ قومیں کہ تہذیب مذہب اور اخلاق اور شایستگي انسان کي بنیان رکھنے میں ساعي ہیں ایسي باولي اور دیواني ہوگئیں کہ اُس اپني بنیاد پر مکان عالیشان تو کیا بناتیں بلکہ اُلٹے بنیاد کے بھي پتھر اُکھیڑ اُکھیڑ کر اپنے سرپر مارنے لگیں — جو پتھر مجھہ پر آپ مارتے ہیں وہ آپ ہي کے سرپر پڑتا ہی - بعد اِس التماس کے اب عرض مطلب یہہ ہی کہ اِس اُنیسویں صدي عیسوي میں شایستہ اور مہذب مُلکوں کے ارباب حقایق معرفت دستگاہ نے بڑي جاں کاہي اور زر فشاني سے زبانوں اور مذاہب بشري میں سعي کي ہی کہ زبان اور مذہب دونوں علوم حکمیہ کے دو فرع بنگئي ہیں اور اُنکي تحقیقات میں جمیع مراتب وہ ملحوظ رہتے ہیں جیسے کہ اور علوم حکمیہ میں - اُن میں اُنھي اصول کا برتاؤ ہوتا ہی جو

کسي علم حکمت میں ھوتا ھی — علوم حکمیه سے میري مراد انسان کے اُن علموں کے حصوں سے ھی که جن میں احقاق حق اور ابطال باطل ھوگیا ھی اور اُن پر یهه صادق آتا ھی که حق آیا اور باطل گیا - حق کا استحقاق دلائل کي استواري پر مبني ھی دعوی ثابت ھی حق ھي کا اُس میں مطالبه ھی - حقایق موجودات اور اعیان کائنات جیسے که وہ نفس الامر میں ھیں اُن پر ایسے اُصول صحیحه اور حقیقیه و یقینیه کے موافق علم حاصل ھوگیا ھی که قوانین کلیه اور قواعد عامه دریافت ھوگئے ھیں اور وہ اِنتظام کے ساتهه ترتیب سے لکھے جاتے ھیں اور آپس میں وہ انضباط رکھتے ھیں اور ایک دوسرے کا استحفاظ کرتے ھیں - جب یهه سب باتیں حاصل ھوگئي ھیں تو اُنکا نام علوم رکھا ھی — پس مذھب میں بھي اِن تمام اُصول اور مراتب کو ادا کرکے اُس کے قوانین کلیه اور قواعد عامه بیان کرنا چاھتا ھوں — یعني جیسے که علم طبعیات میں بیان ھوتا ھی که دنیا کے پردہ پر پنھر کے نیچے گرنے اور اوپر چڑھنے کا ایک ھي قاعدہ ھی اسیطرح مذھب کے قواعد کلیه بیان کیئے جائیں جو سب جگهه ایک ھي ھیں - مثلاً یهه که جو باتیں که انگلستان میں کسي شخص کو عیسائي اور عرب میں مسلمان اور چین میں بدھ اور ھندوستان میں ھندو بناتے ھیں وہ ایک ھي ھیں — غرض جب میں یهه کہونگا که مذھب بھي منجمله اُن علوم حکمیه کے ھی جنکي تعریف میں اوپر بیان کي تو میرے دائیں بائیں دونوں طرف لوگ خفا ھوکر کھڑے ھونگے — ایک طرف سے یهه غل مچائینگے که مذھب ایسي مقدس اور متبرک شی ھی که اُسکو علوم حکمیه میں داخل کرنا پاک کو ناپاک سے آمیزش کرنا اور شکر میں زھر شیر و شکر کي طرح ملانا ھی — چه نسبت خاک را با عالم پاک — دوسري طرف سے یهه صدائیں اُٹھینگي که مذھب کا حال تو علم کیمیا و نجوم کا سا بودا ھی — اُسکو ایسا پایہ کہاں سے ملگیا که وہ علوم حکمیه کا ھم پایه ھوکر اُن میں شمار ھونیکے قابل ھوگیا — علم کیمیا سے مراد اُنکي اُس علم سے ھوگي جسکے موافق مہوسوں نے سونا بنانے کي ھوس کي ھی اور خاک چھاني ھی مگر ابتک کچهه خاک ھاتهه نہیں آیا — بہت سے بیہودہ افترا اور فریب و دھوکه بازیوں سے اُسي کو بھردیا ھی — اور اُسکا نام علم رکھدیا ھی — کبھي وہ سکندر کے صندوق میں بند ھوتا ھی — کبھي پاؤ رتي باون توله بنتا ھی — اور علم نجوم سے مراد اُنکے اُس علم سے ھی جس میں اجرام فلکي کے سعد و نحس احکام انسان کے افعال پر حکمراني کرتے ھیں — آجکل کي تحقیقات علوم حکمیه نے اِن دونوں علموں کے فریبوں کي پردہ دري کي ھی اور مغالطوں کے سروں پر سے چادر اُتار لي ھی — ساري قلعي اُنکي کھولدي ھی — اور اُنکا اصل حال ایسا ظاھر کردیا ھی که اُن کا نام فہرست علوم سے کٹ گیا ھی — اب ھم اِن دونوں طرفوں کے کلام سنکر کچهه باتوں میں اس طرف اور کچهه باتوں میں اُس طرف ساتھي ھونگے — ایک جانب والوں سے ھم

کہینگے کہ ہم بھی مذہب کو خواہ کیسا ہی وہ کامل ہو یا ناقص ہو مقدس اور متبرک سمجھتے ہیں اور دل سے اُسکی سچی تعظیم اور بے ریا ادب کرتے ہیں — مگر سچی تعظیم اور بے ریا ادب کے یہہ معنی نہیں ہیں کہ جس شی کو ہم معظم و مکرم سمجھیں تو اُسکے روبرو سلطان صدق کے بندہ ہوکر آزادانہ اور راست بازی سے گفتگو نہ کریں — سچا ادب اور بے ریا تعظیم اسی کو کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شی ہمکو کیسی ہی عزیز ہو اور اُسکو کیسا ہی بزرگ اور مقدس سمجھتے ہوں مگر اُسکا ذکر بے خوف و خطر اور بغیر کسی اُمید صلہ کے نرم کلامی اور شیریں گفتاری سے کریں — مگر سلطان صدق کی غلامی میں نمکحرامی نہ کریں — اب دوسری طرف والوں سے یہہ التماس کرینگے کہ ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں بھی اور زمانہ حال میں بھی سب ملکوں میں مذہب خواہ اعلی درجہ کا ہو یا ادنی درجہ کا ایسے عذابوں میں پھنس جاتا ہی کہ وہ علم نجوم اور علم کیمیا سے بھی بدتر ہوجاتا ہی — خیال پرستی — توہمات باطلہ — سحر جادو — خوابوں کی تعبیر — فال گوئی — شگون — پیشین گوئیاں — عالم الغیبی — غرض ایسی ہی ہزاروں برائیاں اُس میں پھیل جاتی ہیں اور سب سے زیادہ برائی جس سے بدتر کوئی بدی دنیا میں نہیں ہی یعنی مکاری اور ریا کاری وہ مذہب سے زیادہ کسی اور دنیا کے کام میں نہیں ہی مذہبی لباس میں مکاری کی پردہ دری مشکل ہی — اس لیئے انسان اُسکا مذہبی اُمور میں زیادہ مرتکب ہوتا ہی — اگر ہم اپنی زندگی کے طریقہ عملی اختیار کرنے میں اِن دو متخالف فریقوں میں سے کسی کے طرفدار نہوں تو ہماری بڑی غلطی ہی — ہمارا یہہ فرض ہونا چاہیئے کہ جہاں مذہب کی شان میں وہ سوء ادبی ہورہی ہو کہ جسکا وہ مستحق نہیں ہی تو ہمکو وہاں سے بچنا چاہیئے اور اُسکو روکنا چاہیئے — اور جہاں مذہب کی اصل میں خیال پرستی اور توہمات باطلہ کی آبیاری سے نشو و نما اُسکا ہورہا ہو اور ریا کاری کے زہر سے چشمہ اخلاق پرشور ہورہا ہو تو وہاں سے اعوذ باللہ کہکر بچنا چاہیئے مگر جو علوم حکمیہ کے محقق ہیں وہ ان برائیوں کو اور غلطیوں کو بھی اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کہ حکیم حاذق مریضوں کے امراض کو دیکھتا ہی اور اُسکی علت کو تلاش کرتا ہی اور اُسکے اثروں کی تفتیش کے درپے ہوتا ہی اور حتی الوسع اُنکے لیئے دواؤں کی بھی تلاش کرتا ہی — مگر اُن دواؤں کے استعمال کی اجازت اطبا ہی کو دیتا ہی — یہہ نہیں کہ ہر کس و ناکس کو اجازت دے کہ تم دواؤں کا استعمال کرو اور نیم حکیم خطرہ جاں بن جاؤ — جو علم طبعیات کی تاریخ کا محقق ہی وہ علم کیمیا کی غلطیوں کو دیکھہ کر خفا اور غصہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اُنکو بہت غور سے دیکھتا ہی اور خوض اُس میں کرتا ہی کہ کیوں آدمی اِن مغالطوں میں پڑا — غرض وہ اِن اغلاط اور سقم سے ایک سچے علم کیمسٹری کا تخم نکال لیتا ہی — علم نجوم کے اغلاط کا مشاہدہ کرکے وہ اِجرام فلکی کا صحیح علم دریافت کرلیتا ہی —

خلاصه یہه ھی که وہ اُنکے اغلاط سے جتنا نفع اُٹھاتے ھیں اُتنا اُنکي صحت سے منفعت نہیں حاصل کرتے — علی‌هذالقیاس محقق مذھب یہه تحقیق کرنا چاھتا ھی که نفس مذھب کیا ھی — اُسکي بنیاد انسان کي روح میں کیونکر پڑي ھی — اُسکي تاریخ سے کون سے قوانین کلیه اور قواعد عامه اُسکے دریافت ھونے ھیں — اُسکے مقاصد کي تحقیق اور تعلیم کے ابوئے اغلاط مذھبي میں تفتیش کرني به نسبت اُس کے مسائل صحیحه کے تجسس کے زیادہ تر مؤید اور ممد ھیں — جب وہ دیکھتا ھی که ایک شخص قنات گھیر کر ھوبیٹھا یا جنگل میں گوشه نشین ھوگیا اور یہه سمجھنے لگا که میں تنہا اور مخزن ھوکر خدا کے ساتھه ھوگیا — یا ایک تسبیح کي کھٹ کھٹ سے اور کچھه الفاظ کے بڑبڑانے سے خدا پرست ھوگیا تو اُسکا دل بڑا خوش ھوتا ھی اور وہ اِن باتوں پر غور کرکے اپنے مقاصد پر دور دور پہونچتا ھی — کسیکا یہه کہنا که علوم حکمیه میں سے مذھب بھي ایک علم ھی — اور ساري دنیا کے مذھبوں کے آپس میں مقابله کرنے سے صحیح نتیجه یہه پیدا ھونا ھی که اگر ایک مذھب اپنا منہه اَوْر مذھبوں کو دکھانا چاھے تو ھرگز یہه بات زبان سے نه نکالے که مجھکو کوئي خاص فضل الہي کا منصب حاصل ھی یا کوئي اور قاعدہ اوروں کي نسبت زیادہ مجھے مل گیا ھی — تو بہت آدمیوں کو ناگوار گذریگا — کیونکه ھر شخص اپنے ھي مذھب کو مذھب اور اپنے ھي خدا کو خدا جانتا ھی خواہ ھمه پرست ھي وہ کیوں نہو - یہه اصول اُن کے خیال میں ھي نہیں جیسے که علم زبان کا یہه مسئله ھی که جو چیز اُس میں نئي بات ھی وہ پراني ھی اور جو پراني بات ھی وہ نئي ھی — ایسے ھي مذھب میں جو پراني بات ھی وہ نئي ھی اور جو نئي بات ھی وہ پراني ھی — ابتداے دنیا سے کوئي نیا مذھب نہیں بنا — یہه چند اصول ھیں که مذھب اُنہي کي ترکیب اور ترتیب سے مرتب ھوتا ھی — خداکا خیال — انسان کا اپنے تئیں ضعیف جاننا — خدا کي حکمت اور حکومت پر توکل کرنا — خیر و شر نیک و بد میں تمیز کرني - عاقبت کي اُمیدیں - یہي سارے مذھبوں کے اصل اصول ھیں — گو وہ بعض اوقات چُھپ جاتے ھیں مگر پھر وہ ظاھر ھوتے ھیں — کبھي شکسته ھوکر فرد ھوجاتے ھیں مگر پھر جڑ کر ثابت ھوجاتے ھیں غرض ان ھي اصولوں کي اُلٹ پھیر میں رھتا ھی اُس سے باھر نہیں نکلتا — گو بعض اوقات اُن پر ایسي تہیں چڑھجاتي ھیں که اُنکے دور کرنے میں بڑي کاھش اُٹھاني اور کاوش کرني پڑتي ھی *

جیسے اور مذھبي بلاؤں میں مبتلا ھیں ویسے ھي ھم بھي تھے اور شاید اب بھي ھوں - مگر ھمسے جہانتک ھوسکا اُس بلا سے نکلنے میں سعي کي - بغیر اس کوشش کے ھمارا سارا حساب صدق کے حواله ھي نہیں ھوسکتا تھا — اور تحقیقات صداقت جو ھمکو صدق سے زیادہ عزیز ھی ھوھي نہیں سکتي تھي — ھمکو اس لیئے اپنے اظہار کا گو وہ لوگوں کو کیسا

ہی ناگوار ہو افسوس نہیں ہی — ہم یہہ نہیں کہتے ہیں کہ مذہب کو علوم حکمیہ میں داخل کرنے سے کچھہ نقصان نہیں ہی — نہیں بہت سے نقصان اُن چیزوں کے ہیں جو ہمکو نہایت عزیز ہیں — مگر اِن نقصانوں میں کوئي ایسي چیز نہیں ہی کہ وہ اصلي سچے تہہت مذہب میں نقصان پہنچاوے — اگر اُس کے سود و زیاں اور نفع و نقصان کو میزان عدالت کے دونوں پلڑوں میں تولیں تو نفعوں کا پلڑا بڑا بھاري نکلیگا *

جب ہم مذہب کو علوم حکمیہ میں سے ایک علم ٹھہرائیں تو اُسکے واسطے تین باتیں ہوني ضرور ہیں — اول یہہ کہ ساري دنیا کے مذاہب کي معلومات ہو — دوم پھر اُنکي تقسیم ہو — سوم سارے مذہبوں کا آپس میں مقابلہ کرکے نتیجہ نکالا جاوے — کوئي علم حکمت ایسا نہیں کہ جس میں یہہ تینوں باتیں نہوں — ہمارے زمانہ میں سارے علوم کي تحقیقات کا مدار استقراء پر ہی جسقدر ہمکو جزئیات پر علم زیادہ ہوتا جائیگا اُسي استقراء کے ذریعہ سے کلیات پر علم ہوگا — اسي کا نام علم ہی — پس جتنے مذہبوں کا علم ہمکو حاصل ہوگا اور اُن میں آپس میں مقابلہ کرکے ایک کو دوسرے کے ساتھہ نسبتیں دیکھي جائینگي اُتنا ہي علم مذہب کا دائرہ فراخ ہوگا — اور جو ہماري غلطیاں ہیں اُنکي اصلاح ہوگي — اب علم زبان میں محققین کا یہہ مقولہ ہی کہ جو شخص ایک زبان جانتا ہی وہ کسي زبان کو نہیں جانتا — اسي طرح جو شخص ایک مذہب کو جانتا ہی وہ کسي مذہب کو نہیں جانتا — یہہ تمکو انوکھے مسئلے معلوم ہونگے اور تمکو بڑا تعجب ہوگا اور تم یہہ کہوگے کہ کیا قاآني ایران کا ملک‌الشعرا زبان فارسي نہیں جانتا تھا - تو میں اُس کا یہہ جواب دونگا گو وہ اپني زبان مادري میں عمدہ شعر کہتا تھا مگر وہ اُس زبان کو نہیں جانتا تھا — اگر اُس کے اشعار میں سے کسي ایک شعر میں یہہ پوچھا جاتا کہ کتنے لفظ جو تمنے خود لکھے ہیں سنسکرت کے اصل میں ہیں تو وہ ایک لفظ کو بھي نہ بتا سکتا — اسي طرح ہزاروں کیا لاکھوں آدمي ایسے ہیں کہ وہ اپنے ایمان کو یہہ کہتے ہیں کہ ہم اُس سے پہاڑ کو سرکا سکتے ہیں مگر اُن سے پوچھیئے کہ مذہب کیا چیز ہی تو وہ چُپکے ہو رہینگے یا ظاہري کاموں اور علامتوں کا بیان زیادہ بہ نسبت باطني خیالات کے کرینگے اور اُس قوت روحاني کا ذکر بھي نہیں کرینگے جس سے کہ مذہب یا ایمان پیدا ہوا ہی *

مذہب دو معنوں میں مستعمل ہی جنکا مفہوم جدا جدا ہی — جب یہودیوں یا عیسائیوں یا ہندؤں یا مسلمانوں کے مذہب کا ذکر کرتے ہیں تو ایک معني مذہب کے یہہ ہوتے ہیں کہ مسائل مذہبي کا ایک مجموعہ احادیث سے یا مذہبي احکام کي کتاب سماوي سے اُن پاس پہنچا ہی اور اُسکے موافق اُنکا ایمان اور دھرم ہی — ایسے معني مذہب کے تو ہم وہاں استعمال میں لائینگے جہاں کوئي شخص مذہب بدل ڈالے مثلاً برہمن عیسائي ہوجاوے تو اُس کے معني یہہ ہیں کہ برہمن نے اپنے مجموعہ مسائل کتب سماوي کو ترک کرکے

عیسائیوں کے مجموعہ مسایل کتب الهي کو اختیار کیا ہی — یهہ تبدل مذهب بعینه ایسا هی جیسے کوئي هندوستاني اپني هندوستاني زبان کو چهوڑ کر انگریزي زبان سیکهنا اختیار کرلے — اب دوسرے معنی مذهب کے یهہ ایک اؤر باریک اور غور طلب هیں که جیسے قوت ناطقہ انسان میں کسي زبان کے بولنے کي قدرت پیدا کرتي هی خواه وه کوئي زبان هو اُس کو کچهه تعلق زبان کے تاریخي حالات سے نہیں هوتا هی — اسي طرح انسان میں ایک قوت ایمان مذهبي کي هی که جو مذهب کے اختیار کرنے کي قدرت انسان میں پیدا کرتي هی خواه وه مذهب کچهه هي هو اُسکو کچهه تعلق مذهب کے تاریخي واقعات سے نہیں هوتا — یهہ معني جب هم استعمال کرینگے که انسان کي تمیز حیوان سے مذهب کے سبب سے کرینگے — یہاں مذهب سے مراد کسي هندو مسلمان کے خاص مذهب سے نہیں بلکه اُس سے مراد هماري اُس قوت نفساني سے هوتي هی جسکو کچهه تعلق قواے حسي اور ذهني سے نہیں هی بلکه وه ان دونوں قوتوں کے علاوه ایک تیسري قوت هی جسکے بغیر انسان میں مذهب کا هونا هي ناممکن هی خواه وه مذهب کیساهي هو همه پرستي هي کیوں نهو — اگر هم غور اور خوض سے سنیں تو اُس قوت کے سبب سے تمام مذهبوں میں ایک روحاني غل شور سنائي دیگا — یهہ قوت اُن چیزوں کے تصور اور تعقل کے لیئے جهگڑ رهي هی جو تصور اور عقل میں نہیں آتیں — اُن باتوں کے کہنے کا قصد کررهي هی جو کہي نہیں جاتیں — وه ایک غیر متناهي خدا کو اپنے اندر لانا چاهتي هی — اُس کي محبت میں شور و فغاں کررهي هی — یونانیوں نے انسان کا نام اِس خاص قوت کے سبب سے ایسا هي رکها تها جسکا لفظي ترجمه یهہ تها که انسان ایسا حیوان هی جو اوپر دیکهتا هی — حقیقت میں انسان هي اپنے چهره کو آسمان کي طرف پهیر کر دیکهہ سکتا هی اور اُس طرف سے علم حاصل کرسکتا هی جو حواس اور عقل سے نہیں حاصل هوسکتا — پس علم مذهب بسبب اِن دو معني کے دو فرع میں تقسیم هوگیا — ایک فرع میں اُسکے تاریخي حالات هوتے هیں که وه کیونکر پیدا هوا — کیونکر اُسکي ترقي تنزل هوا اُسکے حالات بمقابله اور مذاهب کے کیا هیں — ان مذهبوں کے آپس میں مقابله کرنے کا نام هم علم الهي بالمقابله رکهتے هیں — دوسري فرع میں وه حالتیں بیان هوتي هیں جنکے اندر مذهب کا حالت اعلی اور ادنی میں هونا ممکن هو — اس فرع کا نام علم الهي نظري رکهتے هیں — محققین مذهب نے علم الهي نظري میں بہت کچهه تحقیقات کي اور ظاهري اور باطني حالتیں جنمیں ایمان مذهبي کا هونا ممکن هی بہت توضیح اور تشریح کے ساتهه لکهیں — مگر علم الهي بالمقابله یعني مذهبوں کو آپس میں مقابله کرکے کچهه نہیں لکها — وه اپنے مذهب کو ایسا مقدس اور متبرک شمار کرتے تهے که اُس کے سامنے دوسرے مذهب کي کچهه حقیقت هي نہیں گنتے تهے که اُس سے مقابله کرتے — مثلاً بسم الله اور اعوذ بالله کي

تفسیر میں سیکڑوں صفحے مسلمان مفسروں نے سیاہ کیئے مگر یہہ لکھتے ہوئے اُنکو شرم آئي کہ زردشتون کي ایک الہامي کتاب هی جسکے اول بهي بسم‌الله موجود هی جسکا ترجمہ بنام ایزد بخشایندہ و بخشایش گر مہربان دادگر هی — اور اعوذ بالله من الشیطان الرجیم کي جگهہ یہہ لکها هی کہ پناهیم بیزدان ارمنش و خوی بد وزشت گمراہ کنندہ براہ ناخوب برندہ رنج دهندہ آزار رسانندہ — شیطان‌الرّجیم کے معني ایک محقق اسلام نے اس زمانہ میں خوی بد وغیرہ بتلاتے هیں *

اِن محققین مذهب کا حال ایسا تها کہ جیسا بخیل دولت مند کا هوتا هی کہ وہ اپنے موتیوں اور جواهروں کي قیمت گهٹني اسي میں سمجهتا هی کہ ویسے هي موتي اور جواهر کسي دوسرے کے پاس هوں -- اسي طرح وہ اپنے مذهب کي راستي کي قدر گهٹني اسي میں جانتے تهے نہ کسي اَوْر مذهب میں بهي راستي هو — اُنکے ذهن میں یہہ بات هي نہ تهي کہ جو سچّي باتیں حضرت عیسیٰ اور موسیٰ کو نہیں سوجهیں اور بُدہ یا زردشت کو سوجهیں تو اُنکا ماننا بهي هم پر فرض هی — اُنکے دل میں یہہ خیال هي نہیں پیدا هوا کہ جسقدر کتب الہي هیں اُن سب کو ایک جلد میں باندہ کر پڑهنا چاهیئے اور جو اُنکے آپس میں مقابلہ کرنے سے نتیجہ پیدا هو وہ اختیار کرنا چاهیئے — اُنکا حال مذهب میں بهي ایسا هي تها جیسا زبان میں کہ وہ اپني زبان کے سوا سارے انسانوں کي زبان کو پرندوں کي کائیں کائیں اور ترٹر سمجهتے تهے — یہہ باتیں تو تهیں مگر ایک قوي سبب اُنکے اس طرف متوجہ نہونے کا یہہ تها کہ اسباب تحقیقات موجود نہ تهے — تاریخ کو پڑهیئے تو سنہ ۱۵۴۲ ع اور سنہ ۱۶۰۵ ع کے درمیان جسقدر مذهبوں کے آپس میں مقابلہ کرنیکا اور تحقیقات مذهبي کا شوق شہنشاہ اکبر شاہ کو هوا ایسا کسي اور شخص کو نہیں هوا - اُسنے کسقدر صرف زر کیا - کہاں کہاں سے مجتهدین مذهب بُلائے آرد شیر زردشتي کو کرمستان سے بلایا — کیا کچهہ روپیہ کتب مذهبي کے ترجموں میں صرف کیا — مگر اُسکے سارے کتب خانہ کي فہرست دیکهیئے تو یہہ معلوم هوتا هی کہ مذهبي تحقیقات کا اسباب جو تین سو برس پہلے ایک شہنشاہ هند کو میسر هونا مشکل تها وہ اب ایک غریب آدمي کو بہم پہنچا لینا آسان هی — اس شہنشاہ عالي گوهر نے برهمنوں کو دهمکایا -- روپیہ کا لالچ دیا — مگر پهر بهي اُسکو سالم وید نہ هاتهہ لگے — جو کچهہ اُنکا حصہ هاتهہ لگا وہ اتهرو وید کے اپنشهد تهے — جو وید کے شاعرانہ مذهب سے ایساهي تعلق رکهتے هیں جیسے کہ عهد عتیق سے تالمود اور قرآن شریف سے صوفیوں کا مذهب - اب سارا وید معہ شروح کے انگریزي زبان میں موجود هی - ارد شیر سے جو زردشت کي کتابیں اکبر کو هاتهہ نہ آئیں اُنکے ترجمے اب آساني سے مل سکتے هیں — علاوہ ازیں مذهبي باتوں میں ایسي آزادي پہلے محققین کو کہاں حاصل تهي جو اب حاصل هی — اب وہ بے تکلف کوئي کتاب جو‌اہ مذهبي هو

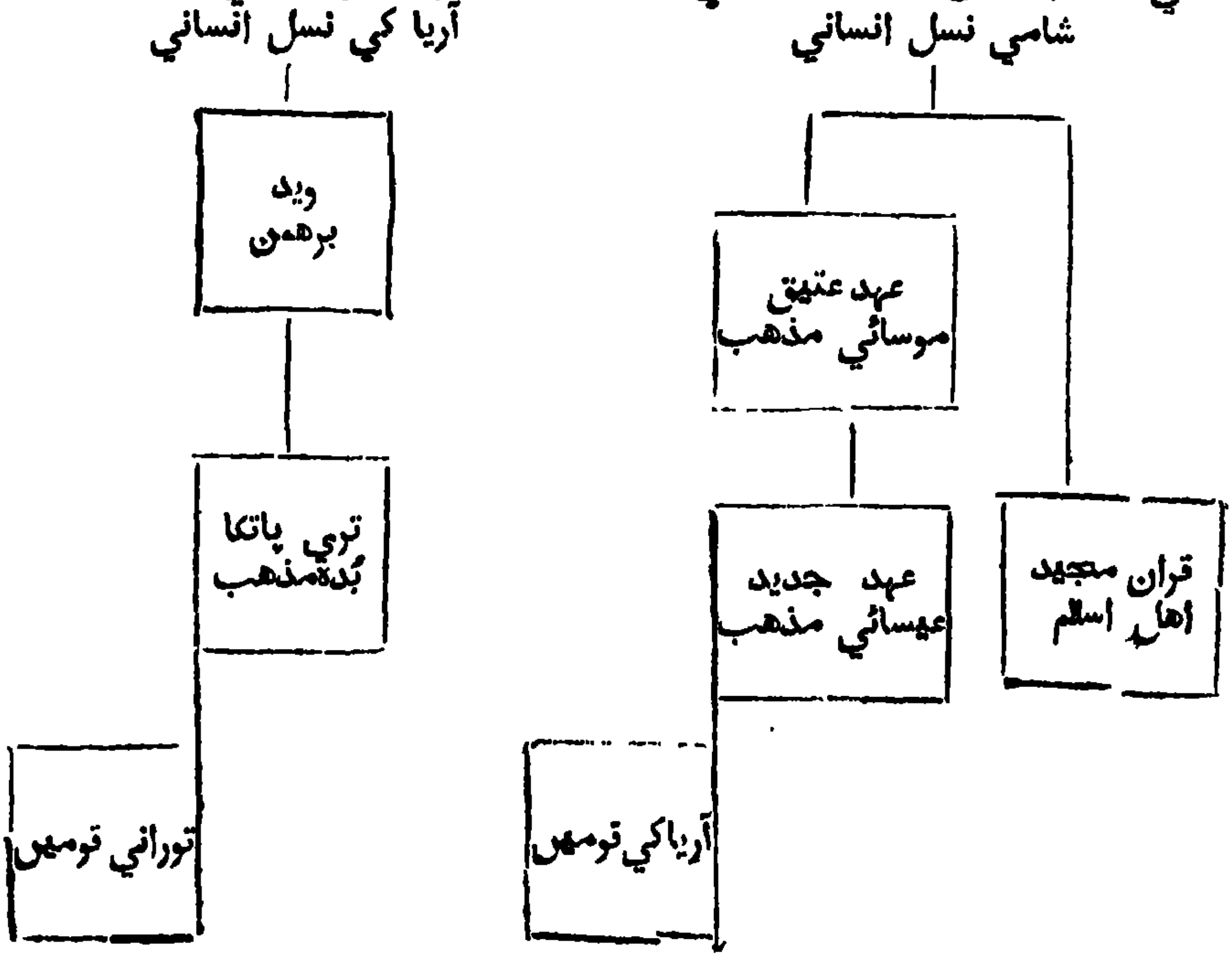
یا غیر مذہبی ہو جب اُنکے ہاتھہ میں آتی ہی تو پہلے وہ اِن باتوں کی تحقیقات کے درپے ہوتے ہیں کہ وہ کسلیے تصنیف کی ہی اور کہاں لکھی گئی ہی — مصنف نے جو واقعات لکھے ہیں وہ اُس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے ہوئے لکھے ہیں یا اپنے کانوں سے سنکر اور یہہ سنانے والے خود واقعات کے شاہد تھے یا وہ بھی سننے والے تھے --- اور اُنکے کلام کے مستند ہونے کی شہادت کیا ہی وہ متعصب اور کسی کے طرفدار تو نتھے — اُنکی تصنیف میں خود اُنکی اغراض نفسانی تو شامل نہ تھیں — یہہ کتاب ساری ایک دفعہ لکھی گئی ہی یا اُس میں کچھہ پیچھے الحاق ہوا ہی - اگر اُس میں یہہ اختلاط ہوا ہی تو وہ اب کیونکر جدا ہوسکتا ہی خلاصہ یہہ ہی کہ دنیا کے مذہبوں کی کتابیں جس آسانی سے اِس زمانہ میں جمع ہوسکتی ہیں وہ پہلے زمانہ میں نہیں ہوسکتی تھیں اور جس آزادی اور راستی سے اب محققین اُنکی تحقیق کرسکتے ہیں وہ پہلے نہیں کرسکتے تھے — آج کل کے زمانہ میں ایسے محققین موجود ہیں کہ انہوں نے بہت سی مذہبی کتابوں کو اُنکی اصلی زبان میں پڑھا ہی اور یہہ تحقیق کردیا کہ ہرایک مذہب میں قدیمی مسائل کونسے ہیں اور اُنکی نسبت جدید کونسے — جو بانیان مذہب گذرے ہیں اُنکے اور جو اُنکے بعد تابعین ہوئے اُنکے کیا مسائل تھے اور پھر اُن میں زمانہ حال میں کیا کیا خرابیاں پھیلیں — ان پچھلے زمانہ کی خرابیوں یا اصلاحوں کو بتلادیا کہ وہ اپنا رنگ کچھہ اَوْر ہی رکھتے ہیں فی‌التحقیقت مذہبوں کا مقابلہ آپس میں کبھی نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہہ نہ معلوم ہو کہ اصل مذہب کیا تھا اور پھر اُسنے کیا کیا صورتیں بدلیں اور کیونکر بدلیں — مثلاً بہت سے مسلمان بانی اسلام کے معجزات بیان کرتے ہیں مگر قرآن شریف کے پڑھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہی کہ بانی اسلام کو معجزات سے نفرت تھی اُسنے صاف صاف کہدیا کہ میں تم میں سے ایک خدا کا بندہ ہوں — میرے ہاتھہ کے معجزات سے کیا خدا کی قدرت دیکھنی چاہتے ہو — اللہ جل شانہ کی شان و قدرت و عظمت آفتاب کے طلوع و غروب ہونے سے زمین کی قوت نمو سے کہ وہ کیونکر درختوں کو بڑھاتی ہی - روحیں جو دنیا میں پیدا ہوتی ہیں اور جنکو کوئی نہیں بتا سکتا کہ کہاں سے آتی ہیں دیکھو اور شان الٰہی اور قدرت ایزدی کے قایل ہو اُس سے محبت کرو (تہذیب‌الاخلاق کی اِسی جلد میں جو نیچر کا مضمون صفحہ ایک سے پانچ تک چھپا ہی پڑھنا چاہئے) — بُدہ کے معجزات کی داستانیں دیکھو تو تمکو تعجب ہوگا کہ یہہ طول طویل معجزات کا بیان کسی بانی مذہب کا نہیں لکھا گیا — حالانکہ بُدہ نے خود اپنے چیلوں کو نصیحت کی تھی کہ خواہ آدمی تم سے کیسے ہی معجزات دکھانے کے واسطے بضد ہوں مگر تم اُنکو مت دکھاؤ — بڑا معجزہ انسان کا یہی ہی کہ اپنے بھلے کاموں کو چھپائے اور بُرے کاموں کا علی‌الاعلان ساری دنیا کے سامنے اقرار کرے ٭

ہندوؤں کے ہاں ذات کی پابندی کی بنیاد پہاڑ پر قایم ہی جو کسی طرح اپنی جگہہ سے ہل نہیں سکتی — مگر وہ پیچیدہ تقسیم ذاتوں کی جو منو میں بیان ہوئی ہی کہیں وید میں مذکور نہیں – مرشدوں – سپاہیوں – شہریوں – غلاموں کو وید میں بیان کیا ہی – کہ وہ سب ایک ہی طرح برھمن سے جو عبارت چشمہ ہستی کائنات سے ہی پیدا ہوئے ہیں – اگر تمام تحقیقات کو ان محققین کی پڑھیئے تو اُنہوں نے جس طرح سے اصلی مذہبی کتابوں کو پڑھکر مغز مذہب جدا اور پھوک اُس کا جدا بتلادیا ہی تو ایک اعجاز معلوم ہوتا ہی — ہم آگے اُس کو بالتفصیل بیان کرینگے — یہہ اُنکی تحقیقات کا نتیجہ ہی کہ پہلے جو عیسائی محققین کو یہہ خیال تھا کہ جہاں کہیں مذہب میں دنیا میں کچھہ روشنی صداقت اور راست بازی کی پائی جاتی ہی وہ ہماری اور یہودیوں ہی کی الہامی کتابوں کا پرتو تھا بالکل غلط ثابت ہوگیا بلکہ قرین قیاس زیادہ یہہ معلوم ہوتا ہی کہ اور مذہبوں سے روشنی اُس میں آئی ہی ؀

سواے اُس کے جب اِن محققین مذہب نے اصل زبانوں میں اِن الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اُنکی عبارات کے معنی موافق اُس زبان کے لگائے تو مطلب ہی کچھہ اَور اُس کا معلوم ہوا — مثلاً توریت میں لکھا ہی کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی اُسکو یہودی اور عیسائی اور مسلمان ( سواے اِس زمانہ کے بعض محققین اسلام کے ) یہہ یقین کرتے ہیں کہ حقیقت میں حضرت آدم کی پسلی سے حضرت حوا پیدا ہوئی تھیں — لیکن عبرانی و شامی زبانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہی کہ جب کسی شخص کو دوسرے آدمی کو یہہ کہنا منظور ہوتا تھا کہ تو مجھہنا ہی تو وہ کہا کرتا تھا کہ تو میری ہڈی ہی – گوشت ہی — آنکھہ ہی – عربی زبان میں لحمک لحمی کی حدیث مشہور ہی – پس اِس آیت کے یہہ معنی ہیں کہ حضرت آدم نے حوا سے کہا کہ تو ایسی ہی جیسے کہ میں یا تو مجھے حد سے زیادہ عزیز ہی – ادھر اِن کتابوں کی یہہ تحقیقات ہوئی اُدھر واعظان دین ساری دنیا میں وحشی قوموں میں مذہب پھیلانے گئے اور اُن کے تمام خیالات مذہبی دریافت کیئے — تو آخر کو یہہ نتیجہ نکالا گیا کہ جیسے ایک پرانا بیش قیمت کندن کا تمغا خاک میں دبجاے – مگر جب اُس پر سے یہہ خاک ہٹالی جاوے تو وہ پھر اپنی چمک دمک دکھانے لگتا ہی — اسی طرح قدیمی مذہب کا حال ہی کہ اگر اُس پر سے زمانہ کے رنگوں کو دھو ڈالیئے تو وہ پاک صاف ہوکر شفاف ہوجاتا ہی اور اُس میں تصویر خداے پاک کی جو سارے انسانوں کا رب اور اب ہی صاف دکھائی دیتی ہی اور اُس کے نقشوں کو پاک دل سے پڑھیئے تو نہ وہ عبرانی زبان میں ہی نہ عربی زبان میں نہ سنسکرت کی بولی میں ہی نہ ژند کی — بلکہ وہ دنیا کی ساری قوموں کی زبان میں ہی — ایزد پاک کا الہام وہیں ہوا ہی جہاں اُس کے الہام ہونے کی جگہہ تھی یعنی قلب انسانی میں –

اُس کا الہام کسي خاص زبان میں نہ کسي خاص مکان میں جوڈیا اور مکہ میں ہوا ھی
پس جب یہہ سامان معلومات مذھبي کا جو اکبر شہنشاہ کے عہد میں محال تھا یوں بہم پہونیچ گیا تو علوم حکمیہ میں مذھب کے داخل ہونے کے واسطے ایک مرحلہ طی ہوگیا — اب دوسرا مرحلہ یہہ ھی کہ اُسکي تقسیم کیجاوے — مشرق میں تو مذھب کي دو نوعیں ھیں — ایک نوع اُن مذھبوں کي ھی جنکي بنیاد کتب سماوي پر ھی اور وہ اھل کتاب کہلاتے ھیں — دوسري نوع اُن مذھبوں کي ھی جن کے پاس کوئي الہامي کتاب نہیں — ھم نوع اول کي تعظیم و تکریم کرتے ھیں گو اُن کي کتابوں میں کیسے ھي جھوٹے مسائل ھوں — اور اُنکو وحشي جنگلي جاھل بے علم قوموں کے مذھبوں سے جو اھل کتاب نہیں ھیں زیادہ بزرگ جانتے ھیں — محققین مذاھب کو اھل کتاب کي کتابیں تحقیقات مذھبي کے اندر زیادہ استعانت کرتي ھیں — مگر یہہ یاد رھے کہ مذھب جدید کے باني کے اصل مسائل اُن کتابوں میں اس طرح پرتو افگن ھیں جس طرح کہ اُس تصویر کا عکس جو بہت سے وسایط میں گذري ھو اور ھر دفعہ انعکاس سے کچھہ سے کچھہ ھوتي گئي ھو سواے اسکے اگر اھل کتاب کو اُن قوموں کے مقابلہ میں دیکھیئے جو اھل کتاب نہیں ھیں یا نہ تھیں تو اُن دونوں میں وہ نسبت بھي نہیں جو ایک وسیع ملک میں غریب رعایا سے اراکین سلطنت کو ھوتي ھی *

انسان کي دو نسلیں اھل کتاب ھونے کا دعوی رکھتي ھیں — ایک آرین — دوسري شامي — آریا میں ھندو — پارسي ھیں — شامیوں میں عبراني اور عرب ھیں —



آریا والوں میں هندو اور شامیوں میں عبرانی والے ایک ایک الهامی کتاب مذهبی رکھتے هیں — هندوؤں میں دو مذهب ایک برهمنوں کا دوسرا بُدھ کا پیدا هوا — عبرانیوں میں دو مذهب حضرت موسیٰ کا اور حضرت عیسیٰ کا — پس ان کے سوا کوئی اور کتاب الهامی نہیں کہ جسکی اصل بنیاد انہی کتابوں پر مبنی نہو - زردشتیوں کی کتب الهامی کا سرچشمہ هندوؤں کے وید کے محیط سے پر هوا هی — مسلمانوں کا مذهب حضرت ابراهیم خلیل الله سے جو وحده لاشریک له کی عبادت کرنے والے تھے پیدا هوا هی — اگر اوپر کے نقشے کو دیکھو تو تمکو معلوم هوجاویگا که آریا اور شامیوں کے مذهب کے دریاؤں کے شعبے کس کس طرف بہے هیں اور انہوں نے کن کن مذهبوں کے چشموں کو هزاروں برس بھکر پر کیا هی اور کن کن قوموں کو اهل کتاب بنایا هی *

بُدھ مذهب برهمنوں کی اولاد هی مگر برهمنوں کا سخت دشمن هی — زردشتیوں کا مذهب وید کی سیدهی راه چھوڑ کر کچھه منحرف هوگیا هی اور وید کے بعض قدیمی دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا — پس ان آریا کے تین مذهبوں میں جو تعلق هی وهی شامیوں کے تین مذهبوں میں تعلق هی — صرف اتنا فرق هی که اهل اسلام کا مذهب به نسبت زردشتیوں کے حال کا هی *

مذهب کی ان دوشاخوں میں عجیب عجیب طرح کی مماثلت اور مشابهت هی — بُدھ کا مذهب برهمنوں کے مذهب سے پیدا هوا هی مگر جس سرزمین میں یهه شجر پیدا هوا برهمنوں کے مقابله اور مدافعت سے اسکی جڑ سست هوگئی — جهاں اسکا نشو و نما هوتا وهاں مُرجها گیا اور وهاں سے اُٹھه کر اور سرزمینوں میں لگایا گیا جهاں اسکی جڑ نهایت استوار هوگئی اور وهاں خوب پھولا پھلا — برگ و بار لایا — تورانی قومیں ممالک متوسطه ایشیا میں اس سے متمتع اور برخوردار هوگئیں — غرض کیا وه ایرینی تها یا تورانی هو گیا — اب یہی کیفیت شامی مذهب کی هوئی که عیسائی مذهب تو شامی مذهب سے پیدا هوا اور اسکو یهودیوں نے اسی طرح نه مانا جس طرح که برهمنوں نے بُدھ کو نه مانا — عیسائی مذهب یهودیوں کے مذهب کی تکمیل اور ترمیم کے لیئے پیدا هوا تها مگر وه اپنے اس مقصد میں ناکامیاب رها — تمام آریا میں پھیل گیا — غرض وه شامی الاصل تها مگر اب ایرینی مذهب هوگیا *

سوائے ان آریا اور شامی کے اهل چین بھی اهل کتاب هونے کا دعوی کرتے هیں اور دو کتابیں اپنی الهامی بتاتے هیں — ایک کنفیوشس کی دوسری لیوٹ کی — غرض کتب مقدسه جن کو انکے معتقدین کلام الهی سمجھتے هیں ان آٹھه کتابوں میں ختم هوجاتی هیں وه سنسکرت — پالی — ژند — عبرانی — یونانی — عربی — چینی زبان میں لکھی هوئی هیں — ان سب کتابوں کا پڑه لینا ایک محقق مذهب کو کچھه دشوار نہیں —

یہہ الہامي کتابوں کا کتب خانہ تو آٹھہ پر ختم ہوجاتا ہی — مگر اُنکي تفاسیر اور اُنکے متعلق اسقدر کتابیں لکھي گئي ہیں کہ اُنکا کچھہ ٹھکانا نہیں — اہل اسلام کا مذہب گو ابتداء میں بہت کم کتابیں رکھتا تھا لیکن اب اُسکي مذہبي کتابیں کثیر التعداد ہیں — بُدھہ کي دو کتابیں کنجور - بیجور ہیں جنکي تین سو پچیس جلدیں تبت کے کتب خانہ میں موجود ہیں - ہر ایک جلد کا وزن ڈھائي سیر سے کم نہیں اُنکو لادیں تو کئي گدھوں پر لدیں - ساري دنیا کي مذہبي کتابوں میں جو اعلیٰ درجہ کي ہیں اُنکي تفصیل کہیں ہم لکھینگے — بالفرض اگر کوئي شخص اِن تمام کتب مقدسہ اور اُنکي تفاسیر اور اُنکے متعلقات کي کتابوں کو اپنے کتب خانہ میں جمع کرلے تو کیا اُسکو دنیا کے مذہبوں کا حال معلوم ہوجاویگا — ہرگز نہیں — ذرا ایشیا کے نقشہ پر نگاہ تو ڈالو — اور دنیا کي تاریخ کو ذرا غور کي نظر سے دیکھو تو تم کو یہہ معلوم ہوگا کہ اُن ہي اِنسانوں کا پلہ بھاري ہی جنکے پاس کوئي الہامي کتاب نہیں — یونانیوں — رومیوں — ٹیو ٹونک — سیلٹک سلیوونک قوموں کو خیال کرو — بھلا اُن قوموں کا اصلي مذہب ہم کیونکر دریافت کرسکتے ہیں کہ جنکے قدیمي عبادت خانوں کے مکان کا پتا بھي نہیں ملتا - فرسودگي دہر سے جنکے پتھر ایسے چورا چور ہوگئے کہ ہوا اُنکو معلوم نہیں کہاں اُڑاکر لیگئي — غرض سینکڑوں مذہب دنیا میں ایسے ہو گذرے ہیں کہ اُنکا اصل حال دریافت ہونا انسان کي قدرت سے باہر ہوگیا ہی — بابل والوں کا مذہب — فنشیا - کارتھیج — عرب کا مذہب پہلے اسلام سے — اِن میں سے کسي قوم کے پاس کوئي کتاب قانون مذہبي کي نہیں — اُنکا کچھہ حال کتابوں — ضرب المثلوں — اسم معرفوں — اُنکے گو سنوں سے معلوم ہوتا ہی - مگر اس طرح کي تحقیقات کرني نہایت مشکل ہی اور اُن میں مختلف محققین کا ایسا اختلاف راے ہوتا ہی کہ کسي پر یقین نہیں ہوتا — اب ذرا اس بات کو بہت غور سے سوچو کہ گو آریا — شامیوں کے مذہب کے دریا ہزاروں برس تک ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور جنوب و مشرق سے شمال و مغرب میں دریاے سندھ سے لیکر دریاے ٹیمز تک اور دریاے فرات سے جارڈن تک اور میڈیٹرینین میں بہے — مگر جتني زمین پر وہ بہے اگر ساري دنیا کے مقابل میں دیکھو تو وہ ایک نہایت تنگ کونا معلوم ہوتا ہی — جسقدر ہم بلند ہوتے جائینگے ہمارا منظر افقي چاروں طرف فراخ ہوتا جائیگا — آخر کو ایسي نردبان پر ہم چڑھ جائینگے کہ وہاں ہمارا منظر بے نہایت ہي ہوجائیگا جہاں انسان کے قدموں کے نشان ہمکو نظر آئینگے وہاں مذہب بھي اُنکے قدموں سے لگاہوا دکھائي دیگا — ذرا مصر ہي کو اس نظر سے دیکھو تو قدیمي دریاے نیل کے کناروں کے مینار - عبادت خانے - بھول بھلیوں کے کھنڈر — اُنکے حروف کندہ — عجیب عجیب دیوتاؤں اور دیبیوں کي تصویریں اور آؤر اسباب ایسے ہیں کہ جن سے یہہ معلوم ہوتا ہي کہ مصري بھي کبھي کتب

مقدسہ رکھتے تھے — مگر پھر بھي کیا اُن سے اصل مذہب کي کیفیت اُن کي معلوم هوتي هی *

اب برِّ اعظم افریقہ کو دیکھو کہ کیا کیا قومیں اُسکے اندر آباد تھیں اور وہ کیا کیا مذهبي خیالات رکھتي تھیں اب وہ سب دنیا کے پردہ پر سے غایب هیں — خدا تو جیسا کہ گورے رنگوں کا رب اور اب هی ویسا هي سیاہ رنگوں کا — معلوم نہیں کہ اُس واهب العطیات نے کیا کیا چیزیں اُنکو عطا کي هونگي — اب ذرا نگاہ اس برِّ اعظم سے اُٹھاکر اُس کے شرقي کنارہ پر میڈیگاسکر سے لیکر هیوائي تک پہنچائیئے تو وہ ایک مجمع الجزایر جسکو جزیرہ زار کہیئے تو بجا هی معلوم هوگا — گو یہاں کے باشندے شایستگي سے دور هیں مگر اُن کے مذهب میں بھي یہہ نشان پایا جاتا هی کہ وہ خدا کو سب جگہہ موجود جانتے هیں — اور اُسکو ایسا سمیع و بصیر سمجھتے هیں کہ اگر اُس سے دعا مانگیں تو وہ سنیگا — قرباني اُسکے نام پر چڑھائینگے تو وہ دیکھیگا — گناهوں کي سزا نیکیوں کي جزا دیگا — اب افریقہ کو چھوڑ کر امریکہ میں جائیئے تو وهاں مذهب کچھہ اور هي جلوہ دکھا رها هی — پھر وهاں سے ایشیا کي طرف پھر آئیئے تو گو اُس کي بہت سي وسعت کو اهل کتاب موسائي — عیسائي — محمدي — برهمن — بُدہ — زردشت — کنفیوشس — لیوتز سے گھیرے هوئے بھي هیں مگر اِس پر بھي بہت سے قطعات ایسے هیں کہ جہاں اِن مذهبوں کا پتہ نہیں *

جب هم اِن مذهبوں کي وسعت پر نظر ڈالتے هیں تو دل چھوٹ جاتا هی کہ مذهب کو کہاں سے شروع کیجیئے اور کہاں ختم — کیونکر اُسکو علوم حکمیہ میں داخل کیجیئے اور اس محیط اعظم میں سے گوهر مقصود کو پائیئے باوجود ان سب دشواریوں اور دقتوں کے مذهبوں کا اسقدر مصالحہ بہم پہنچ گیا هی کہ اُس پر بحث جب هوتي هی تو هم مذهب کو علوم حکمیہ میں داخل کرکے موافق اُصول علمیہ بیان کرسکتے هیں — اور اس میں وہ دوسرا مرحلہ تقسیم کا طی کرسکتے هیں جو علوم حکمیہ کا جزو اعظم هی اور جسکي نسبت یہہ ضرب المثل مشهور هی کہ تقسیم کر اور کامیاب هو — یہي ایک چھوٹي سي بات هی کہ اُسنے تمام علوم حکمیہ کي دشواریوں کو آسان کردیا هی — اُسکے توسل سے هم کو مذهب میں یہہ بیان کرنا آسان هوگا کہ هم یہہ بتلادیں کہ اِن مذهبوں میں کونسے مسایل مشترک هیں کن مسایل میں اختلاف هی اور یہہ اختلاف کیونکر پیدا هوئے هیں — اُنکي ترقي تنزل کس طور پر هوا هی — وہ اصل میں کیا هیں اور کیا اُنکے مقاصد اعظم هیں *

ایک تقسیم مذاهب تو پہلے سے یہہ موجود هی کہ هر ملک اور مذهب میں اُس کي تقسیم دو نوع میں کي هی — ایک نوع مذاهب صادقہ اور دوسري نوع مذاهب کاذبہ — ظاهر هی کہ علم حکمت میں تو ایسي تقسیم اختیار نہیں کرسکے — یہہ تقسیم تو ایسي هی جیسے کہ زبان کي پہلي تقسیم هوئي تھي کہ ایک اپني زبان دوسري غیروں کي زبان —

جیسے اھل عرب اپنی زبان کو عربی کہتے ھیں باقی زبانوں کو عجمی یعنی گونگوں کی — ایسے ھی اھل یونان اپنی زبان کو یونانی کہتے ھیں اور باقی زبانوں کو وحشیوں کی زبان — ھندو سنسکرت کے سوا سب زبانوں کو ملکشوں کی زبان کہتے تھے — بھلا یہہ بیہودہ تقسیم نہ اب زبان میں ھوسکتی ھی نہ مذھب میں *

ایک اور تقسیم الہامی اور نیچریہ مذھب کی جو ظاھر میں حکیمانہ معلوم ھوتی ھی مگر تحقیق کی نظر سے دیکھیئے تو یہہ معلوم ھوتا ھی کہ وہ تقسیم بھی بیہودہ ھی — اس وقت نیچریہ مذھب کا ذکر آیا ھی مجھے ضرور ھی کہ اُسکے معنی اول بیان کروں — نیچر ایک انگریزی لفظ لاطینی الاصل ھی اُسکے بہت سے معنی انگریزی زبان میں آئے ھیں اور اُسکے معنی ھمیشہ بدلتے جاتے ھیں — پھر اُسکے بہت سے مشتقات کثیر المعنی ھیں — ھمارے ملک میں جناب آنریبل سید احمد خاں صاحب سی ایس آئی کی بدولت ھندوستانیوں کی زبان پر نیچر کا لفظ جاری ھوا — مشکل ھی کہ کوئی ٹھیک ترجمہ اُسکا ایک لفظ میں ھوسکے — اصلی معنی اُسکے پیدایش ھی — لفظ کے معنی خواہ کیسے ھی بدل جائیں اور وہ علوم میں نقل ھوجائیں مگر اصلی معنی سے وہ کچھہ نہ کچھہ تعلق رکھتے ھیں — اس لیئے میں اُسکا ترجمہ اصل معنی کے مطابق فطرت کرتا ھوں جسکے معنی بھی آفرینش کے ھیں — اب اس لفظ فطرت ( نیچر ) سے کہیں تو مراد اُس قوت سے ھوگی جو عالم میں ساری مادی اشیا کو پیدا کرتی ھی اور اُس پر حکمرانی کرتی ھی گویا وہ ھمارے خیال کے موافق قضا و قدر کا کام کرتی ھی — کبھی اُسکے معنی اُس ترتیب اشیاء کے ھیں جس میں تغیر و تبدیل ممکن نہیں — کبھی اُس کے معنی عالم کے لیئے جائینگے — کبھی کسی شی کی اصلی طبیعت اور ذاتی خاصیت سے مراد ھوگی — قانون فطرت ( نیچرل لا ) سے مراد یہہ ھی کہ جب اسباب متشابہ میں اتفاق ھو تو اُنکے اثر اور نتایج ھمیشہ متشابہ اور متماثل پیدا ھوں — غرض ایسے قواعد کلیہ اور قوانین عامہ کا نام ھی جن میں زوال راہ نہیں پاسکتا — اب ھمارے اھل دیار کی سنیئے کہ جب سے اُنکے کان میں یہہ لفظ پہنچا ھی تو اُنہوں نے ھر لغو اور لچر کام کا نام نیچر رکھا ھی قانون فطرت ( نیچرل لا ) کے معنی کی تفصیل مولویانہ یہہ ھوتی ھی کہ سب حیوان بول و براز کھڑے ھوکر کرتے ھیں اس لیئے انسان کا بھی کھڑے ھوکر بول و براز کرنا قانون نیچر ھی — مگر یہہ بھی کسقدر سخت جہالت ھی کہ ھر بیہودہ کام کرنے کو قانون نیچر ٹھیرا یا ھی — جیسے نیچر ( قضا و قدر ) نے یہاں کے آدمیوں کو انسانیت کے درجہ سے گراکے شایستہ اور مہذب قوموں کی نظر میں ذلیل اور خوار اور نیم وحشی بنا رکھا ھی ایسا ھی یہاں کے آدمیوں نے نیچر کے معنی پلید کر رکھے ھیں — کوئی اُسکا نیک مفہوم اُنکے ذھن میں نہیں آسکتا — اپنی کوڑ مغزی کے سبب اُنہوں نے اُسکے معنی کو رایگاں

کردیا ہی — اب نیچریہ مذہب کی کیفیت سنیئے کہ پہلے انگریزی زبان میں اُسکا اطلاق مذہب کی اُن صورتوں پر ہوتا تھا کہ جو الہام ربانی پر مبنی نہوتی تھیں — مگر اس معنی میں مستعمل کرنا ایک فاش غلطی تھی — اس لیئے کہ اگر یہہ معنی ٹھہرائے جائیں تو بُدہ کا مذہب برہمنوں کے نزدیک نیچریہ ( فطرتی ) ہوگا اور برہمنوں کا مذہب مسلمانوں کے نزدیک — غرض مسلمانوں کے نزدیک سوائے یہودیوں اور عیسائیوں کے سارے مذہب نیچریہ ہونگے — یہاں حقیقت میں نیچریہ کے معنی کذب اور جھوٹ کے ہوجاوینگے — نیچریہ مذہب سے مراد مذاہب کاذبہ سے ہوجائیگی — مگر نیچریہ مذہب کے مستند ہونے پر سوائے کانشنس کی شہادت کے یعنی قلب کی اُس قوت کی شہادت کے جو افعال یا خواہشوں کے بد و نیک ہونے کا فیصلہ کرتی ہی اور کوئی شہادت الہامی ہونے کی نہیں ہوتی — مگر اب حکیمانہ تحقیقات میں انگریزی زبان میں مذہب نیچریہ کے اور ہی معنی لیئے جاتے ہیں — جب محققان مذہب نے تاریخی مذہبوں کی ( یعنی وہ مذہب جو تاریخ رکھتے ہیں اور اُنکا حال تاریخ میں لکھا ہوا ہی ) تشریح اور تحلیل کی اور ہر مذہب کے تشخصات اور خصوصیات کو دور کیا تو باقی چند اُصول رہے جو سب مذہبوں میں ایک ہی تھے اور سب میں مشترک اور متحد تھے — اُن اُصول مشترک اور متحد کا نام مذہب نیچریہ ہی — اِن ہی اُصول کو نیچریہ مذہب کے اُصول کہتے ہیں — مثلاً عہد عتیق سے وہ باتیں جو خلاف فطرت ہیں مثلاً معجزات اور خلاف عقل باتیں نکال ڈالی جاویں تو پھر بھی ایک مذہب کا ڈھانچ باقی رہے گا — پس اُسکو نیچریہ مذہب یا عقلی مذہب کہینگے یعنی ہر مذہب کا وہ حصہ جو عقل اور نیچر کے موافق ہی نیچریہ مذہب کہلاتا ہی — پس یہی کام سید احمد خاں نے اپنی تفسیر میں کیا کہ اُنہوں نے یہہ دعوی کیا ہی کہ قران میں کوئی بات بھی خلاف نیچر نہیں ہی — اس لیئے ٹھیٹ اسلام نیچریہ مذہب ہی — آج کل زمانہ وہ تو ہی ہی نہیں کہ پیغمبر پیدا ہوں اور اپنے معجزات سے مُردوں کو زندہ کریں یا آفتاب کو اس سبب سے کہ ہم جھوٹے نہوجائیں حرکت سے معطل کردیں — اس اُنیسویں صدی کے تو پیغمبر اور معجزے یہی ہیں کہ محققین اور حکما قوانین فطرت کو دریافت کرکے اہل دنیا کو خدا کا جاہ و جلال اور قدرت دکھادیں کہ اُنکے آگے معجزات کی کیا حقیقت تھی کہ وہ شان کبریائی دکھاتے ( معجزات حقیقت میں ایک بھان متی کا سالگ تھا جس میں سب کچھہ تھا اور کچھہ نہ تھا ) سو جناب سید صاحب نے اپنے دادا کے قرآن کی تفسیر میں قوانین قدرت توضیح سے اپنے تئیں اُس زمرہ میں داخل کرلیا — کروڑوں مسلمانوں میں ایسے عالی دماغ نیک نہاد کو یہہ سوجھی کہ زمانہ حال کے علوم حکمیہ مذہب کی جڑ کاٹنے والے ہیں — اس لیئے اس تفسیر ہی کو اس طرح لکھیئے کہ وہ بھی علوم حکمیہ میں سے

بیک علم حکمت معلوم ہو اور کوئي بات أسکے خلاف قانون فطرت ٹھہرے — وہ یہہ کام کچھہ اس خیال سے نہیں کرتے کہ بناوٹي باتوں سے قران یا مذہب اسلم کي حمایت کریں بلکہ أنکا یقین یہہ هی کہ درحقیقت قران اور مذہب اسلم اور نیچر یعني فطرت متحد ہیں — مجھکو اس سے بحث نہیں هي کہ أنکا یہہ یقین صحیح هی یا غلط مگر اِس میں کچھہ شک نہیں کہ أنکو اِس کا پورا یقین هی — جو کچھہ وہ اپني تفسیر میں لکھتے ہیں حقیقت میں أنکا یقین اور اعتقاد وهي هوتا هی اور أسي کو وہ سچ اور تہمت مذہب اسلم سمجھتے ہیں — غرض کہ وہ تفسیر أس بے ایماني کي روکنے والي هی جو تعلیم یافتہ مسلمانوں میں پھیلنے والي هی — اب تک اهل اسلم کا دستور هی کہ وہ زمانہ حال کے علوم حکمیہ کے پاس جاتے ہوئے ایسے ڈرتے ہیں جیسے کہ کوئي نامرد بودا میدان جنگ میں جاتا ہوا ڈرتا هی — مگر اس جوانمرد نے اپنے مذہب کے استحکام اور استواري کو أس طرح قایم کیا کہ اب أسکو علوم سے لڑنے کي قدرت حاصل هوگئي اور اس طرح أسکا امتحان لیا جس طرح کہ جہازراں عمدہ جہاز کو سمندروں کے طوفانوں کے مقابلہ میں لاکر کرتا هی کہ جس سے پھر اندیشہ أسکو اپني زندگي اور جہاز نشینوں کا نہیں رهتا — وہ اپنے مذہب کو أن علوم کے مقابلہ میں کھڑا کرکے بڑي حکمت سے لڑاتا هی کہ جس میں شکست کا گمان کسي طرح نہیں هوسکتا اور سب طرف سے فتح هي کي أمید هی — حقیقت میں غور سے دیکھیئے تو سارے الهامي مذہب نیچریہ مذہب کے بدعتي فرقہ ہیں — نیچریہ مذہب ایک مجموعہ صداقت و عدالت هی کہ انسان کے نیچر ( طبیعت ) میں پیدا کیا گیا هی وہ عقل کي آنکھہ سے دکھائي دیتا هی — مذہب کے ساتھہ جو اور آلایشیں اور لوث مختلف اسبابوں کے سبب سے مثلاً ملک اور زمانہ کي تاثیرات سے لگ جاتي ہیں اور اس وجہہ سے أسکو ایک نیا مذہب بنا دیتے ہیں أن سب سے یہہ نیچریہ مذہب پاک صاف هی — خدا کي ذات کي توحید اور أسکي یہہ صفات کہ وہ هر جگہہ موجود هی — وہ هر شی پر قادر هی — عالم‌الغیب هی — ازلي و ابدي هی — واجب‌الوجود هی اس مذہب میں معلوم هوتے ہیں — وہ أسکي قدوسیت اور پاکي پر شہادت دیتا هی — غرض ساري صفات الهي أس سے ظاهر ہیں — پھر برائي بھلائي اور نیکي بدي میں تمیز بڑي خوبي سے کرتا هی — جس مذہب میں کہ ان سب باتوں کا ذکر براهین مبرهن اور دلایل روشن کے ساتھہ کیا جاتا هی أسکو نیچریہ مذہب کہتے ہیں — اگر تاریخ مذہبي دیکھیں تو جب مذہب نیچریہ کے خلاف ایک طوفان بدعتوں کا برپا هوا تو کوئي دانشمند جسکو پیغمبر کہو یا اوتار نام رکھو یا ولي مرشد کہو أسنے اِن بدعتوں کے دور کرنے کے واسطے ایک مذہب اسي نیچریہ مذہب کے أصول پر قایم کرنا چاها — مذهبوں کے لیئے مذہب نیچر کو ایسا لازمي اور ضروري سمجھنا چاهیئے جیسے کہ تخم ریزي کے واسطے زمین — اگر زمین

نہو تو بیج کیسے بویا جاسکتا ہی — اگر نیچریہ مذہب نہو تو الہامی مذہب کی بنیاد کہاں رکھی جاے — کوئی جگہہ ہی نہیں جہاں وہ جڑ پکڑے — یہہ تو نیچریہ ہی مذہب ہی کہ جسکے سبب سے الہامی مذہب بہی جڑ پکڑ جاتا ہی — وہ حقیقت میں سارے مذہبوں کی زبانوں کی صرف و نحو ہی کہ اُسکے بغیر کوئی قاعدہ مذہبی منضبط ہی نہیں ہوسکتا — یہی سبب ہی کہ جسقدر بانیان مذہب ہوئے اُنکو پہلے کسی مذہب کو ماننا پڑا — چنانچہ بُدھ نے یہہ کہا کہ میں بہی مرشد ولیوں میں سے ایک ہوں — حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ میں شریعت موسوی کو کامل کرنے کے لیئے آیا ہوں ایک شوشہ مٹانے نہیں آیا — آنحضرت نے حضرت ابراہیم کے مذہب کو اپنا اسلام ٹھہرایا — اب اگر اِن سب بانیان مذہب کے اصلی مسایل مذہب کو دیکھیئے تو کوئی نئی بات اُن میں نہیں پائی جاتی — وہ سب ایک ہی نیچریہ مذہب قایم کرنا چاہتے تہے جسکی تفصیل ہمنے اوپر بیان کی — اگر انصاف کی نظر سے دیکھیئے تو بانی اسلام کو جیسی کامیابی اس کام میں ہوئی ایسی اور مذہب کو نہیں ہوئی — مگر مذہب کا قاعدہ ہوا کیسا ہی خواہ وہ کیسے ہی پاک صاف چشمہ سے نکلے مگر جب چلیگی تو اُسکے ساتہہ ضرور اور آلایشیں مل جائینگی اور اُسکو ناپاک اور غلیظ کردینگی — اس لیئے ہر وقت مصلح دین کی ضرورت ہی کہ وہ اُسکو اِن آلایشوں سے پاک صاف کرے اور پہر اُسکو مقدس چشمہ پر لیجاے — سو اہل اسلام کو خدا کا شکر بہیجنا چاہیئے کہ اُنکے مذہب کو غلاظتوں سے صاف کرنے کے لیئے سید صاحب کو اُن میں پیدا کردیا — جو اپنے دادا کی باتوں کو پوری پوری طرح سے سمجہا اور اُسنے قرآن شریف کے مقاصد اصلی کو اس طرح نمایاں کیا کہ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اب تک نسل کا اثر اُسکے دماغ میں باقی تہا — مذہب کا حال دریا کاسا ہوتا ہی کہ جب تک وہ اپنے منبع سے نکل کر زور شور سے اِدہر اُدہر کناروں کو دباتا ہوا — اور کہیں تالابوں میں اور دہاروں اور نالوں میں پہیلتا ہوا چلا جاتا ہی دریا رہتا ہی — اور جب وہ ایک جگہہ تہر کر رہ جاتا ہی تو دریا نہیں رہتا اور بند پانی کی طرح سڑنے لگتا ہی — خواہ اُسکے پانی کو اپنی جگہہ میں کتنا ہی ہلاؤ جہلاؤ سڑاند اُسکی باقی رہتی ہی — پس مذہب کی بہی بعینہٖ یہہ صورت ہی کہ جب اُسکا آغاز ہوتا ہی اور اُس میں بدعتی فرقے ہوتے ہیں تو اُسکا ذکر اذکار نہایت شد و مد سے شروع ہوتا ہی اور صداقت کے سارے پہلو اُس میں دیکھے جاتے ہیں — ہر فرقہ اپنے پہلو کے بٹہانے کی تدبیر کرتا ہی — اور اس سے اُسکی ترقی ہوتی جاتی ہی اور صداقت کی تحقیقات ہوتی ہی — مگر جب اُس میں یہہ تلاطم نہیں رہتا اور سب یہہ سمجہنے لگتے ہیں کہ ہمکو سچّی بات معلوم ہوگئی تو پہر آگے تحقیقات کے درپے نہیں ہوتے اور بند پانی کی طرح ٹہہر جاتے ہیں اور پہر اُس میں سڑنے لگتے ہیں — اور اگر اُس میں بحث بہی ہوتی ہی تو اُسی

طرح جیسے بند پاني کو اپني جگهه میں هلاتیں که وہ کسي طرح سڑانڈ کو دور نہیں کرتي اس تفسیر سے اسلام کي ترقي ضرور هوگي گو کچهه اُسکے مخالف هونگے کچهه موافق - اس سے پهر ایک راستي کي تحقیقات کا شوق پیدا هوگا — بات کہاں کي تهي کہاں پہنچ گئي — اس تفسیر کا ذکر ایک جملہ معترضه کے طور پر آگیا — اب مذهب نیچریہ کي حقیقت اور مذهب الهامي کي کیفیت لکهینگے اور یهه بتلائینگے که ایا یهه تسلیم کرنا عقل کے نزدیک بہتر هی که خدا نے انسان پاس الهام کے ذریعه سے اپنے اور انسان کے درمیان کا حجاب اُٹها دیا — یا یهه امر که سرے سے انسان اور خدا کے درمیان کوئي حجاب پڑا هي نہیں اور کوئي سبب هي ایسا نہیں پیدا هوا که خدا اور بندوں کے درمیان ناراضي هوتي اور باپ اپنے بچّوں سے خفا هوتا *

راقـــــــم

محمد ذکاء الله

# مذهب انسان کا امر طبعي هی

انسان هو یا حیوان جب اُن میں کوئي ایسي چیز دیکهي جاتي هی جو سب میں هو تو کہتے هیں که وہ اُس میں امر طبعي هی ' سانپ کا لہراتا هوا ' بچّهو کا ڈنک مارتا هوا چلنا ' تمام سانپوں اور تمام بچّهوؤں میں دیکها جاتا هی ' اور اسلئے کہتے هیں که یهه اُنکا امر طبعي هی ' تمام انسانوں کا سیدها قد دیکهتے هیں ' دو پاؤں پر چلتا هوا پاتے هیں ' تو کہتے هیں که اُسکا یهه امر طبعي هی ' اسي طرح اگر یهه بات ثابت هو که تمام انسان کچهه نکچهه مذهب هي رکهتے تهے ; تو ضرور تسلیم کرنا پڑیگا که مذهب بهي انسان کا امر طبعي هی *

انسان کے حالات کي اِسوقت تک جسقدر تحقیقات هوئي هی اُس سے پایا گیا هی ' که جس جس جگهه اور جس جس زمانه میں انسان تها وہ کچهه نکچهه مذهب بهي رکهتا تها ' وہ وحشي قومیں جو اب دنیا سے نیست و نابود هوگئیں ' اور جنکي نشانیاں زمین میں دبي هوئي نکلتي هیں ' اور جیالوجي اُنکے وجود کا ایک زمانه بعید قرار دیتي هی ' وہ صاف شہادت دیتي هیں که وہ بهي کچهه مذهب رکهتي تهیں — جن وحشي قوموں کو همنے پایا هی ' اور جو اب بهي امریکا کے جنگلوں اور افریقه کے کناروں اور اوشیَنیا کے جزایر میں پائي جاتي هیں ' وہ بهي کچهه نکچهه مذهب رکهتي هیں ' جسکو اُنهوں نے اپنے باپ دادا سے پایا هی ' جو قومیں قدیم زمانه میں شایسته تهیں اور جنکے حالات کتبوں اور سکوں اور تاریخ کي کتابوں میں پائے جاتے هیں اُنکے مذهب کا تو تاریخانه ثبوت

موجود هی ' پس ان تمام دلیلوں سے ثابت هوتا هی که تمام انسان کچهه نکچهه مذهب رکهتے تهے *

انسان کي خلقت خدا نے ایسي بنائي هی که وه جن چیزوں کو دیکهتا هی اور جانتا هی اور سمجهتا هی اُس سے ایک نتیجه ( گو وه حیرت هي هو ) نکالتا هی ' اور اُس پر ایک خیال صحیح یا غلط اپنے دل میں قایم کرتا هی ' انسان نے اپنے چاروں طرف اُن چیزوں کو پایا جو اُس سے بهت زیاده مضبوط اور قوي اور اعلی تهیں ' آسمان اور زمین چاند سورج ستاروں پهاڑوں دریاؤں هواؤں کو اُسنے دیکها اور سب کو نهایت قوي اور اپني خلقت سے اعلی پایا ' اُسنے نهایت عجیب عجیب اور خوفناک چیزیں جیسے بجلي ' مینهه ' طوفان ' بهونچال ' آتشیں پهاڑ ' دیکهیں اور متعجب هوا ' ان تمام باتوں نے اُسکے دل پر ایک بڑي قوت کے وجود کا اثر ڈالا اور اُسنے اُسکو تسلیم کیا *

اسي اصول پر خدا تعالی نے بهي فطرت انساني کے مطابق انسان کو تلقین کیا هی ' اور قرآن مجید میں جا بجا اپني عجائبات قدرت کو بتلاکر دکهلاکر سمجهاکر اپنے وجود پر استدلال کیا هی ' پس اس میں کچهه شک نهیں که ایک اعلی قوت کے موجود هونے کا خیال جسکو کچهه هي تعبیر کرو انسان میں ایک امر طبعي هی *

یهه بهي ایک لازمي امر هی که اُس اعلی قوت کے قرار دینے میں اختلاف واقع هو ' کوئي تو انهي موجودات اور مخلوقات میں سے کسیکو وه اعلی قوت سمجهے ' اور کوئي کسي خیالي وجود کو جسکا نقشه خود اُسنے اپنے خیال میں بنایا هو وه اعلی قوت قرار دے ' اور کوئي ایسي لامعلوم اور بیچون و بیچگون قوت کو جو اِن سب کي علةالعلل هو وه اعلی قوت سمجهے ' کوئي هر ایک عجیب چیز میں خواه وه حیوان هو یا نباتات یا عناصر یا معادن یا ایسے شخص میں جو پاک اور مقدس قرار پایا هو اُس اعلی قوت کا ظهور قرار دے ' یهي سب خیالات هیں جن سے معبود برحق یا باطل قرار پاتے هیں ' کوئي شخص چاند اور سورج اور ستاروں کو ' اور کوئي دریاؤں اور سمندروں اور پهاڑوں کو ' کوئي کسي درخت کو ' اور کوئي کسي قسم کي نباتات کو ' کوئي کسي جانور کو ' معبود یعني وه قوت اعلی یا اُس قوت اعلی کا مظهر تصور کرتا هی ' اور کوئي اُن خیالي قوتوں کو جنکا نقشه خود اُنکے خیال نے بنایا هی اور جنکو دیوتا اور دیبي قرار دیا هی معبود سمجهتا هی ' اور کوئي اُن شخصوں کي جنکو مقدس اور پاک قرار دیا تها اُنکے مرنے کے بعد اُنکي روحوں کو ' اور کوئي اُس لامعلوم بیچون و بیچگون قوت کو جسکو تمام کائنات کي علةالعلل سمجهتا هی معبود قرار دیتا هی ' *

یهي خیال رفته رفته مذهب بن جاتا هی — کیونکه انسان بالطبع جلب منفعت اور دفع مضرت پر مایل هی ' اور جب اُس اعلی قوت کے وجود کا یقین اُسکے دل میں

هوا ' تو اُسکو یهه خیال پیدا هونا هی که کوئي ایسي بات کي جاوے جس سے وہ اعلی قوت راضي رهے اور ناراض نهو ' اُس سے فائدہ پهنچے اور اُسکي ناراضي کي مضرت سے محفوظي هو — اسي خیال پر پرستش اور عبادت اُس شی کي جسکو اُسنے وہ اعلی قوت قرار دي هی ' یا اُس شی کي جس میں اُسنے اُس اعلی قوت کا ظهور سمجها هی قایم هوجاتي هی *

یهه بهي انسان کا ایک طبعي امر هی که صرف خیالي چیز سے نه اُسکو محبت هوتي هی نه اُسکي طرف توجهه هوتي هی نه دل رجوع هوتا هی — گو که کچهه دیر آنکهه بند کرکر اُس خیالي شی کا تصور باندهے ' مگر جب آنکهه کهلي تو معلوم هوا که کچهه نه تها ' پوري توجهه جب هي هوتي هی جبکه اُس خیالي شی کا کوئي نشان اصلي یا فرضي اُسکے سامنے موجود هو ' اور وہ اُسکو آنکهه سے دیکهه سکتا هو ' هاتهه سے چهوسکتا هو ' یهه امر درحقیقت بُت پرستي کي جڑ هی — اسي بنا پر انسانوں نے اُن خیالي قوتوں کي مورتیں اُس نقشه کے مطابق جو اُنکے خیال نے کهینچا تها ' یا اُس طریقه پر جس سے اُنکا خیال ظاهر هوتا تها ' بنالیں ' کسي کو بڑے سرکا ' کسي کو بڑے پیٹ کا ' کسي کے سیکڑوں سر ' کسي کے بهت سے ہُهجا ' کسي کو نهایت هیبت ناک ' کسي کو قاتل خونخوار ' کسي کو نهایت خوبصورت دلهن ' کسي کو نهایت کالي بد هیئت ڈاین ' بنالیا — مرے هوئے بزرگوں کے بت بهي اسي خیال سے بنائے گئے — مگر یهه خیال انسان کے لیئے ایک ایسا امر طبعي هی که وہ لوگ بهي جو اُس لامعلوم اور بیچون و بیچگون قوت کے پوجنے والے تهے ' جنهوں نے اُسکو علةالعلل جمیع کائنات کا خیال کر کر پوجنا شروع کیا تها ' اور جسکا نام یهوہ اور الله رکها تها ' وہ بهي کسي مادي شی کے نشان قایم کرنے سے بچ نسکي — نه حضرت ابراهیم اُس سے بچے ' جنکا نصب کیا هوا پتهر اب تک مسلمانوں کے مذهب میں بهي ' یمین الرحمن ' کهلاتا هی ' اور نه حضرت اسحاق و یعقوب بچے ' جو بن گهڑا پتهر کهڑا کرکر اُس پر تیل ڈالتے تهے نه حضرت موسی اور نه داؤد و سلیمان بچ سکے ' جنهوں نے بارہ پتهر بارہ قوموں کے کهڑے کرکر خدا کي عبادت کے لیئے اُن پر تیل ڈالا ' اور خیمه عبادت و تابوت سکینه اور بیت‌المقدس بنایا ' آنحضرت صلعم نے بهي اگرچه کهول کهول کر بتادیا که یهه جو کچهه هی اُسي بے نشان کا نشان هی مگر کوئي خاص سمت اور خاص گهر اُس بے نشان کے لیئے نهیں هی تاهم اُس رسم کو موقوف نهیں کیا ' جسکے سبب هم مسلمانوں میں بیت‌الحرام قایم هی ' اور هم سب اُسي کي طرف منهه پهیرتے هیں اور سجدہ کرتے هیں — مگر صرف اتنا فرق هی ' اور یهي فرق خدا پرستي اور بت پرستي میں تمیز کرتا هی ' که ان انبیاء علیهم‌السلام نے جو کچهه کیا خواہ بن گهڑا پتهر کهڑا کیا ' خواہ گهر بنایا ' وہ صرف خداے واحد ذوالجلال هي کے نام پر بنایا ' جسکو وہ یهوا اور الله کهتے تهے ' اور اوروں نے

جو کچھہ کیا وہ غیر خدا کے لیئے کیا ' جسکے وہ خود بھي مقر هیں اور خدا کي نشاني اُنکو نهیں کهتے ' بلکه دیوتاؤں اور دیبیوں کي اور اَوْر شخص کي جنکو خدا نهیں کهتے نشاني مانتے هیں ' اور غیر خدا کي پرستش کرتے هیں ' اور اسي لیئے بت پرست کہلاتے هیں ' اور انبیاء کے پیرو خدا پرست ' اور کالا پتهر ' یا سیاہ لباس کا گهر ' اُنکي خدا پرستي میں کچھہ نقص نهیں لاتا ' اگر زمانه مهلت دیتا تو شاید یهه بهي نرهتا ' کیونکه جو اُصول قرار دیئے تھے ' وہ لاتعوین کي طرف راجع تھے ' *

یهه بهي انسان کا امر طبعي هی ' که تمام دنیا کے انسانوں میں اُصول پرستش و عبادت ایک سے هوں ' گو که وہ عبادت مختلف طریقوں میں کي جاتي هو ' جب اُس قوت اعلی یعني معبود سے اُمید منفعت اور خوف مضرت انسان کے دل میں پیدا هوا ' تو جلب منفعت اور دفع مضرت کے جو طبعي امور هیں وهي انسان سے ظهور میں آتے هیں — یعني اُسکے سامنے عاجزي کرنا ' اُسکے سامنے گڑگڑانا — اُسکي بے انتها خوشامد اور تعریف کرنا — اپنے تئیں اُسکا غلام اور اُسکا مال قرار دینا ' اُسکا اختیار اپنے پر تسلیم کرنا ' اُسکے سامنے هاتهه جوڑکر کهڑے هوجانا ' اُسکے قدموں پر گر پڑنا ' اُسکے سامنے زمین پر ناک رگڑنا سر رگڑنا — اپنے تئیں تقصیر وار قرار دیکر تقصیر کا معاف کروانا ' اُسکو روپیه کي عمدہ عمدہ کهانوں اور مٹهائیوں کي نذر دیکر خوش کرنا — یهاں تک که خود اپني جان کو اُس پر قربان کرنا اپني جان کے بدلے جانور کي قرباني سے اُسکو راضي رکهنا ' یهه سب امور انسان کے امور طبعي هیں ' جو خوف و رجا کي حالت میں اُس سے ظهور میں آتے هیں ' پس هر قوم میں اور هر وقت میں معبود کي عبادت کے یهي اصول رهے هیں ' اور آج تک یهي اصول قایم هیں ' صرف اتنا فرق هی که جس طرح کسي قوم میں کوئي طریقه عاجزي و تابعداري ظاهر کرنیکا هی ' کسي میں کوئي ' اُسي طرح معبود کي عبادت کا بهي طریقه مختلف دکهائي دیتا هی ' مگر در حقیقت کچھہ اختلاف نهیں هی — یهي طریقه جبکه خدا کے سوا غیر کے ساتهه کیا جاتا هی وہ کفر و شرک و بُت پرستي قرار پاتا هی — اور جب خاص خدا کے ساتهه کیا جاتا هی گو که ایک بِن گهڑا پتهر هي کهڑا کرکر یا اینت مٹي کا گهر بناکر کیا جاتا هو ' وہ خدا پرستي کا طریقه هوتا هی ' *

انسانوں کے گروهوں میں ایسے شخص کا بهي جسکو پیغمبر یا هادي یا رسول یا اوتار یا رفارمر یا مصلح کهتے هیں پیدا هونا انساني طبیعت کا لازمه هی — انسانوں کے گروہ پر جب هم نظر ڈالتے هیں تو اُن میں مختلف عقل و مختلف دماغ کے لوگ پاتے هیں ' اور ایک دوسرے سے قوي و ضعیف و اعلی و ادنی هونے میں درجه بدرجه تفاوت رکهتے هیں ' کسي کي عقل و دماغ کو کسي خاص کام کے زیادہ تر مناسب پاتے هیں ' اور کسي کي عقل

و دماغ کو کسي دوسرے کام کے ' اسي طرح ھم یہہ بھي دیکھتے ھیں کہ کسي کي طبیعت اُن مسائل اور اُصول کے قایم کرنے میں زیادہ مناسب ھوتي ھی جسکو ھمنے مذھب قرار دیا ھی ' پس وہ بہ نسبت اوروں کے اسبات کو زیادہ خوبي و عمدگي سے سمجھتا ھی ' کہ وہ کونسي بیچون و بیچگون قوت ھی جسکو معبود قرار دیا جاوے ' اور وہ کونسے عمدہ طریقے اُسکي پرستش یا عبادت کے ھیں جو اختیار کیئے جاویں ' پس وہ اسکام پر کھڑا ھوجاتا ھی اور اپني نصیحتوں اور وعظوں سے لوگوں کو ھدایت کرتا ھی ' اور وھي اُس قوم کے حق میں پیغمبر یا رسول یا مصلح یا ھادي یا رفارمر ھوتا ھی — اسکا ثبوت دوسري دلیل سے اس طرح پر ھوتا ھی ' کہ جس طرح ھمنے جہاں اور جس زمانہ میں انسان کو پایا ھی ' اور اُسي کے ساتھہ مذھب کو بھي پایا ھی ' اُسي طرح مذھب کے ساتھہ اُسکے کسي نکسي پیشوا کا ھونا بھي پایا ھی ' اور جبکہ ھمکو ھر گروہ انسان میں اس پیشوا کا وجود ملا ھی ' تو ھم درستي سے کہہ سکتے ھیں کہ انساني گروھوں میں ایسے شخص کا ھونا بھي انساني طبیعت کا لازمہ ھی ' *

باني اسلام نے بھي جو درحقیقت سب سے بڑا انسان کے نیچر کا واعظ ھی ' یھي ھمکو بنایا ھی کہ تمام انسانوں کے گروھوں میں پیشوا ھوتے ھیں ' جہانکہ اُسنے فرمایا کہ " وان من امة الّا خلا فیھا نذیر " اور دوسري جگہہ فرمایا کہ " لکل قوم ھاد " اور پھر ایک جگہہ فرمایا کہ " جتنے لوگ دوزخ میں ڈالے جاوینگے اُن سے اُسکے موکل پوچھینگے کہ کیا تمھارے پاس کوئي شخص بري باتوں سے ڈرانے والا یعني پیغمبر نہیں آیا تھا سب کہینگے ھاں آیا تھا اُن پیغمبروں کو بھي برحق کتاب دي گئي تھي خدا نے فرمایا ھی " کان‌الناس امة واحدة فبعث الله‌النبیین مبشرین و منذرین و انزل معھم‌الکتاب بالحق لیحکم بین‌الناس فیما‌اختلفوا فیہ " یعني سب آدمي ایک گروہ تھے پھر بھیجا اللہ نے نبیوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اور اُنکے ساتھہ برحق کتاب اوتاري تاکہ لوگوں میں اُس بات میں جس میں وہ مختلف ھوگئے ھیں حکم دیں — پس یہہ خیال کرنا کہ صرف دنیا کے ایک ذرا سے ٹکرے میں جو دنیا کے ساتھہ ایسي نسبت رکھتا ھی جیسیکہ عدد کے ساتھہ صفر پیغمبر آئے تھے ' اور صرف فلسطین اور جزیرۂ عرب ھي کو اُنھوں نے خدائي روشني سے منور کیا تھا ' اور تمام برّ اعظم افریقہ اور امریکا اور یورپ اور اوشینیا ' اور ایک بہت بڑا حصہ ایشیا کا ' سب گمراھي کے اندھیرے میں پڑے ھوئے تھے ' اور خدا نے صرف ایک مٹھي بھر آدمیوں بني اسرائیل کو اور چند عرب کي قوموں کو جن میں نبي آئے بہشت میں جانے کے لیئے بنایا تھا ' اور باقي تمام دنیا کو دوزخ میں جانے کے لیئے ' ایک ایسا بھونڈا خیال ھی ' جسکو نیچر اور باني اسلام ' خدا اور قرآن ' سب غلط اور جھوٹا بتاتے ھیں ' *

ان هاديوں اور پيشواؤں کے حال پر غور کرنے سے معلوم هوتا هی که سب کا دين واحد تها ' اور اس لیئے هم کہہ سکتے هيں که سچے دين کا وعظ کرنا گويا اُنکا امر طبعي تها ' سچے دين سے ميرے اُس لامعلوم بيچون و بيچگون قوت پر يقين کرنے سے مراد لي هی ' جو تمام کائنات کي علةالعلل اور وحدہ لاشريک له هی — اس امر کے ثبوت کے لیئے همکو تمام دنيا کے اُن مذاهب پر جنکا حال همکو معلوم هوا هی ' اور جو اب موجود هيں يا موجود تهے غور کرنا چاهيئے ' سب مذهبوں ميں گو بعد کو اُن ميں کيسي هي بُت پرستي اور عجائب پرستي داخل هوگئي هو ' اور گو کروڑوں ديوتا اور ديبياں اُنهوں نے ٹهرالي هوں ' اُس جوتي سروپ نرنکار وحدہ لاشريک له پر يقين هونا پايا جاتا هی ' يوناني جو بيشمار ديوتا اور ديبياں مانتے تهے ' اور اب همارے زمانه ميں هندو هر ايک عجيب چيز کو پوجتے هيں ' اور هزاروں ديوتا اور ديبياں مانتے هيں ' اُنکے مذهب کي بهي جڑ ميں اُس علةالعلل ازلي و ابدي وحدہ لاشريک له کا وجود پايا جاتا هی — مصريوں سے زيادہ دنيا ميں کوئي قوم بُت پرست و عجائب پرست نهوگي ' ديوتاؤں کي مورتوں کو ديبيوں کي مورتوں کو مَرے هوئے آدميوں کے بتوں کو دنيا کے تمام جانوروں کو پوجتے تهے ' مگر اُنکے مذهب کي جڑ بهي اُسي وحدہ لاشريک له کے يقين پر مبني تهي — جسوقت که هم يهه پاتے هيں که مصريوں کے سب سے بڑے مندر پر يهه فقرہ کندہ تها اور کيا عجب هی که اُنکي کسي مقدس کتاب ميں سے هوکه

ميں وہ شی هوں جو هميشه سے تها اور اب بهي هوں اور هميشه رهونگا
کسي فنا هونے والي شی نے اس پردہ کو نهيں جانا جس ميں ميں چهپا هوا هوں

جو اسوقت بهي اس قابل هی که مسلمانوں کي مسجدوں کے دروازہ پر کندہ کيا جاوے ' تو اسبات کا کيسا عمدہ ثبوت همکو ملتا هی ' که تمام مذهبوں ميں اُس وحدہ لاشريک له کا اعتقاد علانيه موجود تها ' گو زمانه کے گذرنے سے اور خارجي باتيں اور غلط خيالات کے مذهب ميں ملنے سے وہ کيسا هي پوشيدہ اور نامعلوم قريب معدوم کے هوگيا هو — عيسائي جو اس زمانه ميں تثليث کے قايل هيں ' اگر انهي چاروں انجيلوں پر جو موجود هيں اور جو اُنکے مذهب کي بنياد هيں ' غور کيا جاوے تو اُنکے هر هر صفحه پر توحيد ذات باري کا نقش ملتا هی ' انهي انجيلوں ميں ايک سو کئي آيتيں هيں جو توحيد ذات باري ثابت کرتي هيں ' اور ايک حرف بهي اُن انجيلوں کا تثليث کي طرف اشارہ نهيں کرتا ' ان سب باتوں سے ثابت هوتا هی که توحيد ذات باري پر يقين کرنا ' تمام هاديان دين کا امر طبعي تها *

انسان کے نيچر کے سب سے بڑے واعظ باني اسلام نے بهي همکو يهي هدايت کي هی ' که تمام هاديان دين کا دين ايک هي تها ' صرف شريعت جو انسان کے حالت کي تبديل سے تبديل هوتي تهي جدا جدا تهي — سورہ شوریٰ ميں فرمايا " شرع لکم من الدين ما وصی

به نوحا والذي اوحينا اليک و ماوصينا به ابراهيم و موسى و عيسى ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه " اور سورہ مائدہ میں فرمایا " لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا " پس قران بهي أسي کي گواهي دیتا هی جسکي گواهي نيچر نے دي هی — قران مجيد نے تمام بُت پرستوں کو بهي مُشرک في ذات الله نهيں ٹهرايا جهاں فرمايا هی که " والذين اتخذوا من دونه اولياء مانعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى " بلکه صرف بسبب شرک في صفات الله و في عبادت الله کے أنکو مشرک کہا هی ' أن میں اگر نقص تها تو یهي تها که توحيد کامل نه تهي ' خاتم‌النبيين نے أس توحيد کي تکميل کردي ' اور بتاديا که ذات و صفات و عبادت تينوں کي توحيد سے توحيد کامل هوتي هی *

جو کچهه همنے بيان کيا أس سے ثابت هوتا هی که مندرجه ذيل أمور انسان کے أمور طبعي هيں *

اول — انسان کو کسي معبود يعني اعلى قوت کے وجود کا خيال پيدا هونا *

دوم — معبود قرار دينے ميں اختلاف کا هونا يعني مختلف چيزوں کو معبود يعني وہ قوت اعلى سمجهنا يا أس قوت اعلى کا أس ميں ظهور تصور کرنا *

سوم — أس معبود کي پرستش يعني رضامند رکهنے اور ناراضي کے خوف سے بچنے کا خيال پيدا هونا *

چهارم — محسوس شی کے ذريعه سے أس خيالي قوت اعلى کا پرستش کرنا جسکو معبود قرار ديا هی *

پنجم — تمام انسانوں ميں پرستش کے اصول کا متحد هونا گوکه أسکے طريقے مختلف هوں *

ششم — انساني گروہ ميں ايسے شخص کا پيدا هونا جو پيغمبر يا رسول يا رفارمر يا مصلح کهلاتا هی *

هفتم — تمام دنيا کے هاديوں يعني پيغمبروں کا ايک هي مذهب يعني توحيد ذات باري کا هونا *

پس جو لوگ که پيغمبروں کي راہ پر هيں وہ ضرور نجات پاوينگے ' خواہ وہ پيغمبر چين کا هو يا ماچين کا عرب کا هو يا فلسطين کا امريکا کا هو يا افريقه کا هندوستان کا هو يا فارستان کا مهذب لوگوں کا هو يا وحشيوں کا ' قرآن مجيد ميں خدا نے فرمايا هی " ان الله لايغفر من يشرک به و يغفر ما دون ذلک لمن يشاء " لمن يشاء کا فرمانا صرف سياق قراني هی جس سے خدا کي عظمت اور قدرت کا هر بات ميں اظهار مقصود هی ورنه اگر أس سے مضمون مخالف مراد ليا جاوے تو وعدہ مغفرت مشتبهه هوجاتا هی *

راقـــــــم

سيد احمد

# مذہبي خيال
## زمانۂ قديم اور زمانۂ جديد کا

جس طرح کہ قديم و جديد فلسفہ کے أصول ميں تبديل ہوئي ہی ہم ديکھتے ہيں کہ اسي طرح مذہبي أصول قديم و جديد ميں بھي تبديل واقع ہوئي ہی ' زمانہ قديم سے ہماري اصلي مراد زمانہ ماقبل سنہ نبوي سے ہی ' ليکن جو کہ اہل اسلام بہت جلد أسي قديم زمانہ ميں پھر چلے گئے ' اور زمانہ جديد کي روشني سے أنکھہ بند کرلي ' اس لئے بمجبوري ہمکو زمانۂ قديم کي وسعت آخر سنہ ۱۳۰۰ نبوي تک بڑھاني پڑي *

مذہبي أصول سے ہماري مراد يہہ ہی کہ أسکا برتاؤ اور عملدرآمد قديم زمانہ ميں کس خيال پر مبني تھا — اور اِس زمانہ ميں جو لوگ مذہبي خيالات پر بحث کرتے ہيں وہ أسکا برتاؤ کس خيال پر قرار ديتے ہيں — اگرچہ ميں يقين کرتا ہوں کہ ٹھيٹ مذہب اسلام اور باني اسلام عليہ السلام کي يہي ہدايت تھي جسکا خيال چودھويں صدي نبوي کے شروع ميں پيدا ہوا يا بلا خوف لومۃ لايم کے لوگوں نے بيان کيا ' مگر ميں اس آرٹکل ميں فريقين کي دليلوں سے کچھہ بحث کرني نہيں چاہتا ' بلکہ صاف طور سے دونوں خيالوں کے إختلاف کو بتاتا ہوں ' اور اس بات کا تصفيہ کہ أن دونوں ميں کونسا خيال ٹھيٹ اسلام کے مطابق ہی ' پڑھنے والوں کي رائے پر چھوڑتا ہوں ' *

قديم أصول مذہبي يہہ ہی کہ — انسان مذہب کے لئے پيدا ہوا ہی *

جديد أصول يہہ ہی کہ — مذہب انسان کے لئے پيدا ہوا ہی *

قديم أصول يہہ ہی کہ — انسان جہاں تک کہ أس سے ہوسکے نفس کُشي کرے ' اور اپني خوشيوں اور خواہشوں کو معدوم کردے *

جديد أصول يہہ ہی کہ — انسان اپني تمام خوشيوں اور خواہشوں کو زندہ رکھے ' اور أنکو أن أصولوں پر استعمال کرے جو أصول کہ أنکے پيدا کرنے والے نے أنکے استعمال کے لئے پيدا کئے ہيں *

قديم أصول يہہ ہی کہ — تزکيہ نفس انساني لازم ہی ' جسکا نتيجہ يہہ ہی کہ نفس انساني ناپاک ہی أسکو آلايشوں سے پاک کرنا چاہئے *

جديد أصول يہہ ہی کہ — نفس انساني خود پاک ہی اور أس کام کي قابليت رکھتا ہی جو أس سے ليا جاوے *

قديم أصول يہہ ہی کہ — انسان گوشہ نشيني اور مجاہدات اور کم خوابي اور کم خوراکي سے أس مضغہ گوشت ميں جو بشکل صنوبري سينہ ميں بائيں طرف ہی ايک قسم کي حرکت اور شورش پيدا کرے ' اور بجز استغراق ذات مبدء کے سب کو يہاں تک کہ اپنے آپ کو بھي بُھلادے *

جديد أصول يهه هي كه — ايسا كرنا اپنے ميں ايک مرض كا جسكو ماليخوليا كهتے هيں پيدا كرنا هي دل كو ( اگر أسكو مبده كاموں كا فرض كيا جاوے ) ايسي حالت پر ركهنا چاهيئے جس سے وہ كام جسكے ليئے پيدا هوا هي انجام هوسكيں ' *

قديم أصول يهه هي كه — دنيا و مافيها سے تعلق قطع كرنا ' اور صرف ذات مبدء سے تعلق ركهنا چاهيئے *

جديد أصول يهه هي كه — ايسا كرنا خالق كي مرضي كے برخلاف هي ' دنيا اور جو كچهه أس ميں هي انسان كے فائدہ كے ليئے بنائي هي ' پس انسان كو أسے قبول كرنا اور أسي ميں ذات مبدء سے تعلق ركهنا چاهيئے *

قديم أصول يهه هي كه — نعماے دنيا ميں سے صرف أسيقدر پر قناعت كرني چاهيئے كه جو سد رمق اور دفع حر و برد كو كافي هو *

جديد أصول يهه هي كه — تمام نعماے دنيا كو شكرالمنعمه كام ميں لانا چاهيئے *

قديم أصول يهه هي كه — تقدير پر بهروسه كرنا اور أس پر شاكر رهنا چاهيئے *

جديد أصول يهه هي كه — تقدير أس امر كا نام هي جو واقع هوجاوے ' اور قبل وقوع اسكے منتظر رهنا خدا كي حكمت كو جو سعي و تدبير ميں هي باطل كرنا هي ' اور بعد وقوع أسكو برداشت نكرنا ناشكري كرنا هي *

قديم أصول يهه هي كه — خدا كو اندهيري رات ميں آنكهه بند كركے ڈهونڈنا چاهيئے *

جديد أصول يهه هي كه — خدا كو آنكهيں كهول كر روشني ميں اور موجودات پر توجهه كرني اور أنكے حقايق و منافع دريافت كرنے سے ڈهونڈنا چاهيئے *

قديم أصول يهه هي كه — خدا كي عظمت و قدرت اس ميں هي كه وہ پاني سے آگ كا اور آگ سے پاني كا كام لے سكتا هي *

جديد أصول يهه هي كه — اس ميں خدا كي قدرت اور أسكي عظمت اور صنعت ميں بٹا لگتا هي *

قديم أصول يهه هي كه — الله الله كهنا اور تسبيح و تهليل كرنا خدا كا ياد كرنا هي *

جديد أصول يهه هي كه — خدا كي صنايع سے أسكي ياد كا دل ميں آنا خدا كا ياد كرنا هي *

قديم أصول يهه هي كه — تسبيح و تهليل عبادت هي *

جديد أصول يهه هي كه — انسان كو خدا كي صنايع كو كام ميں انيكے لايق كرنا يا خدا كے صنايع سے انسان كو فائدہ مند كرنا عبادت هي *

قديم أصول يهه هی كه — تزكيه نفس ' نفساني خواهشوں كا دل سے دور كرنا هی *

جديد أصول يهه هی كه — انسان كے دل كو نيكي پر مايل كرنا تزكيه نفس هی *

قديم أصول يهه هی كه — قرآن مجيد ميں شفا بهي هی *

جديد أصول يهه هی كه — امراض روحاني كے لیئے نه امراض جسماني كے لیئے *

قديم أصول يهه هی كه — قران تلاوت كے لیئے هی *

جديد أصول يهه هی كه — نصيحت پكڑنے اور عمل كرنے كے لیئے *

قديم أصول يهه هی كه — ايك كے عمل كا ثواب دوسرے كو پهنچتا هی *

جديد أصول يهه هی كه — ايك كا كهايا دوسرے كے پيٹ ميں نهيں جاتا *

قديم أصول يهه هی كه — مَرے هوؤں كي ارواحيں زندوں كو فائده پهنچاتي هيں *

جديد أصول يهه هی كه — خود أنكا خيال هي أن پر اثر كرتا هی *

قديم أصول يهه هی كه — معجزوں سے انبيا كي تصديق هوتي هی *

جديد أصول يهه هی كه — نيچر سے هوتي هی *

قديم أصول يهه هی كه — مذهب روحاني اور جسماني يعني ديني اور دنيوي دونوں كاموں سے متعلق هی *

جديد أصول يهه هی كه — مذهب صرف روحاني كاموں سے متعلق هی *

قديم أصول يهه هی كه — علوم حكميه مذهب كو سست كرديتے هيں *

جديد أصول يهه هی كه — علوم حكميه سچے مذهب كي سچّائي ظاهر كرتے هيں *

قديم أصول يهه هی كه — نيكي يا عبادت حور و قصور و بهشت كے ملنے اور دوزخ كے عذاب سے بچنے كے لیئے يا خدا كي رضامندي كے لیئے اور أسكي خفگي سے بچنے كے لیئے كرني چاهيئے *

جديد أصول يهه هی كه — همارے نيچر كا مقتضا هي يهي هی كه همكو نيك هونا چاهيئے *

اسي طرح اور بهت سے أصول جديد هيں جو أصول قديم سے مختلف هيں پرانے اسكول كے پڑهے مُلاّ اپني قديم لكير پر فقير هيں اس زمانه كے جوان تعليم يافته ان جديد أصول پر مرتے هيں — مُلاّ أنكي تكفير كرتے هيں اور يهه جوان أنكو يهه جواب ديتے *

من احسن وجهه لله و هو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف عليهم ولاهم يحزنون

راقـــــم

سيد احمد

# قدیم اور جدید علوم

کوئي شی ہو اُسکے حاصل کرنے سے کچھہ نہ کچھہ غرض ہوتي ہی کوئي علم ہو اُسکی کچھہ نہ کچھہ غایت بیان کي جاتي ہی علوم حکمیہ قدیم سے چلے آتے ہیں یوناني گویا اُنکے موجد یا اُستاد یا محقق شمار ہوتے ہیں — وہي علوم بعینہ با کسي تبدیل و تغیر سے ہمارے زمانہ تک چلے آئے ہیں مگر ہمکو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اُن علوم کي جو غایت زمانہ قدیم میں تھي وہي زمانہ جدید میں بھي ہی یا کچھہ ادل بدل ہوگئي ہی — یہي بات ہی جس پر زمانہ حال کي تہذیب و شایستگي اور علوم و فنون کي بنیاد قایم ہوتي ہی *

لارڈ مکالي نے لارڈ بیکن کي زندگي کے حالات پر ایک کتاب لکھي ہی اور اُس میں اِس بات کا مقابلہ کیا ہی کہ قدیم زمانہ میں علوم حکمیہ کي غایت کیا تھي اور زمانہ جدید میں اُنکي غایت کیا قرار پائي ہی — حکماے قدیم میں اُسنے سقراط افلاطون اور اُسکے پیرووں کو منتخب کیا ہی اور حکماے جدید میں لارڈ بیکن کو — اور علوم حکمیہ کي غایت کا جو حکمت قدیم میں قرار دي گئي تھي اُس غایت سے جو حکمت جدید میں قرار دي گئي ہی مقابلہ کیا ہی اور بتایا ہی کہ اُن دونوں میں سے کون سي دنیا اور انسان کے لیئے زیادہ مفید ہی — یہہ بحث نہایت دلچسپ ہی اور انسانوں کے لیئے سویلزیشن کي نسبت صحیح خیالات قایم کرنے کو ایک مستحکم بنیاد ہی — اس لیئے ہم اُس مباحثہ کو اپنے اس پرچہ میں چھاپتے ہیں تاکہ ہماري قوم کو بھي اُس پر غور کرنے کا موقع ملے *

لارڈ مکالي نے لکھا ہی کہ دو لفظ یعني اِفادہ اور ترقی حکمت جدید کي کنجي ہیں — حکمت قدیم سودمند ہونے سے نفرت کرتي تھي اور حالت موجودہ پر ثابت قدم رہنے پر قانع تھي — اخلاقي کمال کي بحثوں میں جو اسقدر لطیف و دقیق تھیں کہ اُن سے اور کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوسکتا تھا عقدہاے مالاینحل کے حل کرنیکي کوششوں میں ناقابل حصول حالت دماغ کے حاصل کرنے کي وعظ و نصائح میں اُسنے دفتر کے دفتر سیاہ کرڈالے — نوع انسان کي آسایش کے ذلیل کام کي طرف توجہہ کرنے میں وہ اپني ذلت اور حقارت سمجھتي تھي — تمام مدارس مختلفہ حکمت قدیمہ اس کام کو ذلیل سمجھتے تھے بعض اُسکو بداخلاقي سے منسوب کرتے تھے — پوسیڈونیس ایک نامي مصنف جو سسرو اور قیصر جولیس کا ہمعصر تھا اسقدر غافل اور بے ہوش ہوگیا کہ اُن ادنی نعمتوں میں جو انسان کو علم حکمت کے طفیل سے حاصل ہوتي ہیں محراب بنانے کے اُصول کا دریافت ہونا اور دھاتوں کے استعمال کا رواج بھي آنا شمار کیا — یہہ تعریف بطور ایک طنز اور طعنہ کے سمجھي گئي اور اُس

زمانہ کے سب حکماے کو شاق گذري — سنیکا حکیم نہایت تندي کے ساتھہ اِن تھتک آمیز تعریفوں کو ناپسند کرتا هی — اُسکے نزدیک علم حکمت کو اس امر سے کچھہ علاقہ نہیں هی کہ آدمیوں کو لداؤ کي چھتیں بنانا سکھاوے — جو شخص کہ سچّا حکیم هی اُسکو اس بات کي پرواہ نہیں هوتي هی کہ میري چھت لداؤ کي هی یا اَور قسم کي — علم حکمت تو اس بات سے کچھہ سروکار نہیں هی کہ آدمیوں کو فلزات کے استعمال کا قاعدہ آجاوے — اُسکا کام تمام مادي اشیا اور تمام مصنوعي قاعدوں سے خارج رهنے کي تلقین کرنے کا هی — دانا انمي نیچر یعني فطرت کے موافق زندگي بسر کرتا هی — بنجاے اسکے کہ اپنے بني نوع کي جسماني آسایشوں کو بڑھانے کي کوشش کرے حکیم موصوف اس بات کا افسوس کرتا هی کہ میري قسمت کا قرعہ اُس اعلی ترین زمانہ میں نہ پڑا جبکہ بني آدم کو سردي سے محفوظ رهنے کے واسطے بجز درندوں اور چوپایوں کي کھال کے اور کوئي پوشش اور طپش آفتاب سے بچنے کے واسطے بجز قدرتي غاروں کے اور کوئي مامن میسر نہ تھا — ایسے شخص کي طرف کسي ایجاد میں کسي قسم کي شرکت یا نل جہاز یا کسي کل وغیرہ کي اصلاح و ترقي کو منسوب کرنا اُسکو بدنام کرنا هی — حکیم سنیکا کا بیان هی کہ " همارے هي زمانہ میں اس قسم کي ایجادیں هوئي هیں مثلاً شفاف شیشہدار کھڑکیاں ایسے نل جنکے ذریعے سے مکان کے تمام حصوں میں گرمي برابر پہنچ جاے مختصر خط جو ایسے کمال کو پہنچ گیا هی کہ ایک محرر جلد سے جلد بولنے والے شخص کا ساتھہ دے سکتا هی — لیکن اِن چیزوں کي ایجاد پر محنت کرنا رزیل ترین غلاموں کا کام هی — علم حکمت کا مقام اور ٹھکانا بہت دور هی — اُسکا کام یہہ نہیں هی کہ آدمیوں کو اپنے هاتھوں کو کام میں لانا سکھلائے — اُسکي تعلیمات کا منشاء روح کي اصلاح هی " — اِسکے بعد حکیم موصوف فرماتے هیں کہ " اب کوئي هم سے یہہ کہیگا کہ جوتے کا موجد ایک حکیم تھا " — هماري یہہ راے هی کہ اگر کوئي هم سے پوچھے کہ اِن دو شخصوں میں یعني جوتے کے موجد اور غصہ کي ماهیت پر تین کتابوں کے مصنف میں سے کس کو زیادہ پسند کرتے هو تو هم جوتے کے موجد کو بلاشبہہ ترجیح دینگے — خفا هونا پاؤں میں کیچڑ بھر جانے سے گو زیادہ بُرا هو — لیکن اس میں کچھہ شک نہیں کہ جوتے نے لاکھوں آدمیوں کے پاؤں کو کیچڑ سے محفوظ کردیا هی اور اِس میں همکو کلام هی کہ ایا سنیکا نے کسي شخص کو خفا هونے سے کبھي باز رکھا هی *

نہایت جبر اور بیدلي کے ساتھہ حکیم مذکور اِس بات کے تسلیم کرنے کي طرف مایل هوتا هی کہ کسي حکیم نے کبھي ذراسي بھي توجہہ کسي ایسي چیز پر مبذول کي تھي جس سے اُس چیز کي جسکو عرف عوام میں نوع انسان کي بہبودي تصور کرتے هیں ترقي کا امکان هوسکتا هو — حکیم دي مقریطوس کو محراب کے موجد هونے کي ندامت بخشں

اتہام سے اور حکیم اناکارسیس کو کُمہار کا چاک ایجاد کرنے کے الزام سے بری کرنے کے واسطے اُسنے بہت محنت اور جفا کشي کي هی — اُسکو بمجبوري اس بات کو تسلیم کرنا پڑا هی که ایسي بات اتفاقیه هوگئي هو جس طرح یهه بهي ممکن هی که کوئي حکیم دوڑ نے میں مشاق هو — لیکن یهه بات که وہ دوڑ میں بازي لیجاے یا کوئي کل ایجاد کرے اُسکے جزو حکمت سے نهیں هی — بےشک نهیں هی — حکیم کا کام یهه هی که الفقر فخري کے مضمون اور افلس کي خوبیوں کا تو نهایت فصاحت و بلاغت کے ساتهه وعظ کہے اور دو کروڑ روپیه سود پر چلوے — عیش و عشرت جسماني اور لذاید نفساني کي خرابیوں کي نسبت ایسے باغیچوں اور چمنوں میں جنکو دیکھکر سلاطین رشک کرتے تھے نازک خیالیاں باندھے — آزادي کي بابت تو خاک اُڑائے اور ایک جابر بادشاہ کے متکبّر اور خود بین درباریوں کي خوشامد اور چاپلوسي کرے — نیکو کاري اور صلاحیت کي خوبي اور پاکیزگي کي تعریف اُسي قلم سے تحریر کرے جسکو ذراهي عرصه پیشتر ایک بیٹے نے هاتهه سے ماں کے قتل کي حمایت میں کام میں لایا هو *

اس فلسفه کي عیاري اور ریاکاري کي باتوں سے جو اپنے غیر سودمند هونے پر هی نالایقي سے نازاں تھي انگریزي اُستاد اعظم کے ملفوظات کي طرف رجوع کرنا بہتر معلوم هوتا هی — وہ حب نوع انساني جوبیکن کي تحریرات کي اصل اُصول هی اور یهه نشان منکسرالمزاجي اور عقیدہ که کوئي چیز گو کیسي هي حقیر اور ذلیل هو مگر ادنی ترین نوع بشر کو نفع یا نقصان پہنچانے کي قابلیت رکھتي هو حکیم دانشمند کي توجهه کے ناقابل نهیں هی فلسفه جدید کي بنیاد هی — بیکن کي کل تحریرات میں خواہ وہ طبعیات پر هوں خواہ قوانین پر خواہ اخلاق پر یهي اُصول نظر آتا هی — اور هم خیال کرتے هیں که اسي تخصیص سے اس قاعدہ کي اور سب تخصیصات اور ممیزات بهي بلواسطه پیدا هوئي هیں *

اس عقیدہ نے جو سنیکا کے قول محوله صدر سے مترشح هوتا هی تمام حکماے قدیم کے دماغوں پر یعني سقراط سے لیکر بعد کے آنے والے حکما تک رنگ جمایا تها اور ایسے ایسے عقلا اور فیلسوفوں کي عقلوں پر حاوي هوگیا تها جنکے روبرو سنیکا ایک طفل مکتب هی — افلاطون کے مکالمات میں موجود هی — ارسطاطالیس کي اکثر تحریرات میں اسکا صاف صاف سراغ ملتا هی — بیکن کے بعض کنایات سے یهه مستنبط هوتا هی که اُسکي راے میں اس عقیدہ کے شایع هونے کي بڑي وجهه سقراط کي رواداري هی — ظاهر هی که همارے نامي گرامي هموطن نے اس انقلاب عظیم کو جو سقراط نے علم حکمت میں پیدا کیا تها ایک عمدہ واقعه نهیں خیال کیا اور اُسکي همیشه یهه راے رهي که حکماے اولین یوناني بالخصوص دیمقریطوس اپنے زیادہ مشهور و معروف خلفا سے فوق لے گئے تهے *

اس میں کچھہ شک نہیں ہی کہ اگر اُس درخت کي قدر و خوبي کا اندازہ جسکا تخم ستراط نے بویا تھا اور افلاطون نے اُسکو پاني دیا تھا اُسکے پھولوں اور پتوں سے کیا جاے تو وہ عمدہ ترین اشجار میں شمار کیا جائیگا — لیکن اگر ہم بیکن والے سادہ اندازہ کو اختیار کریں اور اُس درخت کي قدر و خوبي کو اُسکے پھلوں سے جانچیں تو شاید ہماري راے اُسکي نسبت بہت اچھي نہوگي — جب ہم فلسفہ مذکور کے تمام فواید کو جمع کرنا چاہیں تو وہ کسقدر ہونگے ؟ — ہمکو بلاشبہہ اس بات کے کافي ثبوت ملتے ہیں کہ اُسکے رواج دہندہ اور حامیوں میں بعض لوگ اعلی درجہ کي عقل و فہم رکھتے تھے — ہم اُنکي تحریرات میں فصاحت و بلاغت کے بے نظیر نمونے پاتے ہیں — ہمکو اس امر میں کچھہ کلام نہیں ہی کہ قدیمي مناظروں سے یہہ فائدہ تو البتہ مترتب ہوا ہی کہ مناظرین کے ذہن و ملکہ کو مشق کي وجہہ سے ترقي ہوگئي کیونکہ کوئي مباحثہ اور مناظرہ اسقدر گیا گذرا بھي نہیں ہی کہ یہہ فایدہ بھي نہ پہنچاسکے — لیکن جب ہم کسي اور بات کي توقع کرتے ہیں یعني کسي ایسي چیز کي توقع کرتے ہیں جس سے نسل انساني کي آسایشوں کي ترقي اور مصائب کي تخفیف متصور ہو تو ہمکو اپني مایوسي کا بمجبوري اقرار کرنا پڑتا ہی — ہمکو بیکن کے ہمزبان ہوکر بمجبوري یہہ کہنا پڑتا ہی کہ اس پر شہرت فلسفہ سے بجز بحث و مباحثہ کے اور کوئي نتیجہ نہ نکلا یہہ فلسفہ نہ تو تاکستان اور نہ تختہ زیتون نکلا بلکہ خارستان اور گنجان جھاڑیوں کا ایک وسیع جنگل نکلا کہ اُسکے اندر جانیوالے زخم اور کھرونچے تو بہت سي لائے مگر کوئي کھانے کي چیز لیکر نہ آئے ٭

اس امر کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس بےبر و بےثمر حکمت کے اُستاد و معلمین دنیا کے اعلی ترین اشخاص میں سے ہوئے ہیں — بیکن کے الزام کے بجا ہونے کو اگر ہم تسلیم کرتے ہیں تو اُس افسوس کے ساتھہ تسلیم کرتے ہیں جو ڈینٹي شاعر کو اُن نامي گرامي کفار کے حال پر آیا تھا جنکي نسبت اُسنے سنا تھا کہ جہنم کے اول طبقہ میں پڑینگے ٭

لیکن حقیقت یہہ ہی کہ ہمارا ان حکماے سابقین کي عقل و ذہانت کا قایل ہونا ہي ہمکو اس راے کے اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہی کہ اُنہوں نے اپني قوتوں کے استعمال میں ٹیڑھي راہ باقاعدہ اختیار کي تھي — ورنہ یہہ کس طرح متصور ہوسکتا ہی کہ ایسے لائق و ذي عقل اشخاص انسانوں کو نفع پہنچانے سے اسقدر قاصر رہتے — کولہو کے بیل کو گو اُسیقدر محنت پڑتي ہو جیسے کہ سڑک پر چلنے میں — لیکن سڑک پر چلنے سے یقیناً آگے کو بڑھیگا مگر کولہو میں صبح سے شام تک چلنے میں ایک انچھہ بھي آگے کو ترقي نکریگا — حکمت قدیمہ کي مثال کولہو کي تھي سڑک کي نہ تھي — وہ ایسے مسائل اور مباحثوں سے مرکب تھي جنکا دور کبھي ختم نہوتا تھا اور بار بار ازسرنو شروع ہوتے تھے — اُس میں اس ترکیب و حکمت کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ محنت تو بہت ہو مگر ترقي نام

کو بھي نہو — یہه سوالات که دنیا میں بہترین شی کونسي هی آیا درد و تکلیف مصیبت میں شمار هوسکتي هی ایا مسئله تقدیر ٹہوک هی ایا همکو کسي شی کي نسبت تیقن هوسکتا هی ایا همکو اس امر کي نسبت تیقن هوسکتا هی که همکو کسي شی کي نسبت تیقن نہیں هوسکتا هی ایا صاحب عقل مصیبت میں مبتلا هوسکتا هی آیا هر قسم کي تجروي یکساں معیوب هی — یہه سوالات اور اسي قسم کے اور سوالات مہذب دنیا کے لایق ترین اشخاص کے دماغوں زبانوں اور قلموں پر کئي صدیوں تک حکمراں رهے — ظاهر هی که اس قسم کي حکمت مترقي هوهي نہیں سکتي — اُن لوگوں کے دماغ جنہوں نے اپنے آپکو اس حکمت میں مصروف کیا هوگا ممکن هی که زیادہ تیز اور قوي هوگئے هوں لیکن یہه جودت اور قوت تو للیپٹ † اور بلیفسکیوڈیا کے پکے دینداد اور مدعني فرقوں کے مناظرات باهمي سے بھي جو انڈوں کے موٹے اور پتلے سروں کي بابت واقع هوئے تھے حاصل هوسکتي هی — لیکن ایسے مناظروں سے علم کے سرمایه میں کچھه ترقي نہیں هوتي هی — اسي سبب سے انساني دماغ بجاے اسکے که آگے کو قدم بڑهائے اپني هي جگهه قایم رها — گو اُسکو اسقدر محنت اُٹھاني پڑے جو اُسکو منزل مقصود کو پہنچا دیتي لیکن اُسنے اپنے مقام سے جنبش نه کي — سرمایه صدق کچھه جمع نہوا اور نه ایک پشت دوسري پشت کو اُس میں کچھه نه کچھه اضافه کرکے منتقل کرتي گئي — سسرو کے زمانه میں اس فلسفه کا جو حال تھا سنیکا اور فوریڈوس کے زمانوں میں بھي اُسکا بجنسه وهي حال رها اور سرمو فرق نه آیا — وهي مخالف فرقے ویسے هي ناقابل اطمینان اور پرپچ دلایل کے ساتھه اُنهي متسلسل اور غیر متناهي مسائل کي بابت لڑ جھگڑ رهے تھے — ذهانت سرگرمي اور محنت کي کچھه کمي نه تھي — دماغي تربیت کے جمله آثار موجود تھے مگر کوئي ثمرہ مترتب نہیں هوتا تھا — قلبه راني تخم ریزي اور کٹائي وغیرہ تو بہت کچھه هوئي مگر کھیتوں میں بجز تنکوں اور بھوسے کے اور کچھه نه تھا ●

حکماے متقدمین علوم طبعي سے غافل نه تھے لیکن انسان کے حال کي اصلاح اور اُسکي قدرت کو وسعت دینے کي نیت سے اُنہوں نے اُن علوم کي اشاعت نه کي — داغ بے ثمري

† للیپٹ اور بلیفسکیوڈیا دو فرضي شہر گلیور صاحب کي کتاب میں بیان هوئے هیں — اِن دونوں شہروں کے باشندے دو مختلف مذاهب رکھتے تھے — یعني ایک شہر کے لوگوں کا یہه مذهب تھا که انڈوں کو پتلے سرے کي طرف سے کھانا چاهئے اور دوسري طرف سے کھانا حرام هی اور دوسرے شہر کے باشندوں کا یہه عقیدہ تھا که انڈے کو موٹے سرے کي طرف سے کھانا چاهئے اور پتلے سرے کي طرف سے کھانا حرام هی — اسي عقیدہ کے اختلاف کي وجهه سے اِن دونوں فرقوں میں اکثر مناظرے واقع هوتے تھے اور بارها جنگ و جدال اور قتل اور خونریزي کي نوبت پہنچتي تھي —

اخلاقي مسائل سے طبعي مسائل تک متعدي هوگیا تها — سنیکا نے علم طبعیات میں بہت کنچهہ لکها هی لیکن اس وجهہ سے نہیں لکها هی کہ اس سے تکلیف و مصیبت کي تخفیف اور زندگي کي آسایشوں کي ترقي متصور هی اور موالید ثلاثہ پر انسان کي قدرت و اختیار کے بڑهانے میں یہہ علم کام دیتا هی بلکہ محض اس خیال سے کہ وہ انسان کي طبیعت کو ادنی اور ذلیل تفکرات سے أٹهاتا هی جوهر کو مادہ سے علاحدہ کرتا هی اور ادق مسائل کے حل کرنے میں مدد دیتا هی — اسطرح سے علم طبعیات صرف بمنزلہ ایک دماغي مشق کے خیال کیا جاتا تها — فن مناظرہ کا تابع کیا گیا تها اور اسي باعث سے مفید اور سودمند تحقیقاتوں سے معرا رها *

لیکن ایک فرقہ حکماے متقدمین کا ایسا بهي تها جو باوجود اپنے بعض بیهودہ اور ضرر رساں عقاید کے أس عام الزام سے جو بیکن نے تمام حکماے متقدمین کي نسبت عاید کیا هی مستثنی هونے کا مستحق هی - - فرقہ ایپکیوریں سے جسنے تمام راحت کو جسماني خوشي اور تمام مصیبت کو جسماني تکلیف سے منسوب کیا تها توقع هوسکتي تهي کہ اپني جسماني حالت اور اپنے همجنسوں کي جسماني حالت کي اصلاح اور بهبودي کي کوشش کریگا — لیکن اس فرقہ کے کسي فردبشر کے ذهن میں اسبات کا خیال بهي کبهي نہیں گذرا — أنکا خیال یہہ تها کہ أن علوم و فنون میں جو مفید عیش هاے زندگي هیں زیادہ ترقي کي توقع هي نہیں *

یہہ باقناعت مایوسي اور یہہ میلان طبیعت کہ جو کنچهہ هونا تها سو هوچکا اور اب زیادہ کي توقع نہیں هی جملہ مدارس حکمیہ کا جو مدرسہ ثمر و ترقي سے پیشتر گذرے هیں ایک بڑا خاصہ هی — فرقہ ایپکیورین اور فرقہ اسٹویک گو اکثر امور میں اختلاف عظیم رکهتے هیں مگر اسباب میں دونوں متفق معلوم هوتے هیں کہ ایسے حقیر کاموں میں جو سودمند هوں کوشش کرني نہیں چاهیئے — دونوں کا فلسفہ ایک لفظي مباحثہ مناظرہ اور مناقشہ والا فلسفہ تها — صدیوں تک یہہ دونوں فرقے اپنے متضاد نعرے نیکي اور خوشي کے مارا کیئے اور انجام کار یہہ ثابت هوا کہ ایپکیوریں نے خوشي کے سرمایہ میں اسیقدر کم اضافہ کیا جتنا کہ اسٹویک نے نیکي کے سرمایہ میں کیا تها *

پانچویں صدي عیسوي میں دین عیسوي شرک پر غالب آیا اور شرک کے اثر نے دین عیسوي کو ملوث کیا — اسوقت کلیسا غالب تها مگر ملوث، مشرکین کي رسوم نے کلیسا کي عبادت میں اور حکمت افلاطوني نے أسکے مذهب میں دخل پایا — بقول بیکن کے ایک منحوس ساعت میں فلسفہ قدیم اور مذهب جدید میں یہہ نامبارک اتفاق اور راہ و رسم واقع هوئي تهي — أن سوالات کي بہ نسبت جن پر حکیم پرهو اور کارنیاڈیس نے ذهانت صرف کي تهي نہایت مختلف مگر ویسے هي دقیق ویسے هي غیر متناهي اور ویسے هي غیر مفید

سوالات پر بلیغ اور خوش تقریر یونانیوں نے توجهه مبذول کي — جب یورپ میں علم کي اشاعت ازسرنو شروع هوئي تو اسکول میں یعني حکماے ازمنه متوسطه نے اپني تمام عقل و دهانت کو ایسي هي واهیات میں صرف کیا — وهي هوا کا بونا اور گردباد کا پهل پانا تها — حیثیت انساني کي اصلاح کا عظیم‌الشان کام اب بهي فني علم آدمي کے ناقابل توجهه خیال کیا جاتا تها — جو لوگ که اس کام کو اختیار بهي کرتے تهے اگر اُنکا کام آساني سے سمجهه میں آسکتا تها تو بطور پیشه وروں کے حقیر سمجهے جاتے تهے اور اگر سمجهه میں نه آتا تها تو اُنکو باتهام جادوگري جلاکر مار ڈالے جانیکا اندیشه هوتا تها *

لوگوں کي کج عقلي کا ثبوت اُن دو عظیم‌الشان واقعات کي تاریخ سے زیادہ جو از منه متوسطه میں واقع هوئے تهے اور کوئي نهیں هوسکتا — یعني باروت اور چهاپه کي اختراع سے — دونوں چیزوں کي تاریخیں معدوم هیں — دونوں کے موجد نامعلوم هیں — اسکي وجهه یهه نهیں تهي که لوگ ایسے وحشي اور جاهل تهے که عقلي فوقیت کي قدرداني نکرتے — باروت کا موجد پٹرارک اور بوکیشیو کا همعصر معلوم هوتا هی — چهاپه کا موجد نکلس پنجم اور کاسموڈي میڈیسي اور بہت سے مشهور و معروف علماء کا بلاشبهه همعصر تها — لیکن دماغ انساني میں وهي خراب میلان موجود تها جو دو هزار برس پیشتر اُسکو حاصل هوا تها — جارج طرابزوني اور مارسلیوفسنو کو آساني سے اس امر کا یقین نه آتا که چهاپه کے موجد نے انسانوں کو به نسبت اُنکے یا به نسبت اُن پرانے مصنفین کے جنکے وہ مقلد و متبع تهے زیادہ نفع پهنچایا هی *

آخرکار وہ وقت بهي آ پهنچا جو اس بےثمر فلسفه کے زوال کے واسطے جسکي طرف اتنے عرصه دراز تک لایق و فایق آدمیوں نے اپني عقلوں اور ذهنوں کو مصروف کیا تها موعود تها — اس فلسفه نے بهت سے رنگ بدلے اور بهت سے مذهبوں کے ساتهه رشته اور تعلق پیدا کیا اور ایسے بڑے بڑے انقلابوں کو جن میں سلطنتیں مذهب زبانیں نسلیں ته و بالا هوگئي تهیں جهیل گیا — اپنے قدیمي اور اصلي آشیانه کو چهوڑ کر اُسنے اُس کلیسا کو اپنا مامن بنایا جسکے استیصال اور تخریب کے وہ درپے هوا تها جس طرح که ملٹن شاعر نے شیطان کي نسبت لکها هی که عرش معلی کے قریب هي اپنا مقام اختیار کیا اور اپنے کفر کي ظلمت کو نور لایزال سے ملحق کردیا *

ساتهه پشتوں کے مشهور و معروف عقلا کي عمر بهر کي مشقتوں اور جانفشانیوں کا ثمرہ بجز لفظوں اور محض لفظوں کے اَوْر کچهه حاصل نهوا — لیکن اس بے مصرف شی کا پیمانه عمر لبریز هوگیا *

لوگوں کے خیالات کو تبدیلي کي طرف مایل کرنے کے واسطے بهت سے اسباب جمع هوگئے — متقدمین کي مختلف قسم کي تحریرات کے مطالعه نے گو حکیمانه تحقیقات کا سیدها

راسته نه بتایا مگر اُس نابینایانه تعظیم استناد کي بیخ کني میں جسنے اُس زمانه میں جبکه صرف ارسطاطالیس هي کا دور دورہ تها غلبه حاصل کیا تها بهت کچهه کام دیا — افلاطوني فرقه فلورنٹاین کا عروج جس سے پندرهویں صدي کے بعض لایق ترین اشخاص علاقه رکهتے تهے کوئي حتمي واقعه نه تها — محض یهه امر که ارسطاطالیسي فلسفه کي جگهه افلاطوني فلسفه قایم هوگیا فی نفسه چنداں مفید نه تها — مگر بے دلیل تتبع کے قدیمي عادت سے هر چیز بہتر تهي — گبن مورخ نے ٹهیک ٹهیک بیان کیا هی که " اس متضاد اطاعت کے باهمي مقابله سے آزادي کي ایک چنگاري پیدا هوگئي " *

اور اسباب بهي بیان هوسکتے هیں — لیکن علم حکمت کي بڑي اصلاح کے باعث مذهب کي بڑي اصلاح بالخصوص هوئي هی — مدارس حکمیه اور مذهب رومن کیتهلک میں ایک مدت سے رابطه اتحاد اسقدر مضبوط هوگیا تها که جن لوگوں نے پوپ کے دائرہ اطاعت سے انحراف اختیار کیا وہ مدارس حکمیه کے محکوم نهیں رہ سکتے تهے — فرقهاے جدید کے اکثر باني ارسطاطالیسي حکمت کو نظر حقارت سے دیکهتے تهے اور گویا اُنکے نزدیک ٹامس ایکویناس کے جمله اُصول و عقاید کا جوابدہ ارسطو تها — مصلحان مذهب عیسوي کو سینٹ پال حواري کا وہ بیان ورد زباں تها جهاں وہ اهل کالوسیا کو علم فلسفه سے ملوث هونے سے متنبهه کرتا هی — لوتهر کا یهه قول تها که کوئي شخص ارسطو کے مدرسه کا مستعد طالب علم اور حضرت مسیح کا با اعتقاد پیرو آنِ واحد میں نهیں هوسکتا — زنگل بوسر پیٹر شهید اور کالون کا بهي اسي قسم کا عقیدہ تها — اسکاٹلینڈ کي بعض یونیورسٹیوں نے طریقه ارسطاطالیسي کو خارج کرکے اُسکي جگهه طریقه راموسي کو اختیار کیا — پس بیکن کي پیدایش سے پهلے هي یوناني فلسفه کي بنیاد متزلزل هوگئي تهي — علمي جهان میں بهي ویسي هي ابتري اور خود سري واقع هوئي جو کسي پراني سلطنت کے انقلاب کے بعد اکثر واقع هوتي هی — قدامت رواج اور بڑے بڑے ناموں کا اثر لوگوں کے دلوں سے جاتا رها تها — جس خاندان میں که برسوں سے حکومت چلي آتي تهي اُسکا اختتام هوگیا اور تخت شاهي مختلف دعویداروں کے لڑنے بهڑنے کے واسطے خالي هوگیا *

اس انقلاب عظیم کا اول نتیجه بقول بیکن کے یهه هوا که طرز تحریر کي خوبیوں کو ایک ناواجب وقعت حاصل هوگئي — علماء کي نئي نسل نے جو اغسطوسي زمانه کي بهترین تحریرات کے سرچشمه سے سیراب تهي متکلمین کي خشک و درشت و ناتراشیدہ تحریر سے نفرت اختیار کي — یهه لوگ اپني تحریر کي طرز کي طرف به نسبت مضمون کے زیادہ تر متوجهه تهے — وہ لاطینیت کي اصلاح میں کامیاب هوئے لیکن فلسفه کي اصلاح کا اُنهوں نے کبهي حوصله بهي نه کیا *

اس وقت میں بیکن نے میدان میں قدم رکھا — اسبات کا کہنا جیساکہ اکثر کہا گیا ہی محض غلط ہی کہ یہہ اول شخص تھا جو فلسفہ ارسطاطالیس کے مقابلہ کے واسطے جبکہ اُسکا نیر اقبال اوج پر تھا اُٹھا تھا — فلسفہ مذکورہ کے اعتبار و استناد کو جیساکہ ہمنے اُوپر بیان کیا ہی بیکن کے پیدا ہونے سے پہلے ہی سخت صدمہ پہنچ چکا تھا — اکثر لوگوں نے جن میں راموس نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہی تھوڑے ہی عرصہ پیشتر نئے فرقوں کے قایم کرنے کی کوشش کی تھی — لوتھر کے زمانہ میں جو عام خیالات شایع تھے وہ خود بیکن ہی کی تحریر سے صاف صاف منکشف ہیں — اس انقلاب عظیم میں بیکن کی کارروائی بونا پارٹ کی کارروائی سے مشابہ تھی نہ کہ رابسپیر کی کارروائی سے - قدیمی نظم و نسق تہ و بالا ہوگیا تھا — بعض ذی حمیت اشخاص نے سلطنت اریا افتادہ کی یادگاری کو کمال وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھہ اب بھی اپنے دلوں میں جگہہ دے رکھی تھی اور اُسکے ازسرنو قایم کرنے کے واسطے اپنے امکان و مقدور کے موافق بہت کوشش کی — لیکن جمہور کے یہہ خیالات نہ تھے — آزاد ہوکر مگر اُس آزادی سے مستفید ہونے کے طریقہ کی ناواقفیت کے باعث اُنہوں نے کوئی معین اور منتظم طریقہ نہ اختیار کیا اور کوئی لایق سردار اور ہادی اُنکو نہ ملا *

بالآخر یہہ ہادی پیدا ہوا — جس حکمت کی اُسنے تلقین کی وہ محض نرالی تھی — اساتذہ اور حکماے سابقین کے فلسفہ سے یہہ فلسفہ طرز میں ہی نہیں بلکہ مقصود میں بھی مختلف تھا — مقصود اسکا نوع انسان کی بہبودی ( اُس معنی میں جو لفظ بہبودی سے لوگوں نے ہمیشہ مراد لئے ہیں اور ہمیشہ مراد لینگے ) تھی *

فلسفہ جدید اور فلسفہ قدیم کا فرق باہمی ہماری دانست میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھہ اور کسی طرح پر بیان نہیں ہوسکتا کہ بعض علوم مفیدہ کے باب میں بیکن اور افلاطون کے خیالات کا آپس میں مقابلہ کریں — افلاطون کو ہمنے اس واسطے منتخب کیا ہی کہ ہماری دانست میں سب سے زیادہ اس شخص نے گروہ حکما کے دماغوں اور طبیعتوں کو اُس میلان کے حاصل کرنے میں اثر بخشا ہی جو اُس وقت تک موجود تھا جبکہ بیکن نے اُنکو ٹھیک ٹھیک مخالف سمت میں ایک تازہ حرکت دی *

یہہ عجیب بات ہی کہ اِن نامی شخصوں نے ہر قسم کے علم کی قدر و خوبی کا اندازہ کس قدر مختلف نگاہ سے کیا تھا — مثلاً علم حساب کو لیجیئے — افلاطون ہلکی زبان سے اُس آسانی کا ذکر کرکے جو معاملات روز مرہ میں حساب کتاب کے جاننے سے حاصل ہوتی ہی اُس فائدہ کے بیان کی طرف متوجہہ ہوا ہی جسکو وہ اپنے نزدیک سب سے بڑا اور افضل سمجھتا ہی — اُسکا بیان ہی کہ حقایق اعداد کا مطالعہ دماغ کو صدق خالص کے تخیل کا عادی کرتا ہی اور اشیاے ذی مادہ و جسم سے ہمکو بالاتر کرتا ہی — وہ اپنے شاگردوں کو

اُس علم کے حاصل کرنے کي هدایت کرتا تها نه اس سبب سے کہ اُن میں خرید و فروخت یا مادہ آجاوے یا دوکاندار اور بساطي بننے کي قابلیت پیدا کریں بلکہ اس واسطے کہ اپنے خیالات کو اس مرئي اور محسوس دنیا کے هر لحظه تغیر پذیر منظر سے منقطع کرکے غیر متغیر اور غیر متبدل حقایق موجودات کي طرف رجوع کریں •

برخلاف اسکے بیکن کے نزدیک اس علم کي قدر و منزلت صرف اُسکے اُن فوائد کي وجہ سے تهي جو اُس مرئي اور محسوس دنیا سے علاقه رکهتے تهے جو افلاطون کي نظروں میں اسقدر ذلیل تهي — بیکن افلاطون کے مقلدان متاخرین کے پر اسرار علم حساب کا ذکر حقارت کے ساتهه کرتا هی اور اسبات کا افسوس کرتا هی کہ اُن قوتوں کو جنکا کامل عمل معتدبہ فوائد کے واسطے درکار هی محض شوق و عجائب پسندي کے شغلوں میں استعمال کرنے کا میلان طبع انسان میں پایا جاتا هی — وہ حساب دانوں کو صلاح دیتا هی کہ اِن واهیات باتوں کو چهوڑ دو اور ایسے آسان آسان قاعدوں کے بنانے میں مصروف هو جو علوم طبعي کي تحقیقات میں کارآمد هوں •

جس بنا پر کہ افلاطون نے علم حساب کي تحصیل کي هدایت کي تهي اُسي بنا پر علم هندسہ کي تحصیل کي هدایت کي تهي — وہ لکهتا هی کہ عام مهندسین میرا کہنا نہیں مانینگے — اُنکي مدنظر همیشه عمل رهتا هی — وہ یہہ نہیں جانتے کہ اصل کام علم هندسہ کا یہہ هی کہ انسانوں کو مجرّد موجود بالذات اور لایزال صدق کي علم و ماهیت کي طرف رهنمائي کرے — اگر پلوٹارک کا اعتبار کیا جاوے تو اس میں کچهه کلام نہیں هی کہ افلاطون نے اس خیال کو یہاں تک وسعت دي تهي کہ علم هندسہ سے کوئي مفید خلایق کام نکلنے سے اُسکي تذلیل سمجهتا تها — ارکیطاس مهندس نے علم هندسہ کے اُصول پر عظیم‌الشان کلیں بنائیں تهیں - افلاطون نے یہہ سنکر اپنے دوست کو فہمایش کي اور سمجهایا کہ ایسا کرنا ایک عالي قدر دماغي مشق کو ایک ذلیل هنر اور پیشه کي طرف تحویل کرنا هی جو صرف لوهاروں اور بڑهیوں کے قابل هی — اُسنے بیان کیا کہ علم هندسہ کا کام دماغ کي تربیت هی نہ حوائج جسماني کا پورا کرنا — افلاطون کے اس کہنے سننے کا پورا اثر هوا کیونکہ حسب بیان پلوٹارک کے علم جرّ ثقیل کو اُس وقت سے مَرد ذي عقل و حکمت کے ناقابل توجهه خیال کرنے لگے •

کچهه مدت بعد ارشمیدیس نے ارکیطاس کي تقلید کي اور اُس سے فوق لے گیا — لیکن ارشمیدیس بهي اُس زمانہ کے اس عام خیال سے خالي نہ تها کہ علم هندسہ کو کسي مفید کام میں استعمال کرنے سے اُسکي تحقیر و تذلیل هی — بڑي مشکل سے وہ نظري استفادہ سے عملي استفادہ کي طرف راغب هوا تها — وہ اپني اُن ایجادوں سے جنہوں نے مخالف قوموں کو تحیر میں ڈالدیا تها قریب قریب نادم تها اور همیشه اُنکو براہ حقارت وہ کهیل

اور مشغلہ بیان کرتا تھا جنکو مہندس اپنے علم کے اعلی تر اجزا پر محنت شاقہ اُتھاکر اپنے دماغ کو آرام و آسایش دینے کے واسطے اختیار کرتا ھی *

اس مضمون پر بیکن کی راے حکماے متقدمین کی راے کے بالکل ضد تھی — اُسکے نزدیک علم هندسہ اُن فوائد هي کي جہت سے بالخصوص قابل قدر تھا جو افلاطون کي نظر میں اسقدر حقیر تھے — یہہ تعجب بات ھی کہ جسقدر بیکن کي عمر زیادہ هوتي گئي اُسیقدر یہہ خیال ترقي پکرتا گیا — سنہ ۱۶۰۵ ع میں جب اُسنے ترقي علم پر دو کتابیں لکھي تھیں تو اُسنے اُن فوائد پر بحث کي تھي جو بني آدم کو ریاضیات مرکب سے حاصل ھوئے ھیں لیکن معاً اسکے اُسنے اسبات کو تسلیم کیا ھی کہ وہ مفید اثر جو علم ریاضي کي تحصیل عقل و ذھن پر پیدا کرتي ھی گو وہ ایک ضمني فائدہ ھی مقصود اصلي سے کنچھہ کم رتبہ نہیں رکھتا ھی — لیکن معلوم ھوتا ھی کہ اُسکے اِن خیالات میں تبدیلي واقع ھوگئي تھي — جب بیس برس بعد اُسنے کتاب ڈي آگمینٹس کو اپنے پہلے مضمون ترقي علم کے باب میں کسیقدر شرح و بسط کے ساتھہ لکھا تو اُس میں ریاضیات کے بیان میں بہ نسبت سابق کے بہت زیادہ ترمیم کي اور مہندسین کے بڑے بڑے اور ناواجب دعووں کي نسبت سخت اعتراض کیا — موضوع علم کا نوع انسان کي بہبودي فرض کرکے اُسنے یہہ راے قایم کي کہ علم ریاضي اس سے زیادہ اور کسي رتبہ کا مستحق نہیں ھی کہ وہ دیگر علوم کے ایک ضمیمہ اور مددگار کي حیثیت رکھتا ھی — اُسکا بیان ھی کہ علم ریاضي فلسفہ طبعي کا ایک خادم ھی اور اسي حیثیت سے اُسکو رھنا چاھیئے مگر معلوم نہیں ھی کہ کس منحوس اتفاق کي جہت سے وہ اپنے تئیں اپنے آقا پر ترجیح اور فوقیت رکھنے کا مستحق سمجھنے لگا ھی — وہ ایک ایسي پیشین گوئي کرتا ھی جسکو سنکر افلاطون کے رونگتے کھڑے ھوجاتے یعني طبعیات میں جسقدر زیادہ تحقیقاتیں ھوتي جائینگي اُسیقدر ریاضیات مرکبہ کي فروع بڑھتي جائینگي — اُس ضمني فائدہ کي نسبت جسکہ بیس برس پہلے اُسنے اسقدر وقعت دي تھي اُسنے ایک لفظ بھي نہیں لکھا — یہہ بات سہواً نہیں ھوسکتي کیونکہ خود اُسکي کتاب اُسکے سامنے موجود تھي — اُس کتاب سے اُسنے مضمون مؤید تحصیل ریاضیات خالص کو عمداً خارج کردیا اور علم مذکور کے سرگرم حامیوں پر اکثر مقامات میں طنز کي ھی — اس امر کي ھمارے نزدیک صرف ایک تاویل ھوسکتي ھی — اُن اشغال کي پسندیدگي جو علانیہ مفید بہبودي انسان ھیں اور اُن علوم کي نفرت جو محض شوق پر مبني ھیں بیکن کے دل میں بڑھتي گئي ھوگي اور ممکن ھی کہ حد اعتدال سے بھي متجاوز ھوگئي ھو — اُسکو اندیشہ تھا کہ مبادا میري زبان سے کوئي ایسا کلمہ نکلے جو کسي ذي ھوش آدمي کے ایک گھنٹہ کو بھي جو موالید ثلاثہ پر انسان کي سلطنت اور حکومت کي توسیع میں کام آسکتا ھو کسي ایسے مطالعہ میں استعمال کرنے کي ترغیب دینے پر محمول کیا جاے

جو صرف مطالعہ کنندہ هي کے دماغ کو مفید هی — اگر ہمنے نے اس جگہہ غلطي کي تو هم اُسکي اِس غلطي کو افلاطون کي متضاد غلطي پر بہت زیادہ ترجیح دیتے هیں — هم ایسے فلسفہ سے راضي نہیں هیں جو اُن خاتونان رومي کي مانند جو اپني خوبصورتي اور چمک دمک کے برقرار رکھنے کے واسطے مسقطات کا استعمال کرتي تهیں بخوف جاتے رهنے وضعداري کے عقیم رهنا پسند کرے *

اب علم هیئت کو لیجیئے — یہہ علم منجملہ اُن علوم کے هی جنکے سیکھنے کي افلاطون نے اپنے شاگردوں کو بالتخصوص هدایت کي تهي لیکن اُن وجوهات کے ساتهہ جو عام قاعدہ تخیال سے بالکل مختلف تهیں — سقراط نے اپنے ایک نوجوان دوست گلاکن سے دریافت کیا کہ آیا همکو علم هیئت کو بهي علوم درسیہ میں داخل کرنا چاهیئے یا نہیں — اُسنے جواب دیا کہ میرے نزدیک مناسب هی کیونکہ موسموں مہینوں اور سالوں کي بابت واقفیت حاصل هوني جنگي مطالب کے واسطے اور نیز زراعت اور جہازراني کے حق میں مفید هی — یہہ سنکر سقراط کہنے لگا کہ مجھکو اسبات کے دیکھنے سے بڑي هنسي آتي هی کہ تم ڈرتے هو کہ کہیں عوام‌الناس کے نزدیک بے مصرف تعلیمات کے ساعي هونے کے ملزم نہ بنو — اسکے بعد اُسنے ایسي بلیغ اور شستہ تقریر میں جو بقول سسرو کے جو پطر ( یعني خدائے یونانیان ) هي کي زبان سے نکلتي اگر جو پطر یوناني زبان بولتا هوتا اس امر کا بیان کیا هی کہ علم هیئت کا کام عام عیش‌هائے زندگي کے بہم پہنچنے میں اعانت کرنے کا نہیں هی بلکہ یہہ کام هی کہ ذهن کو اُن چیزوں کے خوض و مطالعہ کي طرف رسائي دے جو محض عقل سلیم هي سے مدرک هوسکتي هیں — سقراط کے نزدیک اجرام فلکي کے واقعي حرکات کا علم چنداں وقعت نہیں رکھتا هی — وہ صورتیں جو رات کے وقت آسمان کو زیب و زینت بخشتي هیں اُنکي تشبیہہ اُسنے اُن اشکال سے دي هی جو کوئي مہندس زمین پر کھینچ لے گویا وہ مثالیں هیں اور ضعیف دماغوں کے واسطے ایک محض اعانت هیں — همکو اُن سے مستغني هونا چاهیئے — همکو اُنہیں بهول جانا چاهیئے — همکو ایک ایسا علم هیئت حاصل کرنا چاهیئے جو حقیقي ستاروں سے ایسا هي خارج هی جیساکہ هندسي صدق کسي بد صورت شکل کے اضلاع و خطوط سے خارج و مستغني هوتا هی — هم خیال کرتے هیں کہ یہہ علم هیئت اگر ٹهیک ٹهیک نہیں تو قریب قریب وهي علم هیئت هی جسکي تشبیہہ بیکن نے پرامثیوس کے بهل سے دي هی — ایک چکنا چپڑا خوبصورت چرسا کوزے کرکٹ سے بهرا هوا دیکھنے میں بہت اچها لیکن کهانے کي چیز ندارد — اُسکو اسبات کي شکایت اور افسوس تها کہ علم هیئت کے حق میں بڑا نقصان یہہ هوا کہ طبعیات کي سلطنت سے جسکا وہ ایک عمدہ ترین صوبہ تها علیحدہ کرکے اُسکو ریاضیات کي قلمرو میں ملالیا هی — وہ لکھتا هی کہ دنیا کو ایک نہایت مختلف علم هیئت کي ضرورت تهی —

ایک زندہ علم ھیئت کي — ایک ایسے علم ھیئت کي جو اجرام فلکي کي ماھیت حرکت اور تاثیرات کو قرار واقعي بتادے *

تمام انساني ایجادوں میں جو سب سے بڑي اور سب سے زیادہ مفید ایجاد ھی یعني حروف تحریري کي ایجاد اُسکو افلاطون نے کچھہ بہت خاطر جمعي کي نظر سے نہیں دیکھا — اُسکا خیال یہہ معلوم ھوتا ھی کہ حروف کے استعمال نے انساني دماغ پر وہ عمل کیا ھی جو لکڑي کا استعمال پاؤں چلنا سیکھنے میں یا مشکیزہ کا استعمال تیرنا سیکھنے میں انساني جسم پر کرتا ھی — اُسکي راے میں یہہ ایک قسم کا سہارا تہا جسکے وہ لوگ جنھوں نے اُس سے استعانت کي نہي بہت جلد عادي ھوگئے اور جسکے چھوڑ نے میں سخت جد و جہد کرنا ابتداءً فضول اور انتہاءً محال ھوگیا — اُسکا خیال تہا کہ قویٰ عقلي بغیر اس فریب دھندہ مدد کے زیادہ مکمل اور مرتب ھوجاتے — آدمیوں کو بمجبوري اپنے فہم اور حافظہ سے کام لینا پڑتا اور سخت اور عمیق غور و خوض کے ذریعہ سے حقیقت حال سے کماحقہ واقف ھوجاتے — اب برخلاف اسکے کاغذ پر تو بہت سا علم لکھا ھوتا ھی مگر دل پر کم منقش ھوتا ھی — آدمي کو اطمینان ھوتا ھی کہ جب ضرورت ھوگي تو ایک لمحہ‌بھر میں اطلاع حاصل کرلوں گا — اسي بھروسے پر اُس علم کو اپنے دل سے محو ھونے دیتا ھی — سچ پوچھو تو ایسا آدمي کسي چیز کا جاننے والا نہیں کہا جاسکتا ھی — اُس میں مجازي عقل ھوتي ھی مگر حقیقي نہیں ھوتي — ان خیالات کو افلاطون نے ایک پرانے بادشاہ مصر کي زباني ظاھر کیا ھی — لیکن قرینہ سے معلوم ھوتا ھی کہ یہہ اُسکے ذاتي خیالات تھے اور یہي گمان اُنکي نسبت کونکتلین نے کیا تہا — اس میں کچھہ شک نہیں ھی کہ یہہ خیالات سارے نظام افلاطوني سے مطابقت تام رکھتے ھیں *

بیکن کے خیالات جیساکہ آساني سے ذھن میں آسکتا ھی اس سے بدرجہا اختلاف رکھتے تھے — اُسکا بیان ھی کہ حافظہ کي قوت بدون استعانت تحریر کے کسي مفید علم کي ترقي میں بہت کم مدد دے سکتي ھی — وہ اس بات کے امکان کو تسلیم کرتا ھی کہ قوت حافظہ کو اِس درجہ ترقي دي جاوے کہ نہایت عجیب و غریب کرتب دکھا سکے — لیکن ایسے کرتب اُسکے نزدیک کچھہ بڑي وقعت نہیں رکھتے ھیں — وہ لکھتا ھی کہ میرے دل کي یہہ کیفیت ھی کہ میرے نزدیک کسي کمال کي گو کیسا ھي عجیب ھو قدر نہیں ھوتي تاوقتیکہ اُس سے انسانوں کو عملي فائدہ نہ حاصل ھوتاھو — حافظہ کے ان عجیب و غریب کرتبوں کو اُسنے بازیگروں اور رسي پر ناچنے والوں سے مثال دي ھی اور بیان کیا ھی کہ یہہ دونوں کرتب قریباً ایک ھي قسم کے ھیں — ایک میں قویٰ جسماني کا بیجا استعمال ھی دوسرے میں قویٰ دماغي کا بیجا استعمال ھی — دونوں کے دیکھنے سے شاید ھمکو حیرت ھو مگر قدر و منزلت کا دونوں میں سے ایک بھي مستحق نہیں ھی *

علم طب کے فوائد افلاطون کے نزدیک مشتبهه تهے — اُن عارضوں میں جو دفعتاً عارض هوتے هیں یا اتفاقیه صدموں میں علاج کرنا اُسکے نزدیک البته قابل اعتراض نه تها — لیکن وه فن جو امراض مزمنه کي بتدریج ترقي کو روکے جو اُن اجسام کي اصلاح کرے جنکو عیاشي نے کمزور کردیا هو پر خوري نے پهلا دیا هو یا شراب خواري نے چور کردیا هو وه فن جو عیاش کي قدرتي سزا کو کم کردینے سے عیاشي کي ترغیب دے اور عقل کي قوت کے بالکل زایل هوجانے کے بعد زندگي کو بڑهادے ایسا فن طبابت اُسکي توجهه اور قدرداني سے دور تها — اُس زندگي کو جو باعانت طب بڑهادي گئي هو اُسنے ایک لمبي موت قرار دیا تها — اُس کا قول هی که فن طبابت کو اُس حد تک جایز و روا رکهنا چاهیئے جب وه اُن آدمیوں کے اتفاقیه امراض کے معالجه میں کام آوے جنکے قوی اچهے هیں — جنکے قوی خراب هیں اُنکو مرجانے دینا چاهیئے خس کم جهاں پاک — ایسے آدمي نه تو لڑائي کے قابل هیں نه حکومت کے لایق هیں اور نه اپنے خانگي معاملات کے بندوبست کرنے یا محنت طلب مطالعه اور غور و خوض کي قابلیت رکهتے هیں — اگر کسي سخت دماغي محنت میں مشغول هوتے هیں تو اُنکي طبیعت پریشان هوجاتي هی اور سر میں چکر آنے لگتے هیں اور اِن سب باتوں کو فلسفه کي طرف منسوب کرتے هیں — ایسے بد بخت لوگوں کے حق میں سب سے بهتر بات یهه هی که دفعتاً زندگي سے کناره کش هوں — حکیم مذکور اپنے اِس عقیده کي تائید میں یونان کے پرانے قصوں سے دلیل لاتا هی اور اپنے شاگردوں کو یاد دلاتا هی که ایسکیولیپیس کے لڑکوں کي طبابت حسب روایت هومر کے صرف بیروني عوارض کے معالجات پر محدود تهي *

بیکن کا فلسفه اس سے کوسوں دور تها — جمیع علوم میں جس علم پر سب سے زیاده توجهه اُسنے مبذول کي تهي وه وهي تها جو افلاطون کے نزدیک ایک شایسته جماعت میں قابل ترویج نه تها — انسانوں کو کامل کردینا بیکن کي تجویز سے متعلق نه تها — اُسکا ناچیز و حقیر منشاء غیر مکمل آدمیوں کو آسوده کرنے کا تها — اُسکے فلسفه کا فیض خدای ربالعالمین کے فیض و رحمت سے مشابهت رکهتا تها جسکا آفتاب بُرے اور بهلے پر برابر چمکتا هی اور جسکا مینهه پاک اور ناپاک پر یکساں برستا هی — افلاطون کي راے میں انسان حکمت کے واسطے پیدا کیا گیا هی بیکن کي راے میں حکمت انسان کے واسطے بنائي گئي هی یعني حکمت ایک مقصد خاص کے حصول کا ذریعه هی اور وه مقصد اُن کروڑها بني آدم کے عیشوں کا بڑهانا اور مصیبتوں کا گهٹانا هی جو خود حکیم نهیں هیں اور نهوسکتے هیں — ایک ضعیف‌الجثه اور دایم‌المرض آدمي کو جسکو اپني سواري میں بیٹهکر سیر کرنے سے خوشي هوتي هو جسکو مرغي کے شوربے اور اپني هلکي شراب اور پاني هي میں لذت ملتي هو اور جسکو ملکهٔ نوار کے قصوں هي سے لطف دلي حاصل هوتا هو اس بنا پر واجب‌الموت

قرار دينا که وہ کتاب ثايميس کو بغير درد سر کے نهيں پڑہ سکتا ايک ايسا خيال تها جسکو انگريزي مدرسه حکمت کي رحيمانه طبيعت نے يک لخت خارج کرديا — بيکن کے نزديک يهه کام حکماء کے رتبه اور وقر کے نامناسب نه تها که ايسے قايم المرض آدمي کي آسايش کے واسطے کوئي نئي قسم کي کرسي تيار کريں يا اُسکي دوا کے زيادہ خوش گوار هونے کي کوئي ترکيب سوچيں يا کوئي ايسي غذا تجويز کريں جس سے اُسکو لذت حاصل هو اور ايسے تکيئے ايجاد کريں جن پر وہ آرام سے سوئے گو اس بات کي ذرا بهي توقع نهو که اس بيچارہ مريض کا دماغ خيالي خوبي اور وهمي نيکي کے تخيل کي طرف کبهي مايل و متوجهه هوگا — جس طرح که افلاطون نے فن طبابت کي اشاعت عام کي نامناسبت پر يونان کے مذهبي افسانوں سے استدلال کيا تها اسي طرح بيکن نے فن مذکور کي وقعت و عظمت کو حضرت مسيح کي نظير سے ثابت کيا هي اور لوگوں کو ياد دلايا هي که روح کے اُس بڑے طبيب نے جسم کي طبابت اختيار کرنے سے بهي نفرت نهيں کي تهي *

جب هم علم طب سے گذر کر قانون کي طرف آتے هيں تو هم اِن دو بڑے آدميوں کے طريقوں ميں وهي اختلاف پاتے هيں — افلاطون نے اپني اُس تقرير کے آغاز ميں جو قانون کے باب ميں هي بطور ايک اصل اُصول کے يهه بات قرار دي هي که ليجسليشن يعني علم توضيع قوانين کا مقصد انسانوں کو نيک بنانے کا هي — اُن لغو اور بيهودہ نتايج کا بيان کرنا فضول هي جو اس مقدمه سے پيدا هوتے هيں — بيکن کو بخوبي معلوم تها که هر جماعت کي بهتري اُسکے اراکين کي صلاحيت اور نيکي پر کس درجه تک منحصر هي اور وہ يهه بهي جانتا تها که نيکي اور صلاحيت کي ترويج کي غرض سے مقنن لوگ کيا کرسکتے هيں اور کيا نهيں کرسکتے هيں — وہ راے جو علم توضيع قوانين کے مقصد اور اُس مقصد کے حصول کے اصلي ذريعوں کي نسبت اُسنے دي هي همکو بالخصوص عمدہ معلوم هوتي هي گو اُسکي تصنيفات ميں اُس قسم کے اَور بهي عمدہ عمدہ کلم هيں — موضوع علم مذکور کا انسانوں کي بهبودي هي اور اُسکے حصول کے ذريعے يهه هيں — مذهبي اور اخلاقي تعليم کا دينا — باهر کے دشمنوں سے محافظت کے واسطے جو چيز ضروري هو اُسکا مهيا کرنا — اندروني انتظام کا قايم رکهنا — ملکي مالي اور تجارتي انتظام کا مقرر کرنا جس کے باعث سے دولت کو ترقي اور لوگوں کو امن و عيش نصيب هو *

طرز انضباط قوانين کے باب ميں بهي اِن يوناني اور انگلستاني حکيموں کے باهم ايک عجيب اختلاف هي — افلاطون کے نزديک قوانين سے پهلے تمهيد لازمي هي بيکن اُسکو مضر خيال کرتا هي — هر ايک کي راے اپنے خيال کے موافق ٹهيک هي — افلاطون علم قوانين کا موضوع انسان کي اخلاقي اصلاح کو تصور کرکے يهه واجبي نتيجه نکالتا هي که وہ قانون جس ميں صرف حکم اور دهمکي هو اور جو نه تو سمجهه پر اثر کرے اور نه دل پر موثر هو

ایک نہایت هي غیر مکمل قانون هوگا — کسي ایسے آدمي کو ڈراکر چوري سے باز رکھنے سے جو دل میں چور بنا رهے یا کسي ایسے بیٹے کو اپني ماں کو مارنے سے روکنے سے جسکے دل میں اپني ماں کي نفرت هنوز موجود هو افلاطون کي خاطر جمعي نه تهي — جس فرماں برداري کي اُسکي راے میں سب سے بڑي وقعت تهي وہ وہ فرماں برداري تهي جسکو کوئي سمجهه دار آدمي معقول هوکر اور کوئي نیک طینت اور سلیم‌الطبع آدمي حسب مقتضاے صلاحیت کے اختیار کرتا هی — اُسکا خیال بلاشک یهه معلوم هوتا هی که هر قانون سے پہلے ایک پر اثر اور پر بلاغت نصیحت درج کرنے سے تعزیري احکامات کي بهت زیادہ ضرورت نرهیگي — بیکن ایسے خیالي پلاؤ نہیں پکا جانتا تها اور قاعدہ مجوزہ افلاطون کي عملي دشواریوں سے بهي وہ خوب واقف تها ۞

اِن نامي آدمیوں میں سے جنکا همنے مقابله کیا هی هر ایک نے اپنے اپنے طریقه کو ایک فلسفیانه فرضي قصے کے پیرایه میں ظاهر کرنے کا ارادہ کیا تها اور دونوں اپنے اپنے قصوں کو ناتمام چهوڑ گئے — اگر افلاطون اپني کتاب کریٹایس کے ختم هونے تک زندہ رهتا تو اُسکو بیکن کي کتاب نیوایٹلینٹس سے مقابله کرنے سے غالباً همکو اور بهي زیادہ عجیب و غریب اور متضاد نظیریں دستیاب هوتیں ۞

بطور خلاصه کے همکو یهه کہنا چاهیئے که فلسفه قدیم کا منشاء انسان کو فرشته بنانا تها — فلسفه جدید کا منشاء انسان کي احتیاجات کا رفع کرنا تها جب تک که وہ انسانیت کي حالت میں رهے — فلسفه قدیم کا مدعا همکو ذلیل اور ناچیز احتیاجات سے مستغني کرنا تها — فلسفه جدید کا مدعا هماري اُن ذلیل اور ناچیز احتیاجوں کا پورا کرنا تها — منشاء اول‌الذکر شریفانه تها لیکن آخرالذکر ممکن‌الحصول تها — اس میں کچهه شک نہیں هی که افلاطون کمان اچهي کهینچتا تها لیکن ورجل کے اسسٹیس کي مانند ستاروں کو تاکتا تها اور اس باعث سے گو قوت اور هنر کي کچهه کوتاهي نه تهي تیر بیکار جاتا تها — بیکن نے ایک ایسے تودہ کو تاکا تها جو زمین پر واقع تها اور تیر کي زد میں تها اسلیئے تیر بہدف بیٹها — افلاطون کا فلسفه لفظوں میں شروع اور لفظوں هي میں ختم هوا — لفظوں کي خوبي اور عمدگي میں کچهه کلام نہیں هی — لفظ بےشک ایسے هي تهے جنکي توقع ایک ایسے شخص سے هوسکتي تهي جو علم و فهم میں یکتاے زمانه هو اور خوب ترین زبانهاے انساني پر حاوي هو — بیکن کا فلسفه تحقیقاتوں اور تجربوں سے شروع هوا اور فنون میں منتج هوا ۞

حکماے قدیم کا دعوی یهه تها که همارا فلسفه انسانوں کے دلوں اور دماغوں کو ایک اعلی درجه کي عقل و صلاحیت کے واسطے مرتب کرتا هی — فی‌الحقیقت یهي ایک عملي نفض تها جسکے پهنچانے کا ان میں سے بڑے بڑے اساتذہ نے دعوی کیا تها اور اگر اُنکا یهه دعوی عملي

و ظہور میں آتا تو بلاشبہہ اُنکا یہہ کام زیادہ تعریف و توصیف کا مستحق ہوتا بہ نسبت اسکے کہ وہ مفید ترین ادویات دریافت کرتے یا قوي ترین کلیں ایجاد کرتے — لیکن حقیقت حال یہہ ہی کہ اُن اُمور میں بھي جن میں وہ انسان کو کسیقدر نفع پہنچانے کا دعوی رکھتے تھے اُن اُمور میں بھي جنکي جِہت سے اُنھوں نے تمام فوائد عامہ انسان کو نظر انداز کردیا تھا اُنھوں نے کچھہ نہیں کیا بلکہ نہ کرنے سے بدتر کیا — اُنھوں نے ممتنع‌الحصول چیزوں کا وعدہ کیا اور ممکن‌الحصول باتوں کو حقیر سمجھا اُنھوں نے دنیا کو بڑے بڑے لفظوں اور لمبي لمبي داڑھیوں سے بھر دیا اور جیسا خراب و جاھل اُسکو پایا تھا ویساھي اُسکو چھوڑ گئے *

مڈل‌سیکس † کي ایک ایکڑ زمین یوٹوپیا ‡ کي ایک ریاست سے بھتر ھی — ذراسا بھي عملي فائدہ مقالات کے بڑے بڑے وعدوں سے بھتر ھوتا ھی — فرقہ استویک کا حکیم بمقابلہ دخاني کل کے بلاشبہہ ایک زیادہ عالي قدر شی ھی — مگر دخاني کلیں موجود ھیں اور فرقہ استویک والا حکیم ھنوز پیدا ھونے والا ھی — وہ فلسفہ جو انسان کو درد و تکلیف کي حالت میں راحت کامل بخشے اُس فلسفہ سے بھتر ھی جو اُس درد و تکلیف کو رفع کرے — لیکن ھمکو ایسے معالجات معلوم ھیں جو درد کو دور کرتے ھیں اور ھم یہہ بھي جانتے ھیں کہ حکماے قدیم دانت کے درد کو ایسا ھي ناپسند کرتے تھے جیسے اُنکے پروسي ناپسند کرتے تھے — وہ فلسفہ جو لالچ اور طمع کو انسان کے دل سے دور کردے اُس فلسفہ سے بےشک بھتر ھی جو حفاظت مال کے واسطے قوانین وضع کرے — لیکن ایسے قوانین کا وضع کرنا ممکن ھی جن سے بدرجہ غایت مال کي حفاظت عمل میں آئے مگر یہہ بات سمجھہ میں نہیں آتي کہ وہ طریقے جو حکماے قدیم نے مہیا کئے ھیں طمع کو کس طرح دور کرسکے ھونگے — یہہ بھي ھمکو معلوم ھی کہ وہ حکما اور لوگوں سے کچھہ فضیلت نہیں رکھتے تھے — دوست اور دشمن دونوں کي شہادت سے ایپکٹیٹس اور سنیکا کے اعترافات سے اور نیز لوشین کي تعریضات اور جووینل کے سخت طعنہ و تشنیع سے صاف ظاھر ھی کہ یہہ معلمان صلاح و تقوی اور لوگوں کے سے جملہ عیوب رکھتے تھے اور ریاکاري کا عیب اُس سے علاوہ تھا — بعض آدمي فلسفہ جدید کي منشاد کو ذلیل اور ادنی خیال کرینگے لیکن اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ ادنی تھي یا اعلی وہ حاصل تو ھوگئي — وہ اس امر سے انکار نہیں کرسکتے کہ ھر سال اُس چیز میں جسکو بیکن نے " ثمر " کے ساتھہ تعبیر کیا ھی اضافہ ھوتا جاتا ھی — وہ اسبات سے انکار نہیں کرسکتے کہ آدمیوں نے اُسکي بتائي ھوئي

---

† انگلستان کے ایک صوبہ کا نام ھی —

‡ ایک فرضي اور خیالي ملک کا نام ھي جسکا ذکر ایک انگریزي مصنف نے اپني کتاب میں لکھا ھی —

راہ میں بہت بڑی ترقی کی ہی اور ترقی کررہے ہیں — ایا حکماے قدیم کے ہاں بھی کوئی ایسی روز افزوں ترقی ہوئی ہی ؟ — آیا اُنکے آٹھہ سو برس کے وعظ نے دنیا کو اُس زمانہ سے بہتر کردیا تھا جبکہ اُنکا وعظ اولاً شروع ہوا تھا ؟ — ہمارا خیال یہہ ہی کہ خود اس جماعت حکما ہي کے اندر بجاے روز افزوں ترقی کے روز افزوں تنزل رہا ہی — لایعقل اور مہمل عقاید اور باطل اوہام نے جن سے دیمقریطوس اور انکسا غورث کو بھی نفرت ہوتی استوٰیک اور افلاطونی مدارس کے بڑھاپے میں اَوْر ذلت بخشی — وہ ناکام کوششیں بولنے کی جو ایک چھوٹے بچے میں ایسی پیاری پیاری اور پسندیدہ معلوم ہوتی ہیں ایک مُسن مفلوج یا لقوہ زدہ شخص میں کیسی نفرت انگیز اور ناپسندیدہ معلوم ہوتی ہیں — اسی طرح وہ خلاف قیاس اور لایعنی مذہبی افسانے جو یونان کی ابتدائی نظم میں ایسے دلچسپ اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں جب فلسفہ یونان کی کبرسنی میں سنے جاتے ہیں تو ہمارے دل میں ایک مرکب جوش افسوس اور نفرت کا پیدا کرتے ہیں — ہم جانتے ہیں کہ توپیں بندوقیں چاتو چُھریاں دوربینیں گھڑیاں اس زمانہ میں اچھی ہوتی ہیں بہ نسبت اِسکے کہ ہمارے باپ کے زمانہ میں تھیں اور ہمارے باپ کے زمانہ میں اچھی تھیں بہ نسبت اِسکے کہ ہمارے دادا کے زمانہ میں تھیں — اس بنا پر ہم اس خیال کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ جبکہ ایک ایسا فلسفہ جسکا دعوی تھا کہ اُسکا مقصد دل و دماغ کی اصلاح اور تربیت ہی بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھہ سیکڑوں برس جاری رہا تو ایک بڑی اخلاقی اصلاح عمل میں آئی ہوگی — لیکن یہہ دیکھنا چاہیئے کہ یہہ بات ہوئی تھی یا نہیں — اس فلسفہ کے اُن مدارس پر نظر ڈالو جو سنہ عیسوی سے چار صدی ماقبل اور سنہ عیسوی سے چار صدی مابعد گذرے ہیں — اُن لوگوں کا آپس میں مقابلہ کرو جو اِن دونوں زمانوں میں مدارس مذکور سے فیض پاکر نکلے تھے — افلاطون کا لبانیوس سے مقابلہ کرو — پیرکلیس کا جولین سے مقابلہ کرو — فلسفہ مذکور اس امرکا اقرار کرتا تھا بلکہ فخر کرتا تھا کہ بجز ایک کام کے اور کسی کام کا وہ نہ تھا — اب یہہ پوچھنا چاہیئے کہ آیا اُسنے اُس ایک کام کو بھی انجام دیا تھا *

فرض کرو کہ جس وقت جستنین نے ایتھنس کے مدرسے بند کردیئے تھے اُس وقت اُن چند باقی ماندہ حکیموں کو جو موجود تھے بلاتا اور اُن سے کہتا کہ اپنے دعوی استحقاق تعظیم عام کو ثابت کرو — فرض کرو کہ وہ اُن سے اسطرح ہم کلام ہوتا کہ جس زمانہ میں سقراط نے فرو طاغورث اور ہیپیس کو لاجواب کیا تھا اُس وقت سے لیکر اب تک ایک ہزار برس گذرے ہیں — اِن ہزار سال کے اندر ہر پشت اور نسل کے لائق لائق آدمیوں نے تمہارے فلسفہ کو تکمیل کو پہنچانے میں انتہا درجہ کی کوشش و جانفشانی کی ذی اقتدار لوگوں نے فیاضانہ اُسکی سرپرستی کی اُسکے جاننے والوں کی عوام الناس نے بڑی قدر و منزلت کی

انساني عقل کي تمام مغز و قوت کو اُسنے اپني طرف کھينچ ليا اور پھر اُس سے کيا فائدہ مرتب هوا — کونسي سودمند بات کي حقيقت سے اُسنے همکو آگاہ کيا هی جو بغير اُسکے هم نهيں جان سکتے تھے — کونسا کام کرنا اُسنے همکو سکھايا هی جو بغير اسکے همکو نهيں آسکتا تھا۔ هم گمان کرتے هيں که ايسے سوالات سمپليشس اور ايپکيورس کو حيران اور لاجواب کرديتے — بيکن کے کسي مقلد سے اگر پوچھا جائے که اِس فلسفه جديد نے انسانوں کے واسطے کيا کام کيا تو اُسکا جواب تيار هوگا که اُسنے عمر کو بڑھا ديا هی — درد و تکليف ميں تخفيف کردي هی — بيماريوں کو کھوديا هی — زمين کي قوت پيداوار کو ترقي دي هی — سمندر کے لوگوں کو امن بخشي هی — لڑائي لڑنے والوں کو نئے هتھيار عطا کئے هيں — بڑے بڑے درياؤں اور نديوں کو ايسے ايسے پلوں سے پات ديا هی جن سے همارے باپ دادا محض ناواقف تھے — بجلي کو آسمان سے زمين پر بغير ضرر رساني کے پهنچا ديا هی — رات کو بوجهه روشني کے دن بنا ديا هی — انسان کي بينائي کو وسعت دي هی — انساني جسم کي قوت بڑھادي هی — حرکت کو تيزي اور آساني بخشي هی — فاصله کو معدوم کرديا هی — آمد و رفت خط و کتابت اور تمام ربط و ضبط اور سب کار و بار کے انجام پانے ميں آساني پيدا کي هی — اسي فلسفه کا طفيل هی که انسان سمندر کي تهه تک جاسکتا هی هوا ميں اُڑ سکتا هی زمين کي پر خطر تهوں کے اندر بحفظ و امن داخل هوسکتا هی زمين کو ايسي گاڑيوں کے ذريعه سے طی کرسکتا هی جو بغير مدد گھوڑوں کے چلتي هيں اور سمندر کو ايسے جهازوں کي وساطت سے عبور کرسکتا هی جو ايک گھنٹه ميں دس ناٹ مخالف هوا ميں چلتے هيں — يهه چيزيں اُسکے پهلوں بلکه ابتدائي پهلوں کي ايک جزو هيں — کيونکه يهه ايک ايسا فلسفه هی جس کو کبھي قيام نهيں اور جو کبھي کمال کو نهيں پهنچتا — اُسکا قانون اور اُصول ترقي هی — جو نقطه که کل نظر نهيں آتا تھا آج اُسکا مقام مقصود هی اور کل اُسکي روانگي کا مقام هوگا *

اِس ميں کچھه کلام نهيں هی که بيکن کے قواے دماغي زبردست اور مختلف* تھے ليکن اُسکي عظيم اور لازوال شهرت کي خاص وجهه يهه هی که اُن سب قوتوں کو بذريعه فهم عام کے کام ميں لايا — اُسکا اُن ذليل چيزوں کو پسند کرنا جو مفيد هوں اور نيک و بد کے عام خيالات کے ساتھه همدردي کرنا اور اُس همدردي کا کشاده دلي کے ساتھه اقرار اور اظهار کرنا يهي باتيں اُسکے خيالات کي تخصيصات ميں سے هيں — اُسکے طريقه ميں ريا و فريب کا نام نه تھا — اُسکے پاس ٹوٹي هڈيوں کے جوڑنے کے واسطے کوئي مرهم و روغن نه تھا — وہ کوئي نازک خياليان نهيں رکھتا تھا اور نه ايسے دلايل و براهين رکھتا تھا جن سے لوگوں کو خلاف قياس باتوں کي ترغيب ديسکے — اُسکو معلوم تھا که آدمي اور حکما لوگ بھي مثل اَوْر آدميوں کے زندگي صحت آرام عزت امن اور دوستوں کي صحبت کو واقعي پسند

کرتے هیں اور موت بیماري درد افلس ذلت خطرہ اور اعزا کي مفارقت کو واقعي ناپسند کرتے هیں — اُسکو معلوم تھا که گو مذهب اِن سب میں اصلاح کرتا هی اور اعتدال بخشتا هی مگر ایسا بہت کم اتفاق هوتا هی که اِن خیالات کو بیخ و بنیاد سے دور کردے اور نه اُسنے اِن خیالات سے رنج و راحت کا یک لخت معدوم هوجانا انسانوں کے واسطے ضروري خیال کیا — سنیکا کي سي نازک خیالیوں یا کریسپس کے سے دلایل و براهین سے اُنکے دور کردینے کا منصوبه بیکن کے دماغ کے مناسب نه تھا — وہ اِس بات کو سمجھه نه سکا که ناموں کے بدل دینے میں جبکه نفس شی کا تغیر محال هو کونسي عقلمندي هی — یہه بات کہنے میں که کورچشمي بھوک وجع مفاصل اور عذاب شکنجه مصیبتیں نہیں هیں اور اس بات سے انکار کرنے میں که تندرستي دولتمندي اور امن اچھي چیزیں هیں کونسي خوبي هی — اِن سب اُمور میں بلحاظ اپني راے کے وہ نه تو اسٹویک نه اپیکیورین اور نه اکیڈمک تھا بلکه وہ شخص تھا جسکو اسٹویک اپیکیورین اور اکیڈمک لوگ اڈیاٹک ( یعني ایک عام آدمي ) کے نام سے ملقب کرتے — ٹھیک یہي وجهه هی که اُسکا نام تاریخ دنیا میں استقدر مشہور و معروف هی — گہري کُھدائي کرنے کي وجهه سے وہ اسقدر بلند اندار اگا سکا — اس وجهه سے که بنیاد کے قایم کرنے کے واسطے وہ طبیعت انساني کے اُن حصوں میں گیا جو پست ترین هیں اور تغیر پذیر نہیں هیں وہ عمارت جو اُسنے بنا کي اسقدر عالیشان اور بلند هوگئي اور ایسے استحکام کے ساتهه قایم هی *

کبھي کبھي همکو یہه خیال آیا هی که ایک دلچسپ فرضي قصه لکھیں جس میں یہه مذکور هو که ایپکٹیٹس اور بیکن دونوں حکیموں کا ایک ایک شاگرد باهم سفر کو نکلے هیں — یہه دونوں شخص ایک گانؤں میں پہنچے اور دیکھا که مرض چیچک کا بہت زور شور هورها هی مکانات کے دروازے بند هیں آمد و رفت موقوف هی مریضوں کو چھوڑ چھوڑ کے لوگ بھاگ گئے هیں مائیں اپنے بچّوں کے سرهانے کھڑي رو رهي هیں — اسٹویک حکیم مضطرب اور پریشان لوگوں کو سمجھانے لگا که چیچک میں کوئي برائي نہیں هی عقلمند آدمي کے نزدیک بیماري بدصورتي موت اور دوستوں کي جدائي کوئي مصیبت نہیں هی — بیکن کے شاگرد نے ایک نشتر نکالا اور ٹیکه لگانا شروع کیا — آگے جاکر اُنہوں نے کان کھودنے والوں کي ایک جماعت کو سخت مصیبت میں مبتلا پایا — بخارات میں دفعتاً آگ لگ جانے سے اکثر لوگ جو کان کے اندر کام کررهے تھے هلاک هوچکے تھے اور پس ماندوں کو اُسکے اندر جانے کي جرأت نه تھي — اسٹویک حکیم نے اُنکو یقین دلایا که ایسا واقعه صرف ایک اتفاقي امر تھا کوئي اندیشه اور تردد کي جگهه نہیں هی — بیکن کے شاگرد نے جسکو کوئي ایسي شسته تقریر میسر نه تھي صرف ایک سیفٹي لمپ ( یعني بچراغ امن ) کے ایجاد کرنے پر قناعت کي — اسکے بعد اُنکو ایک سوداگر ملا جسکا جہاز

تباهي میں آگیا تھا اور کنارہ پر کھڑا ہوا کف افسوس مل رہا تھا — اُسکا جہاز جس میں بیشمار مال و متاع بھرا ہوا تھا اُسي وقت ڈوبا تھا اور ایک هي لمحہ کے اندر کیا وہ متمول و مالدار تھا کیا محض مفلس و قلّاش هوگیا — حکیم استویک اُسکو سمجھانے اور نصیحت کرنے لگا کہ آدمي کو ایسي چیزوں میں جو اپني ذات سے خارج هیں راحت اور خوشي کو تلاش کرنا نہیں چاهیئے اور حکیم ایپکتیٹس کا سارا باب جو اس مضمون پر هی اُسکے سامنے پر زبان پڑھ گیا — بیکن کے شاگرد نے اُسي وقت ایک ڈایونگ بیل ( یعني صندوق غواص ) بناکر پاني میں غوطہ لگایا اور متاع غرق شدہ میں سے قیمتي قیمتي چیزیں لیکر واپس آیا — اس فلسفہ پر خار و فلسفہ پر ثمر اور اِس فلسفہ لفظي اور فلسفہ عملي کے باهمي اختلاف کي بیشمار مثالیں بیان هوسکتي هیں ٭

بیکن پر اِس بات کا الزام لگایا گیا هی کہ اُسنے اُن علوم کے افادہ کو جن سے انسان کي جسماني راحت مترتب هوتي هی مبالغہ کے ساتھہ بیان کیا هی اور فلسفہ اخلاقي کے فوائد کو گھٹاکر بیان کیا هی — اور اِس بات سے انکار نہیں هوسکتا کہ وہ لوگ جو نووم آرگینم اور ڈي آگمنٹس کو پڑھینگے بدون اِس امر پر غور کرنے کے کہ کیسي حالت میں یہہ کتابیں لکھي گئي تھیں اُن میں اکثر باتیں اس قسم کي پائینگے جو اِس الزام کي مؤید هیں — یہہ درست هی کہ گو عملاً اُسنے بسا اوقات بڑي غلطي کي هی اور گو اُسکي تاریخي تصنیفات اور دیگر مضامین اِس امر کے شاهد هیں کہ نظري طور سے بھي اُسکي راے تمدني اخلاق کے اُمور کے باب میں کچھہ بہت مستحکم نہ تھي لیکن ایسے عقلمند آدمي کي ذات سے اِس بات سے ناواقف رهنا بعید تھا کہ هماري بہبودي همارے دماغوں کي اصلاح پر کس درجہ موقوف هی — جس دنیا کي اُسنے خواهش کي تھي وہ کلوں دخاني گاڑیوں عیاش لوگوں اور بدمعاشوں کي دنیا نہ تھي جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا هی — اس قول میں وہ بھي حکیم زینو کي تائید کرتا کہ کوئي جسماني آسایش جو سو بشتوں کي حکمت اور صنعت سے ایجاد هوسکے ایسے آدمي کو هرگز خوشي نہیں پہنچاسکیگي جسکا دماغ هواے نفساني حسد عداوت یا خوف کے مرض میں مبتلا هی — اگر اُس سے بعض اوقات صرف اُنہی فنون و علوم کي طرف جس سے نوع انسان کي خارجي آسایشوں کي ترقي منصور هی افادہ کا خالصتاً منسوب کرنا ظاهر هوا هی تو اِسکي وجہہ صریح هی — یہہ علوم و فنون ناواجب طور پر بےقدر هوگئے تھے اور اهل علم کي توجہہ کے ناقابل متصور هوتے تھے — اکثر هنر اور فنون جو نہایت فائدہ مند تھے اور جن میں بےانتہا ترقي کي گنجایش تھي اهل علم اُن سے غافل هوگئے تھے اورسوناروں لوهاروں معماروں جولاهوں اور عطاروں وغیرہ پر چھوڑدیئے گئے تھے — یہہ بات ضروري تھي کہ اِن فنون کي عظمت کا کماحقہ اظہار کیا جائے اور اِس بات کا علانیہ اشتہار دیا جاوے کہ چونکہ فنون مذکورہ انسان کے رنج و راحت پر ایک قوي

اثر بخشتے هیں لهذا دانا ترین انسان کي توجهه کے ناقابل نهیں هیں — انهي فنون کي مثالوں سے نیکن اپنے أصول کو زیادہ آساني کے ساتهه بیان کرسکا — انهي فنون کي ترقي سے أسکے أصول کي سچّائي نهایت جلد اور نهایت کامل طور سے پایه ثبوت کو پهنچي اور عام لوگوں کي سمجهه میں آ گئي — أسنے ایک عقلمند سپهسالار کاسا کام کیا جو اپني صف کے هر حصه کو هلکا کرکے ایک ایسے مقام خاص کو مستحکم کرتا هی اور تمام قوت وهاں پر مجتمع کرتا هی جهاں غنیم کا حمله نهایت زور شور سے هوتا هی اور جسکے نتیجه پر ساري لڑائي کي هار جیت موقوف هوتي هی — مگر نوومآرگینم میں أسنے صاف صاف اور صحیح صحیح بیان کیا هی که میرا فلسفه جس قدر طبعي هی أسیقدر اخلاقي بهي هی اور گو مثالیں علم طبیعات سے اخذ کي گئي هیں وہ أصول جن کا بیان کرنا أن تشبیهات سے مقصود هی جستدر که حرارت اور نباتات کي ماهیت کي تحقیقات پر قابل اطلاق هیں أسیقدر اخلاقي اور تمدني تحقیقاتوں پر بهي قابل اطلاق هیں *

اخلاقي مضامین پر بهي أسنے بارها لکها هی اور أن میں بهي أسنے ویسي هي روح پهونک دي هی جو أسکے تمام نظام میں پائي جاتي هی — أس دماغي تربیت کے بارہ میں بهي جس سے عمدہ طبایع پیدا هوتي هیں اور جسکو وہ از راہ ظرافت بعض اوقات فلاحت دماغي کہا کرتا تها أسکے بیشمار اقوال موجود هیں — أسکا بیان هی که بعض اشخاص مجهکو ایک ایسي سادہ شي پر محنت صرف کرنے کا ملزم قرار دینگے جسکو متقدمین نے حقیر سمجهکر نظر انداز کردیا تها — أسنے أن لوگوں کو یاد دلایا هی که مینے پہلے هي سے یهه کهدیا هی که میري تحقیقات کي مقصود وہ شي نهیں هی جو تعجب خیز اور تحیر آمیز هو بلکه وہ چیز هی جو مفید اور واقعي هو *

اِس أصول پر ثابت قدم رهکر أسنے اشیا کي قابلیت نیکي کے کامل‌الکفایت هونے اور فطرت انساني کي عظمت کے باب میں کچهه هرزہ سرائي نهیں کي هی — وہ ایسي بلند آواز مهملات میں نهیں پهنسا هی جن سے بولنگبروک نے جلاوطني میں اپنے دل کو تشفي دینے کا دعوی کیا تها یا أس خیالي پلوٗ کي مانند جسکے ساتهه سسرو نے تلیه کے مَرجانے کے بعد تسکین و قرار بیفائدہ تلاش کیا تها — وہ عالمانه موشگافیاں جن میں أس زمانه کے ذهین و ذکي لوگ محو تهے أسکو پسند نه تهیں — أسکي خواهش نهیں تهي که اپنے تئیں أن لوگوں کي سي محنتوں میں مصروف کرے جو یوناني ٹارٹرس یعني جهنم کے لوگوں کے واسطے مقرر کي گئي هیں یعني ایک هي پهئے پر ایک هي کهولتے کے گرد همیشه گهومتے رهنا دهوکه دینے والي خوشیوں کي تمنا میں همیشه منهه کهولے رهنا بے پهندے والے ڈولوں میں لگاتار پاني بهرتے رهنا أسي غیر محدود راسته پر أسي لڑهکنے والے پتهر کے پیچهے پهرتے رهنا — أسنے اپنے تلامذہ کو ایک نهایت مختلف قسم کي تحقیقاتوں کے عمل میں لانے اور

علم اخلاق کو ایک عملي علم تصور کرنے کي هدایت کي تهي یعني ایک ایسا علم جسکا موضوع دماغي امراض و بیقراري کا علاج کرنا هو اور جسکي ترقي أسي کي مانند طریقه سے هوسکتي هو جس سے طب اور جراحي کے فنون میں ترقي هوئي هی — أسکا بیان هی که ماهران فلسفه اخلاقي کو لازم هی که إس بات کے دریافت کرنے میں استقلال کے ساتهه مصروف هوں که انسان کے عادات و اطوار پر خاص طریقه تعلیم سے خاص عادات کے اختیار کرنے سے خاص کتابوں کے مطالعه سے صحبت سے غیرت و حمیت سے اور دیگر اشخاص کي تقلید سے کون کون سے واقعي اثر پیدا هوتے هیں — أس وقت هم أس طریقه تربیت و تعلیم کے دریافت کرنے کي توقع کرسکتے هیں جس سے اخلاقي صحت کا حفظان متصور هو ٭

جسقدر حصه که وه فلسفه طبعي اور فلسفه اخلاقي میں رکهتا تها أسیقدر حصه الهیات میں بهي رکهتا تها — دین عیسوي کا سچّا پیرو تها اور أسکو برحق سمجهتا تها — أسکي کُل تحریرات میں أن چند مقامات سے زیاده بلیغ و پر اثر جو بظاهر ایک قوي جوش مذهبي کے وقت لکهے گئے تهے کوئي چیز نهیں مل سکتي هی — أسنے دین مسیحي کي عظمت کو بیان کرکے أس سے زیاده کامیابي حاصل کي تهي جسقدر حکماے متقدمین نے صرف وعده هي کیا تها — وه مذهب کو رحمدلي کي دستاویز بُري خواهشوں کا روکنے والا مصیبت زدوں کا تسلي دینے والا ضعیفوں اور درماندوں کي دستگیري کرنے والا اور مرنے والوں کا أمید دلانے والا سمجهتا تها — لیکن أن مباحثات مذهبي میں جو خیالي اور لفظي هیں وه کبهي مصروف نهوا تها — مذهب کے معامله میں أسنے جسقدر لکها هی أس سے ایک غیر متعصب اور کشاده دل طبیعت ظاهر هوتي هی — وه هوموشین اور هوماوشین مانوتهلایت اور نیسٹورین کے جهگڑے میں نهیں پهنسا تها — وه ایک ایسے زمانه میں پیدا هوا تها جبکه دقایق دینیات پر تمام یورپ میں سرگرمي کے ساتهه بحث و مباحثے کیئے جاتے تهے اور بالخصوص انگلستان میں — خلاصه یهه هی که أسکا مقام ایک ایسي صف میں تها جهاں آتش جنگ نهایت تیزي سے مشتعل هو رهي تهي — وه سناد آف ڈارت کے زمانه میں موجود تها اور أسکے کان انتخاب و اخراج و استقلال قطعي کا چرچا مهینوں تک سنتے سنتے تهک گئے هونگے — مگر أسکي تصنیفات میں همکو کوئي سطر ایسي نهیں یاد جس سے یهه مستنبط هوسکتا هو که وه کیلونست تها یا آرمنیون — جبکه عالم ایک تکراري فلسفه اور ایک حجتي دینیات کے شور و غل سے گونج رها تها بیکن والا فلسفه مطمئنانه ناطرفداري نیم حقارت نیم فیاضي کي نظر سے دیکهتا تها اور عملي فائده کي مقدار میں اضافه کرنے پر قانع هوکر لفظي مناظرات و مناقشات کو اور لوگوں کے واسطے چهوڑ دیا تها ٭

عام لوگوں کا خیال بیکن کي نسبت یهه معلوم هوتا هی که أسنے نتیجه دریافت کرنے کا ایک نیا قاعده ایجاد کیا تها جسکو استقراء کهتے هیں اور أس بُرهان قیاسي میں جو أسکے

زمانہ سے پیشتر زایم تھی اُسنے کچھہ مغالطہ دریافت کیا تھا — اس خیال کی بنیاد قریباً ایسی ہی جیسی اُن لوگوں کے خیال کی بنیاد تھی جنہوں نے ازمنہ متوسطہ میں ورجل شاعر کو ایک بڑا جادوگر خیال کیا تھا — اکثر آدمی جو زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور ایسے بیہودہ خیالات نہیں رکھتے ہیں اُنکے خیالات بھی اِسبارہ میں کہ بیکن نے دراصل کیا کام کیا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں *

استقرائی قاعدہ پر ابتداے دنیا سے ہر انسان کا عملدرآمد ہی — جاہل سے جاہل گنوار بےفکر سے بےفکر طفل مکتب اور نبز دودہ پیتے بچّہ کا اسی پر مدار ہی — اسی قاعدہ سے گنوار اِس نتیجہ کی طرف رہنما ہوتا ہی کہ اگر میں جو بوؤں گا تو گیہوں نہیں پیدا ہونگے — اسی قاعدہ سے طفل مکتب کو معلوم ہوجاتا ہی کہ ابر والا دن مچھلی پکڑنے کے واسطے موزوں ترین ہی — ہم خیال کرتے ہیں کہ دودہ پیتا بچّہ بھی اسی قاعدہ استقراء سے اپنی ماں یا دایہ سے دودہ کا متوقع ہوتا ہی اور باپ سے نہیں ہوتا ہی *

صرف یہی غیر صحیح نہیں ہی کہ بیکن قاعدہ استقراء کا موجد تھا بلکہ یہہ بھی صحیح نہیں ہی کہ یہی اول شخص تھا جس نے ٹھیک طور سے اُس قاعدہ کی تشریح کی تھی اور اُسکے فوائد کو بیان کیا تھا — ارسطاطالیس نے بہت مدت پہلے اس خام خیالی کو ظاہر کردیا تھا کہ بُرہان قیاسی انسانوں کو کسی نئے اُصول کے دریافت کرنے کی طرف رہنما کرسکتی ہی اور اِس بات کو ثابت کردیا تھا کہ ایسی تحقیقاتیں صرف قاعدہ استقراء ہی سے عمل میں آئینگی اور اِس قاعدہ کی تاریخ بھی مختصراً مگر نہایت سلاست اور درستی کے ساتھہ لکھی تھی *

ہمکو اُس قاعدہ کی خوبی اور صحت میں جو نووم آرگینم کی دوسری جلد میں مندرج ہی کچھہ حجت اور کلام نہیں ہی مگر ہمارا یہہ خیال ہی کہ بیکن نے اُسکی سودمندی کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہی — ہم خیال کرتے ہیں کہ قاعدہ استقراء کے برتاؤ میں مثل اَور قاعدوں کے اِس امر سے کچھہ زیادہ تسہیل نہیں ہوجائیگی کہ آدمیوں کو اُسکے برتنے کا قاعدہ معلوم ہوجاے — ولیم ٹیل کو اگر یہہ معلوم ہوتا کہ اُسکا تیر زمین کی کشش کی وجہہ سے ایک بیضوی قوس پیدا کریگا تو اُسکو سیب کے دوپارہ کرنے میں کچھہ زیادہ مدد نہ ملتی — کپتان بارکلی کو اگر اپنی ٹانگوں کے ہر ایک رگ و پے کا نام اور مقام معلوم ہوجاتا تو اُسکو ہزار گھنٹہ میں ہزار میل کی مسافت طی کرنے میں کچھہ زیادہ آسانی حاصل نہوتی — مانشیر جورڈین کے منہہ سے حروف ڈ اور ف کچھہ زیادہ صحت کے ساتھہ نہ نکلتے جبکہ اُسکو اس بات کا علم ہوجاتا کہ حرف ڈ کا تلفظ دانتوں کو زبان کی نوک سے چھونے سے اور ف کا تلفظ اوپر کے دانتوں کو نیچے کے لب پر رکھنے سے ہوتا ہی — ہم نہیں خیال کرسکتے کہ اُن لوگوں کی تقریر میں جو ہمیشہ عمدہ سوسئیٹی میں رہے ہوں صرف و نحو کے پڑھنے سے

کچھہ بھی فرق ہوجاتا ہو — دس ہزار سکناے لندن میں سے ایک فرد بشر بھی لفظ ول اور شیل کے مناسب استعمال کے قواعد منضبط نہیں کرسکتا — مگر دس لاکھہ اهل لندن میں ایک شخص بھی ول اور شیل کے استعمال میں غلطی نہیں کرتا هی اور ایک کو دوسرے کی جگہہ نہیں بول جاتا هی — ڈاکٹر رابرٹسن صاحب اِن الفاظ کے استعمال پر بلا شبہہ ایک عمدہ رسالہ لکھہ سکے ہونگے مگر اپنی پچھلی تصانیف میں ڈاکٹر موصوف بھی بعض مقامات میں الفاظ مذکور کا بیجا استعمال کرگئے هیں *

جو کچھہ کہ ارسطاطالیس نے بُرهانِ قیاسی کے واسطے کیا تھا وهی بیکن نے اپنے نووم آرگینم کی دوسری جلد میں قاعدہ استقرائی کے واسطے کیا هی یعنی اُسنے اُسکی تشریح خوب کی هی — اُسکے قواعد بالکل ٹھیک هیں مگر همکو اُنکی ضرورت نہیں هی کیونکہ همارے روز مرہ نے عملدر آمد سے اخذ کیئے گئے هیں *

لیکن چونکہ ہر شخص اُس قاعدہ کو جو نووم آرگینم کی دوسری جلد میں مذکور هی بلاناغہ عمل میں لاتا هی بعض شخص اُسکو اچھی طرح سے عمل میں لاتے هیں بعض بُری طرح سے — بعض اُسکی وساطت سے صحیح نتیجہ کو پہنچ گئے هیں بعض نے غلط نتیجہ حاصل کیا هی — فرینکلن کو اُسکے وسیلہ سے بجلی کی ماهیت دریافت ہوگئی — هزاروں آدمیوں کو جنکا دماغ فرینکلن کاسا نہ تھا اُسکی وجہہ سے قوت مقناطیسی حیوانی پر یقین آ گیا — اِسکی وجہہ یہہ نہ تھی کہ فرینکلن نے بیکن کے بنائے ہوئے قاعدہ کو اختیار کیا تھا اور مسمر کے مقلدین نے اُس سے انحراف کیا تھا — همنے سنا هی کہ حال کے ایک مشہور و معروف شخص نے کھانا کھانے کے بعد ازراہ ظرافت کے ایک سلسلہ دلایل سے یہہ نتیجہ نکالا کہ فرقہ جیکوبنزم کے غلبہ کا سبب اُنکے سہ لفظی ناموں کا ہونا هی — ایک جانب تو اُسنے چارلس جیمس فاکس — رچرڈ برنسلی شیریڈن - جان هارن ٹک - جان ولیاٹ کرن - سیموئیل ٹیلر کولرج — تھیوبلڈولف ٹون کے نام گنائے اور دوسری طرف ولیم پٹ — جان اسکاٹ — ولیم ونڈهم — سموئیل هارسلی — هنری ڈنڈس — ایڈمنڈبرک کی مثال دی — اسکے بعد بیان کیا کہ بچّوں کے سہ لفظی نام رکھنے کا رواج کُچھہ عرصہ سے زیادہ ہوگیا هی اور جیکوبنزم کا بھی غلبہ ہوگیا هی — بچّوں کے سہ لفظی نام رکھنے کا رواج امریکہ میں بہ نسبت انگلستان کے زیادہ هی — انگلستان میں ابتک بادشاہ اور ہوس آف لارڈز موجود هی مگر امریکہ میں سلطنت جمہوری هی — برک اور تھیوبلڈولف ٹون دونوں ایرلینڈ کے رهنے والے هیں لہذا ایرلینڈ کا باشندہ ہونا جیکوبنزم کا باعث نہیں هی — هارسلی اور هارن ٹک دونوں پادری هیں لہذا پادری ہونا جیکوبنزم کی وجہہ نہیں هی — فاکس اور ونڈهم دونوں اکسفورڈ کے تعلیم یافتہ هیں لہذا اکسفورڈ کا تعلیم یافتہ ہونا جیکوبنزم کا سبب نہیں هی — پٹ اور هارن ٹک دونوں کیمبرج کے تعلیم یافتہ هیں لہذا کیمبرج کا تعلیم یافتہ ہونا جیکوبنزم

کي دلیل نہیں هی — اسي سلسله دلایل سے یهه فلسفي قایل استقراء اِس نتیجه پر پہنچا که سه لفظي ناموں کا هونا هي جیکوبنزم کي علت هی *

یهه ایک استقراء هی جو بیکن کے قاعدہ تحلیل سے مطابقت رکھتا هی مگر ایک مہمل اور نامعقول نتیجه پیدا کرتا هی — اب یهه سوال عارض هوتا هی که اِس استقراء میں اُس استقراء سے کیا فرق هی جسکي بِنا پر هم یهه استنباط کرتے هیں نه آفتاب کي موجودگي هي اِسبات کي علت هی که دن کو به نسبت شب کے زیادہ روشني هوتي هی — یهه فرق صریحاً مثالوں کي نوع میں نہیں هی بلکه مثالوں کي تعداد میں هی یعني قاعدہ تحلیل کے اُس حصه میں فرق واقع نہیں هوا هی جسکے واسطے بیکن نے قواعد صحیحه مقرر کیئے هیں بلکه ایک ایسے امر میں اختلاف هی جسکي نسبت کسي ٹھیک قاعدہ کا معین کرنا محالات سے هی — اگر جیکوبنزم کے اِس استنباط کا دانشمند موجد اپني مثالوں کے دائرہ کو ذرا بھي اور وسعت دیتا تو اُسکا قاعدہ کلیه بالکل ته و بالا هوجاتا — ٹامپین اور ولیم‌ونڈھم کے نام هي اِس کام کے واسطے کافي هوتے *

اب همکو معلوم هوتا هی که استقراء صحیحه اور غیر صحیحه میں یهه فرق نہیں هی که صاحب استقراء صحیحه اُس قاعدہ کا پابند هی جسکي تشریح نووم آرگینم کي دوسري جلد میں کي گئي هی اور صاحب استقراء غیر صحیحه ایک مختلف قاعدہ کو اختیار کرتا هی — اِن دونوں کا عملدرآمد ایک هي قاعدہ پر هی — لیکن ایک شخص بیوقوفي یا بےپرواهي سے اُس قاعدہ کو برتتا هی دوسرا شخص استقلال غور فکر اور دانائي سے اُسکو برتتا هی — اب یهه بات رهي که سمجھانے بُجھانے سے آدمي مستقل مزاج اور هوشیار نہیں هوسکتا هی ذي‌فہم اور دانا هونے کا تو ذکر هي کیا هی — یهه ممکن هی که لوگوں کو متنبه کیا جاے که تعصبات سے بچے رهیں تھوڑي سي شہادت پر واقعات پر یقین نه کر بیٹھیں قلیل تعداد واقعات کے دستیاب هوجانے پر اکتفا نه کریں — لیکن یهه قواعد ایسے عام هیں که اُن سے کوئي عملي فائدہ مترتب نہیں هوسکتا — سوال یهه هی که تعصب کسکو کہتے هیں — کسي مسئله جدید کي نسبت بےاعتقادي کس درجه تک روا اور قابل ستایش هی اور کب وہ ایک جاهلانه نامعقول ضد شمار هوتي هی — تھوڑي سي شہادت سے کیا مراد هی — کونسي تعداد واقعات کي قلیل کہي جاسکتي هی — دس مثالیں کافي هونگي یا پچاس یا سو — اول انسانوں کو جو سمندر کے کنارہ پر آباد هوئے تھے کے مہینے میں اس امر کا یقین کرنا جائز تھا که چاند جوار بھاٹے پر اثر بخشتا هی — کتنے امتحانوں اور تجربوں کے بعد جینر کو اِسبات کا یقین کرنا جایز تھا که اُسنے چیچک کا دفعیه دریافت کرلیا هی — یهه ایسے سوالات هیں جنکا ٹھیک جواب پانا نہایت ضروري هی — مگر افسوس هی که اِن کا ٹھیک جواب کوئي نہیں دیسکتا *

هم خیال کرتے هیں که قاعدۂ استقراء کے اُس حصه کے استعمال کي بابت قواعد منضبط
ن هی جسکو تمام آدمي بلا تمیز و لحاظ روز مرہ استعمال کرتے هیں اور یهي بیکن نے
— مگر یهه قواعد گو صحیح هیں لیکن درکار نهیں هوتے هیں کیونکه في‌الواقع وہ
ں بات کا کرنا سکهاتے هیں جو هم سب کیا کرتے هیں — همارے نزدیک قاعدہ
ے اُس حصه کے استعمال کي بابت قواعد منضبط کرنا غیر ممکن هی جسکو ایک
، ایک طرح پر کام میں لاتا هی اور ایک سریع‌الاعتقاد بُڑهیا دوسري طرح پر *

مضمون میں بیکن نے هماري راے میں غلطي کي هی — اُسنے اپنے قواعد کي
اور سودمندي کا اندازہ اعتدال سے زیادہ کیا هی — اُسنے یهه دعوی کیا هی که
ن کرنے میں اگر میرے قاعدہ کو اختیار کیا جاے تو ذهن کي قوت اور تیزي سے
کام پڑیگا سب دماغ هموار هوکر ایک هي حیثیت کے هوجائینگے اور میرا فلسفه
ار یا مسطر کي مانند هی جو سب هاتهوں کو برابر کردیتا هی اور اناڑي سے اناڑي
هاتهه سے ایک ایسا صحیح دائرہ یا خط کهنچوا دیتا هی جو بغیر مدد پرکار یا
، کسي مشاق آدمي کے هاتهه سے هرگز بن نه اوے — یهه بات همکو درحقیقت
، مهمل معلوم هوتي هی جیساکه لنڈلي مرے یهه دعوي کرے که جو شخص میري
هیگا وہ تریڈن کي سي عبارت لکهه سکیگا یا اگر وہ لٹیهي مصنف یعني ڈبلن کا
پ یهه وعدہ کرے که جو شخص میرے منطق کو پڑهیگا وہ چلنگورتهه کي مانند
هوجائیگا اور جو شخص میري کتاب علم بلاغت کو پڑهیگا وہ برک کي طرح گفتگو
— اِس میں کسیکو کلام نهوگا که اِس مقام پر بیکن نے غلطي کي هی — دو سو
اُسکا فلسفه جاري هی اور اِس قسم کي همواري اُسنے کهیں پیدا نهیں کي هی —
ر صاحب عقل سلیم کے باهم اُسیقدر فرق هی جیسا پهلے تها اور یهه فرق اُسوقت
زیادہ ظاهر هوتا هی جبکه وہ ایسي تحقیقاتوں میں مصروف هوتے هیں جن میں
نقراء کا استعمال اکثر درکار هوتا هی *

معلوم هوگا که قاعدہ استقراء کي اُس بالیاقت تحلیل و تشریح کو جو بیکن نے کي
، بهت مفید کام هم نهیں تصور کرتے هیں — هم ابهي کهه چکے هیں که بیکن اِس
نقراء کا موجد نه تها — وہ اول شخص بهي نه تها جسنے قاعدہ استقراء کي تحلیل
کے ساتهه کي هو گو اِس میں شبهه نهیں هی که کسي شخص نے بیکن سے پهلے
زوي طور سے اُسکي تحلیل و تشریح نهیں کي تهي — بیکن وہ شخص بهي نه تها
ب سے پهلے اِس بات کو ثابت کیا هو که صرف قاعدہ استقراء هي سے نئے حقایق
هوسکتے هیں — بلکه وہ وہ شخص تها جسنے سب سے پهلے حکما کے دماغوں کو جو
مه سے لفظي مباحثوں میں مصروف تهے نئي اور مفید باتوں کے دریافت کرنے کي

طرف پھیرا تھا — اور ایسا کرنے سے أسنے قاعدۂ استقراء کو دفعتاً وہ وقعت اور عظمت بخشي جو أس سے پہلے کبھي أسکو نصیب نہوئي تھي — وہ إس شاهراہ کا بنانے والا نہ تھا وہ أس رستہ کا دریافت کرنے والا نہ تھا وہ اول شخص نہ تھا جسنے أس رستہ کي پیمایش کرکے نقشہ کھینچا ہو — بلکہ وہ وہ شخص تھا جسنے سب سے پہلے لوگوں کو ایک ایسي لازوال دولت کي کان کي طرف توجہہ دلائي تھي جس سے لوگ محض غافل تھے اور جسکي راہ صرف أسي رستہ سے تھي — ایسا کرنے سے أسنے یہہ البتہ کیا کہ جس سڑک پر پہلے عوام‌الناس کي آمد و رفت تھي أس پر أسنے اعلی درجہ کے مسافروں کو چلایا ٭

أسکے نظام میں جو چیز کہ بالتخصیص أسکي تھي وہ وہ مقصود تھا جو أسنے اپنے واسطے تجویز کیا تھا — جب مقصود معلوم ہو تو أسکے حصول کے ذریعے اختیار کرنے میں بہت کم غلطي هوسکتي هی — اگر اَور لوگوں کا بھي وهي مقصود هوتا جو بیکن کا تھا تو همکو یقین هی کہ وہ بھي بیکن هي کاسا طریقہ اختیار کرتے — سنیکا إس بات کو مشکل سے مانتا کہ سیفتي لمپ کے ایجاد کرنے کا کام کسي حکیم کو زیبا هی — ٹامسن ایکوینَاس کو إس بات پر راغب کرنے میں بہت مشکل هوتي کہ وہ اپني قیاسیہ کا بنانا چھوڑکر باروت کا بنانا اختیار کرے — مگر سنیکا إس امر میں ذرا بھي شک نہ کرتا کہ سیفتي لمپ صرف ایک سلسلہ امتحانات هي سے ایجاد هوسکتا هی — ٹامسن ایکوینَاس کے دل میں ایک لمحہ بھي یہہ خیال نہ گذرتا کہ اصطلاحات باربرا اور باراليپٹن کے ذریعہ سے أسکو وہ مناسبت معلوم هوجائیگي جو باروت میں کوئلہ اور شورہ کو ایک دوسرے سے رکھني چاهیئے ٭

لوگوں کو نئے صدق کے دریافت کرنے کي ترغیب و تحریص دینے سے بیکن نے أنکو قاعدۂ استقراء کے استعمال کي ترغیب دي اور اس امر کے خود حکماے متقدمین بھي شاهد هیں کہ نئے صدق کے دریافت کرنے کا صرف یهي ایک قاعدہ هی — لوگوں کو سودمند باتوں کے دریافت کرنے کي ترغیب و تحریص دینے سے أسنے أن میں قاعدۂ استقراء کو خوبي اور هوشیاري کے ساتھہ عمل میں لانیکي ایک تحریک پیدا کردي — پہلے لوگ بقول أسکے نیچر کے سمجھنے والے تھے مگر أسکي تشریح کرنے والے نہ تھے — أنہوں نے أن هي أصول اولی پر اکتفا کي تھي جن تک نہایت ناقص اور خراب قاعدۂ استقراء کے ذریعہ سے وہ پہنچ گئے تھے — إسکي وجہہ هماري دانست میں یہہ تھي کہ أنکے فلسفہ نے کوئي عملي مقصود اپنا قرار ندیا تھا کیونکہ وہ صرف ایک دماغي مشق تھا — جو شخص کہ کوئي نئي دوا یا نئي کل ایجاد کرني چاهے تو أسکو صحت اور استقلال کے ساتھہ انتظار کرنے اور امتحان پر امتحان کیئے جانے کي ایک بڑي تحریک حاصل هوتي هی — لیکن جس شخص کو کہ مناظرہ اور مباحثہ کے واسطے صرف ایک مضمون درکار هوتا هی أسکو إس قسم کي تحریک حاصل نہیں هوتي — إس واسطے وہ أن مقدمات پر جو مفروضات یا نہایت ناقص استقراء

پر مبني هیں اکتفا کرتا هی — ایسا هي ازمنہ متوسطہ کے حکما نے کیا تھا — بیہودہ مقدمات سے اُنہوں نے اکثر بڑي لیاقت کے ساتھہ استدلال کیا تھا اور چونکہ اُنکا مقصود مناظرہ میں غالب آنا تھا نہ کہ نیچر پر غلبہ حاصل کرنا اِس واسطے وہ مہمل نہ تھے کیونکہ جسقدر مقدمات صحیحہ پر بحث کرنے میں منطقي لیاقت ظاهر هوسکتي هی اُسیقدر مقدمات غیر صحیحہ میں بھي هوسکتي هی — لیکن فلسفہ جدید کے مقلد جنھوں نے اپنا مقصود مفید صدق کا تحقیق کرنا قرار دیا تھا اگر ظاهر نما استقراء پر منصوبہ قایم کرنے پر اکتفا کرتے تو اپنے مقصود کے حاصل کرنے میں بالکل ناکام رهتے ٭

بیکن نے بیان کیا هی کہ جس زمانہ میں فلسفہ کو سکون رها صناعي کے فنون ترقي کرتے رهے — اِسکي وجہہ صریح یہہ تھي کہ صناع ایسے ناقص طریقہ استقراء پر قانع نہ تھا جس سے حکما اپنا کام نکالتے تھے — اور اسکي وجہہ کہ حکما نہ نسبت صناع کے کیوں زیادہ آساني کے ساتھہ مطمئن هوجاتے تھے صریح یہہ تھي کہ صناع کا مقصد چیزوں کا بنانا تھا اور حکیم کا مدعا صرف لفظوں کا گڑھنا تھا — ایک عمدہ برهان قیاسي کے بنانے میں غور طلب استقراء کي مطلق ضرورت نہیں هی — لیکن عمدہ جوتے کے بنانے میں یہہ ایک لازمي امر هی — اس واسطے صناع لوگ جہاں تک کہ اُنکے ناچیز مگر سودمند پیشوں کے دائرہ کي وسعت هوئي هی نیچر کے سمجھنے والے نہیں بلکہ اُسکي تشریح کرنے والے هوئے هیں — اور جب ایک ایسے فلسفہ کا ظہور هوا جسکي منشاء اُس کام کو زیادہ وسعت کے ساتھہ انجام دینے کي تھي جسکو صناع لوگ کم وسعت کے ساتھہ کرتے تھے یعني آدمي کي طاقت کو وسعت دینا اور اُسکي ضروریات کو مہیا کرنا تو مقدمات کي صحت کي بحث جو از روے منطق کے چنداں عظمت نہیں رکھتي هی سب سے زیادہ مفید بات هوگئي اور وہ ناقص استقراء جس پر اهل علم زمانہ سابق میں مطمئن هوگئے تھے ایک زیادہ صحیح اور طمانیت بخش استقراء کے سامنے بطور ایک لازمي امر کے بےفروغ هوگیا ٭

بیکن نے فاسفہ استقرائیہ کے حق میں جو کچھہ کیا هی وہ همارے نزدیک اس طرح پر بیان هوسکتا هی — حکماے متقدمین کے مقاصد ایسے مقاصد تھے جو بدون غور طلب استقراء کے حاصل هوسکتے تھے — اِس واسطے اُن حکما نے قاعدہ استقرائي کو غور و احتیاط کے ساتھہ استعمال نہ کیا — بیکن نے لوگوں کو ایک ایسے مقصد کے حاصل کرنے کي ترغیب دي جو صرف استقراء هي سے حاصل هوسکتا تھا اور بالخصوص ایسے استقراء سے جو بغور و احتیاط کام میں لایا گیا هو — هم یہہ نہیں خیال کرتے کہ اُس کام کو جو بیکن نے فلسفہ استقرائیہ کے حق میں کیا هی مبالغہ کے ساتھہ وقعت دي گئي هی مگر هم یہہ خیال کرتے هیں کہ اُسکي خدمات کي طرز کي نسبت اکثر غلطي هوئي هی جسکو اُسنے خود بھي اچھي طرح سے نہیں سمجھا تھا — اِسکي وجہہ کہ اُسنے لوگوں کو اسقدر نفع عظیم پہنچایا

یهه نهیں تهي که أسنے حکما کے طریقه استقراء کے خوبي کے ساتهه عمل میں لانے کے قواعد مهیا کیئے تهے بلکه یهه وهي تهي که أسنے أس طریقه کے خوبي کے ساتهه عمل میں لانے کے واسطے أن میں ایک تحریک پیدا کردي تهي *

دماغ انساني کو ایک ایسا میلان بخشنا جو مدتوں تک قایم رهے ایسے رودار لوگوں کا کام هی جو شان و نادر پیدا هوتے هیں - إس واسطے یهه ایک دلچسپ سوال هوگا که بیکن کے اخلاقي اور دماغي قواے کا کیا حال تها جلکي وجهه سے أسنے دنیا پر اسقدر وسیع اثر پیدا کیا *

بیکن کے مزاج میں دلیري اور سلیم‌الطبعي کا ایک عجیب اجتماع تها — وه بڑے بڑے وعدے جو أسنے لوگوں سے کیئے هیں سرسري نظر سے دیکهنے والوں کو لغو اور مهمل معلوم هونگے — مگر بیکن نے جس چیز کا وعده کیا أسکو پورا کر دکهایا — حقیقت یهه هی که فلیچر کو أن وعدوں کا دسواں حصه بهي جو بیکن کے فلسفه نے پورے کیئے هیں آربسیس کي زبان سے بیان کرانے کي کبهي جرأت نهوتي — أسکے مزاج کي فلسفیانه تعریف همارے نزدیک چار الفاظ سے بیان هوسکتي هی یعني أمید بهت اعتقاد کم — إس بات پر اعتقاد رکهنے کا میلان که کسي کام کا کرنا گو کیسا هي عجیب و غریب معلوم هو ممکن هی اور إس بات پر اعتقاد رکهنے کا عدم میلان که کوئي عجیب و غریب کام کیا گیا هی — إن أمور میں بیکن کے دماغ کي ترکیب کامل معلوم هوتي هی *

همارے مسلمان بهائي بهي اپنے جس علم پر بهت نازاں هیں اور جس پر عالمیت کا مدار و فخر هی وه وهي یوناني فلسفه هی جسکي بیکن نے حقیقت کهول دي هی همارے ملک میں بهي بڑے بڑے منطقي بڑے بڑے فلسفي گذرے هیں اور کچهه نکچهه اب بهي موجود هیں مگر درحقیقت انصاف سے دیکهنا چاهیئے که بجز لفظوں کے جهگڑے کے کچهه بهي أن سے دین و دنیا میں کسي کو فائده هوا هی هاں البته همارے ملک میں یوناني فلسفه نے دو کام ضرور کیئے هیں ایک تو انسانوں کو خر دماغ بنادیا هی دوسرے یهه که أنکے ذهن میں ایسي کج بحثي اور جهل مرکب پیدا کردي هی که سیدهي بات بهي أنکے ذهن میں آتي هي نهیں — یهه مضمون همنے اسي توقع پر لکها هی که همارے ملک کے جوان طالب علم سوچیں اور سمجهیں که وه کس طرح دنیا کے لیئے مفید هوسکتے هیں *

راقم

ابوالحسن

سال سنه ۱۳۰۹ نبوي

ختم هوا

لباس، بستر، ساز و سامان صاف ستھرا رکھتے تھے (ہ ن ر۔ ۴۴)

ش/ش

بددل و بے زار ہونے کے بجائے شاکر و شادماں رہے (ہ ن ر۔ ۹۱)
گہری، روشن اور ہنستی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں (گ گ۔ ۱۵)
شکل و شباہت پر امتداد زمانہ کا اثر پڑا بھی ہے تو اتنا (آب م۔ ۹۰)
جیسے زلزلہ کے بعد زمین کی شکست و شکن میں ہمواری اور زمین پر بسنے والوں کے پاؤں میں استقامت آگئی ہو۔ (ہ ن ر۔ ۱۰۷)

ص/ص

اگر ماضی کے صحیح و صالح عناصر و عوامل، حال کی دستگیری نہ کریں تو حال بے حال ہو جائے (غ ش ش۔ ۴)

ط/ط

ہنسی، دل لگی، مذاق، تمسخر، طعن و طنز سبھی کچھ ہوتا (ط م۔ ۱۴)
اس طرز و طریق میں علی گڑھ اپنی بیداری اور اپنی تخلیقی و تعمیری صلاحیتوں کی بشارت دیتا اور ثبوت پہنچاتا رہا (آب م۔ ۴۳)

غ/غ

اس کے غیض و غضب اور سب و شتم سے محفوظ نہ تھی (م ر۔ ۱۶۰)

ف/ف

وہ علی گڑھ کو سیاسی فساد و فشار سے دور اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے (گ گ۔ ۲۴۵)
ان کی شاعری میں وہی تب و تاب اور فکر و فرزانگی ملتی ہے (غ ش ش۔ ۱۷)

ق/ق

جو مصالح خداوندی اور عظمت انسان سے قریب و قریں تھا (غ ش ش۔ ۹۱)

اور قضا و قدر کا کوئی اندوہناک فیصلہ نافذ ہونے والا ہو (آب م ۔ ۱۷)
قد و قامت چہرے مہرے کے اعتبار سے غیر معمولی نہ تھے (گ گ ۔ ۳۰۵)

ک/ک

یہ احباب کی دعاؤں کا اثر تھا کہ کامیاب و کامراں واپس ہوا (ذ ص ۔ ۷۰)

ل/ل

جن کی شاعری کا محور جنسی لمس و لذت، سب و شتم، قتل و غارت ہے (آب م ۔ ۱۹)
لب و لہجہ کا شستہ ہونا بھی ضروری ہے (ہ ن ر ۔ ۷۲)

م/م

غیب سے کیسے کیسے مردانِ کار مامور و مبعوث ہوتے رہتے ہیں (گ گ ۲۹۰)
ہر صبح اپنا حواری پانے پر اسی طرح مسرور و مطمئن ہوتا ہے (گ گ ۔ ۳۰۹)
باتیں بھی زیادہ مربوط و مسلسل نہ ہوتیں (گ گ ۔ ۳۲۹)
تمام مذہب و مسلک کے طلبا اس ادارے میں یکجا ہو رہے ہیں (آب م ۔ ۴۶)

ن/ن

اس نازیبا حرکت پر نفرت و نفریں کا ایسا طوفان برپا ہوا (آب م ۔ ۱۰۰)
کچھ دیر ہندو مسلم نفرت و نفاق کا ذکر چلا (م ر ۔ ۲۳۹)
دتی کے مخصوص و گرانقدر معیارِ اخلاق و اقدار کے نگہبان و نگہباں تھے ۔
(غ ش ش ۔ ۱۲)

و/و

نیز اس کی عام وقعت و وقار کا چرچا سن کر (آب م ۔ ۲۴)
ہر وہ بات جو وزن و وقار اور خوبصورتی کے ساتھ کہی جائے علی گڑھ کا حصہ تھی (آب م ۔ ۱۲۲)

(۲) مرکب کے دونوں اجزا کا ایک ہی آواز پر ختم ہونا۔ بعض اوقات یہ دونوں اجزا ہم قافیہ لائے جاتے ہیں جن سے مرکب مقفیٰ بن جاتے ہیں۔ اس قسم کے مرکبات میں قافیہ بندی (RHYMING) کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

ب/ب

ایک طرف کا پہلوان دوسری طرف کے پہلوان کو دعوت ضرب وحرب دے رہا ہو۔ (آب م۔ ۱۱۰)

عجیب وغریب خطوط لکھتے تھے (آب م۔ ۱۳۹)

ت/ت

قومی سیادت و قیادت کا مرکز ثقل علی گڑھ سے منتقل ہوگیا (آب م۔ ۱۳۹)

جس ریاضت وبصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پورے طور پر آشنا (ہ ن ر۔ ۱۳۳)

اور وہ جودت وندرت ہے جسے انفرادیت کہتے ہیں (رغ ش ش۔ ۶۲)

ح/ح

وہاں صلاح وفلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے (ہ ن ر۔ ۵۳)

د/د

اپنے فرائض کو ........ خدا کی تاکید وتائید پر نظر رکھ کر بجالائے (رغ ش ش۔۲۰)

ہندوستان کی جنگ آزادی میں قید وبند کے جیسے جیسے مصائب اٹھائے (ہ ن ر۔ ۱۲)

ر/ر

سرسید مسلمانوں کے یکہ وتنہا یار وناصر رہے (آب م۔ ۳۵)

پھر اس پھول کی خوشبو کیسے کیسے دیار وامصار میں پھیلی (رغ ش ش۔ ۶)

سیاسی جبر و اقتدار کا یہ نسخہ ہر زمانے اور ہر دور میں کارگر رہا ہے (گ گ ۳۳۵)

ش/ش

اور آرائش و زیبائش وسیلہ نہیں مقصود بن جاتی ہے (غ ش ۔ ۵۸)

گ/گ

لیکن اس کو تب و تاب ، رنگ و آہنگ ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیے (آب م ۔ ۵)

ل/ل

بلکہ جمال و کمال کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے (گ گ ۔ ۱۲۶)

حال و مستقبل کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں (ہ ن ر ۔ ۷۳)

م/م

ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے (گ گ ۔ ۸۳)

پرانے زمانے کے سورما اور ان کی داستانہائے رزم و بزم (ہ ن ر ۔ ۸۹)

ن/ن

زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو (گ گ ۔ ۱۷۰)

جہاں خیالات کی رعنائی ہو وہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ (گ گ ۔ ۲۱۳)

(۳) دونوں اجزا کا ایک ہی آواز سے شروع اور ایک ہی آواز پر ختم ہونا ۔ بہت سے اجزا میں آوازوں کی مخصوص ترتیب و تنظیم پائی جاتی ہے ۔ ایسے اجزا کا اگر ہوشیاری سے انتخاب کیا جائے اور انھیں سلیقے سے مرکب کی شکل میں ترتیب دیا جائے تو ان میں ایک طرح کی خوش آوازی (EUPHONY) اور صوتی حسن پیدا ہو جاتا ہے جو سننے

والوں کے ذہن پر خوش گوار سمعی تاثر قائم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اجزا کا انتخاب کرتے وقت اگر صوت جمالیاتی (PHONORESTHETIC) وجدان سے کام نہ لیا جائے تو تنافر صوتی پیدا ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ ایسے مرکبات تلفظ کے اعتبار سے ثقیل اور غیر رواں ہوتے ہیں اور ان میں آوازوں کی تکرار قبیح معلوم ہوتی ہے۔ خوش آوازی کا انحصار آوازوں کی ترتیب (ARRANGEMENT)، تواتر (FREQUENCY) کے باہمی اتصال (COMBINATION) اور ان کی مشترک صوتی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ صوتی تجزیے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ جن مرکبات کے دونوں اجزا ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں یا ایک ہی آواز پر ختم ہوتے ہیں یا ایک ہی آواز سے شروع اور ایک ہی آواز پر ختم ہوتے ہیں انھیں مرکبات میں خوش آوازی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ت ت / ا ا

تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے (گ گ ۔ ۱۷۸)

ت ت / ر ر

جو لوگ کلام پاک کی تفسیر و تعبیر کی نزاکتوں کو جانتے ہیں وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں (گ گ ۔ ۱۸۹)

ت ت / ح ح

خود مخاطب کے نقطۂ نظر کی تنقیح و توضیح اس طور سے کردی (ذص ۔ ۲۹)

ج ج / ل ل

بوڑھے مجاہد کا جلال و جمال دیکھ کر محسوس ہونے لگتا (گ گ ۔ ۲۴۰)

ح ح / ت ت

اس کی حرکت و حرارت ہندوستان تک پہنچی (غ ش ش ۔ ۱۳)

ز ز / ی ی

اسی طرح بخاری نے ظرافت کو نہ صنی و زمانی ہی رکھا (ہ ن ر ۔ ۱۳۱)

ش ش / ات ت

اس زمانے میں کالج کی شوکت و شہرت پورے عروج پر تھی (آب م ۔ ۶۰)

ص ص / ح ح

ماضی صحیح و صالح عناصر و عوامل (رغ ش ش ۔ ۴)

ق ق / ت ت

اور جیسے ہر امکانی قوت و قدرت پر دسترس ہو (رغ ش ش ۔ ۵۰)

ک ک / ت ت

اگر اس سے پہلے کا ایک سال اس سے بھی زیادہ کوفت و کلفت کا نہ گذرا ہوتا (آب م ۔ ۶۰)

م م / ل ل

جب آپ کو یا مجھے کار آمد کار آفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (ہ ن ر ۔ ۵۴)

م م / ت ت

لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں (ہ ن ر ۔ ۵۴)

انھوں نے علی گڑھ کے وسیلے سے مسلمانوں کی آبادکاری بڑی محنت و محبت سے کی تھی (گ گ ۔ ۳۲۵)

م م / ن ن

ان کو علی گڑھ اور اس کے متعلقین و متوسلین سے جیسا تعلق خاطر تھا اتنا اپنے اعزا و اقربا سے نہ تھا (گ گ ۔ ۳۱۵)

چند مرکبات ایسے بھی پائے گئے ہیں جن میں پہلا جزو جس آواز پر ختم ہوتا ہے
دوسرا جزو اسی آواز سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے مرکبات میں یکساں (IDENTICAL) آوازوں کے پاس پاس واقع ہونے کی وجہ سے خوش آوازی کا عنصر تقریباً مفقود ہوجاتا ہے۔ مثلاً اسرار ورموز (گ گ ۔ ۲۶۰)، دار ورسن (گ گ ۔ ۸)، جام ومینا (گ گ ۔ ۲۶۲) وغیرہ۔ رشید صاحب کے یہاں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

(۴) مرکب کے دونوں اجزا کا، سوائے پہلی یا آخری آوازوں کے یکساں (IDENTICAL) ہونا۔ اسی کو تجنیسِ مطرف کہا گیا ہے۔

خ ج/-

خلوت وجلوت میں کہیں بھی خدا کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف نہیں کرنا چاہیئے (گ گ ۲۲۳)

ل ط/-

لعن وطعن یا سب وشتم ہر قوم میں خودبخود نشوونما پاتے ہیں۔ (ط م ۔ ۱۵)

ح ض/-

حرب وضرب کا عہد گذر چکا ہے (ط م ۔ ۳۳)

ر ب/-

فرزندانِ علی گڑھ رزم وبزم دونوں کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں (م ر ۔ ۲۲۱)

/ت ن-

بعض طلباء کلاس میں سکوت وسکون قائم نہیں رہنے دیتے (گ گ ۔ ۱۸۱)

و ا/-

ہجو وہجا میں منقصت کا پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے (ط م ۔ ۲۵)

ن/ب ن۔

جو معالمِ خداوندی اور عظمتِ انسان سے قریب و قرین تھا (رغ ش ش۔۹۱)

ی/ی ن۔

جس میں عالمانہ اور الہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں (گ گ۔۱۵۱)

(۵) مرکب کے ایک جزو میں دوسرے جزو سے زائد آواز یا آوازوں کا ہونا۔ اسے تجنیس زائد بھی کہا گیا ہے

ص/ص۔

اچھے خط میں شخص و شخصیت کا انکشاف (رغ ش ش۔۲۸)

ن/ن۔

نئی آرزوؤں نے انسان و انسانیت کے فروغ کے لئے نئی شمعیں روشن کیں۔ (رغ ش ش۔۱۳)

ر/ر۔

موسم خوشگوار، اونچی اونچی سرسبز چوٹیاں، اچھلتے بل کھاتے چشمے یا فرہاد کا خواب شیر و شیریں (م ر۔۷/۲۴۴)

غ/غ۔

جن کی خدمت و خیر خواہی اور فراغت و فراغ کے لئے مرحوم نے اپنی تمام عمر صرف کر دی (گ گ۔۳۵۵)

(۶) مرکب کے ان دونوں اجزا کے آخر میں آنے والے مختلف مصمتوں (CONSONANTS) سے قبل ایک ہی مصوتے (VOWEL) کا آنا۔ صوتی آہنگ پیدا کرنے کا یہ بڑا اچھا طریقہ ہے۔ اس خصوصیت کو مصوتی تکرار (ASSONANCE) کہتے ہیں۔

ا/رغ

ہرطرح کے خیالات وجذبات کا اظہار وابلاغ کیا جا سکتا تھا (گ گ۔ ۲۸۱)

ی/ل م

قوم وملک کی نئی تشکیل وتنظیم کے لئے (ن ر ۔ ۱۴۴)

ی/رغ

نہ تشہیر وتبلیغ کا ادارہ یا محاذ قائم کیا (گ گ ۔ ۲۴۳)

ی/ک ز

پنڈت سندر لال ہر تحریک وتجویز کے قانونی پہلوؤں کی دیکھ بھال رکھتے۔
(گ گ ۔ ۳۳۵)

ا/م ر

اکابر واقربا ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا کہ آلام وادبار میں ہو جایا کرتے ہیں۔
(غ ش ش ۔ ۲۶)

د/ص د

زمانی ومکانی اعتبار سے انسان کی حیثیت مخصوص ومحدود ہے (غ ش ش ۔۴۹)

(۷) مرکب کے دونوں اجزا کے آخر میں مختلف مصوتوں کے بعد ایک ہی مصمتے کا آنا اسی کو مصمتی تکرار (CONSONANCE) کہا گیا ہے۔

-/ر ر

ہر آدمی اپنے عمل کے خیر وشر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔
(گ گ ۔ ۲۷۹)

-/ب ب

جوانوں کی تازگی اور صاحب کرامت کی تب وتاب (گ گ ۔ ۱۸۸)

۴۱ -
شمیم و شبنم کے تخت رواں پر مجھے بٹھا دینا چاہتے ہوں (گ گ - ۲۴۸)

-/دد
صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے
(گ گ - ۱۷۸)

(۸) مرکب کے دونوں اجزا کے انتخاب میں صوتی ترتیب و تواتر ملحوظ رکھنے اور ان اجزا کو مناسب طور سے ترکیب دینے پر بیشتر مرکبات میں وزن و آہنگ (RHYTHM) پیدا ہو جاتا ہے جسے رکن یا ارکان کی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ موزونیت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

جن کو ہم رشک و حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں (ذص - ۵۹)
فاعلاتن

ان کی شاعری میں بھی عورت سے لمس و لذت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا (رغ ش ش - ۳۶)
فاعلاتن

اپنی شاعرانہ صلاحیت کو وہ رنگ و رخ دیا اور ایسی کامیابی حاصل کی۔
فاعلن (رغ ش ش - ۹)

ان کی شاعری میں وہی تب و تاب اور فکر و فرزانگی ملتی ہے (رغ ش ش - ۱۷)
فاعلن فاعلن

اگر ماضی کے صحیح و صالح عناصر و عوامل، حال کی دستگیری نہ کریں تو حال بے حال ہو جائے
فعول فعلن (رغ ش ش - ۳)

(۹) مرکب کے دونوں اجزا کا صوتی ساخت (PHONOLOGICAL STRUCTURE) در صوت رکن (SYLLABLE) کے اعتبار سے یکساں ہونا۔ اسے

C[1] اور V[2] کی شکل میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

کسی روز کالج کے در و بام پر چسپاں نظر آتی (آب م۔۱۲۳)

CVC / CVC

باہمی مخالفت نہایت درجہ تند و تلخ ہو چکی تھی (آب م۔۵۲)

CVCC / CVCC

دلی میں ان کی شاعری نے صحیح سمت و سطح پائی (غ ش ش۔۱۱)

CVCC / CVCC

تنقید و تحقیق کا یہ کارواں برابر سرگرم سفر ہے (غ ش ش۔۵)

CVCCVC / CVCCVC

اور مایوسی و بیزاری سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا ہو (ہ ن ر۔۵۸)

CVCVCV / CVCVCV

(۱۰) مرکب کے دونوں اجزا میں بہ اعتبارِ صوتی یکساں (IDENTICAL) اور بہ لحاظ تعداد برابر مصوتوں کا آنا، مثلاً

ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے (آب م۔۵۵)

ے ی / ے ی

شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے (گ گ۔۱۲۷)

ے آ / ے آ

محبت اور رفاقت کے تقاضے تسلیم کرنے سے عاجز و قاصر رہتے ہیں (گ گ۔۲۴۵)

آ ـِ / آ ـِ

(باقی آئندہ)

---

[1] C = CONSONANT (مصمتہ)

[2] V = VOWEL (مصوتہ)

## ابوسلمان شاہجہاں پوری

# مولانا عبدالماجد دریابادی

۱۸۹۲ء میں دریاباد، ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے شیخ زادوں کے خاندان اور عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا تو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ جب اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر اس دنیا سے رخصت ہوگا تو اپنے وقت کا نامور ادیب، صاحب طرز انشا پرداز اور بے باک صحافی ہوگا۔ اس وقت جبکہ مولانا سیتاپور میں زیر تعلیم تھے اور میٹرک کے امتحان میں بھی ابھی کئی سال باقی تھے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے اس وقت جن لوگوں نے انھیں "گوری" کے روپ میں شرماتے لجاتے اور کسی پر اپنا دل نچھاور کرتے دیکھا تھا، انھیں کیوں کر خیال آسکتا تھا کہ یہ لڑکا ایک دن قومی تحریکات میں حصہ لے گا اور سیاسی زندگی کے ابتلا اور آزمائشوں سے بھی گزرے گا اور آج جس کی شرمگیں نگاہیں حاضرین محفل کا دل برما رہی ہیں ایک دن برٹش استعمار اس کی تیکھی چتون سے لرزاٹھے گا۔ اور کون شخص یہ گمان کر سکتا تھا کہ وہ نوجوان جس کی پوری تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی اور جس کی ننھیال اور ددھیال کی خواتین و مرد اپنی دین داری اور تقویٰ کی وجہ سے معروف تھے، اپنے عہد شباب میں کفر و الحاد میں معروف ہوگا اور پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ بلند پایہ مفسر قرآن ہوگا اور اصحاب باطن میں اس کا شمار ہوگا۔ لیکن زمانہ عجائبات سے کبھی خالی نہیں

---

مولانا ابوسلمان شاہجہاں پوری، لکچرر شعبۂ اردو، گورنمنٹ نیشنل کالج۔ کراچی۔ متعدد کتابوں کے مولف ومرتب، مثلاً "امام ہند۔ تعمیر افکار" "مکاتیب ابوالکلام" ۔ وغیرہ

رہا۔ یہ عجوبہ شخصیت بھی ہماری آنکھوں نے دیکھی جو اپنے انھیں خصائص کی بنا پر زندگی کی مختلف مجلسوں میں لوگوں کی نظر و توجہ کا مرکز رہی ہے۔ جو اپنی آزاد خیالی اور عقلیت پرستی کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تنقید سے باز نہ آیا تھا اور کسی بزرگ کی نصیحت کو درخور اعتنا نہ سمجھتا تھا، اس کے نزدیک ایک شیخ طریقت سے نسبت دنیا کی سب سے بڑی سعادت ٹھیری۔ یہ جامع جہات اور جامع حیثیات شخصیت مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تھی۔

مولانا دریا بادی کی شخصیت دریا باد کے دو علمی خاندانوں کا مجمع البحرین تھی۔ یہ دونوں خاندان جوان کی ننھیال اور ددھیال کے خاندان تھے نہایت روشن اور طویل علمی، دینی اور تہذیبی روایات کے حامل تھے۔ اگر ایک دور کو جسے ہم زندگی کا اضطراری دور کہہ سکتے ہیں، نظر انداز کر دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان دونوں خاندانوں کی بہترین علمی اور دینی روایات نے حصہ لیا تھا۔ ان کے خاندانی بزرگوں میں ان کے دادا مفتی مظہر کریم مشاہیر علما، بزرگان دین اور مجاہدین آزادی میں سے گزرے ہیں۔ لکھنؤ کے علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ تحصیل علمی سے فراغت کے بعد انگریزی ملازمت اختیار کرلی۔ جہاد آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران میں وہ شاہجہاں پور (یوپی) میں سرشتہ دار عدالت تھے۔ اس لیے شاہجہاں پور میں تحریک آزادی کو پروان چڑھانے میں ان کا خاص حصہ رہا۔ تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد گرفتار ہوئے اور سات سال کے لیے انھیں جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا۔ لیکن ان کی علمی قابلیت اور خدمت کی بنا پر جلد ہی رہائی مل گئی۔ مولانا دریا بادی کے ددھیالی بزرگوں میں کئی اور نامور شخصیتیں گزری ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ننھیال بھی ایک علمی خانوادہ تھی۔ ان کے نانا اور ایک بزرگ حکیم عبدالعزیز دریا بادی کا ان کے زمانے کے نامور اطبا میں شمار ہوتا تھا۔ حکیم عبدالعزیز تو ملی خدمت گزاروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قیام میں کوشش کی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے والد مولوی عبدالقادر بھی بڑے نیک بزرگ تھے۔ شروع ہی سے سرکاری ملازمت میں تھے۔ اپنی محنت، دیانت داری، انسانیت اور خدمت خلق کی خوبیوں کی بنا پر بلا تفریق مذہب ہندوؤں اور مسلمانوں میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ آخر عمر میں حج کے لیے تشریف لے گئے تھے مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ مولوی عبدالقادر کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام عبدالمجید تھا۔ انھوں نے تحصیل علم کے بعد سرکاری ملازمت کرلی اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے بیٹے کا نام عبدالماجد تھا جو اپنی جوانی میں فلسفی عبدالماجد کے نام سے اور پھر مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ زادوں کا یہ خاندان جس میں مولانا دریا بادی کی ولادت ہوئی بارہ بنکی کا وہی خاندان ہے جو قدوائی خاندان کے عرف سے مشہور ہے۔ ان کی ابتدائی اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مرزا محمد ذکی اور مولوی عظمت اللہ فرنگی محلی سے عربی زبان کی تحصیل بھی کی تھی لیکن تکمیل نہیں کی۔ اردو اور فارسی کی مبادیات سے گزرنے کے بعد انھیں اسکول میں داخل کردیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں سیتاپور سے جہاں ان کے والد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ لکھنؤ آگئے اور کیننگ کالج سے بی اے پاس کیا۔ ایم اے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ داخلہ لیا کچھ دنوں قیام کیا لیکن حالات نے مساعدت نہ کی اس لیے واپس آگئے اور مزید تعلیم کا خیال ترک کردیا۔ کالج میں فلسفہ ان کا خاص مضمون تھا۔ فلسفے کے مطالعے اور انہماک نے ان کی مذہبی زندگی کی عمارت مسمار کردی۔ وہ اپنی عقلیت پسندی اور فلسفے کے سامنے مذہبی تعلیمات، دینی عقائد حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی کتاب "سائیکلوجی آف لیڈرشپ" شائع ہوئی تو اس میں ان کی آزاد خیالی اور بے باکی زبان وقلم حد سے تجاوز

کر چکی تھی۔ مولانا محمد علی نے اس پر لکھا کہ "آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں ان میں اس چیز کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ اتنے کروڑ مسلمان جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آقا مانتے ہیں تو کوئی بات تو آپ میں ضرور ہوگی۔ پھر بحیثیت انسان کے آپ کو کئی کروڑ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا تھا۔" مذہب کے باب میں ان کی سنجیدگی اور جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے فارم میں مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا گوارا نہ کیا۔ منافقت انھیں پسند نہ تھی۔

مطالعہ کا شوق مولانا دریابادی کو بچپن ہی سے تھا اور بقول خود ان کو جو کچھ الم غلم ملا پڑھ ڈالا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی شخصیت کی اٹھان نہایت شاندار تھی بقول ملا سعید احمد اکبر آبادی "مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا مطالعہ کے دھنی اور رسیا، نظر میں وسعت اور ذہانت و فطانت خداداد، اس زمانے کے باکمال ارباب قلم کی صحبت و معیت، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشا و تحریر کا ایک منفرد اسلوب ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب ہی میں اردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنا دیا۔" ادبی زندگی کا آغاز تو بارہ سال کی عمر میں ہوگیا تھا جب وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے پہلا مضمون "اودھ اخبار" میں چھپا تھا، نویں جماعت میں تھے جب ایک یونانی ڈرامہ کا اردو میں ترجمہ کیا لیکن باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز قیام لکھنؤ کے زمانے سے ہوتا ہے۔ مطالعہ کے شوق اور اہل علم کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو چمکا دیا تھا۔ لکھنؤ اہل علم و ادب کا مرکز تھا ان سے ملنا جلنا تھا۔ رات دن بحث و مباحثے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ کے اصحاب درس و تدریس خصوصاً علامہ شبلی سے تعلقات تھے، فرنگی محل کے مولانا عبدالباری کے ہاں آنا جانا تھا۔ اکبر الہ آبادی سے تعارف تھا، مولانا محمد علی اور شوکت علی سے بھی تعلقات

تھے۔ ان کے علاوہ مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، آثر لکھنوی، عزیز لکھنوی، مرزا عسکری، امیر احمد علوی وغیرہ سے قریبی روابط اور ان کی محفلوں میں آنا جانا تھا۔ مشہور فلسفی ظفر حسین تو ان کے کالج کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ابو الکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالباری ندوی سے تو برابر کے دوستانہ روابط تھے اور صبح وشام کا ملنا جلنا تھا۔ ان صحبتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ پڑھنے اور لکھنے کا عمل ساتھ ساتھ جاری رہا۔ ان علمی صحبتوں میں ان کی زبان بھی منجھ گئی اور ان میں بلا کا اعتماد پیدا ہوگیا۔ یہ اعتماد انھیں اپنے مطالعے پر بھی تھا۔ اپنی رائے اور فکر پر بھی تھا اور اپنی زبان اور قلم پر بھی طبیعت کی تیزی نے قلم میں بھی جولانیاں بھر دی تھیں، وہ اپنے وقت کے بڑے بڑے اہل قلم کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شبلی کی الکلام چھپی تو الناظر میں کئی قسطوں میں اس پر ایک زبردست تنقید لکھی۔ ادھر شبلی مرحوم کی علمی صحبتوں میں شریک تھے۔ اخبار میں تنقید چھپ رہی تھی۔ تنقید پر صاحب تحریر کے نام کی جگہ چوں کہ "ایک طالب علم" چھپتا تھا اس لیے ایک مدت تک کسی کو پتا نہ چل سکا کہ یہ طالب علم کون صاحب قلم ہے۔ شبہ ہوا تو مولوی عبدالحق کی طرف جو بعد میں بابائے اردو کے لقب سے ملقب ومشہور ہوئے۔

مولانا دریابادی کی زندگی کا یہ جذباتی دور تھا۔ جن بزرگوں اور دوستوں سے تعلقات تھے انھیں دریابادی کی یہ آزاد خیالی پسند نہ تھی، قلق تھا کہ ذہانت برباد اور صلاحیتیں رائیگاں جارہی ہیں۔ لیکن مقصد چوں کہ اصلاح تھا اس لیے انقطاع تعلقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ یقین تھا کہ بچپن کی تعلیم وتربیت اور ابتدائی دینی ماحول کا اثر اپنا رنگ ضرور دکھائے گا۔ ہر بزرگ نصیحت ووعظ کے بہترین موقع کی تلاش میں تھا۔ بہرحال وہ دور سعادت جلد ہی آگیا۔ اس میں سب سے بڑا حصہ تو ان کی فطرت کی سعادت اور قلب کی سلامتی کا تھا۔ لیکن ظاہری اسباب میں شبلی نعمانی کی سیرت النبی، قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کا حصہ تھا۔ اس پر مولانا محمد علی اور حضرت اکبر کے نصائح نے اپنا رنگ دکھایا۔ ابھی

تک سیرت کی جو کتابیں ان کے مطالعے میں آئی تھیں ان کا اسلوب و معیار مولانا کی عقل اور انداز فکر کو مطمئن نہ کر سکا تھا۔ سیرت النبی چوں کہ اسلوب و معیار کا ایک شاہکار تھی اس لیے اس نے مولانا کے دماغ کو آسودہ کیا اور دماغ سے اس کا اثر دل نے قبول کیا۔ اکبر اور محمد علی کی نصیحت کی دل پذیریوں نے بھی اپنا کام کیا۔ مولانا محمد علی نے انھیں لکھا کہ تم عربی کے طالب علم رہے ہو، قرآن مجید کو الہامی کتاب سمجھ کر نہ سہی عربی ادب کی بہترین کتاب سمجھ کر پڑھو۔ زبان و ادب سے تمھیں دل چسپی بھی ہے۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے بھی انھیں اسی قسم کی بات لکھی کہ تم قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے اس لیے اس کے آداب تلاوت کے بھی تم مکلف نہیں ہو سکتے اس لیے اگر کسی وقت بے وضو بھی تم اس ادب کے شاہکار اور انقلاب آفریں کتاب کو بیٹھے یا لیٹے ہوئے پڑھ لیا کرو تو اس میں مضائقہ نہیں۔ کیا ہی اچھے ہمارے بزرگ تھے اور کتنا دل پذیر ان کا اسلوب وعظ تھا۔ جدید کے بانیوں سے اگر ان کا سابقہ پڑتا تو پہلے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر ہوتا پھر مناظرہ کی دعوت دی جاتی اور پھر مباہلہ کا چیلنج دینا سنتی۔

فلسفہ اور تصوف کا قریبی تعلق ہے۔ تصوف بھی ایک فلسفہ ہی تو ہے۔ فلسفہ کے ذوق و انہماک نے انھیں تصوف اور روحانیت کی طرف متوجہ کیا۔ رفتہ رفتہ مولانا کو دماغ کے ساتھ دل اور عقل کے ساتھ جذبات کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا گیا۔ تصوف و روحانیت کے ذوق نے اصحاب دل کی صحبتوں کی طرف متوجہ کیا اور بالآخر ایک دن حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کا رشتہ قائم ہو گیا۔

ان کے شیخ طریقت یہی بزرگ تھے لیکن انھوں نے روحانی فیض وقت کے ایک دوسرے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اٹھایا لیکن انھوں نے محبت مولانا محمد علی اور اکبر الٰہ آبادی سے بھی اسی طرح کی جس طرح ایک مرید اپنے پیر و مرشد سے کرتا ہے۔ چناں چہ "اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں" اور "مکاتیب اکبر"، "محمد علی ذاتی ڈائری"

پر حصول ہیں۔ اور حکیم الامت کے نقوش وتاثرات" ان کی بلند پایہ ادبی تصانیف ہی نہیں بلکہ ان اکابر کو ان کا زبردست خراج عقیدت بھی ہے۔

صحافی کی حیثیت سے مولانا کا مقام بہت بلند تھا۔ مولانا آزاد، محمد علی، ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، صحافیوں کے اس طبقہ علیا سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے صحافت سے علم اور ادب کا رشتہ قائم کیا اس سلسلے کی آخری کڑی مولانا دریا بادی تھے۔

۱۹۲۵ء میں "سچ" کے اجرا سے ان کی صحافیانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا، "سچ" کے بعد "صدق" کے نام سے اخبار جاری کیا، تقسیم ملک کے بعد اس کا نام بدل کر انھوں نے "صدق جدید" کر دیا تھا۔ اور زندگی کے آخری دنوں تک اس سے ان کا مدیرانہ تعلق رہا۔ اور ان کے رشحات فکر وقلم سے "صدق جدید" کے صفحات مزین ہوتے رہے۔

روزنامہ "حقیقت" لکھنؤ کے اجرا میں ان کی مساعی کا حصہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں وہ چندماہ تک مولانا محمد علی کے ہمدرد دہلی سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ ہندوستان کے مشہور علمی رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کی مجلس ادارت میں تو وہ ہمیشہ رہے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کی غیر حاضری کے زمانے میں اس کی پوری ادارتی ذمہ داریاں بھی ان پر تھیں۔

مولانا دریا بادی کو اختصار و ایجاز میں اعجاز کی حد تک کمال حاصل تھا۔ وہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے حکمت کے ایسے نکتے پیدا کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ گرد وپیش کے واقعات پر خواہ سیاسی ہوں، خواہ تہذیبی ومعاشرتی وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور روزمرہ کی زبان اور بول چال کے اسلوب میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ فکر انگیز تبصرہ کرتے تھے۔ ان کے طنز کا کوئی جواب نہ تھا ان کی نگاہیں واقعات کے پس منظر اور تحریر وبیان سے دل کے چور کا پتا چلا لیتی تھیں۔ حالات وواقعات پر یہ تبصرے "صدق جدید" میں مستقل طور پر "سچی باتیں" کے عنوان سے صفحہ اول ودوم کی

اب بھی ہے لیکن ان کی خالص ادبی تحریریں بھی ان کی صحافتی اور فلسفیانہ و مذہبی تحریروں سے کم نہیں ہیں۔ یوں تو ان کی ہمہ قسم کی تحریریں اپنا بلند پایہ ادبی معیار رکھتی ہیں لیکن ان کی ادبی تحریریں واقعی اردو ادب کا شاہکار ہیں۔ ان تحریروں میں ان کی زبان، اسلوب اور فکر و انشا کی معجز نمائیاں حد کمال کو پہنچ گئی ہیں۔ انھوں نے بے شمار تنقیدی مضامین بھی لکھے اور آخر عمر تک وہ کتابوں پر جو مختصر تعارفی نوٹ لکھا کرتے تھے وہ تبصرہ نویسی کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔ وہ چند سطروں میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کا اظہار کرتے تھے اور یہ جملے ادب و انشا کا شاہکار ہوتے تھے۔ ادب کے یہ شہ پارے ابھی مرتب کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی لیکن جو چیزیں ابھی تک مرتب ہو کر عوام و خواص سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں اور جن کے وجود نے مولانا کی انشا پردازانہ حیثیت کو مستحکم اور ایک نقاد کی حیثیت سے مولانا کی شخصیت کو تسلیم کرالیا ہے ان میں سے انشائے ماجد، مضامین ماجد، مقالات ماجد، نشریات ماجد، مثنوی بحر المحبت (انشا) کی ترتیب اور اس کا مقدمہ وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

مولانا دریا بادی کے چوں کہ وقت کے تمام مشاہیر اہل علم و ادب سے تعلقات تھے پھر یہ کہ انھوں نے ایک نہایت کام یاب صحافیانہ زندگی گزاری تھی اس لیے انھیں بہت بڑے بڑے لوگوں سے مراسلت کا موقع ملا تھا اور اس طرح ان کے پاس مکاتیب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ان تمام خطوط کی ترتیب و اشاعت کا تو انھیں موقع نہیں ملا لیکن مولانا سید سلیمان ندوی، اکبر الہ آبادی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی وغیرہ کے خط انھوں نے کئی مجموعوں میں شائع کر دیے ہیں ان کی دو کتابیں اور جو بہت پسند کی گئیں وہ "سفر حجاز" اور "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" ہیں۔

لکھنؤ کی ادبی صحبتوں کا اثر تھا کہ شاعری کے کوچے میں بھی قدم رکھا۔ اور اگرچہ شاعری میں وہ نہ کام یاب ہوئے نہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن اس کوچے کے راہ و رسم

سے نا واقف بھی نہ تھے۔ شاعری کے شوق کا زمانہ وہ ہے جب مذہب کی طرف نیا نیا رجحان پیدا ہوا تھا۔ اور قوالی کا ذوق مزاج میں رچ بس رہا تھا چنانچہ قوالی کے طرز پر کچھ کلام کہا۔ مولانا محمد علی کی نعتیہ غزلوں سے بھی متاثر ہوئے اور ان پر تضمین کی۔ کچھ چیزیں قوالوں کی بدولت عوام تک پہنچیں اور خوب واہ واہ ہوئی۔ لیکن مولانا نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ قدرت نے انھیں شاعری کے لیے نہیں بلکہ نثر نگاری کے لئے پیدا کیا ہے۔ خود ان کا ادبی ذوق اتنا پاکیزہ اور تنقیدی شعور اتنا بلند تھا کہ خود اپنی نظر میں اپنا کلام نہ جچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلام محفوظ بھی نہ رہا ممکن ہے تلاش سے الناظر لکھنؤ اور اس دور کے دوسرے اخبارات و رسائل میں کچھ دستیاب ہو جائے۔ ادبی تحریروں میں "زود پشیماں" کے نام سے ایک ڈرامہ ۱۹۱۸ء کی یادگار ہے۔ استاد مکرم پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے مولانا کی تصانیف کی ایک فہرست ۱۹۶۵ء میں مرتب کی تھی۔ اس میں مولانا کی ۴۳ کتابوں کے نام درج ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بھی مولانا کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

افسوس کہ اردو کا یہ سپاہی، مسلمانوں کا یہ محسن، اردو ادب کی یہ مایۂ ناز شخصیت، بے مثال ادیب اور انشا پرداز، بلند پایہ صحافی، بہت بڑا مفسر اپنے وطن مالوف دریاباد میں ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انور صدیقی

# ذاکر صاحب ــــ ایک تصوّر، ایک تصویر

میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کروں گا کہ میں ذاکر صاحب کو جانتا ہوں اور ان کی شخصیت کے اسرار کی پردہ کشائی کر سکتا ہوں اس لئے کہ شخص کو تو سمجھا جا سکتا ہے، مگر شخصیت کا مکمل ادراک بڑی حد تک، "مابعد الطبیعاتی ناممکنات" کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے جب معاملہ ایسی شخصیت کا درپیش ہو جیسی ذاکر صاحب کی تھی۔ ان کی شخصیت ایسی پہلو دار تھی کہ اس کا منصفانہ احاطہ کرنا دشوار ہے۔ اس کے تمام تر ابعاد کی طرف توجہ بھی لرزہ خیز حد تک مشکل ہے۔ اُن کی شخصیت کے ذہنی اور اخلاقی منظر نامے پر تصویروں، تمثالوں، بولتے ہوئے اور خاموش رنگوں کا وہ ہجوم ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا یا دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرنا، خود اُن کے ساتھ بھی انصاف نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کی مادی حیثیتوں میں بھی جو تنوع ہے، وہ ایک مکمل تصویر بنانے کے کام کو مشکل بناتا ہے، جب ایسی مشکل درپیش ہو تو صرف ایک صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے اس ذہنی تصویر پر اکتفا کرنا، جو شخص یا شخصیت کی خود لکھنے والے کے اپنے ذہن میں ہو۔ میں اپنے اس مختصر سے مضمون میں یہی طریقۂ کار استعمال کروں گا، مگر اس کے ساتھ ساتھ، عام رویّے کے برخلاف، اس بات پر اصرار

---

جناب انور صدیقی، ریڈر و صدر شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

نہیں کروں گا کہ جو تصویر میں نے بنائی ہے، وہی مکمل تصویر ہے۔

ذاکر صاحب کی جو تصویر میرے ذہن میں ابھرتی ہے، وہ ایک ایسے جری، جانباز مگر شائستہ مجاہد کی تصویر ہے جو تنگ نظری اور تعصب کے قلعے کی فصیلوں کو اپنی آواز کے شعلوں سے توڑتا ہے، اپنے خیال کی تابندگی سے ظلمت پسندی کو روشنی اور حرارت کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے، چشم تنگ کو "کثرت نظارہ" سے وا ہو جانے کی دعوت دیتا ہے، اس سارے عمل میں اس کے اندر، مجاہد ہونے کے باوجود، عسکری جارحیت نہیں، دلنوازی، دلسوزی اور شائستگی دیدۂ تر کے تمام اوصاف نظر آتے ہیں۔ اسے تعلیم کے عمل کے دھیمے پن کا احساس ہے مگر تعلیم کے انقلاب آفریں کردار پر بھی بھروسہ ہے۔

میرے ذہن میں ذاکر صاحب کی یہ تصویر اس وقت بنی جب میں نے ۵۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی یونین میں بولتے سنا۔ یہ ان کی شاید علی گڑھ میں وائس چانسلر کی حیثیت سے آخری تقریر تھی، وہ اپنے اہم اور تاریخ ساز منصب سے استعفیٰ دے چکے تھے، اس فیصلے کے پس منظر میں وہ واقعہ تھا جب علی گڑھ کے طلبا نے کے، ایم منشی کی کتاب کو بنیاد بنا کر ہنگامہ کیا تھا اور جس کے نتیجہ میں علی گڑھ کا شہر فرقہ وارانہ فساد کی زد میں آچکا تھا۔ ذاکر صاحب جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ اس لئے گئے تھے کہ اسے ہی نہیں، ملک کی مسلم اقلیت کو ان کی ضرورت تھی۔ تقسیم ملک کے پہلے اور بعد کے اثرات اب بھی باقی تھے۔ علی گڑھ کو ضرورت تھی کہ اس کا سربراہ ایک ایسا شخص ہو جو مسلمانوں کے ذہنی افق کو وسیع کر سکے اور انھیں یہ سمجھا سکے کہ اب دورِ جنوں گزر چکا ہے اور کہ اب ایک نئی ہوش مندی کی تشکیل کی ضرورت ہے جس کی بنیاد قومی تہذیب کے تسلسل پر ہو اس کی تقسیم پر نہ ہو، جو رنگِ گل ونسریں کے جدا ہونے کے باوجود بہار کے اثبات کا عرفان بھی رکھتی ہو اور حوصلہ بھی۔ مشترکہ تہذیب کا جو تصور جامعہ کے روحانی وجود کی اساس تھی، اس کی آبادکاری، تفہیم اور ترسیل کے لئے ذاکر صاحب جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ گئے تھے کہ اس تہذیبی رویے کی تعلیم جامعہ میں مکمل ہو چکی تھی

اور وہ اب اس کی امین و وارث تھی۔ اب انھیں ایک ایسی جگہ کام کرنا تھا جسے جناح صاحب نے "مسلم ہندوستان کا اسلحہ خانہ" قرار دیا تھا۔ یہ کام ان کے لئے بڑا چیلنج تھا۔ یہ کام انھوں نے جس تدبّر، سوجھ بوجھ اور حکمت سے انجام دیا، اس کا اعترافاً علی گڑھ کا ماضی نہیں، اس کا حال ہے! وہ علی گڑھ، جسے بقول رشید احمد صدیقی سرسید نے پہلی بار اور ذاکر صاحب نے دوسری مرتبہ اسپین بننے سے بچالیا تھا، اسے ذاکر صاحب چھوڑ رہے ہیں، اور اسے چھوڑنے سے پہلے وہ طلبا ر سے مخاطب ہیں۔ وہ جس طرح بول رہے ہیں، اس میں شکست خوردگی نہیں ہے، ہزیمت نہیں ہے، شکستِ خواب کی افسردگی نہیں ہے۔ ان کے لہجے میں جلن نہیں جلال ہے، اپنے مسلک کی صداقت پر ایمان ہے۔ اسی ایمان کی صداقت سے منوّر لفظوں کے شرر ہمارے دلوں پر گر رہے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شرر ہمارے دلوں میں شعلے بنتے جارہے ہوں، وحشت اور بربریت کی جو موج وقتی طور پر طلبار کو بہالے گئی تھی، لگتا ہے کہ وہ اپنے تاریک ساحلوں کی آغوش میں سو چکی ہے۔

اب سننے والوں کی آنکھوں میں ندامت کے آنسوؤں کی نمی تھی۔ اور شاید بہت سی نمناک آنکھوں میں ذاکر صاحب اور ان کے پیغام کو آنسوؤں کی "دولتِ بیدار" کی طرح محفوظ کر لینے کی تمنا بھی تھی اور تڑپ بھی۔

میرے احساس کی آنکھوں میں ذاکر صاحب کی یہ تصویر آج بھی نمایاں اور محفوظ ہے اس لئے کہ تصویر شاہد کے مشہود سے بصری اتصال سے جنم لیتی اور مکمل ہوتی ہے۔ اس تصویر کے باطنی منظر نامے پر تہذیبوں کا سنگم شاید نہیں سنگم نظر آتا ہے۔ ایک وسیع تر مسلک انسانیت نوازی HUMANISM کے سارے تابندہ و تابناک پیکر نظر آتے ہیں، خیر اور حسن ہم آمیز نظر آتے ہیں، عمل ایک بڑے خیال کے تابع محسوس ہوتا ہے۔

ہندوستان کی ایک تہذیبی تاریخ ایک صد رنگ پھوار کی طرح جلوہ کار ہے، جس کا

ایک ایک رنگ منفرد بھی ہے اور متحد بھی ہے۔ اس کی تصویر، بنیادی طور پر ہندوستان کی اپنی تصویر ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ اس تصویر کو چند لفظوں میں بیان کروں تو میں کہوں گا کہ وہ "اضطرابِ موج" اور "سکونِ گہر" کا بہترین امتزاج ہے۔ میرے ذہن نے ۱۹۴۸ء کے جلسے میں ان کی جو تصویر مرتب کی تھی، میرا خیال ہے، بعد کی ذہنی تصویریں، پہلی تصویر کی تائید کرتی ہیں، تردید نہیں !

(مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کے ۸۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر ۸ر فروری ۱۹۷۷ء کو یہ مضمون پڑھا گیا)

---

## بیان بابت ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(فارم ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ نام رسالہ : جامعہ

۲۔ مقام اشاعت : جامعہ کالج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۳۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۴۔ نام طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : دفتر شیخ الجامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۵۔ نام اڈیٹر : ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات، میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

عبداللطیف اعظمی

# مولانا آزاد کی انیسویں برسی

## ایک رپورتاژ

آج ۱۹۷۷ء کی ۲۲ر فروری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کا دن، آج ان کی وفات کو ۱۹ سال ہو گئے۔ آج سے نو سال پہلے ۱۹۶۸ء میں میں نے، مولانا آزاد کی دسویں برسی کے موقع پر ایک رپورتاژ لکھا تھا جو جامعہ کے مارچ کے شمارے میں چھپا تھا۔ اس سال دہلی میں نہ صرف یہ کہ مولانا کی یاد میں کئی اچھے جلسے ہوئے تھے بلکہ ریڈیو پر بھی کئی اچھی تقریریں ہوئی تھیں، مثلاً خواجہ غلام السیدین مرحوم کی "مولانا آزاد بحیثیت ایک انسان" پروفیسر آل احمد سرور کی "اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد" جناب مالک رام کی "مولانا ابوالکلام کی ادبی خدمات"۔ یہ تمام تقریریں جامعہ کے مارچ اور اپریل کے شماروں میں اسی سال شائع ہوئی تھیں۔ مجھے یاد ہے، اسی سال ڈاکٹر تاراچند مرحوم کی بھی ایک تقریر ہوئی تھی جو مجھے بہت پسند آئی تھی، ڈاکٹر تاراچند نے وزارت تعلیم کے سکریٹری کی حیثیت سے کئی سال مولانا کے ساتھ کام کیا تھا، اس لیے اس میں بعض چیزیں ایسی تھیں جو کسی اور کے یہاں نہیں مل سکتیں، مگر افسوس کہ وہ تقریر شائع نہ ہو سکی، باوجود کوشش کے مجھے اس کی نقل نہ مل سکی۔ غالباً اسی سال مسعود صاحب کی انگریزی میں تقریر نشر ہوئی تھی، مسعود صاحب نے مولانا کے سرکاری پرسنل مددگار کی حیثیت سے کئی سال ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ یہ تقریر بھی مجھے پسند آئی تھی، چنانچہ اس کی نقل بھی فاضل مقرر سے میں نے منگوائی

تھی، مگر بروقت ترجمہ نہ کرسکا، اس لیے اردو میں شائع نہ ہوسکی، مگر انگریزی کی کسی کتاب میں یہ چھپ گئی ہے۔ اُس وقت سے اب تک، پچھلے نو برسوں میں مولانا کی یاد میں دلی میں کوئی اہم جلسہ نہیں ہوا اور نہ شاید ریڈیو ہی پر کوئی قابل ذکر تقریب ہوئی، اس لیے مسالک جب چند روز پہلے کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کی عنایت سے ایک دعوت نامہ ملا کہ انگریزی کے مشہور روزنامہ "نیشنل ہیرالڈ" کا مولانا کی انیسویں برسی کے موقع پر ایک خاص نمبر نکل رہا ہے اور ۲۲ کو منگل کے دن ۱۱ بجے صبح کو اس کی رسم اجرا عمل میں آئے گی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، اگرچہ یہ وقت دفتر میں کام کرنے والوں کے لئے مناسب نہیں تھا، دوسرے مجھے ایک ضروری کام بھی تھا، پھر بھی محض مولانا کی عقیدت اور محبت میں میں نے فیصلہ کیا کہ بہرحال اس میں شرکت کرنی ہے۔

وقت مقررہ سے کوئی دس پندرہ منٹ پہلے "ہیرلڈ ہاؤس" پہنچا، جہاں رسم اجرا کی تقریب منائی جانے والی تھی۔ صدر دروازہ پھولوں سے سجا ہوا تھا اور اوپر گیلری بھی ہاروں سے لدی ہوئی تھی، دروازے کے دونوں جانب اردلی بے داغ وردی میں چاق چوبند کھڑے ہوئے تھے۔ دعوت نامے پر لکھا ہوا تھا کہ: "برائے مہربانی کارڈ ساتھ لائیے۔" خیال تھا کہ یہ کارڈ دیکھیں گے، مگر خاموشی اور احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا، اوپر پہنچا تو چند دیویاں سفید ساریوں میں ملبوس مصری اور الائچی لئے استقبال کے لئے کھڑی تھیں، مگر ابھی وقت نہیں ہوا تھا اس لیے وہ باتوں میں مشغول تھیں، میں ان کی نگاہوں سے محفوظ اندر کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایسوسی ایٹڈ جرنلس لمیٹڈ کے چیرمین اور مینجنگ ڈائرکٹر کرنل بشیر حسین زیدی اور جناب محمد یونس خاں (خصوصی نمائندہ وزیر اعظم ہند) حسب معمول شیروانی میں سرخ گلاب کی کلی لگائے مہمانوں کے استقبال کے لئے کھڑے تھے اور ایک صوفے پر پروفیسر محمد مجیب تشریف فرما تھے۔ زیدی صاحب نے محمد یونس صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ میں ان سے کئی بار مختلف جلسوں میں مل چکا

ہوں اور ان کی کتاب "قیدی کے خط" کے بارے میں مفصل گفتگو کر چکا ہوں ۔ انھوں نے فرمایا : ہاں میں واقف ہوں ۔ اس کے بعد زیدی صاحب نے شکایت کی کہ میرے ساتھ کیوں نہیں آئے ؟! عرض کیا : ایک کہاوت ہے : لا دے ، لدا دے ، لدانے والا ساتھ دے ۔ یہی عنایت کیا کم تھی کہ آپ نے دعوت نامہ دستی طور پر بھجوانے کی تکلیف کی ، اب اگر یہ عرض کرتا کہ مجھے ساتھ لیتے چلئے تو یہ بڑی نامناسب بات ہوتی اور شاید گستاخی بھی ۔ پروفیسر مجیب صاحب نے پوچھا : وہ کیوں نہیں آئے ۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا ، عرض کیا : پروفیسر مسعود حسین صاحب ایک اور میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں ، جس کا پہلے سے وعدہ کر چکے تھے ۔ خود کلامی کے انداز میں پہلے فرمایا : مگر یہ تو ضروری تھی ، پھر فرمایا : خیر اور جملہ نامکمل چھوڑ دیا ۔

گیارہ بجے تو مہمانوں نے آنا شروع کیا ۔ مگر یہ کمرہ جہاں ہم کھڑے تھے بہت مختصر تھا اور صرف ایک صوفہ اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں ، البتہ ملے ہوئے کمرے میں ایک لمبی میز اور اس کے دونوں طرف قرینے سے کرسیاں لگی ہوئی تھیں ۔ میرا خیال تھا کہ یہاں صرف مہمانوں کا استقبال ہوگا اور دوسرے کمرے میں رسم اجرا ہوگی ، مگر بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا ۔ مجیب صاحب کے علاوہ سبھی مہمان کھڑے تھے مجیب صاحب کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ کھڑے رہیں اور وہ بیٹھے ہوں ، اس لئے انھوں نے کئی مرتبہ لوگوں کا ساتھ دینے کی کوشش کی ، مگر سب نے اصرار کے ساتھ انھیں بیٹھا دیا ۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب تشریف لائے ، سر پر فر کی ٹوپی ، کچھ کھوئے کھوئے ، اردگرد سے بے نیاز ، اپنی شخصیت کی وجہ سے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا ، مگر میں ان سے ناواقف تھا ، بعد میں معلوم ہوا کہ یہی صاحب "نیشنل ہیرلڈ" کے اڈیٹر اور مشہور جرنلسٹ چلاپتی راؤ ہیں ۔ مہمانوں کی اچھی خاصی تعداد آ گئی ٹیلی ویژن اور دوسرے کیمرے والے خاصے مشغول تھے کہ وزیر سیول سپلائیز سید میر قاسم داخل ہوئے اور متعلقہ

لوگوں سے ہاتھ ملا کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ اس کے بعد ہی وزیر تعلیم سید نورالحسن تشریف لائے اور دوسروں کی طرح وہ بھی کھڑے رہے۔ چند لوگوں نے ان سے بیٹھنے کے لئے کہا تو فرمایا: زیدی صاحب کھڑے ہیں تو میں کیسے بیٹھوں۔ زیدی صاحب نے مختصر سا جواب دیا: میں ہوسٹ (میزبان) ہوں۔ بالآخر لوگوں کے اصرار پر ایک طرف ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں بدرالدین طیب جی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ داخل ہوئے۔ بیگم صاحبہ نے مجیب صاحب کو دیکھا تو ان کی طرف بڑھیں اور ان ہی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ طیب جی نے ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور وہ بھی صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ کسی بے تکلف دوست نے کہا: آخر طیب جی نے مان لیا کہ وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ انھوں نے فوراً ہی جواب دیا ٹینس کے تین سیٹ کھیل کر آرہا ہوں، مزید "ورزش" کی ضرورت نہیں۔ اسی درمیان میں ایک ممتاز صحافی آئے اور زیدی صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے یہ نمبر دیکھا ہے، واقعی آپ نے بہت اچھا اور ضخیم نمبر نکالا ہے۔ زیدی صاحب نے فرمایا: کوئی ایک تہائی مواد گنجائش کی کمی کی وجہ سے رہ گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ: اسے کتابی صورت میں چھپوائیے۔ طیب جی نے بھی تائید کرتے ہوئے فرمایا: سائز ایسا ہونا چاہیئے کہ شلف میں آسکے، اخباری سائز کو کوئی کیسے محفوظ رکھے گا۔ زیدی صاحب نے فرمایا، جو مضامین رہ گئے ہیں ان کو شامل کر کے کتابی صورت میں چھپوانے کا ارادہ ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سفیر پاکستان جناب فدا حسن صاحب تشریف لائے اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔

کوئی آدھا گھنٹہ گذر چکا تھا اور مہمان بھی کافی تعداد میں آگئے تھے، لیکن ابھی کارروائی شروع کرنے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے، کھڑے کھڑے شاید لوگ اکتا بھی گئے تھے، اس لئے پہلے ذہنوں میں یہ سوال ابھرا، پھر اس نے خود کلامی کی شکل اختیار

کر لی کہ اب کس کا انتظار ہے ؟ کسی نے کہا کہ شاید وزیر اعظم آنے والی ہیں، مگر کسی نے یہ کہکر مایوس کر دیا کہ وہ دلی میں کہاں ہیں ؟ اتنے میں صدر کانگریس بروا صاحب تشریف لائے، اس امید پر کہ اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، لوگوں کے چہروں پر رونق آگئی، مگر خاموشی کی برف اب بھی نہیں پگھلی۔ اسی عرصے میں دو غیر ملکی مہمان تشریف لائے، ہمیں انھیں نہیں پہچانتا تھا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک عمان کے سفیر جناب محمد الجمالی اور دوسرے الجیریا کے سفیر جناب عمر عصیدین ہیں۔ شاید انھیں کا انتظار تھا، کیونکہ ان کے آتے ہی، زیدی صاحب اس میز کی طرف بڑھے جس پر "نیشنل ہیرلڈ" کا یہ ابوالکلام آزاد نمبر پلاسٹک کے کور میں سرخ فیتے سے بندھا ہوا رکھا تھا۔ انھوں نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں تقریر شروع کی۔ پہلے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا اور جب اس خصوصی نمبر کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اڈیٹر صاحب وہاں سے کھسک گئے ہیں، پوچھا کہاں ہیں، معلوم ہوا کہ دوسرے کمرے میں ہیں، بڑی مشکلوں سے وہ تشریف لائے۔ زیدی صاحب نے فرمایا کہ میں اس نمبر کی اور آپ کی تعریف کرنا چاہتا ہوں اور آپ غائب ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تقریر مکمل کی اور یہ خصوصی نمبر جناب محمد یونس خاں کی طرف بڑھا دیا، انھوں نے لیکر جناب بروا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ زیدی صاحب نے مرحوم راشٹرپتی جناب فخرالدین علی احمد صاحب کے پیغام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: دیکھئے ان کی زندگی ہی میں ہم نے یہ پیغام حاصل کر لیا تھا۔ بروا صاحب نے فرمایا، جی مجھے معلوم ہے، اس کے حصول میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ اس کے بعد مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ: مولانا آزاد بہت بڑے محب وطن اور جنگ آزادی کے عظیم جنرل تھے رسم اجرا ختم ہوئی تو مجھے اس خاص نمبر کو دیکھنے کی بے چینی ہوئی جو کہیں نظر نہیں آرہا تھا، فکر ہوئی کہ اگر نہ ملا تو تمام محنت رائگاں گئی، مگر یہ فکر یا اندیشہ چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہا، دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ کاپیاں لئے ہوئے تقسیم کے

لیے کھڑے ہیں۔ فوراً لیکر دیکھنے بیٹھ گیا۔ واقعی بہت پسند آیا اور ضخامت تو توقع سے کہیں زیادہ تھی۔

اخباری سائز پر کل ۷۲ صفحات ہیں اور چھ ابواب میں تقسیم ہے اور بہت سی نہایت ہی اہم اور نادر تصویریں ہیں۔ پہلا باب مولانا آزاد اور ان کے عہد پہ ہے، جس کے زیادہ تر مضامین مطبوعہ ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر پی۔ این چوپڑا کا "آزاد اور ان کا عہد" ہے، دوسرا پنڈت جواہر لال نہرو کی جیل ڈائری سے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ء سے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء تک سات دن کے روزنامچے درج ہیں، گاندھی جی کا ایک مختصر سا خراج تحسین ہے۔ زمانۂ جنگ میں مولانا آزاد کسی موقع پر "نیشنل ہیرلڈ" کے دفتر (لکھنؤ) میں تشریف لے گئے تھے اور صدر کانگریس کی حیثیت سے اردو میں یہ پیغام لکھ کر دیا تھا کہ: "مجھے امید ہے کہ نیشنل ہیرلڈ کا یہ دور اس کے پچھلے دور سے بھی زیادہ شاندار اور کامیاب ہوگا۔" اس کا فوٹو عکس شائع کیا گیا ہے، اس کے بعد محمد آصف علی، جواہر لال نہرو، جان گنتھر، یوسف مہر علی، مہادیو ڈیسائی، سی راجگوپال اچاری اور معین الدین حارث صاحب کے مضامین ہیں۔ دوسرے باب کا عنوان ہے: "مولانا آزاد کی ذہانت و فراست"۔ اس میں سب سے پہلے اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت کا ترجمہ ہے، اس کے بعد مولانا کی دوسری تقریریں اور خطبے دئے گئے ہیں۔

تیسرا باب: "مولانا کے اہم معاصر رہنما" (۱) جسٹس بدرالدین طیب جی (بدرالدین طیب جی) (۲) خان عبدالغفار خاں۔ ان کے ساتھ میرے بیتے دن (محمد یونس) (۳) رفیع احمد قدوائی (محمد ہاشم قدوائی) (۴) محمد علی۔ ایک فراموش شدہ محب وطن (ڈاکٹر سلیم قدوائی) (۵) محمد آصف علی ـــــ ایک یادگار کردار (میر مشتاق احمد) (۶) ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ہندو مسلم اتحاد کی ایک سچی علامت (ایل۔ دیوانی) (۷) تصدق حسین شیروانی (ایم آر شیروانی) (۸) مولانا عبدالباری فرنگی محلی (مفتی محمد رضا انصاری) (۹) ایم۔ اے۔ او اور مسلم یونیورسٹی

کے طلبائے قدیم کا حصہ (ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی)

چوتھا باب: "ہندوستان میں: رجحانات، تحریکات" (۱) مولانا آزاد کے سیاسی تصورات (معین شاکر) (۲) مولانا آزاد اور تحریک خلافت (قاضی محمد عدیل عباسی) (۳) فرنگی محل (مفتی محمد رضا انصاری) (۴) مفسر قرآن (مولانا سید سلیمان ندوی) (۵) تحریک خلافت اور عدم تعاون (آر سبرامونیا آئر کی کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستانی سیاست میں رول کا ایک باب) (۶) ہندوستانی تحریک جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کا رول (معین شاکر) (۷) افغانستان اور ہندوستان کی جدوجہد آزادی (ڈاکٹر پربھا چوپڑا) (۸) مولانا آزاد کی زندگی گاندھی جی سے راہ ورسم سے پہلے (آر سبرامونیا کی کتاب کا ایک باب) (۹) خدا کا قرآنی نقطۂ نظر (مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "قرآن کے بنیادی تصورات" کا پہلا باب)

پانچواں باب: "تعلیم، تغیر اور اصلاح" (۱) سر سید احمد خاں اور تحریک علی گڑھ (ڈاکٹر علی محمد خسرو) (۲) علی گڑھ کی معنویت موجودہ دور میں (سید انوار الحق حقی) (۳) ہندوستان میں اسلامی علوم کی تعلیم (سید اوصاف علی) (۴) مولانا حسرت موہانی ـــ ایک فراموش شدہ نیشنلسٹ (شریف الحسن) (۵) ممتاز شخصیت (خورشید الاسلام) (۶) مولانا شبلی نعمانی (خورشید الاسلام) (۷) آزاد ـــ چند یادیں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) (۸) ذاکر حسین (ایم۔ سی) (۹) حکیم اجمل خاں ـــ قومی یکجہتی کے علمبردار (قاضی ارشد مسعود گنگوہی) (۱۰) مولانا آزاد کا پیغام ہندوستانی مسلمانوں کے نام (ضیاء الحسن فاروقی)

چھٹا باب: "ادب، آرٹ، فن تعمیر وغیرہ" (۱) قومیت اور اردو شاعری (خواجہ احمد فاروقی) (۲) اقبال کی معنویت (آل احمد سرور) (۳) ہندوستان اور مغربی ایشیا (محمد شفیع اگرانی) (۴) امیر خسرو ـــ طوطئ ہند (ڈاکٹر محمد حسین) (۵) مغل آرٹ میں نباتات اور جانور (شانتی سروپ) (۶) ہند اسلامی فن تعمیر (ضیاء الدین احمد ڈیسائی) (۷) تعلیم آزادی کے بعد (۱۵ مارچ ۱۹۵۲ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے انیسویں جلسے میں مولانا آزاد کی تقریر)

(۸) مسلم تہوار (نجم الحسن) (۹) تعلیم کی یک سالہ ترقی (سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن دہلی کے بائیسویں اجلاس کے موقع پر ۱۲ر جنوری ۱۹۵۵ء کو مولانا آزاد کی تقریر)

مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی اور مذہبی و سیاسی خدمات پر اردو اور انگریزی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر ان کی زندگی اور خدمات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن پر یا تو کچھ لکھا ہی نہیں گیا ہے یا بہت ہی تشنہ ہیں۔ "نیشنل ہیرلڈ" کے اس خصوصی نمبر میں اگرچہ متعدد کمیاں ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس نے مولانا آزاد کا بہت ہی کامیاب اور بڑی حد تک مکمل مرقع پیش کیا ہے۔

---

مولانا آزاد کے مزار پر "مولانا آزاد اسٹڈی فورم" کی طرف سے ہر سال صبح سویرے پھول چڑھائے جاتے ہیں اور فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ امسال اس رسم میں انجمن ترقی اردو دلی شاخ نے بھی شرکت کی۔ دلی کے لفٹنٹ گورنر جناب کرشن چندر صاحب خصوصی مہمان تھے، ان کے علاوہ مفتی عتیق الرحمان عثمانی، بیگم ذاکر حسین صاحبہ، جناب خورشید عالم خاں صاحب، محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ، چودھری محمد شفیع صاحب، میر مشتاق احمد صاحب اور مسز سعدرا جوشی صاحبہ نے شرکت کی۔ لفٹنٹ گورنر کرشن چندر نے مولانائے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ: مولانا نے جن قدروں کو پیش نظر رکھا اور ان پر خود عمل کیا وہ ہمارے لیے ایسی رہنمائی پیش کرتی ہیں جس سے ملک ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ سکتا ہے۔ قومی یکجہتی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ وہ ممتاز عالم تھے ان کی زبان میں اتنی شیرینی اور باتوں میں اتنا خلوص ہوتا تھا کہ ان سے ملنے والا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ گاندھی جی اور مولانا آزاد کا پیغام صرف اپنی قوم کے لیے نہیں تھا بلکہ پوری دنیا کے لیے تھا اور اس سے دنیا کے سامنے ہمارا سر اونچا ہوا اور ہمارا اعتبار قائم ہوا۔

# صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی وفات

صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد کی اچانک وفات کی خبر جامعہ پہونچی تو اسی وقت جامعہ کے تمام ادارے اور دفاتر بند کر دیے گئے اور فوراً ہی شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب راشٹر پتی بھون روانہ ہو گئے، ان کے ساتھ مسجل جامعہ جناب شعیب الرحمان صاحب اور ڈین ہیومنیٹیز اینڈ سائنسز جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب بھی تھے، جامعہ کی دوسری کاریں بھی منگوائی گئیں اور ان میں جامعہ کے افسران شعبہ، اساتذہ اور کارکن روانہ ہوئے۔ تیسرے روز ۱۳ر فروری (اتوار) کو منل گارڈن میں بعد نماز ظہر ڈیڑھ بجے نماز جنازہ تھی جس میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے شرکت کی ان کے ساتھ راقم الحروف بھی تھا اور جامعہ کے قدیم طالب علم اور مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری آئے ہوئے تھے، وہ بھی ساتھ تھے۔ جامعہ کے اسٹیورڈ جناب محمد شبیر ندوی کے مرحوم کے خاندان سے خصوصی تعلقات ہیں، اس لئے وہ تو وفات سے لیکر آخری رسم تک راشٹر پتی بھون ہی میں تھے۔ نماز جنازہ کے بعد آخری آرام گاہ کی طرف جنازہ روانہ ہوا تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرف سے کمنٹری کا اہتمام کیا گیا تھا، کمنٹری کرنے والوں میں جامعہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی تھے، ان کی وجہ سے کمنٹری کے وزن اور وقار میں اضافہ ہوا۔

چوتھے روز، ۱۴ر فروری کو سہ پہر میں نماز عصر سے متصل جامعہ کی مسجد میں قرآن خوانی اور تعزیتی جلسہ بھی کیا گیا۔ تعزیتی جلسہ شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین کی صدارت میں منعقد

ہوا۔ جناب مولوی حافظ بدر الدین صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد جناب محمد شبیر ندوی صاحب، جناب سعید انصاری صاحب اور صدر جلسہ نے تقریریں کیں اور مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی۔

## پروفیسر مسعود حسین کی تقریر

عالی جناب فخر الدین علی احمد صاحب مرحوم سے میری واقفیت تھوڑے عرصے کی تھی۔ پہلی بار شخصی رابطہ کا موقع ۱۹۶۷ء میں ملا جب وہ وزیر زراعت تھے۔ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلے میں وہ دلچسپی لے رہے تھے اور ان ہی کے ایما پر بیگ کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ انہیں بڑی امید تھی کہ ان کی مداخلت اور خدمات کے ذریعہ یونیورسٹی کا یہ الجھا ہوا مسئلہ سلجھ جائے گا۔ یونیورسٹی کی انجمن اساتذہ کا جو وفد ان سے ملا تھا میں بھی اس کا ایک رکن تھا۔ جب ہم لوگ ان سے نئی دہلی میں ملے تو ان کو بڑا بے بس اور مایوس پایا، ان کی مایوسی اور بے بسی کے پیچھے گہرے غم کا احساس تھا۔ ان کا ہم سے پہلا جملہ تھا: کیا آپ لوگ وزیر تعلیم سے مل چکے ہیں؟ ہمارے مثبت جواب پر ان کا دوسرا جملہ تھا: ان سے پھر ملئے، حل تو انھیں کو نکالنا ہے۔ ان کی یہ حالت دیکھکر اور ان کا یہ جواب سن کر بڑی مایوسی ہوئی، ایک منچلے نے تو یہاں تک کہدیا کہ: آگ تو لگا دی مگر بجھانا نہیں آتا۔ انھوں نے بیگ کمیٹی تو بنوا دی تھی، مگر اس کی سفارشات کو وہ حکومت ہند سے نہ منوا سکے، حکومت کے پیش نظر اپنے مصالح تھے۔ علی گڑھ اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا کہ اس سے کم پر وہ کسی حالت میں راضی نہ ہوگا۔ مرحوم کو علی گڑھ سے بڑی ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ واقعی اس کے مسائل کو سلجھانا چاہتے تھے، مگر انھیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ حالات اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں جتنا کہ وہ سمجھتے تھے۔ درحقیقت یہ بڑا ہی بدنصیب ادارہ ہے، یہ اتنا بد نہیں جتنا بدنام ہے۔

جامعہ آنے کے بعد جب ان سے ملا تو محسوس کیا کہ مسلمانوں اور مسلم اداروں سے ان کو

بے انتہا ہمدردی اور محبت ہے۔ جامعہ کے معاملات کے سلسلے میں جب بھی ان سے وقت مانگا، ۲۴۔۴۸ گھنٹے کے اندر وقت مل گیا۔ بات کم کرتے تھے، مگر ہر بات اور ہر مسئلے کو ذہن نشین رکھتے اور جب بھی موقع ملتا اس کو پورا کرنے یا حل کرنے کی ضرور کوشش کرتے۔ چند ہی ملاقاتوں میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی بھی جلسے میں یا کھانے اور چائے پر ملاقات ہو جاتی تو بڑی بے تکلفی کے ساتھ کہتے: کہئے آپ کی جامعہ کا کیا حال ہے؟ یا آپ کی جامعہ ٹھیک تو ہے؟ ملاقات کے لئے وقت لینا ہو یا جامعہ میں مدعو کرنا ہو تو کبھی در کے چکر یا ان کے اسٹاف کے پیچھے پیچھے بھاگنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ابھی حال میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے سمینار کے افتتاح کے لئے ہم نے ان سے درخواست کی تو بڑی خوش دلی کے ساتھ وقت دیا۔ یہاں تشریف لائے تو وقت کی تنگی کی وجہ سے ان کے پروگرام میں کافی کی شرکت شامل نہیں تھی، لیکن عین وقت پر جب معلوم ہوا کہ ان کے خطبے کے بعد کافی "بریک" ہے تو جاتے جاتے لوٹ پڑے اور جہاں کافی کا انتظام تھا اس طرف چل پڑے۔ اس کی وجہ سے سیکوریٹی کے لوگوں کو سخت پریشانی ہوئی، مگر مرحوم کی یہ انتہائی محبت اور عنایت تھی جو انھوں نے ایسا کیا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جامعہ والوں اور مندوبین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنا چاہتے ہیں۔

وہ سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کی پیداوار تھے، پھر کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا ذہن کھلا ہوا اور جدید تھا، یہ وہ ذہن تھا جو انگلستان سے واپس آتا ہے تو زیادہ ہندوستانی ہو جاتا ہے، زیادہ مشرقی ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی قومیت کے ساتھ ساتھ وہ ایک مذہبی وجدان کے مالک تھے۔ اسی لئے ہم سب کہتے رہے ہیں کہ وہ سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی تھے۔ ہندوستان کی تہذیب کی رنگارنگی کا انھیں اس لئے احساس تھا کہ ان کا بچپن دہلی میں اور جوانی آسام میں گذری تھی۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کے تنوع کو بھرپور انداز میں دیکھا اور محسوس

کیا تھا۔

## تعزیتی قرارداد

آخر میں شیخ الجامعہ صاحب کی طرف سے حسب ذیل تعزیتی تجویز پڑھی گئی جسے جلسے نے خاموش کھڑے ہو کر منظور کی :

"جناب فخرالدین علی احمد صاحب اُن چند قوم پرور مسلمانوں میں سے تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی قوم اور ملک کے لئے وقف کر دی تھی۔ موصوف شروع سے جب سے عملی زندگی میں قدم رکھا، کانگریس سے وابستہ رہے، اس عرصے میں سخت سے سخت حالات پیش آئے، ملک کی سیاسی فضا میں تبدیلیاں آئیں، وطن تقسیم ہوا، مگر انھوں نے اول دن اپنے لیے جو سیاسی راستہ منتخب کیا تھا، اس پر آخر دم تک قائم رہے۔ شروع میں آزادی سے قبل، ان کی خدمت کا میدان، ملک کا ایک دور افتادہ علاقہ صوبہ آسام تک محدود تھا، لیکن آزادی کے بعد انھوں نے دہلی کو مستقل مرکز بنایا اور پورے ملک کی خدمت میں پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ ایک طویل عرصے تک مرکزی وزیر کی حیثیت سے خدمت انجام دی، مختلف قسم کے کام انھیں سپرد کئے گئے جنھیں انھوں نے انتہائی خلوص اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیا۔ اگست ۱۹۷۴ء میں قوم نے ملک کے سب سے بڑے عہدے راشٹرپتی کے لئے منتخب کیا۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی، مگر انھوں نے قومی اور بین اقوامی دونوں سطحوں پر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔

مرحوم کو جامعہ ملیہ سے خصوصی تعلق تھا نہ صرف یہ کہ جامعہ کی درخواست پر جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر وہ جامعہ تشریف لائے اور خطبہ ارشاد فرمایا،

نیز ابھی حال میں جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے سمینار کا افتتاح فرمایا، بلکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مختلف مواقع پر جب جامعہ ملیہ کے بعض اہم معاملات میں مشورہ کیا گیا تو انھوں نے نہ صرف اپنے مشوروں سے نوازا بلکہ قابل قدر مدد فرمائی۔ میں جب بھی ان سے ملا تو ہمیشہ محسوس کیا کہ جامعہ کے لیے ان کا دروازہ اور ان کی آغوش دونوں کھلے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ ملک کا بے لوث خادم، اردو کا حامی و مددگار اور جامعہ کا مخلص خادم ایسے نازک موقع پر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے جب ان کی رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی۔ جامعہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ مرحوم کی اہلیہ محترمہ عابدہ احمد صاحبہ، ان کی بہنوں محترمہ حمیدہ سلطان احمد صاحبہ، خجستہ سلطان احمد صاحبہ، رقیہ صاحبہ اور عابدہ صاحبہ، ان کے بھائیوں، احترام الدین علی احمد، احتشام الدین علی احمد اور شمس الدین علی احمد، ان کے صاحبزادوں، ڈاکٹر پرویز علی احمد اور جناب بدر دُرّویز علی احمد اور صاحبزادی بیگم ثمینہ خاں صاحبہ کے غم میں شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین!"

---

## جناب سید احمد علی آزاد کی وفات

۱۳ فروری کی سہ پہر میں ساڑھے چار پانچ بجے، صدر جمہوریہ کا تعزیتی جلسہ ختم ہوا تو سید احمد علی صاحب آزاد کی وفات کی اطلاع ملی۔ وہ کئی دن سے قریبی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ شیخ الجامعہ صاحب دوسرے اساتذہ اور کارکنوں کے ساتھ فوراً ہی ہسپتال پہنچے۔

سید احمد علی آزاد مرحوم جامعہ کے قدیم طالب علم اور سابق استاد اور انجمن جامعہ کے حیاتی رکن تھے۔ اسی روز رات کو تقریباً ۹ بجے تجہیز و تدفین ہوئی، دوسرے روز مرحوم کے سوگ میں جامعہ کے تمام ادارے بند رہے اور ۲۲ر فروری کو قرآن خوانی ہوئی اور شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین کی صدارت میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں مولانا بدرالدین صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد مرحوم کے دوساتھی اور حیاتی رکن جناب عبدالرزاق صاحب اور سعید انصاری صاحب نے تقریریں کیں اور آخر میں صدر جلسہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی، اس کے بعد صدر جلسہ کی طرف سے حسب ذیل تعزیتی تجویز پیش ہوئی جسے حاضرین جلسہ نے خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو کر منظور کیا:

"جناب سید احمد علی صاحب آزاد اُن حیاتی اراکین میں سے تھے جنھوں نے ۱۹۴۲ء میں ۲۰ سال یا تاحیات جامعہ کی خدمت کا عہد کیا تھا۔ موصوف ۲۴ سال تک خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۷۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ اس طویل عرصہ میں انھوں نے تعلیمی مرکز قرول باغ کے نگران اور مدرسہ ابتدائی، جامعہ نگر کے استاد اور اتالیق کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مرحوم ان چند اساتذہ میں سے تھے، جنھوں نے اپنے خلوص اور ان تھک محنت سے منصوبی طریقۂ تعلیم میں بڑا نام پیدا کیا تھا اور اس سلسلے میں مرحوم نے جو کام کئے ہیں وہ تعلیمی تجربات میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے خاص طور پر آخر وقت میں مرحوم

نے کچھ خرابیٔ صحت کی وجہ سے اور کچھ ناساعد حالات کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، مگر ہمت اور اُمید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور گوناگوں مشکلات کے باوجود جامعہ کی تعلیمی بستی میں اپنی زندگی کے دن پورے کئے اور دوسرے حیاتی اراکین کے پہلو بہ پہلو آسودۂ خاک ہوئے۔ جامعہ ملیہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کی اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلنے اور تمام متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آمین!"

---

## ماہنامہ جامعہ

اگر اتفاق سے مہینے کا نہ ملے تو اسی مہینے میں نمبر خریداری کے حوالے کے ساتھ اطلاع کر دیجئے۔ دیر میں اطلاع کرنے سے دوبارہ رسالہ مہیا کرنا ہمارے لئے ممکن نہ ہوگا۔

(مینجر رسالہ جامعہ)

# جامعہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ

جلد ۷۴ | بابت ماہ اپریل ۱۹۷۷ء | شمارہ ۴

## فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی ● مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی ● ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

افسوس، اردو کا ایک اور چراغ گل ہوا۔ اس سال کے پہلے ہی مہینے میں چوٹی کے دو ادیب اور دانش ور اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ اور اب تیسرے مہینے کی آٹھ تاریخ کو اردو کے افسانوی ادب کے ممتاز اور منفرد قلم کار، کرشن چندر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ وہ صبح کو ۶ بجے اس دنیا میں آئے تھے اور ۶ ہی بجے صبح کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

کرشن چندر اردو کے محبوب ترین اور مقبول ترین ادیبوں میں سے تھے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار اور ناول نویس تھے، مگر ڈرامے بھی لکھے اور رپورتاژ بھی اور بچوں کے لئے دلچسپ اور طنزیہ کہانیاں بھی۔ انھوں نے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا، بلکہ پریم چند کے کردار اور موضوعات عام طور پر یوپی کے دیہاتوں تک محدود تھے، کرشن چندر کی کہانیوں کے موضوعات اور کردار کا تعلق تمام ہندوستان سے ہے، تہذیبی اور مذہبی لحاظ سے بھی ان میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں فطری مناظر کی مرقع نگاری ملے گی، مگر جلد ہی رومانیت سے گزر کر حقیقت نگاری پر آ گئے۔ وہ پکے اشتراکی تھے، مگر اندھے مقلد نہیں۔ انھوں نے خود اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ: "جس طرح کوئی خیال جزو ایمان بن جاتا ہے، اسی طرح اشتراکیت نے مجھے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ میرے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی اور میری حیات کا سب سے روشن پہلو۔ ۔ میں آج بھی اشتراکیت کے راستے پر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق چلتا ہوں، کام کرتا ہوں اور لکھتا ہوں، لیکن اس کا اندھا مقلد نہیں ہوں۔"

انھوں نے تقسیم ملک سے پہلے جس ہمت اور جرأت سے فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی مخالفت کی، اس کی مثالیں بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں ملیں گی۔ پروفیسر مسعود حسین نے اپنے ایک پیغام

میں مرحوم کی اسی خصوصیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "عہد حاضر کے اس نازک خیال، حساس دل اور انسانیت دوست ادیب کی میں اس للکار کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کا مظاہرہ اس نے تقسیم ہند کے وقت کیا تھا۔ کانٹے کے ہر وقت پر میں نے کرشن چندر کے جذباتی اور تخیلی ردِّ عمل کو کھرا پایا۔" اسی طرح تقسیم کے بعد جو انسانیت سوز واقعات پیش آئے اس پر بھی انھوں نے، ہمدردی، دل سوزی اور انسانیت دوستی کے گہرے اور مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا۔

مرحوم کا اسلوب سادگی و پرکاری کا حامل تھا۔ خود مرحوم نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ: "بالعموم نثر میں یورپ کے نثر نگاروں کے کہنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں اور شاعروں میں مشرقی شاعروں کی ادا کا قتیل ہوں۔" اس طرح مشرق و مغرب کی آمیزش سے ان کے اسلوب میں وہ حسن، سادگی اور دلکشی پیدا ہوئی جو اردو کے شاید ہی کسی افسانہ نگار کو نصیب ہو۔ اسی آمیزش کا اثر ہے کہ وہ جہاں براہ راست بات کہتے ہیں وہاں رمز و اشارے اور تشبیہ و استعارے سے بھی کام لیتے ہیں۔ موقع موقع سے طنز و مزاح بھی ہوتا ہے، مگر اس میں آورد نہیں آمد ہوتی ہے۔

کرشن چندر صرف ایک ادیب ہی نہیں تھے، ترقی پسند تحریک کے ممتاز معماروں اور رہنماؤں میں سے بھی تھے۔ اس تحریک نے اپنی عمر کے چالیس اکتالیس برسوں میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ایک عرصے سے تعطل کا شکار ہے۔ مرحوم کی مقبولیت اور ہردلعزیزی سے اس تحریک کو بڑی تقویت اور سہارا ملا اور شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ جب بھی ترقی پسند مصنفین کی صف میں انتشار اور اختلاف پیدا ہوا تو اتفاق و اتحاد پیدا کرنے اور مصالحت کرانے میں مرحوم کی محبوب اور مرنجا مرنج شخصیت بڑی مددگار ثابت ہوتی تھی۔

---

کرشن چندر ۲۳ رنومبر ۱۹۱۴ء کو وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں صبح کے ۶ بجے پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ایم اے اور ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں اکزکیٹو پروگرام کی حیثیت سے کام شروع کیا، تین سال کے بعد دہلی سے شالی مار اسٹوڈیو، پونہ چلے گئے اور وہاں سے بمبئی اور پھر بمبئی کی فضا ایسی راس آئی کہ پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۶۶ء میں سوویٹ لینڈ نہرو انعام ملا اور ۱۹۶۹ء میں پدم بھوشن کا خطاب۔ مرحوم کے افسانوں، ناولوں،

ڈراموں اور رپورتاژوں کی مجموعی تعداد سو بتلائی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے افسانوں اور ناولوں کے ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمے شائع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ انگریزی، روسی اور چینی زبانوں میں بھی متعدد ترجمے شائع ہوکر مقبول ہوئے ہیں۔ افسوس کہ اردو کا اتنا فعال اور ہر دلعزیز ادیب ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ ان کی وفات سے اردو ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کو پُر کرنا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

---

مارچ ہی کے اواخر میں، ۲۶ تاریخ (سنیچر) کی شب میں ایک انگریز نژاد، انتہائی خدمت گزار اور عبادت گزار خاتون، فریدا بیدی (Freda Bedi) کا دہلی میں انتقال ہوا۔ محترمہ ان چند برطانوی خواتین میں سے تھیں جنھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑدو" کی تحریک کے موقع پر گاندھی جی نے ستیہ گرہ کے لیے جن لوگوں کو منتخب کیا تھا ان میں یہ خاتون بھی تھیں۔ آزادی کے بعد سماجی خدمت اور مذہبی مطالعہ کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کردیا۔

مسز بیدی کا پورا نام فریدا مارے ہولسٹن (Freda Mare Houlston) تھا اور ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں ڈربی (انگلستان) میں پیدا ہوئیں۔ آکسفورڈ سے سیاسیات، معاشیات اور فلسفے میں بی اے آنرز کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں جناب بی، پی، ایل، بیدی سے شادی کرلی، ۱۹۳۴ء میں میاں بیوی دونوں ہندوستان آئے اور تحریک آزادی میں شریک ہوگئے اور دونوں کو بارہا جیل کی سزا ملی۔ مرحومہ نے کچھ عرصہ تک انگریزی صحافت کے ذریعہ بھی ملک و قوم کی خدمت کی۔ "کنٹمپریری انڈیا" کے نام سے لاہور سے ایک قومی سہ ماہی رسالہ نکلتا تھا، کچھ عرصہ تک اس کی جوائنٹ اڈیٹر رہیں، ایک انگریزی ماہنامہ "ماڈرن گرل" کی ادارت میں کچھ عرصہ کرشن چندر کے ساتھ بھی کام کیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد پورا خاندان کاشمیر منتقل ہوگیا اور مسز بیدی شرنارتھیوں کی خدمت میں، اور کاشمیر پر قبائلی حملے کی وجہ سے جو تباہی آئی تھی اس کی آبادکاری میں لگ گئیں۔ ۱۹۵۳ء میں یہ خاندان دہلی آگیا اور مسز بیدی یو این کی طرف سے برما چلی گئیں اور "سوشل ویلفیر" کے اڈیٹر کی حیثیت سے، ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۹ء تک برما کے مختلف دیہی علاقوں

کا دورہ کیا، اس موقع پر تبتی مہاجرین کی خدمت اور اس علاقے کے سماجی مسائل، مذہبی حالات خاص طور پر بدھ مت کے مطالعے کا بہترین موقعہ ملا اور وہ بدھ مت کی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ اس مذہب کو اختیار کرلیا اور خدمت اور عبادت کے ذریعہ ۱۹۶۶ء میں بدھ ازم کے بلند مرتبے سے سرفراز ہوئیں اور تبتی روایت کے مطابق سکم کے پہاڑوں میں اپنے گرو کی خانقاہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئیں۔ اس عرصے میں کبھی کبھی اپنے مشن کی خاطر یورپ و امریکہ کا دورہ بھی کیا اور متعدد لکچر دئے۔ ۱۹۷۵ء میں جب عورتوں کا بین اقوامی سال منایا گیا تو سماجی خدمت کے لئے مرحومہ کو خصوصی انعام عطا کیا گیا۔

---

قارئین جامعہ کو یہ معلوم کرکے یقیناً خوشی ہوگی کہ اترپردیش کی اردو اکیڈمی نے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کو اردو ادب کی مجموعی خدمت پر پانچ ہزار کا گراں قدر انعام دیا ہے۔ پروفیسر مجیب صاحب علم و ادب کی مدت العمر جو مخلصانہ خدمات انجام دی ہیں، ہمیں خوشی ہے کہ اردو اکیڈمی لکھنؤ نے اس کا اعتراف کرکے ایک ایسا فرض ادا کیا ہے جو بہت پہلے ہونا چاہئے تھا۔ اسی موقع پر جامعہ کے ایک قدیم طالب علم اور جامعہ ملیہ کے قدرداں اور ہمدرد ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کو بھی ان کی تازہ ترین کتاب "حافظ اور اقبال" پر تین ہزار کا انعام ملا ہے۔ نیز دلی انتظامیہ کی طرف سے بھی موصوف کو اردو زبان و ادب کی خدمت پر اعزاز عطا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ امسال یوم جمہوریہ کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے جن لوگوں کو پدم بھوشن کا خطاب ملا ہے، ان میں جامعہ ملیہ کے تین قدیم طلبا بھی شامل ہیں، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جناب سی کرشنا نائر اور ڈاکٹر کیلاش نرائن کول، وائس چانسلر اگریکلچرل یونیورسٹی کانپور۔ اول الذکر دونوں حضرات جامعہ کے گھر بجوٹ ہیں، البتہ ڈاکٹر کول صاحب ابتدائی زمانے میں جامعہ میں کچھ عرصے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد چلے گئے تھے۔ ہم ماہنامہ جامعہ کی طرف سے پروفیسر مجیب صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین صاحب، کرشنا نائر صاحب اور کول صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین

# قومی خدمت کا پیکر
## راشٹرپتی فخرالدین علی احمد صاحب

کل، ۱۱ فروری کو ہمارے درمیان سے ایک انسان اُٹھ گیا، نیکی و شرافت، بھلائی اور بھلمنساہٹ کا پُتلا چلا گیا۔ عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب کی اچانک موت صرف صدرِ جمہوریہ ہند کی موت نہیں ایک شخص اور شخصیت کی موت ہے جو انسانیت اور شرافت کا مظہر و پیکر تھی!

ع عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے!

یہ سانحہ کچھ روز اور ٹل جاتا تو ان کی انسان دوست شخصیت کی مہک سے مستفیض ہونے کا اور موقع ملتا، ان کی سیاسی بصیرت سے ملک و قوم کو کچھ اور روشنی ملتی، ان کے دم سے دلّی کچھ دنوں اور آباد رہتی: لیکن صد حیف!

ع شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

فخرالدین علی احمد مرحوم دلّی کی تہذیب کے زائیدہ اور آسامی کلچر کے پروردہ تھے۔ اس طرح ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی پر وسیع تر ہندوستانی تمدن کی چھاپ تھی۔ وہ نرے 'دلّی وال' ہوتے تو یک رنگ ہوتے، خالص 'آسمیا' ہوتے تو محدود ہوتے۔ ان کی گہری قوم پرستی کا راز اسی وسیع تر تہذیبی رنگارنگی میں ہے۔ اسی میں ان کی سیکولرازم کے سرچشمے ملتے ہیں۔

ان کی شخصیت کا پہلا تاثر ذہانت سے زیادہ شرافت اور متانت کا پڑتا تھا۔ کم سخن تھے لیکن صاف گو۔ ان کی نیک نیتی اور ہمدردی کا احساس پہلی ملاقات میں ہو جاتا۔ مجھے ان کی خدمت میں نیاز زیادہ تر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے توسط سے رہا۔ جب وہ وزیر تھے اس وقت بھی اپنے معاملات لے کر ان کے پاس جا پہونچتا اور جب وہ راشٹرپتی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو گئے اور نسبتاً عدیم الفرصت ہو گئے اس وقت بھی۔ ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا اور جامعہ ملیہ کے معاملات میں ان کی دلچسپی ہمیشہ یکساں رہی۔ مجمعوں اور جلسوں میں جب بھی سلام و نیاز کا موقع ملتا تو ان کے لبوں پر ہمیشہ ایک ہی سوال پاتا ـــ "کیا حال ہیں آپ کی جامعہ کے۔" میں بھی ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ـــ "آپ کی جامعہ بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔" "آپ کی جامعہ" کے تاکیدی لہجہ پر خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر جاگ اٹھتی۔ راشٹرپتی بننے کے فوراً بعد انھوں نے ہماری پیش کش قبول کرتے ہوئے جامعہ آکر کنووکیشن کا خطبہ دینے کی زحمت گوارا کی۔ چند ماہ قبل جب جامعہ ملیہ نے اسلامی فکر کی تشکیل جدید پر سیمینار منعقد کیا اور پہلی بار قدیم و جدید مکاتیب فکر کے عالموں کو یکجا کیا تو انھوں نے ایک فکر انگیز افتتاحی خطبہ دیا۔

میں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"جب ہمیں اسلامی فکر کی تشکیل جدید سے متعلق سیمینار کے افتتاح کے لئے کسی ایسی مناسب شخصیت کی تلاش ہوئی تو ہمیں آپ کی ذات گرامی سے بہتر دوسرا کوئی نظر نہیں آیا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بزرگوں کے متعین کردہ اس تعلیمی نصب العین کا مظہر ہو جو عبارت ہے ـــ 'سچے مسلمان اور اچھے ہندوستانی سے ـــ'"

میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ "سچا مسلمان اور اچھا ہندوستانی" جو جامعہ ملیہ کی تعلیمی

تحریک کا نصب العین ہے، ان کی شخصیت اس زمانے میں اس کا بہترین مظہر تھی ۔ وہ اس لحاظ سے ان دیوزادوں میں تھے جن کا سلسلہ سرسید احمد خاں سے شروع ہوتا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوتا ہوا ڈاکٹر ذاکر حسین تک پہونچتا ہے۔ ان شخصیتوں میں اسلامیت اور ہندوستانیت دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ انسانیت کے سنگم پر آکر دونوں مدغم ہوجاتی ہیں۔ یہ سب کے سب بڑے ہندوستانی تھے لیکن اپنے محوروں سے بے تعلق ہوکر نہیں بلکہ انھیں قومی دھارے کے قریب لاکر۔ ہر شخصیت کے پس منظر میں ایک تہذیبی صدائے بازگشت ہوتی ہے اس کو سنتے رہنا تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی جانب سے کان بند کرلینا اپنے ماضی سے کٹ کر علاحدہ ہو جانے کے مترادف ہے ۔

فخرالدین علی احمد صاحب کی زندگی اس کی آئینہ دار تھی۔ وہ سابق صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح معلی کے راستے سے اس اعلیٰ منصب تک نہیں پہونچے تھے ۔ ان کا راستہ سیاست کا گرم راستہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ نرم سیرت اور نرم گفتار رہے ۔ ان کی خاموشی ان کی سیاست تھی، اور یہ سیاست ہمیشہ تابع رہتی ان کی انسانیت کی ۔ معلم کے لئے منکسر المزاج ہونا بڑی بات نہیں لیکن سیاست داں کے لئے انکساری غیر معمولی بات ہے ۔ فخرالدین علی احمد صاحب کی شخصیت میں یہ غیر معمولی بات رچی بسی ہوئی تھی جس کی شہادت ہر اس شخص نے دی ہے جس نے کل سے آج تک اُن کے بارے میں کچھ کہا ہے۔

لیکن ان کے اس انکسار کے پیچھے ایک فولادی سیرت تھی جس کا اظہار ان کی قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبہ میں ہوتا رہا ہے ۔ اور اس لحاظ سے وہ علامہ اقبال کے اس مصرع کے مظہر تھے ؎

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اس میدان میں ان کے یہاں کوئی مصلحت یا مصالحت نہیں تھی۔ شروع سے ان کی ڈگر ایک رہی۔ قوم پرستی کی راہ سے ان کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وفاداری بشرطِ استواری سے وہ قدم بقدم بڑھتے رہے اور قومی قیادت کے دل پر اپنا سکہ بٹھاتے رہے۔ سیاست کی دلدل میں بھی انھوں نے اپنے کردار کے یہ نقش قائم رکھے۔

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

وہ میدان سیاست میں بھی ہمیشہ اسپورٹسمین رہے اور اسی اسپرٹ سے اس کا کھیل کھیلا۔

انھیں ہندوستان کے پس ماندہ طبقات بالخصوص مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کے مختلف النوع اداروں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دارالعلوم دیوبند ہر جگہ عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے سربراہوں سے قریبی تعلق رکھتے اور ان اداروں کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ آخری زمانے میں مسلمانوں کے معاشرتی مسائل سے ان کی دلچسپی گہری ہوگئی تھی اور بڑی جرأت اور ہمدردی کے ساتھ وہ اُن میں فیملی پلاننگ کا پرچار کرتے رہتے تھے۔ اُن کی آواز پر لوگ کان بھی دھرتے تھے اس لئے کہ ان کی شخصیت ان کی نظروں میں معتبر اور محترم تھی اور ان کا خلوص اور ہمدردی بے لوث، ان کا ایمان محکم تھا اور ساؤتھ میں اُن کا عمل پیہم۔ وہ سینٹ اسٹیفن اور کیمبرج کے پروردہ تھے لیکن روایت میں تھے ایک دہلی نژاد یعنی سرسید احمد خاں کی، اس لئے چاہتے تھے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو عہد جدید کے تقاضوں سے روشناس کراسکیں۔ اس لحاظ سے ان کی ذات جدید و قدیم کا سنگم تھی۔ جو کہتے اس پر عمل کرتے۔ جدھر بلاتے اُدھر پہلے خود جاتے۔

اردو زبان اور اردو تہذیب کے لئے انھوں نے جو کچھ کیا وہ یادگار رہے گا۔ غالب کی عظمت کو ایوانِ غالب قائم کرکے جو خراج عقیدت پیش کیا وہ آج زبانِ حال سے خود

ان کی عظمت کا اعتراف کر رہا ہے۔ وہ دلّی کے چاہنے والے اور چہیتے دونوں تھے۔ اور آج یہ کیفیت ہے کہ

ع مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اداس ہے !

دلّی اُداس ہے، اس کی گلیاں جس میں وہ کھیلے اور پلے بڑھے اُداس ہیں، اُس کے ایوانِ سیاست جہاں انھوں نے قوم کی تقدیر ڈھالی، اُداس ہیں، علی گڑھ اُداس ہے کہ اُس کے عقدۂ لاینحل کا حل کرنے والا چلا گیا، جامعہ ملیہ اُداس ہے کہ اُس کا ایک مربی و شفیق چلا گیا، مسلمان اُداس ہیں کہ ایک مردِ مومن چلا گیا، سارا ہندوستان اُداس ہے کہ ایک عظیم محبِ وطن چلا گیا۔ رہ رہ کر بزبانِ غالب یہ حرف تمنا چیخ بن کر نکل رہا ہے ؎

تم ایسے کھرے کون سے تھے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

(بہ شکریہ اردو سروس، آل انڈیا ریڈیو۔ نئی دہلی)

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

# مرکباتِ عطفی کا اسلوبیاتی تجزیہ
## (پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تصانیف کی روشنی میں)

(۲)

۲۔ تشکیلیاتی نحوی : صوتیاتی تجزیے کے بعد جب ان مرکبات کا ہم الفاظ کی سطح (WORD - LEVEL) پر یا تشکیلیاتی (MORPHOLOGICAL) اور نحوی (SYNTACTIC) اعتبار سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ذیل کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

(۱) مرکب کے دونوں اجزا کا ایک ہی جزوِ کلام (PART OF SPEECH) سے تعلق رکھنا۔

دونوں اجزا اسم:

زبان کے لکھنے اور بولنے والوں کے قوائے ذہنی و عملی کی اصلاح و تربیت کی جائے (آ ب م ۔ ۱۷۲)

بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے (گ گ ۔ ۱۶۹)

کس کو فکر و فرصت ہے (گ گ ۔ ۱۷۶)

دونوں اجزا صفت:

وہ مشہور و معروف مقدمہ جو "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے شائع ہوا (آ ب م ۔ ۱۶۷)

اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو ترس

گیا (گ گ - ۱۰۶)

دونوں اجزا فعل یا مشتقاتِ فعل:

ان کو مشرقی تصورات اور مشرقی آداب بود و ماند سے کوئی سروکار نہ تھا (گ گ - ۱۹۴)

تندرست نرسوں کی مستعدی، مصروفیت اور مسلسل آمد و رفت اور زیادہ وحشت انگیز بنا دیتی ہے (م ر ـــ ۱۴۹)

(۲) مرکب کے دونوں اجزا کا بحیثیت واحد یا جمع آنا۔ مرکب کا اگر ایک جزو واحد یا جمع ہے تو دوسرا جزو بھی واحد یا جمع ہوتا ہے۔ جن کی مثالیں پیش ہیں:

کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں (گ گ - ۱۷۸)

جن کو احباب و اعزا جلد نہ بھولیں گے (گ گ - ۲۰۷)

زندگی و زمانہ کے جن مصائب و مطالبات سے دوچار تھے (آب م - ۱۷۹)

(۳) مرکب کے ایک جزو کا دوسرے جزو سے مشتق ہونا، مثلاً:

جسم و جسامت کے اعتبار سے ممتاز نہ تھے (گ گ - ۸۸)

صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی رنگینیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ (گ گ - ۱۷۸)

مذہب کی افہام و تفہیم میں سرسید یا کسی اور کا کہیں کہیں غیر محتاط ہونا تعجب کی بات نہیں (آب م - ۴۵)

سیاسی جدل و جدال کے لئے جگہ خالی کر دی (آب م ۱۰۹)

مولانا کا بہترین مشغلہ تصنیف و تالیف یا درس و تدریس ہوگا (م ر - ۴۸)

(۴) مرکب کے دونوں اجزا کا سابقہ یا لاحقہ دار ہونا۔ مرکب کے ایک جزو میں جو سابقہ یا لاحقہ ہوتا ہے وہی سابقہ یا لاحقہ دوسرے جزو میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہمدوش و ہمعناں رہنے کی روایت قائم کی (گ گ - ۲۷۳)

ان راستوں پر مجاہدانہ ومجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہوجاتا (گ گ۔ ۱۹۵)

ادبی وفنی نقطۂ عروج تک پہنچا کر بس نہیں کیا (گ گ۔ ۱۹۲)

ناکام ونامراد واپس جاتا (آب م۔ ۶۰)

(۵) مرکب کے دونوں اجزا کا مذکر یا مونث ہونا۔ مرکب کا اگر ایک جزو مذکر یا مونث ہے دوسرا جزو بھی مذکر یا مونث ہوتا ہے۔

ناغہ ہوتا رہا اس لئے مشق وصفائی کی نوبت نہ آئی (گ گ۔ ۸۶)

انھوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر وپندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا (گ گ۔ ۹۳)

جس میں ابتدائی عیش وطرب کی جھلکیاں ملتی ہیں (غ ش ش۔ ۱۰)

۳۔ معنوی: عطفی مرکبات کا مطالعہ وتجزیہ معنوی (SEMANTIC) سطح پر بھی انتہائی دلچسپی کا باعث ہے۔ ان مرکبات پر جب ہم معنوی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ان کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ رشید صاحب کے اس اسلوب کی قدر وقیمت کا بھرپور اندازہ دراصل ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان مرکبات کے معنوی پہلوؤں اور باریکیوں پر بھی غور کرتے ہیں۔

(۱) مرکب کے دونوں اجزا کا مترادف ہونا۔ جب مرکب کے دونوں اجزا مترادف (SYNONYMOUS) ہوں تو یہ ترادفی مرکب (SYNONYMIC COMPOUND) کہلاتا ہے۔ رشید صاحب کے اسلوب کی دراصل یہی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ ان کے یہاں بیشتر مرکبات اس قبیل کے ہیں جن میں دو ہم معنی یا قریب قریب ہم معنی الفاظ کو یکجا کردیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مرکبات کا پہلا یا دوسرا جزو حذف کردیا جائے تو جملے کی نحوی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی معنی میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ البتہ مفہوم کی باریکی اور (SHADES)

سے وہ عبارت ضروری عاری ہو جاتی ہے۔ صرف ایک تصنیف "غالب کی شخصیت اور شاعری" سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نوجوان، بوڑھوں کو آزمائش میں نہیں مبتلا کرتے، ان کی آبرو کے امین ہوتے ہیں (ص۔۳)

وہی ان کی شخصیت کے بنانے میں مستقل طور پر معین ہوئے۔ (ص۔۱۱)

یہ اشخاص اور ادارے دلی کے مخصوص وگرانقدر معیارِ اخلاق و اقدار کے نگران تھے (ص۔۱۲)

ان کو اپنے نسب پر بڑا ناز تھا جس کا برابر اظہار کرتے رہتے (ص۔۱۷)

جیسے غالب کی وفات نے حالی کی تمام خوابیدہ صفات کو..... ہر طرف بکھیر دیا ہو (ص۔۴۴)

غالب ہماری تہذیب اور ہمارے شعر و ادب کا ایسا جوہری عنصر بن گئے جو مسلسل تابکار رہتا ہے (ص۔۵۲)

غالب کے حزن اور رشک دونوں کا ماخذ یہی طبقاتی احساسِ زیاں تھا (ص۔۶۴)

ان مثالوں میں خط کشیدہ الفاظ مفرد نہیں، مرکب استعمال کیے گئے ہیں جو علی الترتیب یہ ہیں: امین و محافظ، سیرت و شخصیت، نگران و نگہبان، اظہار و اعلان، خفیہ و خوابیدہ، مسلسل و مدام اور ماخذ و منبع۔ یہ مرکبات مفہوم کو آگے بڑھانے اور معنی کو اوپر اٹھانے میں بیحد مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا جملوں کو پھر سے پڑھ کر دیکھئے۔

نوجوان، بوڑھوں کو آزمائش میں نہیں مبتلا کرتے، ان کی آبرو کے امین و محافظ ہوتے ہیں۔

وہی ان کی سیرت و شخصیت کے بنانے میں مستقل طور پر معین ہوئے۔

یہ اشخاص اور ادارے دلی کے مخصوص وگرانقدر معیار اخلاق و اقدار کے

نگران و نگہبان تھے۔

ان کو اپنے نسب پر بڑا ناز تھا جس کا برابر اظہار و اعلان کرتے رہتے۔

جیسے غالب کی وفات نے حالی کی تمام خفیہ و خوابیدہ صفات کو ۔۔۔۔ ہر طرف بکھیر دیا ہو۔

غالب ہماری تہذیب اور ہمارے شعر و ادب کا ایسا جوہری عنصر بن گئے ہیں جو مسلسل و مدام تابکار رہتا ہے۔

غالب کے حزن اور رشک دونوں کا ماخذ و منبع یہی طبقاتی احساس زیاں تھا۔

مترادفات کا استعمال رشید صاحب کے یہاں دو وجوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ اول یہ کہ ایک ہی معنی رکھنے والے دو الفاظ کے استعمال سے بات میں زور اور وزن (WEIGHT) پیدا ہو جاتا ہے۔ لہجے کو تاکیدی اور پُرزور (EMPHATIC) بنانے کا یہ بڑا اچھا طریقہ ہے۔ دوم بعض اوقات تنہا یا مفرد لفظ کسی خاص مفہوم کی اچھی طرح وضاحت نہیں کرپاتا یا جو معنی و مفہوم مراد لینا ہوتے ہیں، وہ لفظ ان کا احاطہ نہیں کرپاتا۔ ایسی صورت میں مزید وضاحت کے لئے دوسرا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس سے باریک سے باریک مفہوم بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے اور تعینِ مفہوم میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اسے معنوی تکرار (SEMANTIC REPETITION) کہہ لیجئے یا معنوی دہراپن (SEMANTIC DUPLICITY) یا دوسرے لفظوں میں حشو و زائد لیکن رشید صاحب کی نثر کی یہی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ رشید صاحب نے مترادفات کا استعمال کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ یہ چیز ان کے اسلوب کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت بن کر رہ گئی ہے۔ اُردو کے کسی دوسرے ادیب نے اس جامعیت اور تنوع کے ساتھ مترادفات کا استعمال آج تک نہیں کیا۔

دو مترادف الفاظ مل کر معنی میں جو زور اور اثر پیدا کرتے ہیں وہ تنہا لفظ ہرگز پیدا نہیں کرسکتا۔ اس طرح کے الفاظ کے انتخاب میں رشید صاحب آوازوں کی ترتیب و تنظیم اور

ان سے پیدا ہونے والے صوتی وزن و آہنگ (جن کا تفصیلی ذکر اوپر گذر چکا ہے) کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ مترادفات کے استعمال سے کسی زبان کے لفظی سرمایے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو زبان کو اس سلسلے میں مالا مال کرنے میں رشید صاحب نے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ ترادفی مرکبات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

سرسید مسلمانوں کے یکہ و تنہا یار و ناصر رہے (آب م ۔ ۳۵)

نتائج و عواقب کے لحاظ سے یہ بہت بڑی تبدیلی تھی (آب م ۔ ۳۹)

جس کے بغیر نہ تو کسی قوم کے تہذیبی شعور میں ربط و تسلسل باقی رہتا ہے، نہ خود نسلِ انسان (آب م ۔ ۴۸)

خواہ عزت و ناموس کی، خواہ راحت و عافیت کی، خواہ ذہن و ضمیر کی (آب م ۔ ۴۸)

تمام عمر کیسا ہی موقع و محل کیوں نہ ہو، خوش اعتماد رہا (آب م ۔ ۸۵)

شکل و شباہت پر امتداد زمانہ کا اثر پڑا بھی ہے تو اتنا (آب م ۔ ۹۰)

اس نازیبا حرکت پر نفرت و نفریں کا ایسا طوفان برپا ہوا کہ فریق مخالف الکشن ہار گیا (آب م ۔ ۱۰۰)

تعلیم سے فارغ ہو کر زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں مصروف و منہمک ہیں (آب م ۔ ۱۳۶)

آپ کو یا مجھے کار آمد کار آفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (ہ ن ر ۔ ۵۴)

مسلمانوں کی آبرو، جان و مال کی تباہی و تاراجی کا وہ عالم تھا کہ (ہ ن ر ۔ ۸۵)

جہاں تک یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کا تعلق تھا ان کی نگاہ کتنی دور رس تھی (ہ ن ر ۔ ۹۴)

جہاں تاویل و تعبیر کے ایک سے زیادہ پہلو نکلتے ہیں (ہ ن ر ۔ ۱۲۱)

گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے (گ گ ۔ ۱۴)

وہ ہر طرح راضی و خوشنود ہے (گ گ ۔ ۴۷)

انھوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا (گ گ ۔ ۹۳)

دوسرے یہ کہ توصیف و تحسین کے جن کلمات سے میرا تعارف کرایا گیا ہے (غ ش ش-۱)
تو زبان و ادب میں آئے دن انتشار و خلفشار کا سامنا ہونے لگے (غ ش ش-۱۲)
تشکیل اور تہذیب کا مہذب بھی توافق و توازن ہے (غ ش ش-۵۳)
جس کی گرمی و گداز سے حسنِ خیال اور حسنِ عمل کا ظہور ہوتا ہے (غ ش ش-۵۶)
ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق و ہمدم مل جاتا ہے (ذ ص-۴۵)

(۲) مرکب کے دونوں اجزا کا قریب المترادف ہونا۔ جہاں مکمل (ABSOLUTE) مترادفات دستیاب نہ ہوں وہاں قریب قریب (APPROXIMATE) ہم معنی الفاظ کے ساتھ مرکبات بنائے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ معنی کے اعتبار سے کچھ مختلف ضرور ہوتے ہیں لیکن مرکب بن کر جب کسی خاص سیاق و سباق میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کی حیثیت ترادفی ہو جاتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

مختلف مذہب و مسالک کے طلبا اور اساتذہ اس ادارے میں یکجا رہے ہیں۔ (آب م-۴۶)
زبان کے لکھنے بولنے والوں کے قوائے ذہنی و عملی کی اصلاح و تربیت کی کوشش کی جائے (آب م ۱۷۲)
انسانی عقل و شعور کا بھی نامی اور حرکی ہونا لازم آتا ہے (آب م ۱۷۶)
ہمارے ہاں بزرگانِ سلف کی خدمات کو بالعموم احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا گیا (آب م ۱۸۱)

عالم کیف و جذب میں، پہنچ کر اس طرح داستان سنانے لگتے (ہ ن ر-۸۳)
نفاق و افتراق کو دور کرنے میں تمام عمر کوشاں رہے (گ گ-۱۱۹)
یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا ہیچ (گ گ-۵۳)
اردو میں مغربی انداز کی تنقید مروج و مقبول ہوئی (گ گ-۱۶۷)

جو لوگ قاضی صاحب کی ذہانت وفطانت سے واقف ہیں (گ،گ - ۲۳۷)

ذی استعداد اور ہونہار نوجوانوں کو مناسب ومعقول رہبری اور ماحول نہ ملنے سے (گ،گ - ۲۷۲)

اس کے آئین واصول ایک مختصر فارسی رسالے میں مدون کر چکے تھے (غ ش ش - ۲۵)

اس معیار ومیزان کے پیش نظر جب ہم ان شاعروں اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں (غ ش ش - ۸۸)

عربوں کے یہاں ہجو کی تعریف تشریح میں جو کچھ کہا گیا ہے (ط م - ۱۵)

ہوریس نے اپنے سنجیدہ اور شگفتہ طعن وطنز میں ایک قسم کا مذہبی تقدس پیدا کر دیا تھا (ط م - ۲۱)

ان پر کسی قدر تمیز وتہذیب کا عمل ہوا (ط م - ۱۷)

(۳) مرکب کے ایک جزو کا دوسرے جزو کی رعایت یا مناسبت سے آنا۔ رشید صاحب کے یہاں ایسے بہت سے مرکبات ہیں جن کے دونوں اجزا نہ تو مترادف ہوتے ہیں اور نہ ہی متضاد، بلکہ معنوی سطح پر دونوں میں مناسبت پائی جاتی ہے، مثلاً جسم وجان (گ،گ - ۳۷) میں جسم کی مناسبت سے 'جان' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس طرح حسن وعشق (ہ ن ر - ۱۴۱) میں حسن کی مناسبت سے 'عشق' آیا ہے۔ کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

اس ادارہ میں برگ وبار کے آثار تیزی سے پیدا ہونے لگے ہیں (آ ب م - ۵۷)

ماہ ومریخ کی تسخیر میں بھی اب کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے (غ ش ش - ۸۶)

لیکن امید ہے کہ سن وسال کا بار حشو وزوائد کو زائل کر دے گا (ط م - ۲۰۳)

مصیبت ومایوسی میں انسان توہم پرست ہو جاتا ہے اور ..... [illegible] ہو جاتا ہے (م ر - ۶۰)

(۴) مرکب کے دونوں اجزا کا مختلف المعنی ہونا۔ [illegible] صاحب کے [illegible]

مرکبات کی تعداد بھی کافی ہے جن میں دونوں اجزا معنی کے اعتبار سے متضاد ہوتے ہیں، مثلاً :

نثر و نظم کے حسن و قبح کے پہچاننے کی شدبد ہو گئی تھی (آب م - ۲۳)

زندگی کے طرح طرح کے نشیب و فراز سے گذرنا پڑا (غ ش ش ۲۲)

اپنے نفع و ضرر کو خوب سمجھتے تھے (غ ش ش - ۲۰)

اس رد و قبول میں ہر شخص آزاد ہے (غ ش ش - ۵۷)

کشمکش و گریز اور حضور و سرکار کا خالق خود شاعر ہوتا ہے (غ ش ش - ۵۷)

ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے (گ گ - ۲۷۹)

کھیل میں، کھانے میں اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے (ان ر - ۵۰)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں مرکبات عطفی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی خصوصیات کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب ہم انھیں لسانیات کی مختلف سطحوں کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ صوتی، صوری، نحوی اور معنوی نقطۂ نظر سے ان کا مطالعہ و تجزیہ انتہائی دلچسپ ہے۔ اس اسلوب کو ہم بجا طور پر رشید صاحب کا مخصوص و منفرد لسانی اسلوب کہہ سکتے ہیں۔

(ختم)

پروفیسر محمد مجیب
ترجمہ: صادقہ ذکی

# سیکولرازم

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا انحصار سیکولرازم پر ہے۔ ممکن ہے ہم اس پر عمل کئے بغیر اس کی صحیح تعریف بیان کر دیں یا اس پر عمل پیرا تو ہوں لیکن کوئی اطمینان بخش تعریف نہ کر سکیں۔ ہم اس کی تعریف کرنے یا اس پر عمل کرنے میں جس حد تک بھی کامیاب ہوں بہر صورت سیکولرازم کا مقصد پورا ہو جائے گا اگر وہ ہمیں آزادی خیال سے روشناس کر دے۔ ہم جن عقائد کی پیروی کر رہے ہیں وہ محض چند عادتیں ہیں جنھیں تقدیس کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ سیکولرازم ہمیں اس عقیدے کی تشکیل میں مدد دیتا ہے جسے وجدان فکر اور تجربے کا نتیجہ کہنا چاہیے اور جو تغیر پذیر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت قوی ہوتا ہے۔ ایسا ہی عقیدہ ہماری قسمت کے بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ایسے مذاہب جن میں معاملات اور عبادات کا ایک مرتب نظام ہے، سیکولر ریاست کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن اس ضمن میں خدشات ان لوگوں سے ہیں جو قنوطیت پسند ہیں، شکست خوردہ ذہنیت رکھتے ہیں، طبیعتاً حیلہ ساز ہیں یا محض امتیاز پسندی کا سودا ہے۔ یہ تعداد میں اگرچہ زیادہ ہیں لیکن توانائی کے اعتبار سے کم زور ہیں اور عموماً کسی بھی ایسے معقول طریقۂ کار پر جو عوام کی فلاح سے متعلق ہوتا ہے، یہ

---

محترمہ صادقہ ذکی، ایم اے (جامعہ) ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

سیر متمن نظر آتے ہیں۔

قنوطیت پسند صحیح بات کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ زمانہ کے کتنے ہی سرد و گرم دیکھ چکے ہیں، اپنی تائید میں اپنے عہد اور تاریخ سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے شکست خواب اور ناکام امیدوں کے شواہد فراہم ہوں۔ قنوطیت پسند کی رائے اتنی ہی صحیح ہوتی ہے جیسے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ زندگی کا انجام موت ہے۔ ہم اس کی رائے سے بخوشی اتفاق کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سیکولرازم کی کتنی ہی تعریف کی جائے اس کو کسی شکل میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے قنوطیت پسندوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ زندگی کی بے اعتباری پر کبھی بات نہیں کرتے جو ترقی کے صحتمند تصورات کی بنیاد ہے بلکہ ہر وقت انسانی کمزوریوں اور ناکامیوں پر جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، بحث و گفتگو کرتے رہتے ہیں، مثلاً ریل گاڑیاں وقت پر نہیں پہنچتیں، کلرک کاہل ہوتے ہیں، امیر لالچی ہیں، سیاستداں مکار ہیں، نعرے جھوٹے اور جوش و ولولے بناوٹی ہوتے ہیں۔ قنوطیت پسند جواب کا طالب نہیں ہوتا جب کہ شکست خوردہ ذہنیت کا مالک اپنی بات کہنے کے ساتھ دوسروں کی باتیں سننا بھی پسند کرتا ہے۔ قنوطیت پسند کے لئے گوشۂ تنہائی کافی ہے لیکن احساس شکست رکھنے والا دوسرے ساتھیوں کی تلاش میں رہتا ہے کیونکہ گفتگو کرنا اس کی عادت میں داخل ہے۔ اس کے برعکس سیکولرازم ایسے صحتمند شعور کا مطالبہ کرتا ہے جو ہر قسم کی ذہنی اور اخلاقی پستی کا تسلی بخش تدارک کر سکے۔ شکست خوردہ اپنی ہی قماش کے لوگوں میں خوش رہتے ہیں۔ مزاجی ہم آہنگی، نرمی اور غمگینی سے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ یہ باہمی اختلاط اس نوع کے اشخاص کی تعداد میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے۔ جیسے ہی سیکولرزم توانائی اختیار کرتا ہے وہ توہم پرستی، دقیانوسیت، جدت پسند بننے کی خوش فہمی اور عقلمندوں کی امتیاز پسندی جیسی ناقابل تسخیر مہلک صفات کو پھیلانے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی ان کی باتیں ضرور سن لینا چاہئیں، بشرطیکہ ہم خود کو شکست خوردگی کا شکار نہ ہونے

دیں اور یہ محسوس نہ کرنے لگیں کہ ہم ان کے ساتھی ہیں۔

جہالت اور سیکولرزم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ جیسا کہ شکست حوصلہ لوگ ہندوستان کے ناخواندہ عوام سے منوانا چاہتے ہیں۔ یہ حقائق بڑے مایوس کن ہیں۔ ایک طرف کثیر تعداد میں علم کی روشنی سے بہرہ مند اصحاب نظر آتے ہیں تو دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس علم کی روشنی ہنوز نہیں پہنچی۔ لیکن عوام میں بہرصورت ایسی سوجھ بوجھ ہوتی ہے جو سیکولرازم کی جان ہے۔ تعصب اور جنون کو برانگیختہ کرنے کی ذمہ دار تعلیم یافتہ افراد کی ذہنیت ہوتی ہے نہ کہ عوام کی جہالت — اسی لئے ہماری توجہ تعلیم یافتہ اصحاب پر ہونی چاہئے۔ ان کی خامیاں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اس فہرست میں اثر انداز ہونے والے اور اثر لینے والے دونوں ہی شامل ہیں۔

بے کردار شخص سے کسی طرح کا علم بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کردار کے معنی انسان کی وہ مخصوص صفات ہیں جو ایک محور سے عبارت ہیں اور شخص کو شخصیت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہی محور دراصل وہ شے ہے جس کے لئے انسان خود کو وقف کر دیتا ہے اور یہ اتنا ہی غیر دلچسپ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ پابندی وقت کا خیال یا اتنا پرشکوہ بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ خود شناسی۔ بہرحال فرد کا کردار اس سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اپنی شخصیت کے محور کے لئے وہ کس حد تک خود کو وقف کر سکتا ہے ہماری تعلیم نے اس پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔ چنانچہ موجودہ علم غیر مربوط اطلاعات، غیر مہذب خواہشات، غیر واضح مقاصد اور آوارہ خیال آرائیوں کا پلندہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسکول اور کالجوں کی یہ تعلیم ان اخلاقی اور روحانی اقدار کی پابندی نہیں کرتی جو ایثار سے عبارت ہیں۔ جن تعلیم یافتہ افراد میں یہ خصوصیت ہے انھوں نے مروجہ تعلیمی معیار سے الگ اپنے کردار کو بلند کیا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے استادوں کا فقدان ہے جن کا کردار شاگردوں کے ذہن پر کوئی اثر مرتب کر سکے۔ اس طرح کا مزاج بنانے کے لئے انھیں اتنا جاذب ہونا پڑے گا کہ وہ شاگردوں کی پرخلوص توجہ اور تعظیم حاصل کر سکیں۔

ایسے استاد جن کی شخصیت طلبار کے لئے جاذب توجہ نہ ہو وہ ایسے پردے کے پیچھے پناہ لیتے ہیں جس کا سیکولرازم متحمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سیکولرازم کو غیر مذہبی اور غیر روحانی قرار دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ وہ دنیاوی اقدار کی حمایت اور آخرت کی نفی کرتا ہے اور انسان اور اس کی خوشی کو مد نظر رکھنے کے بجائے وہ خیالی اور آسمانی باتوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس لئے وہ استاد جسے سیکولرازم کو فروغ دینا چاہئے، یہ فرض کر لیتا ہے کہ اسے چند چیزوں کے انکار کے سوا کوئی درس نہیں دینا چاہئے۔ اس طرح وہ فکر اور اخلاقی استحکام سرایسے ایسا خلا، پیدا کر دیتا ہے جہاں تعلیم محدود ہو جاتی ہے۔

یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ حیلہ باز اور سب کے سب امتیاز پسند تعلیم یافتہ طبقہ ہی میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ سخن طراز سیکولر مزاج لوگوں کی طرح بات کرتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت قدیم توہمات کی پروردہ ہوتی ہے۔ وہ غیر عقلی رسم ورواج کو قومی حیثیت دے کر فن اور کلچر کے نام پر زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور ان میں سے کچھ خود کو جدت پسند کہہ کر سیکولر تعلیم کے ذریعے ہی توہمات اور رسوم کا تحفظ کرتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے لوگوں کی یہ ایک عام بات ہے کہ وہ باہر گوشت کھاتے اور وہسکی پیتے ہیں اور گھر پر اپنے آپ کو محتاط سبزی خور اور نشہ بندی کے علمبردار ثابت کرتے ہیں۔ ایسے افراد خود کو روشن خیال عناصر کی طرح ظاہر کر کے مذہب کے غیر معقول عناصر سے انکار کرتے ہیں لیکن اس طرح حقیقتاً ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ مجھے ہرگز اس بات پر یقین نہ آتا اگر میں اس میٹنگ میں نہ ہوتا کہ جس میں سادھوؤں کی خدمت سے پنج سالہ منصوبے کو کامیاب بنانے کی تجویز زیر بحث تھی۔ گرچہ پنج سالہ منصوبے کو اس حکمت عملی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیکن سادھو اونچے مقامات پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ علم نجوم نے اتر پردیش میں اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں اور یہ بات عام لوگوں کو معلوم ہے کہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو ایک وزیر اعلیٰ نے اس لئے سخت سست کہا کہ انھوں نے علم نجوم کی خبر کے مطابق آنے والی قیامت کا کوئی اثر نہیں

گیا تھا۔ ہولی منانا مذہبی عقیدہ ہے جو کہ قومی فریضہ بن گیا ہے۔ حیلہ سازی اور متضاد رویہ میں غرق ہے لیکن عموماً ہندوستان میں وہ ایک ہی نسل کے جانور معلوم ہوتے ہیں جو ایک ہی باڑے میں رہتے ہیں۔

ہم میں سے بہت سے متضاد رویہ سے محفوظ رہ سکتے تھے لیکن اس طرح کے عقلیت پرستوں کو کیا کہا جائے جو مذہب کا نام سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے آغاز کے وقت سے ہی ایسے لوگوں نے ہر اس پھیلا رکھا ہے بہت عرصہ پیشتر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اس طرح مذہب کو عقلیت اور سیاست کے خوف کے زیر اثر گوشہ گیر رہنے پر مجبور کر دیا گیا اگر سیکولرازم کا مقصد مذہب کا توڑ کرنا ہے تو اس کا بہت اندیشہ ہے کہ امتیاز پسند ذہن اسے اپنا لیں اور یہ فطرت ثانی بننے کے بجائے فیشن میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح تسکین کے بجائے تخریب کا ذریعہ بنے۔ آکسفورڈ ڈکشنری سیکولرازم کو منفی چیز بتا کر ایک طرح سے اس کے بنیادی مقصد کی مذمت کرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ تعریف درست ہے اور اس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کیونکہ صدیوں تک منظم مذہب اور کلیسا نے مذہبی اصولوں کا استحصال کیا ہے۔ لیکن اب یہ ضروری نہیں ہے کہ سیکولرازم مذہب سے زیادہ عرصہ تک بے نیاز رہے۔ کسی کشاکش کے بغیر اخلاقی اقدار کی تنظیم میں مذہب کے حریف کی حیثیت کے خلاف ایک معاون دوست بن سکتا ہے۔

زمانۂ قدیم سے تمام دنیا کے لوگ اس واہمہ کا شکار ہیں کہ جسم روح کا دشمن ہے۔ جسم اور روح دو کمزور اصطلاحیں ہیں۔ اس زاویہ نگاہ سے سوچنا فرسودہ خیالی ہے جسے کسی ادبی حسن آرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں خاص طور سے تقدس کو

برہنگی میں دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے۔ جسم اور روح کی دوئی کے اس تصور کو جو صدیوں سے قائم ہے ختم کرنے کے لئے زیادہ تیز ہتھیار کی ضرورت ہے۔ دنیادی ذہن رکھنے والے لوگ اس پر مجبور کئے گئے ہیں کہ وہ روحانی لوگوں (صوفی حضرات) کی تقدیس کریں اور نذرانے پیش کریں۔ ان بزرگوں نے احترام اور نذرانوں کا حق بڑی عزت اور تکریم کے ساتھ حاصل کر لیا ہے۔ وہ لوگوں کو یہ سمجھاتے رہے ہیں کہ دنیا کو ترک کئے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دنیاداروں کے جبری انکسار اور اہل نظر کی سرد منطق کے درمیان جو تعلقات کے سامنے بے دست وپا نہیں ہوجاتے تھے، انسانی شخصیت گم ہوگئی تھی۔ گویا کہ آدمی اپنے دو پیروں پر سیدھے کھڑے ہو کر اپنا منصب پورا نہیں کر سکا، وہ یا تو ایک طرف گر پڑا یا دوسری طرف۔ کیونکہ اس کے سامنے 'توازن' نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مگر اب جب کہ مغرب ان تمام گناہوں کا مرتکب ہو چکا ہے جو تصور کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا سب سے اچھا بیان مجھے غالب کے یہاں ملتا ہے۔

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم زعصیاں می زنم

انسانی حقوق کا تصور اور حقوق وفرائض کے درمیان توازن کا رشتہ دریافت ہونا چاہیئے۔ یہ تصور ریاستی پالیسی میں سیکولرازم بن کر آتا ہے۔ ہمارا خیال ہے اس سے مذہبی کردار کی نفی نہیں ہوتی بلکہ کارکردگی کی حدود اور حقوق کا تعین ہوتا ہے۔ میں نے لوگوں کو وزیروں کے قدموں کو چھوتے دیکھا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں اس وقت تک انتظار کروں جب تک کہ وزیر عبادت سے فارغ نہ ہوجائیں۔ خاص طور سے ایسے اوقات جنھیں میں کام کرنے کے اوقات میں شمار کرتا ہوں۔ لیکن وزرا کی نہ تو کوئی پالیسی ہے اور نہ کوئی اصول۔ اگرچہ سیکولرازم اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ کسی قسم کا وزارتی خبط شہریوں کی عام خوش حالی کو متاثر نہ کر سکے گا۔ یہ خوشحالی مادی اور

حاصل ہوگی اور معاشی ترقی نیز صحت اور دیگر خوشیوں کے پیمانے پر پوری اترے گی۔ کسی ہندوستانی کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس دنیا کی اچھائی یا آخرت میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے ۔ وہ جس حصہ کا بھی مستحق ہو وہ اسے اولین فرصت میں ملنا چاہیئے

سیکولرازم کو ان لوگوں نے قبول کیا ہے جو باضابطہ مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ حکومت کے تئیں ایک غیر جانب دار پالیسی کا ضامن ہے ۔لیکن یہ سیکولرازم کا غیر تسلی بخش پہلو ہے ۔میں نے مسلم کانفرنس میں ایک تجویز رکھی تھی جو اس مقصد کے لیئے بلائی گئی تھی کہ مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے ۔ مذہبی لوگوں کو چاہیئے کہ وہ سیکولرازم کو چیلنج سمجھیں اس بات کو ثابت کرنے کے لیئے کہ انھیں انسانی ترقی سے دلچسپی ہے نہ کہ رسمی مذہب سے۔ اور وسیع پیمانے پر یہ ثابت کریں کہ ملک کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لیئے کس طرح ایک مذہبی آدمی نسلی و شخصی مفادات سے بلند ہو سکتا ہے ـــــ بلاشبہ یہ تعبیر مثالی ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ شبہ اور خوف کو جگہ دی جائے ۔ اس مخصوص جلسہ کے سامعین کے لئے یہ تجویز ایسی نہ تھی کہ جس کا خیر مقدم نہ کیا جائے ۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سیکولرازم کا قبول کرنا یا رد کرنا فیصلہ کن ثابت ہوگا ۔

یہ سیاسی فکر اور گفتگو کی عام بات ہوگئی ہے کہ سارے جھگڑوں کو مذہب یا مذہبی جھگڑوں کے سر مڑھ دیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے رویوں میں تبدیلی کی سست رفتاری کا سبب مذہبیت اور توہم پرستی ہے ۔ یہ الزام غیر منصفانہ نہیں ہے ۔ مسائل کا حل اقدار کو ترک کر دینے، مسترد کر دینے یا خلا پیدا کر دینے میں نہیں ہے ۔ عقلی اور مثبت تصورات کے لیے سیکولرازم کو بڑی سمجھداری اور صبر و ضبط کے ساتھ فروغ دینا چاہیئے اور وہ تصورات یہ ہیں کہ مادی بہبودی کی کوشش حقیقی مذہبیت کا مظہر ہے ۔ اور یہ کہ ذاتی تکمیل مادی اور روحانی اقدار کے درمیان توازن حاصل کرنے کا نام ہے ۔ بہت کچھ توہمات جو کہ ہماری معاشی اور انسانی تہذیب کے دور اولین کی باقیات میں سے اس دور میں انسانی نظر

کے آگے تھراتا تھا۔ اور بغیر جانے بوجھے پتھروں، درختوں اور جانوروں کی عبادت کرتا تھا اور ان کی تقدیس پر اس لئے آمادہ تھا کہ ان سے اس کا تحفظ ہوگا۔ جیسے ہی انسان کو دورِ اولین کے توہمات کا بتدریج احساس ہوگا وہ انھیں ترک کرتا جائے گا۔ اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اسے چاہیئے کہ وہ دوسروں سے تعاون کرے اور اس تعاون کا سب سے واضح مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ سب کی مادی ترقی کے لئے ہو۔ لیکن انسان اپنی شخصیت کے بے پایاں امکانات سے انکار کرے گا اگر وہ جسمانی اور مادی ترقی کے آگے کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس لئے کہ مادی دنیا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ کوئی شے ان سے ماوراء بھی ہے جس کی شہادت وہ خود ادب، سائنس اور فلسفیانہ فکر سے دیتا رہا ہے۔ مادی فوائد کے تصور پر اس کے اخلاقی، جمالیاتی اور روحانی مقاصد کو غالب رہنا چاہیئے۔ یہ محض کوئی تجویز ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ کسی بھی تنظیم، کسی بھی ادارہ حتیٰ کہ کسی ریاست کو بھی اس بات کا حق نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ انسان اپنے شخصی وجود کی خلوت میں کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ سیکولرازم اس داخلی زندگی کے حق کی ضمانت بھی دیتا ہے اور زور بھی کہ انسانی عمل کے سرچشمہ کو نہ تو روکا جا سکتا ہے اور نہ اس کے صاف شفاف پانی کے بہاؤ کو بنجر زمینوں کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

رفیع الدین احمد

# "نئی اور پرانی تعلیم"

"نئی اور پرانی تعلیم" ملک کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر عبدالغفور کی تالیف ہے۔ یہ مندرجہ ذیل پانچ مضامین کا مجموعہ ہے:

(۱) پچھلی صدی میں دیسی تعلیم کی کہانی (۲) تعلیم اور زندگی (۳) اچھا مدرسہ (۴) سماج اور استاد (۵) استاد اور اس کے مسائل

کتاب پر ایک مختصر مگر جامع "تعارف" خواجہ غلام السیدین مرحوم کا لکھا ہوا ہے جس میں تعلیمی مسائل پر مصنف کے زاویہ نگاہ کو سراہا گیا ہے۔

ان مضامین کے موضوعات الگ الگ ہیں لیکن ان سب میں ایک مخصوص تعلیمی نقطۂ نگاہ مشترک ہے۔ ان مضامین کے ذریعے پروفیسر عبدالغفور نے نئی اور پرانی تعلیم کی اچھی قدروں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف وہ جدید تعلیم کے ان اصولوں کو اہمیت دیتے ہیں جن کی بنیاد بچوں کی نفسیات پر رکھی گئی ہے اور دوسری طرف وہ اس کے قائل ہیں کہ قدیم تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ ہماری جدید تعلیمی تنظیم کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ پرانی تعلیم سے ان کی مراد عہد قدیم کی تعلیمی کوششیں اور اس کے حیات بخش اثرات ہیں اور نئی تعلیم سے ان کا مقصد تعلیم کے وہ جدید نظریے ہیں

---

جناب رفیع الدین احمد، ایم اے، بی ایڈ۔ استاد انجمن اسلام ہائی اسکول، کرلا، بمبئی۔

جو طلبہ کو نئی تہذیب اور ایک نئی دنیا کے لئے تیار کرتے ہیں[1]۔

## پچھلی صدی میں دیسی تعلیم

مجموعے کا پہلا مضمون 'پچھلی صدی میں دیسی تعلیم کی کہانی' ہے ۔ ابھی تک تعلیم یافتہ حلقے میں عام طور سے یہی خیال کیا جاتا رہا ہے کہ قدیم دیسی نظام تعلیم جامد، ناکارہ اور غیر تسلی بخش تھا۔ لیکن پروفیسر غفور نے یہ بتایا ہے کہ ہمارا ماضی تعلیمی لحاظ سے پست نہیں تھا اور دور جدید کی تعلیمی کوششوں اور کامیابیوں کا سلسلہ بھی اسی سے ملتا ہے ۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارا قدیم نظام تعلیم زندگی کی ٹھوس بنیادوں پر قائم تھا۔ اسی لئے اس نے ہمارے ماضی کو شاندار اور قابل رشک بنادیا تھا ۔

مغربی افکار و نظریات کا طلسم اب ٹوٹ رہا ہے ۔ آزاد ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اب یہ آوازیں اٹھنے لگی ہیں کہ مغربی آب وہوا میں پروان چڑھا ہوا پودا اس ملک کی فضا میں برگ و بار نہیں لاسکتا۔ یہاں وہی تعلیمی نظام کامیاب ہوگا جس کی بنیادیں اس ملک کی قدیم روایات پر رکھی جائیں گی، اس لئے پروفیسر غفور نے اپنے پہلے مضمون میں دیسی تعلیم کا پورا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے ۔ اس طرح تعلیم کی جدید تنظیم میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے ۔ زیر نظر مضمون میں یورپین ماہرین تعلیم کے حوالے کافی دئے گئے ہیں لیکن ڈاکٹر لائٹز کے خیالات سے خصوصاً استفادہ کیا گیا ہے ۔ دوسرے ناموں میں چند اہم نام فریزر، ایڈم، سر ٹامس منرو، ہاول، ڈاکٹر بیل، الفنسٹن، لڈلو، میکلوڈ اور گارساں ڈی ٹاسی وغیرہ کے ہیں ۔ ان میں سے اکثر تعلیمی محکمے کے حکام اعلیٰ یا حکومت کے ذمہ دار افسر، صوبوں کے گورنر اور کتابوں کے مصنف ہیں ۔

---

۱۔ نئی اور پرانی تعلیم، دہلی، کتابی دنیا لمیٹڈ، ۱۹۴۷ء، پیش لفظ، ص ۱۲

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عہد قدیم میں پورے ملک میں مدرسوں، مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ طلبہ اور مدرسوں کی اتنی کثیر تعداد پورے انگریزی دور میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس مقالے میں دیسی مکتب اور ان میں تعلیم کے بنیادی اصولوں کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ قدیم طرز تعلیم پر ہر زاویے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس کی صحیح بنیادوں کا پتا چلایا جا سکے۔ چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتنے ہی ایسے اصول اور طریقے ہیں جنھیں چھوڑ کر غلطی کی گئی ہے۔ ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دور جدید کی تعلیمی تنظیم کا سلسلہ جب تک ان سے پھر نہ جوڑا جائے گا تعلیمی میدان میں ملک کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ہندوستان کی معاشی تباہ حالی ایک مستقل مسئلہ ہے۔ غربت اور افلاس نے یہاں ایسے ڈیرے جمائے ہیں کہ ابھی مدتوں ان سے چھٹکارہ پانے کی صورت نظر نہیں آتی۔ اتنے وسیع اور عریض ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے لئے آج بھی جو رقم بجٹ میں رکھی جاتی ہے وہ قطعی ناکافی ہے۔ اس لئے کسی جامع تعلیمی اسکیم کا بروئے کار لانا مشکل ہو گیا ہے لہٰذا تعلیم کی تنظیم و اشاعت کے لئے کم سے کم خرچ کی صورتیں تلاش کرنا ماہرین تعلیم کا فرض ہے۔ لائٹنر نے دیسی تعلیم کے قرآنی مدارس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے خیال میں اس قدر کم خرچ میں غربا اور عوام میں تعلیمی اشاعت کی اس سے بہتر صورت نہیں ہو سکتی۔[۲] دیسی مکتبوں کی دوسری خصوصیت پروفیسر غفور نے یہ بتائی ہے کہ ان میں مانیٹوریل سسٹم رائج تھا۔ استاد چند ذہین اور اونچی جماعت کے طلبہ کو سبق پڑھا دیتا تھا۔ پھر وہی طلبہ بعینہٖ دوسرے بچوں کو سبق دیا کرتے تھے۔ اس سے وقت کی بچت بھی ہوتی تھی اور خود پڑھانے والے طلبہ کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔ پوری جماعت کو ایک ساتھ پڑھانے کا طریقہ

---

۲۔ ایضاً، ص ۲۹

نہ تھا بلکہ ہر طالب علم کو انفرادی طور پر سبق دیا جاتا تھا۔ اس طرح کمزور طلبہ بھی جلد ہی مطلوبہ معیار پر پہنچ جاتے تھے۔ آج بھی مکتبوں میں کم و بیش تعلیم کا یہی انداز پایا جاتا ہے لیکن جدید تعلیمی نظام میں اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں[3]۔ مضمون نگار نے اپنی تائید میں لائٹنر کا یہ بیان پیش کیا ہے کہ جرمنی کے نظام تعلیم اور دیسی تعلیم میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں میں کنڈر گارٹن طریق تعلیم ملتا ہے جس میں تعلیم کی بنیاد خود فعلیت کے اصول پر رکھی گئی ہے یہاں بچے کے فطری رجحانات اور عمل کو کام میں لایا جاتا ہے۔ لائٹنر نے یہ بھی کہا ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ میں عام اور سستی تعلیم کا رواج ڈاکٹر بیل (Bell) نے ڈالا۔ انھوں نے مانیٹوریل سسٹم کے طریقۂ تعلیم کو تیزی سے پھیلانے کا کام شروع کیا۔ لیکن یہ طریقۂ تعلیم انھوں نے ہندوستان ہی سے لیا تھا مسٹر کیمپبل (Campbell) کلکٹر ضلع بلاری (مدراس) نے اپنی ۱۸۲۳ء کی رپورٹ میں اس کا اعتراف کیا ہے:

> "دیسی مکتبوں میں بچوں کو لکھنا سکھایا جاتا ہے اور جس کفایت اور تھوڑے خرچ میں یہ کام انجام دیا جاتا ہے، جس طرح سے زیادہ استعداد والے طلبہ مبتدیوں کو پڑھانے میں مدد دیتے ہیں، اپنے علم کو اور زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں یہ طریقے بلاشک و شبہ قابل تعریف ہیں اور ولایت میں اس کی جو پیروی کی گئی ہے لائق صد تحسین ہے[4]۔"

دیسی مکتبوں کے طریقۂ تعلیم پر پروفیسر غفور نے ریونڈ ٹربرک کے خیالات بھی نقل کئے ہیں جو کچھ کم دلچسپ نہیں۔ وہ کہتا ہے:

> "قدیم زمانہ کے دیسی مکتبوں میں بعض مفید خصوصیات موجود تھیں

---

۳۔ ایضاً ص ۳۳۔۳۲ ــ ۴۔ ایضاً ص ۳۲

اور اگر انھیں دوبارہ زندہ کر کے جدید اسکولوں میں رائج کر دیا جائے تو وہ ضرور کار آمد ثابت ہوں گی۔ ان مکتبوں میں بعض مضامین کی تدریس، مثلاً لکھنے اور پڑھنے کے سلسلے میں بچہ کی خود فعلیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اس کے برعکس آج کل کے اسکولوں میں اس کی کمی سب سے نایاب ہے (کذا)۔۔۔۔ پرانے مکتبوں میں لکھنا پڑھنا سکھانے کا طریق یورپ کے جدید طریق تعلیم سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ نے یہی طریقے دوبارہ ڈھونڈ نکالے ہیں۵۔"

لائٹنر نے دیسی تعلیم کے مہاجنی مکتبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان مکتبوں کے طلبہ کا تعلیمی معیار اور ریاضی کے زبانی سوالوں کے جواب نکالنے کی مہارت کو دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا تھا۔ مہاجنی مکتبوں کی یہ تعلیم کس قدر عملی تھی اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو خود اس کا تجربہ رکھتے ہوں۔ ہمارے اسکولوں کے طلبہ ان کے مقابلے میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ جدید تعلیم سے ہمارے روزانہ کے کتنے ہی معاملات، کاروبار، لین دین اور تجارت میں کوئی مدد نہیں ملتی

انگریزی حکومت نے تعلیم کا رشتہ ہندوستان کے معاشی اور سماجی ماحول سے کاٹ کر انگلستان کے تمدنی سوتوں سے جوڑنا چاہا۔ اگر اس میں نیک نیتی کو دخل ہوتا تو بھی یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ تعلیم اور تہذیب و ثقافت کے گہرے رشتے عوام کی نفسیات پر زبردست اثر ڈالتے ہیں۔ اخلاق اور انسانیت کی تعمیر کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔ دیسی تعلیم میں جو کمزوریاں اور خامیاں تھیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس میں بے شمار

---

۵۔ ایضاً صفحہ ۳۳

ایسی خوبیاں بھی تھیں جن کا تحفظ کیا جانا ضروری تھا اور انھیں پرانی قدروں سے جدید تعلیم کی بنیاد کا کام لیا جا سکتا تھا۔ انگریزی دور کی نئی تعلیم نے ہمارے قدیم تعلیمی مدرسے سے ہمارا رشتہ الگ کر دیا۔ چنانچہ اسی بنا پر اس میں گہرائی اور گیرائی کا فقدان ہے اور اس میں کوئی تخلیقی قوت باقی نہیں رہی۔ انگریزی حکام کی اس غلطی کا اعتراف بقول پروفیسر غفور لائٹنر کو بھی ہے:

> تعلیمی افسروں کا مطمح نظر اور ان کی بہترین کوششیں اس بات پر مرکوز ہو گئی تھیں کہ وہ بے حیثی زمین میں ان اصلاحات کا بیج بوئیں جن کی کامیابی یورپ میں بھی ایک حد تک مشکوک نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہے.... ہمارے افسروں نے اپنی توجہ ترقی کے ان عناصر پر مبذول نہیں کی جو دیسی تمدن میں پہلے سے موجود تھے اور جنھیں ذہنی طور پر جلا دی جا سکتی تھی۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے[7]"

لائٹنر نے کھلے لفظوں میں دیسی تعلیم کے انحطاط کی ذمہ داری حکومت کی غلط پالیسی پر ڈالی ہے[8]۔ گارساں ڈی تاسی بھی لائٹنر کا ہمنوا ہے۔ وہ اپنے خطبات میں میکالے اور اس کے ہم خیال انگریز حکام کی دیسی ادب پر غیر متوازن تنقید کا جواب دیتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ ہندوستان کا قدیم ادبی سرمایہ بہت قیمتی ہے اور یہاں ایسی کتابیں موجود ہیں جو یورپ کی مشہور ترین کتابوں سے بھی زیادہ قابل قدر ہیں[9]۔ الفنسٹن نے جو ایک صاحب بصیرت اہل قلم تھا اور بمبئی کا گورنر رہ چکا تھا، ۱۸۲۳ء میں ایک روئداد میں بمبئی کی تعلیمی حالت پر ان الفاظ میں اظہار افسوس کیا تھا:

> "انصاف کی بات تو یہی ہے کہ ہم نے دیسیوں کی قابلیت کے سرچشمہ

---

۶۔ ایضاً، ص ۲۴۔ ۷۔ ایضاً، ص ۴۵۔ ۴۴ ۸۔ ایضاً، ص ۴۴ تا ۴۶

کو خشک کر دیا اور ہماری فتح کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ علم و ہنر کی ترقی اور شوق
ختم ہو گیا بلکہ خطرہ ہے کہ ان لوگوں کے علوم ویسے ہی ختم نہ ہو جائیں
اور وہ عہد ماضی کے بلند پایہ مصنفین کی چیزوں کو بھی نہ بھول جائیں
اس الزام کو دور کرنے کے لئے ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔[۹] "

مسٹر ہاول نے بھی، جو حکومت ہند کے تعلیمی انڈر سکریٹری تھے، حکام کی غفلت شعاری اور حکومت کی غلط پالیسی کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان کی رائے میں ہندوستان کی تعلیمی روایات کی بنیادوں ہی پر نئے نظام کی تعمیر کا کام ہونا چاہیئے تھا۔ ان کے خیال میں نئے اسکول کھولنے کے بجائے دیسی مکتبوں کو بہتر بنانے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ ہمیں اس تعمیر میں پرانے معماروں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے تھا "لیکن حکومت کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا گیا جس سے کہ مولویوں اور پنڈتوں کے گروہ کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔[۱۰]" ڈاکٹر لائٹز نے اپنی کتاب کے آغاز میں درسی تعلیم کے انحطاط پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ اس کی رائے اس لئے بھی قابل قدر ہے کہ وہ ہنگری نژاد تھا۔ لندن کے کنگز کالج میں پروفیسر اور مشرقی علوم کا ماہر تھا اور حکومت ہند کے تعلیمی محکمے میں مختلف عہدوں پر کام کر چکا تھا۔ اس نے ہندوستان کے تعلیمی نظام کے انحطاط کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا اور اس کے اسباب پر غور کیا تھا۔ اس لئے اس کے خیالات و تاثرات کو تاریخی اہمیت حاصل ہے وہ کہتا ہے کہ میرے اس بیان میں کسی کے خلاف بغض اور کینہ کا اظہار نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس میں کوئی مبالغہ ہے۔ "میں تو صرف آپ کو ایک ایشیائی تمدن کے ساتھ ایک مغربی تہذیب کے میل کی داستان بتانا چاہتا ہوں۔" اس نے یہ بھی کھل کر کہا کہ اچھے

---

۹۔ ایضاً صفحہ ۴۸
۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۴۹ ۔ ۴۸

اور نیک حاکموں کے خیر خواہی کے جذبے کے باوجود یہاں کی حقیقی تعلیم مفلوج اور قریب قریب ختم کر دی گئی۔ پھر وہ کہتا ہے کہ "یہ ناکامی افراد کی ناکامی نہیں، یہ ناکامی حکام کی ناکامی نہیں، یہ ناکامی پورے نظام کی ناکامی ہے[11]۔"

مقالے کے آخر میں پروفیسر غفور نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ 'دیر آید درست آید' کے مصداق ہمیں دیسی تعلیم کی ان جاندار قدروں کی طرف دوبارہ توجہ کرنا چاہیئے جو جدید تعلیم کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتی ہوں۔ ہندوستانی تعلیم کی تنظیم نو کو اسی پس منظر میں جانچنا چاہیئے۔ ارتقار کے عمل میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ ارتقار کی منزلیں ماضی کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہیں۔

## تعلیم اور زندگی

ملک کو آزادی ملنے کے بعد ہماری تعلیمی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ تعلیم کا کام صرف کل پرزے ڈھالنا نہیں بلکہ انسانی کردار کی تعمیر بھی ہے۔ آزاد ہندوستان میں نئے سماج کی تعمیر ایک بڑا اور اہم کام ہے۔ ایک ایسے سماج کی تعمیر جس میں اقتصادی استحصال اور سماجی کشمکش نہ ہو، جس میں تنگ نظری، تعصب اور بے اعتمادی نہ ہو، جس میں محبت کی ایک عام فضا ہو، خوشحالی ہو، سماجی عدل و انصاف اور مساوات کا دور دورہ ہو، تعلیم سے صرف نظر کر کے یہ سارے مقاصد ہرگز حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ مجموعے کے دوسرے مضمون میں پروفیسر غفور نے تعلیم اور زندگی کا تعلق بتاتے ہوئے تعلیم کی اسی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ دورِ غلامی کے بعد بھی تعلیم کی زمام ایسے قدامت پرست اور تنگ نظر لوگوں کے ہاتھوں میں ہے

---

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۷

جن میں نہ تو وقت کے ساتھ چلنے کی امنگ ہے اور نہ حوصلہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ذوق جستجو سے کوئی سروکار نہیں۔ لہٰذا نئے مقاصد کے حصول کے لئے یہ ہاتھ بدلنے ہوں گے اور نئے راستے تلاش کرنے ہوں گے۔ اس کے بغیر تعلیمی جمود ٹوٹ نہیں سکتا۔ ایک ہمہ گیر انقلاب لانے کے لئے تعلیم کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ تعلیم نئے خیالات عطا کرتی ہے، ذہن میں وسعت اور دماغ میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ انسانی تہذیب اور زندگی میں جتنے انقلابات آئے ہیں وہ سب تعلیم ہی کے مرہون منت ہیں اور تعمیر نو کا کام ہمیشہ مدرسوں کے ہی سپرد ہوا ہے۔ قدیم یونان میں افلاطون، فرانس میں روسو اور روس میں تالستائی نے اپنی خیالی دنیا کی تعمیر میں تعلیم ہی کو بنیاد بنایا تھا۔[۱۲]

ہندوستان کی تعمیر نو کے عظیم منصوبے میں ایک جامع قومی تعلیمی اسکیم کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی لئے پروفیسر غفور نے بنیادی تعلیم کی اسکیم کے چند اہم اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً، وہ کہتے ہیں کہ اب بچے کو 'بنیادی حرفہ' کے ذریعہ تعلیم دینا چاہیئے۔ اس لئے تعلیم کا پہلا بنیادی اصول 'عمل ہے قول نہیں'۔ قدیم اور جدید تعلیم میں یہی فرق ہے کہ "ایک عملی ہے اور دوسری قولی۔ ایک میں حرکت ہے دوسری میں سکون اور اگر حرکت ہے بھی تو وہ شعوری نہیں"۔ دوسرا اصول انھوں نے یہ بتایا ہے کہ تمام مضامین میں ایک رابط پیدا کرکے ان کو ایک مربوط اکائی کی شکل میں پیش کیا جائے۔ تیسرا اصول بچے کے ذہن میں صنعت و حرفت کے معاشی اور اخلاقی پہلوؤں کی اہمیت کو ابھارنا ہے تاکہ ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ اور چھوٹے موٹے محنت اور مزدوری کے کام کی بھی اہمیت اور افادیت کا اسے اندازہ ہو سکے۔ اس طرح کام کی اہمیت اور اس کا احترام بچے کے ذہن نشین کرایا جائے۔ چوتھے اصول میں مادری زبان کے سیکھنے پر زور دیا گیا ہے تاکہ ہر شہری آزادانہ اظہار رائے کے

---

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۸ تا ۶۱

قابل بن سکے۔ ایک جمہوری ملک میں شہریوں کو اپنی مادری زبان میں اظہار رائے سے محروم رکھنا ایک جرم کے مترادف ہے۔ اسی کے ساتھ ایک ایسا نصاب ہوا ور ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جن میں عوامی زندگی کی جھلک ملتی ہو، جن میں عوام کے دکھ درد کی سچی تصویریں پائی جاتی ہوں۔ پانچواں اصول اس اسکیم کا یہ ہوگا کہ بچوں کو اہلکاروں کے حقوق نہیں جتائے جائیں گے بلکہ قومی خدمت گاروں کے فرائض بتائے جائیں گے۔" اس طرح آزاد ہندوستان کے شہریوں کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کے لئے تیار کیا جائے گا۔ ان کے اندر بے لوث خدمت کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی جائے گی۔ چھٹا اور سب سے اہم اصول اس کا یہ ہوگا کہ اس پوری اسکیم میں استاد کی اہمیت اور احترام پر زور دیا جائے گا۔ کیونکہ استاد کے بغیر ساری تعلیمی اسکیم دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اس سلسلے کی تمام تر کامیابیاں دراصل استادوں کے اخلاصِ عمل اور سعیِ پیہم پر منحصر ہوتی ہیں[۳۸]۔

پروفیسر غفور نے بنیادی تعلیم کی مجوزہ اسکیم میں جدید تعلیمی نظریات کو بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے۔ تعلیم جدید کی بنیاد بچہ کی خود فعلیت پر رکھی گئی ہے۔ جدید طریقۂ تعلیم میں ربط مضامین کا اصول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تخلیقی قوتوں کو ابھارنے کے لئے جدید تعلیمی نظریات میں مادری زبان کی تدریس پر بجا طور پر زور دیا گیا ہے۔ ایک آزاد ملک کے جمہوری شہریوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا اور انھیں اعلیٰ اوصاف سے متصف کرنا، تعلیم کا منتہا سمجھنا چاہیئے۔ پروفیسر غفور نے تعلیم کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس میں ان تمام باتوں کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بعض اصول نظری اور کتابی بن کر رہ گئے ہیں۔ عملی میدانوں میں کام کرنے والوں کی دقتیں اور مشکلات ایک حقیقت ہیں جہاں مخصوص مقاصد کے حصول میں کسی پیش رفت کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک تعلیمی

---

[۳۸] ایضاً، ص ۶۵ تا ۷۰

اسکیم میں "ایسا کیا جائے گا" کی جو اہمیت ہے وہ اپنی جگہ مسلّم، مگر اس سے زیادہ اہمیت کا حامل وہ حصہ ہے جس میں بتایا جائے کہ "ایسا کیوں کر کیا جائے گا؟" بچوں میں کام سے محبت، احساس ذمہ داری، بے لوث خدمت اور ایثار و قربانی کے جذبات کیوں کر پیدا کئے جا سکتے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ جدید تعلیمی تنظیم کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا جا رہا ہے یہ احساس بھی شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ ہم تعلیمی منتہاؤں سے دور ہٹتے جا رہے ہیں اور پوری تعلیمی اسکیم ایک مشینی عمل بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی پروفیسر غفور کی مجوزہ اسکیم میں امید کی کرن کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا ہے وہ استاد کا احترام ہے۔ جدید تعلیمی نظام نے اسے بالکل پس پشت ڈال رکھا ہے۔ انھوں نے استاد کی مرکزی اہمیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے استاد کی مرکزی اہمیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ اس لحاظ سے جدید تعلیمی نظریات پر اسے ایک اضافہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچے کو اپنی قدیم روایات سے جوڑ کر براہ راست اس سے فیض یاب بھی ہو سکیں گے۔

## استاد اور اس کے مسائل :

مجموعے کا آخری مقالہ "استاد اور اس کے مسائل" میں پروفیسر غفور نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ استاد اور اس کو پیش آنے والے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی ہے جنھیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر موصوف کی رائے میں تعلیمی دنیا میں استاد اور اس کے مسائل ایک زندہ حقیقت ہیں اور اس سے غفلت صرف وہی لوگ برت سکتے ہیں جن کو نہ تو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہے اور نہ وہ اس سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ استاد کے مسائل دراصل تعلیم کے مسائل بلکہ زندگی کے مسائل ہیں۔ لیکن پچھلی صدی میں ہمارے ملک

میں جو تعلیمی کھیل کھیلا گیا ہے اس نے ہماری تہذیبی ترقی کو بڑا دھکا پہنچایا ہے۔ انگریزی دور میں جو تعلیمی نظام جاری ہوا وہ دراصل ایک دوسرے ماحول کی پیداوار تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا زندگی سے تعلق کٹ گیا۔ ہماری قدیم تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ تعلیم کی کی روح کو تہذیب و تمدن کھیت اور کھلیانوں سے غذا ملتی ہے۔ سماج کی تہذیبی ترقی اور سازگار ماحول کے سہارے ہی تعلیم کا پودا برگ و بار لاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے برسوں میں ہمارے دیہی اور ابتدائی مدرسوں سے نکلے ہوئے بچے ہماری جدید تعلیم کی مسموم فضا میں کمہلاتے اور سوکھتے رہے، اور ہمارے سارے علوم و فنون میں انحطاط کا رجحان غالب رہا۔ ہمارے قدیم تمدن میں حالات بالکل مختلف تھے، جہاں تعلیم اور زندگی کے درمیان کوئی خلیج نہ تھی۔ ہمارے قدیم تعلیمی ادارے اور قدیم اساتذہ اور اہل کمال کی مثال ایسے اخلاقی اور تہذیبی چشموں کی تھی جن سے لہریں اٹھ اٹھ کر ہر چہار طرف پھیلتی رہتی تھیں اور تعلیم کی روشنی سے ساری فضا جگمگا رہی تھی۔

پروفیسر عبدالغفور نے اس اہم موضوع پر دوسرے مضامین میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مدرسے کا اچھا ماحول اور آزادی کی فضا تعلیمی عمل کو بہت متاثر کرتی ہے، لیکن استاد کی علمی فضیلت، اس کا خلوص، بچوں سے لگاؤ اور کام کی لگن اس کی اثر آفرینی کو دوآتشہ کر دیتی ہے۔ اچھے مدرسے کی تلاش و جستجو کے سلسلے میں مصنف نے بجا طور پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ابھی ہمارے مدرسوں کا ماحول ایسا نہیں ہے اور اساتذہ کا تعلیمی معیار پست ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ اس پیشے میں آگئے ہیں۔ ان کا نہ کوئی اصول ہے اور نہ کوئی ضابطۂ زندگی۔ لیکن وہ حالات سے مایوس نہیں ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے تمام مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں ابتدا میں ایسے ہی حالات تھے۔ ان کی یہ رائے بھی صحیح ہے کہ اساتذہ میں خود اپنی تنظیم کی ضرورت ہے۔ والدین کی غفلت اور بے توجہی اور محکمۂ تعلیم کے افسروں اور ہیڈ ماسٹروں کی جا و بے جا مداخلت کے خلاف صف آرا ہونے

میں انھیں جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ اب ان کے اندر جو حرارت، سرگرمی اور بیداری پیدا ہوئی ہے تو اس سے امید ہو چلی ہے کہ مدرسوں میں انھیں کام کرنے کا کھلا ہوا اور صاف ستھرا ماحول مل سکے گا۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے جس کا اظہار فاضل پروفیسر نے کیا ہے کہ اساتذہ کے آپس کے تعلقات میں عموماً تلخی اور بدمزگی ہوتی ہے اس کے اسباب میں ہیڈ ماسٹروں کی گندی سیاست کو بڑا دخل ہے کیونکہ وہ اساتذہ کو ان کا صحیح مقام دینے کو تیار نہیں ہیں۔ پروفیسر غفور کا مشورہ ہے کہ اساتذہ کو ایک دوسرے کی عزت کرنی چاہیئے اور ان کے اندر مل جل کر کام کرنے کا سلیقہ ہونا چاہیئے۔

تدریس اگر ایک آرٹ ہے اور معلم ایک آرٹسٹ تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشین یا مشینی نظام تعلیم کبھی استاد کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہمارے قدیم تعلیمی نظام کی یہی خوبی تھی کہ اس میں استاد کو قانون کی رسیوں میں جکڑ کر بے دست و پا نہیں کر دیا گیا تھا۔ اس کے جوش اور ولولہ اور تلاش و جستجو کی آگ کبھی سرد نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی تقریروں سے طلبہ کے سینوں میں شعلے دہکاتا۔ پروفیسر غفور کی اس بات میں بڑی صداقت ہے کہ بے چین روح اور جاندار الفاظ اور بے پناہ جذبہ اور پرجوش طریق اظہار یہ دو ایسے اصول ہیں جن کے اثرات تعلیمی دنیا میں بڑے گہرے اور عالمگیر ہوتے ہیں۔ استاد انھیں طریقوں کو اپنا کر بچوں کی زندگی میں انقلاب لا سکتا ہے۔ اس موقع پر استاد کی فنکارانہ صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے پروفیسر غفور نے ایک عمدہ مثال پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گرنٹ وگ ڈنمارک کا ایک شاعر معلم تھا۔ اس کی زبان میں بڑا جادو تھا۔ اس نے اپنے بیانیہ طریق تدریس سے اپنی قوم کو بیدار کر دیا۔ وہ اپنی وجدانی قوت اور زندہ و جاندار الفاظ سے طالب علموں کی زندگی میں ایک شعلہ بھڑکا دیتا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ استاد کو سب سے پہلے بیدار کرنے والے ترنم اور نغمے سے تعلیم کی ابتدا کرنا چاہیئے۔ پھر انتہائی جاندار اور مؤثر تقریروں کے ذریعہ پڑھانا چاہیئے۔ اس کی تقریر میں زندہ واقعات جگمگا رہے ہوں جو

عام عقل اور سمجھ کی سطح سے گزر کر روح میں سرایت کر جائیں۔ اسی لئے غفور صاحب کہتے ہیں کہ استاد جب اس کوشش میں عام طریقۂ تدریس سے اوپر اٹھ جاتا ہے تو پھر اس کا فن محض ایک فن نہیں رہ جاتا بلکہ "تخلیقی آرٹ" بن جاتا ہے۔ لیکن یہ آرٹ دوسرے آرٹوں مثلاً ادب، مصوری، سنگ تراشی وغیرہ سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے بچے کو اپنے تصورات کے عین مطابق نہیں ڈھال سکتا کیونکہ وہ بچے کو اس کی فطرت کے خلاف کوئی رجحان نہیں دے سکتا[۱۴]۔ ایک دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ بچے کی آزادی اور اس کی زندگی کی تعمیر ہی اصل تعلیم ہے۔ "استاد کا سب سے پہلا اور اہم فرض تعمیر حیات ہے۔ انسانوں کو انسان بنانا ہے اس کا کام تعمیر حیات ہے۔ اس کی بخیہ گری یا ٹھگلی لگانا نہیں ہے۔ جسم انسانی کی رفوگری یا کفش دوزی طبیبوں کے حصے میں آئی ہے مگر استاد کا کام صحیح معنوں میں تعمیر حیات ہے[۱۵]" اس سلسلے میں ان کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ تعمیر حیات کا کام غیر محسوس طریقے پر بھی ہوتا ہے۔ استاد کی شخصیت کے بڑے دیرپا اثرات طالب علموں کی زندگی پر پڑتے ہیں۔ اس کی روح کی حرارت اور آنکھوں کی چمک میں ایک ابدیت کار فرما ہوتی ہے۔ اس کے دل کی تڑپ کی گونج آنے والے زمانوں میں دور تک سنائی دیتی ہے اور نہ جانے وہ کتنے نوجوانوں اور دھڑکتے دلوں میں بار بار جنم لیتا رہتا ہے[۱۶]۔

## مجموعی تأثر:

ان مضامین میں بتایا گیا ہے کہ حقیقی تعلیم اور اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اسی ضمن میں تعلیم اور زندگی کا تعلق خصوصاً واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اچھی تعلیم

---

[۱۴] ایضاً، ص ۱۵۹ تا ۱۶۱ ۔ [۱۵] ایضاً، ص ۱۵۶ ۔ [۱۶] ایضاً، ص ۵۸ - ۱۵۷

کے لئے سازگار ماحول کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا ایک اچھے اور موافق اور سماجی ماحول کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اچھے مدرسوں کے سلسلے میں شانتی نکیتن، جامعہ ملیہ اور موگا کے مدرسے کا ذکر ملتا ہے۔ غفور صاحب ان مدرسوں کی آزاد اور کھلی فضا کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے اور صحیح ہے کہ ایک ذمہ دار سماج بہتر مدرسوں کو وجود میں لانے کا سبب بن سکتا ہے۔ استاد کی شخصیت اور اس کی خدمات کی اہمیت کو غفور صاحب نے اپنے مقالوں میں بجا طور پر نمایاں جگہ دی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ جدید تعلیمی نظام کے تاجرانہ انداز نے ابھی استاد کا مقام تسلیم نہیں کیا ہے اسی لئے تعلیمی معاملات میں اس کی آواز اور اس کے نقطۂ نظر کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

پروفیسر غفور کی تنقید کا متوازن اور صحت مندانہ انداز پڑھنے والوں کو کافی متاثر کرتا ہے۔ وہ نئی اور پرانی تعلیم پر یکساں حاوی ہیں اسی لئے دونوں میں سے کام کی باتیں آسانی سے الگ کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ملک کے قدیم نظام تعلیم کے مفید اور جاندار پہلوؤں کو سامنے لانے کی مستحسن کوشش کی ہے جنھیں یا تو ہم نے فراموش کر دیا تھا یا جنھیں ہم لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ بعض ایسے پہلوؤں کی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی ہے جو ہیں تو قدیم تعلیمی ماحول کی پیداوار لیکن عام طور پر ان کا تعلق نئی تعلیم سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ آزاد ہندوستان میں تعلیم کی تعمیر نو کا اب وقت آ گیا ہے۔ لہٰذا اگلی پچھلی تمام کوششوں کا پھر سے جائزہ لینا ضروری ہو گیا ہے۔ نہ تو ہمارا ماضی بالکل بیکار اور پھینک دینے کے لائق ہے اور نہ دور جدید اس قابل ہے کہ اسے پورے کا پورا اپنی جھولی میں ڈال لیا جائے، بلکہ احتیاط سے اپنی ضرورت اور روایات کے مطابق نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھنا چاہئے۔ ہم اپنے ماضی سے کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے اور نہ دور جدید کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

# کوائف جامعہ

## شیخ الجامعہ صاحب کی بیرونی مصروفیات

مکہ مکرمہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کی طرف سے امسال ۳۱ مارچ سے ہفتہ عشرہ کے لیے ایک بین اقوامی کانفرنس ہونے والی ہے، جس کا موضوع بحث ہے "مسلمانوں کی تعلیم موجودہ دور میں: چیلنج اور اس کا جواب"۔ اس میں شرکت اور مقالہ پڑھنے کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب کو دعوت نامہ ملا ہے اور وہ ۳۰ مارچ کی صبح سویرے دہلی سے روانہ ہو رہے ہیں اور بمبئی سے ہوتے ہوئے اسی روز رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک جدہ پہنچ جائیں گے۔

اسی سال مئی کے پہلے ہفتے میں ازہر یونیورسٹی کی طرف سے قاہرہ میں ایک سہ روزہ سمینار ہونے والا ہے جس کا موضوع ہے: "بچے کا مستقبل مسلم ممالک میں"۔ اس میں بھی شرکت اور مقالہ پڑھنے کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب کو دعوت نامہ ملا ہے اور انھوں نے اسے بھی منظور فرما لیا ہے

(عبداللطیف اعظمی)

## اقبال صدی سمینار جامعہ میں

ہندوپاک میں امسال ۱۹۷۷ء میں اقبال کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں بین اقوامی سمینار منعقد کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ہندوستان میں اکتوبر یا نومبر میں مجوزہ بین اقوامی

سیمینار منعقد ہوگا۔ اس سے قبل مختلف مقامات پر سیمینار منعقد کئے گئے، ۱۹۷۶ء کا پہلا سیمینار جامعہ ملیہ کے شعبۂ اردو کے اہتمام اور انتظام میں ۲۶ ور ۲۷ مارچ کو منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین نے فرمائی اور جناب اندر کمار گجرال نے افتتاح فرمایا جو آجکل ماسکو (روس) میں ہندوستان کے سفیر ہیں اور کئی سال پہلے جب اقبال صدی کی مرکزی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی تو وہ اس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ موصوف نے مرکزی کمیٹی کی گزشتہ سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اس سے پہلے حیدرآباد، سری نگر اور جموں میں سیمینار منعقد ہو چکے ہیں اور اب چوتھا سیمینار جامعہ میں ہو رہا ہے۔ آیندہ کے ارادوں اور پروگراموں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ روس میں بین اقوامی سیمینار کی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں، وہاں اکتوبر میں دو سیمینار منعقد ہوں گے ایک تاشقند میں، دوسرا ماسکو میں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اس موقع پر اقبال کی نظموں اور غزلوں کے ترجمے اور اقبال کے بارے میں کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ صدر جلسہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اقبال کی ایک طویل نظم "ساقی نامہ" پر مقالہ پڑھا، مقالے سے پہلے اقبال اور جامعہ کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ کے قیام کے بعد جب پہلے شیخ الجامعہ کے تقرر کا مسئلہ پیش آیا تو بانیانِ جامعہ کی نظر ڈاکٹر اقبال پر پڑی اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے مہاتما گاندھی نے انھیں خط لکھا، مگر خرابیِ صحت کی وجہ سے انھوں نے معذرت کرلی۔ مزید فرمایا کہ پہلے دو شیخ الجامعہ مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحومین اقبال کے اشعار بطور وظیفہ پڑھا کرتے تھے، اول الذکر اپنی تقریروں اور تحریروں میں بڑی کثرت سے اقبال کے اشعار استعمال کرتے اور ثانی الذکر اقبال کے منتخب کلام کی بیاض ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھا کرتے تھے اور ان کو پڑھتے وقت ان پر عجیب وغریب کیفیت طاری ہوتی تھی۔

اس سے قبل جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

مہمانوں میں اردو کے مشہور شاعر جناب حفیظ جالندھری صاحب بھی تھے جن کو جامعہ سے گہری محبت اور لگاؤ ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب جامعہ میں جشن سیمیں منایا گیا تھا تو اس میں موصوف نے بھی شرکت کی تھی اور ۷ر نومبر کی شب میں جو کل ہند مشاعرہ ہوا تھا، جس میں اس زمانے کے تمام مشہور شعراء نے شرکت کی تھی، حضرت حفیظ جالندھری نے جامعہ پر ایک بہت اچھی نظم پڑھی تھی۔ ضیاء صاحب نے اپنے استقبالیہ کلمات میں اس نظم کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف کا خاص طور پر ذکر کیا۔ سمینار کے کنوینر اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور مرکزی اقبال صدی کے جنرل سکریٹری علی سردار جعفری صاحب نے اقبال صدی کے سیمناروں کی گذشتہ کارروائیوں اور آئندہ کے ارادوں پر گفتگو کرتے ہوئے خاص طور پر پاکستان کے بین الاقوامی سیمینار کی شاندار تیاریوں کا ذکر کیا اور اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ اقبال کی یاد میں ایک مستقل ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہے۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد اقبال نمائش کا افتتاح کیا گیا، اس جلسے کی صدارت دلی میٹرو پولٹن کے چیف اکزکٹیو کونسلر جناب رادھا رمن جی نے فرمائی اور کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے افتتاح فرمایا۔ موصوف نے نمائش اور اس کے مرتب جناب جگن ناتھ آزاد کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ سب سے اہم مسئلہ اس کو محفوظ کرنے کا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے تجویز فرمایا کہ اس کی بہترین جگہ جامعہ ملیہ ہے۔ افتتاحی کلمات کے بعد جناب جگن ناتھ آزاد نے نمائش کے بارے میں مختصر تقریر کی اور آخر میں صدر جلسہ جناب رادھا رمن جی نے صدارتی ارشادات سے مستفید فرمایا۔

افتتاحی اجلاس میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبار کے علاوہ بہت سے معززین نے شرکت کی، جن میں حفیظ جالندھری صاحب کے علاوہ پاکستانی سفارت خانے کے منسٹر جناب شاہد محمد امین صاحب، اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب

حیات اللہ انصاری صاحب (چیرمین ترقی اردو بورڈ) اور صالحہ عابد حسین صاحبہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات کے لیے تین اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے فرمائی۔ اس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:

(۱) اقبال کا لفظیاتی نظام از شمس الرحمان فاروقی (۲) فلسفیانہ شاعری اور اقبال از وارث علوی (۳) اقبال کی ترجموں کا تنقیدی مطالعہ از جگن ناتھ آزاد (۴) اقبال کی شعری تمثالیں از عبید الرحمان ہاشمی

آخر میں صدر جلسہ نے مقالات پر مختصراً اظہار خیال کرنے کے بعد اپنا مقالہ پڑھا۔

دوسرا اجلاس ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، اس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:

(۱) اقبال کی اردو شاعری کا صوتی آہنگ از گوپی چند نارنگ (۲) اقبال کے ہاں تصورات کی شاعری از اسلوب احمد انصاری (۳) اقبال: روشنی کی جمالیات از شکیل الرحمان (۴) شعر اقبال کا علامتی پہلو از سید عبد الوہاب اشرفی۔ آخر میں صدر جلسہ نے سیمینار کی کامیابی پر منتظمین کو مبارکباد دیتے ہوئے ایک عمومی شکایت کی کہ آج کل اقبال پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے، عام طور پر پچھلی چیزوں کو نئے عنوانات اور نئے انداز سے بغیر کسی حوالے کے لکھا جا رہا ہے، ضرورت ہے کہ اقبال پر نئی چیزیں لکھی جائیں۔

تیسرا اور آخری اجلاس جناب راج بہادر گوڑ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ موصوف کچھ پہلے چلے گئے تو اس کے بعد جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے صدارت فرمائی۔ اس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے:

(۱) اقبال کی شاعری میں تضمین، تلمیح اور ترکیب از سید حامد (۲) اقبال کی غزل از شمیم حنفی (۳) اقبال کا شعری کردار از محمود ہاشمی (۴) اقبال کا تصور فن از وحید اختر۔

جناب راج بہادر گوڑ صاحب نے مقالات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال کو پیش کرتے ہوئے انھیں کسی تنگ اور محدود حلقے میں مقید کرنے کے بجائے، ان کی شاعری اور ان کے پیغام کے پیش نظر ان کے فکر و خیال کی وسعت پر زور دینا چاہیے۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے دو روزہ سمینار کی کامیابی پر منتظمین کا اور مقالہ نگاروں کے تعاون اور تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں سمینار کے داعی پروفیسر نارنگ صاحب نے شیخ الجامعہ صاحب، فیکلٹی کے ڈین صاحب، شعبے کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز، طلباء اور دیگر منتظمین اور مقالہ نگاروں کا پر زور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

دونوں دن مقالات کے بعد، کلچرل پروگرام کا انتظام کیا گیا تھا جس میں دہلی کے مشہور فنکاروں نے اقبال کی غزلیں گا کر پیش کیں

(عبداللطیف اعظمی)

## اقبال کی دو طویل نظموں پر پروفیسر مسعود حسین کا مقالہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے ایک جلسے میں پروفیسر مسعود حسین صاحب وائس چانسلر نے "اقبال کی دو طویل نظموں کی بازآفرینی" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے فرمائی۔

صاحب مقالہ نے اقبال کی دو نظموں "خضر راہ" اور "مسجد قرطبہ" کا الگ الگ تجزیہ فرمایا۔ موصوف نے شاعری، اس کے محرکات اور تخلیقی زبان کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا "تخلیقی بازآفرینی ایک لسانی عمل بھی ہے اور نفسیاتی بھی، اس کے لیے ناقد شعر کے لیے دو قسم کی صلاحیتوں سے متصف ہونا ضروری ہے۔ ایک طرف اس کا زبان کی تشکیل اور اس کے شاعرانہ استعمال سے باخبر ہونا لازمی ہے، اس اسلوب سے واقف ہو جس کی مدد سے شاعر معنی کی سنہری کیلوں سے معنی کے جھلملاتے ستارے تراشتا ہے،

شاعرانہ باز آفرینی کے لیے دوسری شرط ہم گدازی (EMPATHY) ہے جو ایک نفسیاتی عمل ہے اس لیے کہ شعری تنقید صرف تخلیقی عمل تک محدود نہیں، اس کے تاریخی، عمرانی، سیاسی اور فلسفیانہ پہلو بھی ہوتے ہیں۔" اس کے بعد "خضر راہ" کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: "اقبال جو ایک بیدار انسانی ذہن رکھتے تھے وہ اپنے وطن اور اپنے روحانی مرکز کی ابتری پر جس انداز میں نوحہ خواں ہوئے اس کا صحیح عکس خضر راہ پیش کرتی ہے۔ یہ نظم بھرپور جذباتی دباؤ کے عالم میں تخلیق ہوئی۔" پروفیسر مسعود حسین نے فرمایا کہ: اس نظم میں اقبال شاعر اور اقبال مفکر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہے۔ پوری نظم ایک ڈراما اور حرکی و نامیاتی استعاروں کی گونج سے ہمارے اندر زندگی کے احساس کو تر و تازہ رکھتی ہے۔ عام مایوسی اور پسپائی کے عالم میں بھی اقبال کا نقطۂ نظر رجائی اور امید افزا رہتا ہے۔" موصوف نے اس نظم کا لسانی تجزیہ بھی فرمایا اور اس کی گوناگوں تخلیقی خوبیوں کو اجاگر کیا۔

دوسری نظم "مسجد قرطبہ" تھی جس کے تجزیے میں صاحب مقالہ نے نظم کے مرکزی خیال اور پھر مختلف بندوں میں پیش کردہ تصورات، ان کی نامیاتی وحدت اور معنی خیزی پر تفصیل سے بحث کی۔ اقبال کے تصور زمان و مکان کی اس خصوصیت کو اجاگر کیا جو اسے آئن اسٹائن اور برگسان کے تصورات سے الگ ایک منفرد حیثیت عطا کرتی ہے۔ مرد خدا اور عشق کے معنی آفرین تصورات کی رمزیت سے بحث کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ: "سیل زمان، مرد خدا اور سیل عشق یہ سب مجرد تصورات تھے لیکن اقبال کی وساطت سے یہ ایک سیال حقیقت بن گئے۔ مسعود صاحب نے فرمایا کہ: "مسجد قرطبہ جذبات کی رفعت کا نقش اور اقبال کے فلسفۂ زمان کا شاعرانہ حل ہے۔ خضر راہ ہی کی مانند یہ نظم بھی ترکیب بند میں ہے، ترکیب بند میں غزل کا تمام آہنگ اور ایمائیت باقی رہتی ہے۔" موصوف نے مسجد قرطبہ کی تمام ترفنی، لسانی اور جمالیاتی خوبیوں کو اپنے دائرۂ کار میں لیتے ہوئے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا۔ آخر میں فرمایا کہ: "خضر راہ ایک قسم کی رجائی خطابت پر ختم ہوتی ہے جبکہ مسجد قرطبہ ایک بشارت پر۔

خضرِ راہ میں اقبال رہبر ہے اور مسجد قرطبہ میں پیمبر۔"

مقالے کے اختتام پر صدر جلسہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے مقالہ نگار کو مبارک باد دی اور فرمایا کہ مقالہ نہایت عالمانہ اور بصیرت افروز تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اقبال اصلاً ایک رومانی شاعر ہیں ان کا تخیل اور جذبہ انتہائی حرکی ہے۔ وہ ہماری زبان کے سب سے بڑے دانشور شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بعض الفاظ اپنے اندر تصورات کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہیں جن کی نوعیت اجتماعی اور عمرانی ہے۔ خضرِ راہ اس کی بہترین مثال ہے۔ "مسجد قرطبہ" میں شاعری اور فلسفہ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ اقبال کی خواہش قابل احترام سہی لیکن عالم نو کی تعمیر شاید اس دور کے عربوں کا مقدر نہیں ہے۔ البتہ ان کی گذشتہ تاریخ اور اسلام کی بے پناہ صلاحیتوں سے انکار ناممکن ہے۔ اسلام ایک جمہوری نظام لے کر اٹھا تھا جس نے اس دور کی دو عظیم تہذیبوں ایران اور رومتہ الکبریٰ کو سرنگوں کر دیا۔ اقبال نے حقائق کو فن بنایا ہے اسی لیے ان کی شاعری آج زندہ ہے۔

ابتدا میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، ڈین فیکلٹی نے صدر جلسہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر مسعود حسین کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اقبالیات کو پڑھا بھی ہے اور پڑھایا بھی ہے۔ وہ معنیات کی دنیا میں بہت دور تک گئے ہیں۔ ان کو اقبالیات سے جس قدر انس اور لگاؤ ہے اس کا اندازہ ان کی تحریر و تقریر سے ہوتا ہے۔

آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شعبۂ اردو اور تمام فیکلٹی کی جانب سے معزز مقرر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "پروفیسر مسعود حسین صاحب کو اقبال کی شاعری سے جو قلبی اور ذہنی لگاؤ ہے اور جس طرح شعر اقبال کو محسوس کر کے انھوں نے اقبال کی ان دو طویل نظموں کی بازآفرینی کی ہے، اس سے مقالے کے دوران برابر یہ تاثر قائم رہا کہ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا"۔ اقبال کی نظموں کے ایسے بھرپور لسانی، ادبی اور

فکری تجزیے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ مسعود صاحب اردو زبان کے مورخ و محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے معروف و ممتاز ہیں لیکن جب جب انھوں نے تنقید کی وادی میں قدم رکھا ہے وہ اپنے انداز نقد سے الگ پہچانے گئے ہیں۔ انھوں نے تحسین شعر کے نئے گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور نئی راہیں دریافت کی ہیں۔"

(ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی)

## کرشن چندر کی وفات ــــ تعزیتی جلسہ

اردو کے مایۂ ناز افسانہ نگار کرشن چندر کی اچانک وفات پر شعبۂ اردو میں ۱۰ مارچ ۷۷ء کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ مرحوم کی وفات سے دو دن قبل ان کی افسانہ نگاری پر ایک مضمون پڑھا گیا تھا۔ جناب صدر نے اس کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: کسے معلوم تھا کہ ہمارا محبوب افسانہ نگار اور اردو کی تہذیبی قدروں کا مرقع نگار اتنی جلد ہم سے رخصت ہو جائے گا۔ آپ نے کرشن چندر کے فکشن کا بھرپور جائزہ لیا اور فرمایا کہ افسانے کی جو روایت پریم چند نے قائم کی تھی اس کو ایک نئی وسعت دینے میں کرشن چندر پیش پیش رہے۔ اور کرشن چندر کو عوام و خواص میں جتنی مقبولیت نصیب ہوئی وہ بہت کم لوگوں کو میسر آئی۔ نارنگ صاحب نے فرمایا کہ کرشن چندر تین باتوں کی وجہ سے خصوصاً یاد رکھے جائیں گے۔ مناظر فطرت سے والہانہ محبت، اخلاص اور ایثار سے معمور انسان دوستی اور جذبات سے تھرتھراتا ہوا انتہائی سادہ اور حسین اسلوب۔ یہی وجہ ہے کہ رومانیت کے باوجود ان کا شمار ملک کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ کرشن چندر کے فن میں دلآویزی دراصل "جہلم میں ناؤ پر" بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی کی آنکھوں کے دکھ کے گہرے احساس سے پیدا ہوئی تھی۔ مناظر فطرت کے حسن کی فراوانی میں انسانی غربت اور بے بسی کا تضاد کرشن چندر کے فن کا بنیادی سانچہ ہے جو آگے چل کر شہری

زندگی میں تعیش اور افلاس کے تناظر میں بدل جاتا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری اپنی فنی غذا جذبات نگاری سے حاصل کرتی ہے، اس پر بھی اس کی تین سطحیں خاص ہیں۔ ابتدائی دور کی منظریہ حقیقت نگاری، وسطی دور کی نفسیاتی حقیقت نگاری اور آزادی کے بعد کی نظریاتی حقیقت نگاری جس میں وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل کا خیالی اور علمی حل پیش کرنے لگے تھے۔ اگرچہ اس دور میں بھی انھوں نے "بالو بھنگی"، "مہالکشمی کا پل"، "برہمپترا" جیسی کہانیاں لکھیں لیکن ان کے فن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے "زندگی کے موڑ پر" اور "بالکونی" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن میں ان کی قوت مشاہدہ اور نفسیاتی ادراک اپنی معراج پر ملتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب کرشن چندر کی کشادہ نظری بہار کو حنائے پائے خزاں کے طور پر بھی دیکھ سکتی تھی۔ "ان داتا"، "پشاور ایکسپریس" اور "ہم وحشی ہیں" کی تخلیق ان سماجی سچائیوں کی حامل ہے جو پورے برصغیر کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ کرشن چندر ایک ایسی نثر کے خالق تھے جس کی نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ اس نثر کی بڑی طاقت اس کی تازگی، نشاط آگینی اور جمال آفرینی ہے۔ جذبے کی آنچ سے کپکپاتی ہوئی نثر کرشن چندر کا ایسا وسیلۂ اظہار تھا جو ذہن و شعور کو فوری طور پر مسحور کر لیتا تھا اور اس کی بدولت ان کی انسان دوستی اور حقیقت نگاری انتہائی پر تاثیر اور دل آویز معلوم ہوتی ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے بھی اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کرشن چندر نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ہر اس طبقے کے ساتھ اپنا جذباتی تعلق محسوس کیا جو مظلوم اور مقہور تھا، وہ عالمی دہشت اور بربریت کے خلاف سینہ سپر ہوئے اور تمام عمر اسی میں گھلتے رہے۔ صدر جلسہ کی طرف سے ڈاکٹر شمیم حنفی صاحب نے حسب ذیل تجویز پڑھ کر سنائی جسے حاضرین جلسہ نے خاموش کھڑے ہو کر منظور کیا:

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا اور اساتذہ کا یہ جلسہ کرشن چندر کی ناگہانی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ کرشن چندر اردو کے سب سے محبوب اور

معروف افسانہ نگار تھے۔ ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ اردو سے قطع نظر ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں ان کی ساٹھ سے زیادہ کتابیں منتقل ہو چکی تھیں۔ اس طرح کرشن چندر کے فن کی مقبولیت اردو کے وقار اور عزت کا احساس عام کرنے کا وسیلہ بھی بنی۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، رپورتاژ، خاکہ نگاری، طنز اور مزاح کے رنگا رنگ دائروں میں کرشن چندر کے قلم نے ایک مدت تک جادو جگائے رکھا۔ ان کی تمام تحریریں اپنی دلچسپی، بے ساختگی، شادابی اور اسلوب کی روانی کے سبب عام اور خاص ہر حلقے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کے حسین اور رواں دواں اسلوب سے چھلکتی ہوئی ان کی گہری انسان دوستی، اعلا اقدار سے والہانہ وابستگی اور مظاہر کے جمال کی معصومانہ پرستش نے کرشن چندر کی تخلیقات کو ایک مخصوص سمت عطا کی تھی جسے انسان اور اس کائنات سے دلچسپی رکھنے والے تمام حلقے محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کرشن چندر نے انسان اور فطرت کی رفعت و جلال کا رزمیہ بھی لکھا ہے اور دونوں کے زوال کا نوحہ بھی۔ ان کی سچی، شدید اور ایک غم آلود احساس سے مزین انسان دوستی ان کی تحریروں کو ایک زبردست اور اثر انگیز سماجی معنویت کا حامل بناتی ہے۔ اردو افسانے کے ایوان میں ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔ ہم سب بارگاہ خداوندی میں کرشن چندر کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

(سید فرحت حسین)

## جدید شعری جمالیات ــــ فاروقی کا توسیعی خطبہ

جامعہ کے شعبۂ اردو میں جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب نے "جدید شعری جمالیات" کے عنوان پر توسیعی خطبہ دیا۔ موصوف نے خطبے کی ابتدا کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کا مشہور جملہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" شعری حسن کے بارے میں نہیں بلکہ انسانی حسن کے بارے

میں ہے۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ ترقی پسند نظریہ سازوں کے لیے ممکن تھا کہ وہ نئے شعری جمالیات کے لیے کوشاں ہوتے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ شعر کی بدلی ہوئی خوبصورتی کے بارے میں ترقی پسند نظریہ کیا تھا۔ دراصل ترقی پسند نظریہ شعری جمالیات سے زیادہ شعری تفاعل میں الجھا ہوا تھا۔ لہٰذا حسن کا معیار بدلنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود معیار بدلنے کی نظریاتی کوشش ترقی پسندوں سے نہ ہو سکی۔ فاروقی صاحب نے ترقی پسندوں کے جمالیاتی معیار کی تغیر پذیری کے نظریے کے تحت اس رویّے کا ذکر کیا جو ترقی پسندوں نے ٹیگور و اقبال کی تخلیقی شخصیتوں اور غزل، آزاد نظم اور تصوف کی تردید کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسندوں کو یہ سب پاپڑ اسی لیے بیلنے پڑے کہ وہ قدیم تصورات کے جس جس پہلو کو دریابرد کرتے اس کا بھوت، جلد یا بدیر ان کے دروازے پہ حاضر ہو جاتا۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ اس تمام دردسری سے نجات اسی وقت ممکن ہے کہ جب ادب میں خوبصورتی کی قدروں کو قائم و دائم مان لیا جائے۔ بعد ازاں فاروقی صاحب نے کہا کہ خوبصورتی کی فہرست کوئی صحیفۂ خداوندی نہیں جس کی تنسیخ یا جس میں سے ایک آدھ چیزوں کا حذف کفر ہو۔ فاروقی صاحب نے اپنے خطبے کے اختتام پر کہا کہ جدید شعریات نے خوبصورتی کو پرکھنے اور خلق کرنے کے طریقے ضرور دریافت کئے ہیں، لیکن اس میں نیاپن درجے کا ہے، نوع کا نہیں۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ جدید شاعری تو بس یہ کر رہی ہے کہ آپ میں پوری خوبصورتیوں کی فہم دوبارہ پیدا کرے اور اس طرح اپنی خوبصورتیوں کو دوبارہ اجاگر کرے۔

شمس الرحمان فاروقی کے خطبے کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ شمس الرحمان صاحب نے اپنے خطبے میں جو نکات اٹھائے ہیں ان پر سوالات قائم کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ مارکسی فکر کے تئیں کوئی بھی رویّہ اختیار کرتے وقت یہ پہلو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ مارکسی جمالیات ایک مخصوص فلسفے کی دین ہے اگر اس سے اختلاف کرنا ہو تو مارکس کے فلسفے کو ضرور معرض بحث میں لانا

پیشنگار۔ انھوں نے مزید بتایا کہ جمالیات کی مجموعی اصطلاحوں کے تحت تمام فنون لطیفہ کو لانے میں تضادات پیدا ہو جاتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی صاحب کا یہ کہنا کہ خوبصورتی اپنا اخلاقی نظام رکھتی ہے، کافی بحث طلب ہے۔

شروع میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے صاحب مقالہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ فاروقی صاحب ان نقادوں میں سے ہیں جو صاحب رائے اور صاحب نظر ہیں۔

(شمس اسحق عثمانی)

## امیر خسرو کی حسّی حقیقت نگاری ـــ شکیل الرحمان صاحب کا مقالہ

ڈاکٹر شکیل الرحمان صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اردو کاشمیر یونیورسٹی نے "امیر خسرو کی حسّی حقیقت نگاری" کے عنوان سے جامعہ کے شعبۂ اردو میں ایک مقالہ پڑھا۔ موصوف نے حضرت امیر خسرو کو اپنے وقت کا ایک عظیم دانشور، نابغہ اور نورانی شعاعوں کا ایک ایسا عظیم مجموعہ قرار دیا جس کی پرداخت میں زمانہ صدیوں سے سرگرم سفر رہا تھا۔ موصوف نے خسرو کی شخصیت میں اس آمیزش کو خصوصی اہمیت دی جس کی تشکیل وسط ایشیائی، ترکی، عربی اور عجمی قدروں سے ہوتی ہے۔ امیر خسرو کے متعلق سوچنا ہندوستانی تہذیب کی اس روح سے متعلق سوچنا ہے جو ترکیب اور آمیزش کے بعد مشترکہ تہذیب کی روشن ترین صورت ہے۔ شکیل صاحب نے حضرت خسرو کے اجتماعی لاشعور کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا اور اپنے مطالعے میں ترک جمالیات، ترکی ورثے یا "ترک ذہن" کی طرف اشارہ کیا جس کو خسرو کے مطالعے میں اولین اہمیت حاصل ہے۔ مقالہ نگار نے "ترک ذہن" کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے وسط ایشیا کی صدیوں پرانی تہذیب، تاریخ اور فنی و جمالیاتی روایات پر روشنی ڈالی۔

صدر جلسہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے فرمایا کہ شکیل صاحب نے تصویروں اور دیگر فنون کے ذریعے ترکی جمالیات سے متعلق کچھ تجریدی سوالات قائم کر کے انھیں حسّی

حقیقت نگاری کی اصطلاح میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ موصوف نے اس امر کی اہمیت پر زور دیا کہ وسطی ایشیا، بدھ تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اس کے اثرات اسلامی فنون لطیفہ پر جس طور پر پڑے ہیں اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہو سکتا ہے اور کارآمد بھی۔

(ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی)

## جامعہ میں تعلیم پر سہ روزہ سمینار

استادوں کے مدرسے کے اہتمام میں، ۱۰ر مارچ سے ۱۲ر مارچ تک مطالعۂ تعلیم پر ایک سمینار منعقد ہوا، جس میں تقریباً سو حضرات نے شرکت کی، دہلی سے باہر کے مندوبین کی تعداد پندرہ تھی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین نے کی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر بی۔ ڈی۔ ناگ چودھری نے افتتاح فرمایا، فیکلٹی آف ایجوکیشن کے قائم مقام ڈین پروفیسر ایس شکلا نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور آخر میں استادوں کے مدرسے کے ریڈر ڈاکٹر بی سین گپتا نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات اور ان پر بحث و گفتگو کے لیے سات اجلاس منعقد ہوئے جن کی صدارت کے فرائض مشہور ماہرین تعلیم اور معلمین نے انجام دئے۔ ایم ایڈ کے طلبا نے سمینار کے انتظام میں نمایاں حصہ لیا، نیز ان طالب علموں اور فیکلٹی آف ایجوکیشن کے ریسرچ اسکالر نے سمینار کے مختلف زیر بحث موضوعات پر رپورٹیں تیار کی تھیں جنھیں آخری دن پیش کیا گیا۔ عام طور پر ان رپورٹوں کو بہت پسند کیا گیا۔

(عبداللطیف اعظمی)

# جامعہ





جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ

جلد ۷۴ | بابت ماہ مئی ۱۹۷۷ء | شمارہ ۵

## فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵..۱۱

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی • ٹائٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

ملک کی آزادی کانگریس اور کانگریسی رہنماؤں کی مرہونِ منت ہے اور اسی وجہ سے وہ پچھلے تیس سال سے بے دخل و غش ملک پر حکومت کرتے رہے ہیں، مگر لوک سبھا کے حالیہ انتخابات میں کانگریس کو جس ناکامی بلکہ رسوائی کا سامنہ دیکھنا پڑا اس میں بڑی عبرت ہے اس سے زیادہ افسوس اور عبرت کی بات یہ ہے کہ اس ناکامی کے بعد اس کی صفوں میں ایسا انتشار و اختلاف پیدا ہوا ہے کہ صرف کانگریس ہی کی نہیں بلکہ پورے ملک و قوم کی دنیا بھر میں بدنامی ہو رہی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا انسان صرف اقتدار کا بھوکا ہے، اس آسانی اور تیزی کے ساتھ اچھے اچھے لوگ پارٹیاں بدل رہے ہیں جس آسانی اور تیزی کے ساتھ کوئی شخص کپڑے بھی نہیں بدلا کرتا۔ ایسی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی اور نہ عظیم قوم کہلانے کی مستحق ہے جس کے پاس ضمیر نہ ہو، کوئی اصول نہ ہو، کوئی نظریہ نہ ہو، کوئی اعلیٰ قدر نہ ہو۔ اقتدار اور حکومت کا آنا جانا وقتی چیز ہے، اصل چیز نصب العین اور ملک و قوم کا مفاد ہے، مخلص اور ایماندار وہ ہے جو گرم و سرد ہر حال میں اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین پر قائم رہے۔

---

جامعہ ملیہ اگرچہ سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، مگر وہ خالص تعلیمی اور تہذیبی ادارہ ہے، بحیثیت ادارہ اس کو وقتی سیاست اور سیاسی جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ وقت کے تعمیری، تعلیمی اور ادبی و تہذیبی کاموں میں اس ادارہ نے ہمیشہ سب کے ساتھ کام کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے اس تعمیری کردار کا حق آج بھی اسی طرح ادا کرے گا جیسے کہ ماضی میں اس کی تعا

رہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانگریس سے جامعہ کا گہرا اور دیرینہ تعلق رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ کے بہت سے لوگوں نے اس کے جھنڈے کے نیچے آزادی کی جنگ لڑی تھی، مثلاً شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم نے اپنے مقدس ہاتھوں سے جامعہ کا افتتاح فرمایا تھا، پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی، پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں، دوسرے امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، دوسرے شیخ الجامعہ اور تیسرے امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ، جامعہ کے قدیم طالب علم اور جامعہ کے کئی اداروں کے سابق سربراہ جناب شفیق الرحمان قدوائی، جامعہ کے سابق استاد اور سابق خازن موسیٰ خواجہ حافظ فیاض احمد وغیرہ۔ نیز ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے اپنے غیر مشروط تعاون سے کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کے بعض تعمیری اور تعلیمی کاموں میں مدد کی، مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب جنھوں نے وردھا اسکیم کی تشکیل و ترویج میں ممتاز حصہ لیا اور تعلیمی سنگھ کے بہت سے منصوبوں کی کامیابی میں ان کا براہ راست اور نمایاں حصہ ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ موجودہ جنتا حکومت میں بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں جامعہ کی ملکی اور تعلیمی خدمات کا صدق دل سے اعتراف ہے اور جامعہ کے بعض اکابر سے ان کے خوشگوار تعلقات اور اچھے مراسم ہیں، اگر وہ اپنے کسی علمی و تعلیمی منصوبے میں جامعہ کی امداد و اعانت چاہیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جامعہ اپنی گذشتہ روایات کے مطابق اس پیش کش کو قبول نہ کرے۔

---

جنتا حکومت کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ چونکہ وہ مختلف الخیال پارٹیوں کا مجموعہ ہے، اس لیے وہ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکے گی، مگر اب تک یہ خیال غلط ثابت ہوا ہے اور کانگریس کے موجودہ اختلاف اور انتشار کی وجہ سے یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ جنتا حکومت کے بارے میں جو خدشات ظاہر کیے گئے تھے وہ پورے نہیں ہوں گے۔ مگر خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے، جنتا پارٹی کے خلوص اور تدبر کا امتحان ابھی باقی ہے، صحیح صورت حال ریاستی انتخابات کے بعد سامنے آئے گی، ہماری دعا اور خواہش یہ ہے کہ ملک میں مضبوط اور حقیقی جمہوری اور سیکولر حکومت قائم ہو، لیکن اس وقت انتشار

اور بے یقینی کی جو فضا پائی جاتی ہے وہ جلد سے جلد دور ہونی چاہیئے۔ ہمارا خاص طور پر اشارہ تعلیمی اداروں کی موجودہ بگڑتی ہوئی فضا اور بعض تعلیمی اسکیموں کی طرف ہے ۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ تعلیم کی کامیابی اور ترقی کے لئے پُرسکون فضا ازحد ضروری ہے اس لئے پُرسکون فضا کو قائم رکھنا موجودہ حکومت کے مفاد اور ہر دلعزیزی کے لیے ضروری ہے۔ پچھلی حکومت نے ثانوی سطح کے لیے ایک اسکیم منظور کی تھی جو دس جمع دو جمع تین کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکیم پر ملک و قوم کا کافی وقت اور روپیہ صرف ہوا ہے، اب سننے میں آرہا ہے کہ موجودہ حکومت اس اسکیم کو ختم کرنا یا اس میں بنیادی تبدیلی کرنا چاہتی ہے، اگر یہ بات صحیح ہے اور ایسا تعلیمی نقطۂ نظر سے کیا جا رہا ہے تو ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے، لیکن اگر سیاسی وجوہ اور مصلحتوں سے کیا جا رہا ہے تو اس میں سراسر نقصان ملک کا ہے، اس لیے ہماری مخلصانہ گذارش ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ کیا جائے تعلیمی مفاد اور مقاصد کے پیش نظر کیا جائے اور یہ کام ماہرین تعلیم کی رائے اور فیصلہ سے کیا جائے اور جو فیصلہ بھی کرنا ہو تعلیمی سال کے شروع ہونے سے بہت پہلے کر دینا چاہیئے تاکہ ہائی اسکول کے طلبا کو موجودہ بے یقینی اور بے چینی کی کیفیت سے نجات ملے ۔

---

پچھلے مہینے کا شذرات لکھا جا چکا تھا جس میں کرشن چندر کی وفات پر ماتم کیا گیا تھا، کہ بہار کے دو مشہور ادیبوں کی وفات کی اطلاع ملی ۔ ۲۲ر مارچ کو اردو کے مشہور ادیب و نقاد پروفیسر سید اختر احمد اختر اورینوی کا اور دوسرے روز ۲۳ر مارچ کو مرحوم کے دیرینہ رفیق کار اور دوست پروفیسر سید محمد صدر الدین فضا کا انتقال ہوا۔

اختر اورینوی بہار کے ایک گاؤں اورین (مونگیر) میں ۸ر اگست ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں میٹرک کیا اور ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد پٹنہ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور تین سال تک وہاں تعلیم حاصل کی، مگر اسی زمانے میں دق جیسے موذی مرض نے ان کو آگھیرا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، جب اچھے ہوئے تو ڈاکٹری کی تعلیم جاری رکھنے کے بجائے بی اے میں داخلہ لیا، ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور ۱۹۴۰ء میں پٹنہ کالج کے شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے، پھر ترقی کر کے ریڈر، شعبے کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوئے۔ اردو کے استاد کی حیثیت سے ۳۵ سال تک اور صدر شعبہ کی حیثیت سے تقریباً ۲۳ سال تک خدمت کرنے کے بعد ۱۹۷۳ء

میں ریٹائر ہوئے۔ ادھر کوئی تین سال سے علیل تھے اور یہی علالت ان کی وفات کا سبب بنی۔
مرحوم شاعر بھی تھے، افسانہ نگار بھی، ناول نویس بھی، ڈرامہ نگار بھی اور نقاد بھی مگر ان سب میں نقاد کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند تھا۔ تنقید نگاری میں متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں، مثلاً کسوٹی، تحقیق و تنقید، تنقید جدید، قدر و نظر، سراج و منہاج، تحقیقی مقالے اور بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ان کے انتقال کے بعد، ان کی ایک تازہ غزل شائع ہوئی ہے جو یقیناً طویل علالت کے زمانے میں کہی گئی ہوگی، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

تجھے پا کے میں نے کھویا، تجھے کھو کے اب جو پاؤں
تو ستارے توڑ لاؤں، تری انجمن سجاؤں
مری چشم منتظر کے یہ چراغ بجھ چکے ہیں
جو ترا پیام آئے تو چراغِ دل جلاؤں
دل اخترِ تپاں کا ہے وجود شعلہ ساماں
میں عنایتوں کے قرباں، کسے داغِ دل دکھاؤں

---

ڈاکٹر صدر الدین فضا، اختر اورینوی کے احباب میں سے تھے۔ ۳۱ مارچ کو ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے، وہیں طبیعت خراب ہوئی، رہائش گاہ پر واپس آئے تو سخت دل کا دورہ پڑا اور طبی امداد سے قبل اللہ کو پیارے ہو گئے۔
مرحوم بہار شریف ضلع نالندہ کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ سے فراغت کے بعد عربی، فارسی اور اردو میں ایم اے کیا۔ پہلے مظفر پور کے کالج میں لکچرر مقرر ہوئے، پھر پٹنہ کالج کے شعبۂ عربی میں تقرر ہوا، کچھ عرصے کے بعد شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے اور اختر اورینوی کی سبکدوشی کے بعد ان کی جگہ صدر شعبہ اور پھر پروفیسر مقرر ہوئے۔ مرحوم کئی کتابوں کے مصنف اور مرتب تھے۔
دسمبر ۱۹۷۵ء میں میں پٹنہ گیا تھا تو ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب ریڈر شعبۂ اردو پٹنہ کالج نے مرحوم سے مجھے ملایا تھا اور ان کی صدارت میں ایک جلسہ بھی ہوا تھا جس میں اردو کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کے لیے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ مرحوم یونیورسٹی اور پٹنہ کے علمی و ادبی حلقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، کم گو مگر خلیق اور ملنسار تھے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل

# الہ آباد۔ ایک ادبی اور تہذیبی مرکز

## (۱)

شہر الہ آباد کو جو تہذیبی، ثقافتی اور ادبی حیثیت اور مرکزیت حاصل رہی ہے اس کا احاطہ مختلف زاویوں اور صدیوں کی مختلف النوع زندگی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس سرزمین پر مختلف تہذیبوں کے ایسے اثرات پائے جاتے ہیں جن کا مطالعہ اور تجزیہ کئی سمتوں، مذہبی رسم و رواج اور تاریخ کے پرپیچ مگر دلکش اثرات کو نظر میں رکھکر کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ کے صفحات پر الہ آباد اپنی پہلی شکل میں پراگ، پریاگ اور پیاگ ملتا ہے۔ اس میں کچھ کا زمانہ تاریخ کے دھندلکوں کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ کچھ حوالوں کے مطابق اسے رام چندر جی کے بیٹے کُش نے آباد کیا تھا۔ کچھ اس سے بھی پہلے رشی بھاردواج کے دور سے اس شہر کا تعلق ثابت کرتے ہیں اور کچھ مہابھارت اور پرانوں تک پہنچ جاتے ہیں، یہاں تک کہ اشوک اور ہرش کے دور تک پہنچتے پہنچتے الہ آباد کو تیرتھ استھان کی شکل میں ایک اہم مقام کی حیثیت سے مرکزیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اشوک اور ہرش وردھن کے دان پن کے قصے، دلچسپی کے ساتھ، الہ آباد سے وابستہ ہیں

---

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، ریڈر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

اور الہ آباد کے سنگم پر دان پن کی روایت دورِ قدیم سے آج تک چلی آتی ہے اگرچہ اس کا جواب مشکل سے ملے گا کہ خاص طور پر اس جگہ کو دان پن کا مرکز کیوں بنایا گیا۔ کمبھ، ادھ کمبھ اور مہا کمبھ کے میلے گنگا جمنا اور سرسوتی کے سنگم پر لوگوں کو اطراف عالم سے کھینچ لاتے ہیں۔ اشنان کے ساتھ مذہبی جلسے ہوتے ہیں، مذہبی بحث و مباحثے اور مختلف نقاطِ نظر کے لوگوں کو اپنی اپنی باتیں کہنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ سادھوؤں کے آشرم، کلپ باس، پراگ والوں کی بھاگ دوڑ اور میلے کے جشن عجب دلکش سماں پیش کرتے ہیں۔

اکبر کے دورِ سلطنت میں اس سرزمین نے ایک نیا چولا بدلا۔ ابوالفضل کے اکبر نامہ کے مطابق بادشاہ نے ایک شہر بسایا اور اس کا نام الہا باس رکھا۔ اس سے پہلے یہ پیاگ نام کا ایک تیرتھ استھان تھا۔ ۱۵۷۵ء میں جب گنگا جمنا کے سنگم پر قلعہ تعمیر ہوا، اسی وقت الہ آباد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قلعہ میں اشوک کی لاٹ اور اکشے وٹ درخت بھی داخل کر لیا گیا۔ البیرونی نے اپنی کتاب عجائب الہند میں پریاگ کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اکشے وٹ کا تذکرہ "وٹ" کے نام سے کیا ہے "الہا باس" سے "الہ آباد" بھی اکبر کے زمانے میں ہوا۔ اگرچہ سجان رائے بھنڈاری نے خلاصۃ التواریخ میں تحریر کر دیا کہ الہا باس سے الہ آباد نام شاہ جہاں نے تبدیل کیا۔ حال ہی میں الہ آباد یونیورسٹی سے صوبہ الہ آباد پر ایک مقالہ پیش کیا گیا جس میں اسی خیال سے اتفاق کیا گیا ہے۔ مقالہ کی عبارت یوں ہے:

> اکبر نے اسے صوبے کا دار السلطنت بنایا اور اس کا
> نام الہ باس رکھا۔ بعد میں شاہ جہاں نے اس کا نام

---

District Gazetteer 1884, P. 175 II ال
Tabqate AKBari P. 359

الہ آباد کر دیا[1]

مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے آئین اکبری میں ابوالفضل کی عبارت یوں ہے :

"پراگ و پیاگ در ہندی وصل و اتصال ، الہا باس و الہ آباد بمعنی جائے ظہور قدرت اسم ذات بمعنی باش و بود آبدہ بمعنی جائے فرود آمدن وظہور بودن در او مکان و الہ آباد یعنی آباد کردہ حق سبحانہ تعالیٰ و الہا باس یعنی جائے ماندن حق جلال جلالہ" [2]

اس کے علاوہ حسب ذیل شواہد اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ الہ آباد شاہ جہاں کا رکھا ہوا نام ہے ۔

(۱) اکبر کے زمانے میں جو سکے الہ آباد کی ٹکسال سے نکلے اُن پر ضرب الہ آباد کے ساتھ یہ شعر ملتا ہے ؎

ہمیشہ چوں زرِ خورشید و ماہ روشن باد
بہ شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

کچھ سکوں پر دار الغرب الہ آباد بھی کندہ ہے ۔

(۲) آئین اکبری کی تیسری جلد میں ابوالفضل کی عبارت بیوزرخ کے ترجمہ میں یوں ملتی ہے :

نیابت خاں صوبے میں خالصہ کا عامل مقرر کیا گیا جس کی الہ آباد کے قریب جھوسی اور اریل میں جاگیریں تھیں[3]

---

1 S.N. Sinha - Introduction P. II

[2] آئین اکبری جلد دوم ص۱۷ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ

3 AIN Vol III P. 481

(۳) اکبرنامہ (جلد سوم ص۴۱۲ مطبوعہ نولکشور پریس) میں یہ عبارت ملتی ہے: "بساعت خمستہ اساسِ شہر الہ آباد نہادند۔" اس کے علاوہ اکبرنامہ میں حویلیٔ الہ آباد (صفحات ۴۱۵، ۴۱۷، ۷۳۴ پر) بار بار آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا صوبۂ الہ آباد سے تعلق نہیں ہو سکتا۔

(۴) توزک جہانگیری اور جہانگیرنامہ میں بھی الہ آباد کا نام بار بار آیا ہے۔

(۵) نورجہاں کے نام پر جو سکے جہانگیر کے زمانے میں بنے اُن پر یہ شعر ملتا ہے ؎

بحکم شاہِ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

یہ سکہ الہ آباد کے عجائب گھر میں آج بھی محفوظ ہے:

۱۰۳۴ھ ضرب الہ آباد

(۶) جہانگیر کو منانے اور سمجھانے کے لئے جب سلیمہ سلطان بیگم الہ آباد پہنچی تو جہانگیر نے دو منزل آگے جاکر اس کا استقبال کیا تھا[۱]

اتنے شواہد کے بعد مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

یہاں یہ بحث فضول ہے کہ اِلٰہ اکبر نے عربی لفظ سے لیا تھا، پرانوں کی زبان میں جو الا آیا ہے اس سے استنباط کیا۔ دونوں ہی کے معنی ذات باری تعالیٰ کے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سریانی زبان کا ایل بھی معنی کے اعتبار سے ذات باری تعالیٰ ہی کو ظاہر کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ الہ آباد کے عروج کا زمانہ مغلوں ہی کے دور حکومت سے شروع ہوتا ہے، یہاں کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں جو کچھ رنگارنگی، فنونِ لطیفہ کی نیرنگیاں اور متصوفیانہ زندگی کے نقوش ابھرے وہ سب اسی عہد حکومت کے مرہون

---

[۱] منتخب اللباب مصنفہ خان خاں حصہ اول ص۳۲۲

سنت اہیں کیونکہ اس سے پہلے سلطنت دورِ حکومت میں کڑے کو مرکزیت حاصل تھی، اگرچہ کڑے کی نظامت سے پہلے اور اُس وقت بھی الہ آباد کی سرزمین فقرا اور سالکین کے ساتھ ساتھ بھگتوں اور سادھو سنتوں کی آماجگاہ رہی۔ مغلوں کے دور میں بھگتی تحریک والوں کا ایک مرکز الہ آباد ہی تھا۔ سگن اور نرگن، سنت، ستت، چت اور آنند کے پرچار نے سوامی رامانند جیسے لوگوں کو پیدا کیا جو پریاگ ہی کے تعلیم یافتہ تھے جو بعد کو بنارس منتقل ہو گئے۔ جن کی تعلیم نے مذہب سے ذات پات کے فرق کو مٹانے پر زبردست زور ڈالا۔ رامانج کے شری فرقہ کے گرد، راگھوانند سے رامانند کا اصولی طور پر اختلاف ہو گیا کیونکہ رامانند اپنے خیالات میں ضرورت سے زیادہ انقلابی ثابت ہوئے۔ اسی وجہ سے رامانند کی تعلیمات نے ہندو مذہب کے نچلے طبقے کو بہت متاثر کیا۔ کبیر جیسا شاگرد بھی اسی آزاد خیالی کی وجہ سے سوامی رامانند کو ملا۔ سوامی رامانند کے ماننے والے رامانندی بیراگی کہلائے جن کے خیالات سے تقریباً پورا صوبہ الہ آباد متاثر ہوا۔

سوامی رامانند کے بعد کبیر پنتھ، باوری پنتھ، ناتھ پنتھ، ست نامی، ملوک داس، کیشو داس، مست محمد، فقیر شیخن، دیال داس، گورکھ ناتھ جیسے سنتوں کی تعلیمات ایک طرف تو غریب داس، نرہری داس اور تلسی داس جیسے رام بھگتوں کے اپدیش دوسری طرف اہلِ الہ آباد کو متاثر کرتے رہے۔ صوفیوں کی مذہبی تحریکوں میں بھی مختلف طور پر کوششیں الہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں ہوئیں۔ چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلوں نے الہ آباد پر اچھا خاصا اثر قائم کیا۔ ان کے اثر سے الہ آباد میں بہت سی خانقاہیں اور دائرے بن گئے جن میں مذہبی اور صوفیانہ تعلیم کے مرکز قائم ہوئے۔ ان دائروں میں بہت سے آج بھی باقی ہیں اور کچھ استداد زمانہ سے تباہ ہو گئے۔ ان کی تعداد بارہ ۱۲ بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کے ناموں میں بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔ مختلف اقوال کے مطابق دو چار دائرے

کے نام اور مقامات بھی معرضِ بحث میں آگئے ہیں۔ کچھ دائرے تباہ ہوگئے اور اب ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سبب سے بھی ناموں میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ صوفیوں کے ان سلسلوں میں کہیں کہیں شطاریہ اور مداریہ بھی مل جاتے ہیں تاہم الٰہ آباد پر چشتیہ سلسلے کا اثر غالب رہا ہے۔ دائروں کے ناموں کی ایک فہرست مولانا محمد حسین صاحب فاروقی جدِ اعلیٰ مولانا محمد میاں فاروقی کی سوانح حیات میں درج ہے جسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ دائرہ شاہ منور علی محلہ ہمت گنج

۲۔ دائرہ شاہ جان محمد۔ یہ دائرہ بدیع آباد میں تھا۔ یہ محلہ اب باقی نہیں رہا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ کہاں تھا۔

۳۔ دائرہ شاہ اوسن میجا۔ یہ دائرہ محلہ باؤلی امیر خسرو میں تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

۴۔ دائرہ شاہ جہاں محلہ میراں پور۔ یہ محلہ اور اس سے ملا ہوا کسی بزرگ کا مزار اور مسجد اب بھی موجود ہے مگر اب نئی پھیلتی ہوئی آبادی ہر چیز کا صفایا کر رہی ہے۔

۵۔ دائرہ شاہ غلام علی محلہ کولہن ٹولہ رانی منڈی جو اب دائرہ شاہ محمدی کے نام سے مشہور ہے۔

۶۔ دائرہ شاہ اجمل۔ یہ دائرہ ہمیشہ سے علم و فن کا مرکز رہا۔ ناسخ اسی دائرہ میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ آج بھی اس دائرے سے اہلِ علم وابستہ ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر اور میرے عزیز شاگرد اجمل اجملی کا تعلق اسی دائرے سے ہے۔

۷۔ دائرہ شاہ تیمور محلہ اترسوئیا۔ اس کا اب کہیں پتہ نہیں۔

۸۔ دائرہ شاہ عبدالرحمٰن محلہ شاہ گنج۔ جو اب مولوی غلام امام شہید کے نام سے

یاد کیا جاتا ہے۔

۹۔ دائرہ شاہ عبدالجلیل محلہ چک۔ یہ دائرہ اب بھی موجود ہے اور سلسلۂ صابریہ سے متعلق بتایا جاتا ہے۔

۱۰۔ دائرہ شاہ زین الدین محلہ شہر آرا باغ

۱۱ دائرہ شاہ محب اللہ محلہ کیٹ گنج (Kaaganj) لیکن بعد کو شاہ صاحب کی اولاد محلہ بہادر گنج منتقل ہو گئی۔

۱۲۔ دائرہ شاہ حجت اللہ۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں شیخ محب اللہ الہ آبادی کی اولاد مقیم ہوئی جس نے بعد کو دائرہ شاہ حجت اللہ کا نام اختیار کر لیا۔ الہ آباد کے مولانا محمد میاں فاروقی اسی دائرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۳۔ یحییٰ پور میں ایک مشہور دائرہ اور ہے جو دائرہ شاہ رفیع الزماں کے نام سے مشہور ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ دائرہ اوپر کے ناموں میں سے کوئی بدلا ہوا نام ہے یا کوئی الگ دائرہ ہے۔ راقم الحروف نے بڑی کوشش کی کہ دائروں کے کچھ صحیح حالات معلوم ہو سکیں مگر ان دائروں کے شاہ صاحبان نے کوئی مدد نہ کی بلکہ اکثر جگہ تو یہ احساس ہوا کہ صرف خلط مبحث میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہے اس لئے صحیح صورت حال کا پتہ نہیں چلتا۔ کچھ بزرگوں نے قصداً اپنی معلومات کو چھپایا کہ شاید محرر رسالہ ان معلومات سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھائے اردو کے قدیم اسکول کا یہ مزاج بڑا افسوسناک ہے۔

الہ آباد کے وجود میں آنے سے پہلے خلجیوں کے زمانے میں خصوصاً کڑے کو بھی اہمیت حاصل تھی مگر الہ آباد موجودہ کے گرد و پیش ہندو سنتوں کے ساتھ ساتھ بہت سے مسلمان صوفیوں کا بھی قیام تھا۔ الہ آباد سے دو تین میل کے فاصلے پر جھونسی اس وقت سیاسی اور مذہبی مرکز تھا۔ یہاں مشہور صوفی بزرگ مخدوم شاہ تقی جنھیں

جنھیں شیخ تقی بھی لکھا گیا ہے قیام پذیر تھے ۔ مخدوم شاہ تقی کا دورِ حیات ۱۳۲۰ء سے ۱۳۸۴ء تک ہے ۔ اکبری عہد میں بھی جھونسی کو اچھی خاصی اہمیت حاصل تھی اور یہ جگہ شاہجہاں کے عہد تک کافی اہم رہی ۔ آئین اکبری میں جھونسی کا ایک نام ہنڈیہ باس بھی لکھا گیا ہے جہاں بہت سے پرانے سادھوؤں کے مٹھ اس وقت بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں ۔ شاہ تقی اور ان کے مُرید اپنے خیالات کی تبلیغ الہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں کرتے رہے ۔ شاہ تقی اور شاہ بیابانی دونوں کے مزار آج بھی سنگم کے اوپر موجود ہیں اور خلائق کا مرجع ہیں ۔ یہ حصّہ کسی زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا ۔ آج بھی بہت سی جگہیں یہاں اُلٹی پڑی ہیں اور اُلٹی جھونسی کے نام سے مشہور رہیں ۔ مقامی روایتوں کے مطابق یہی وہ جگہ ہے جو دورِ قدیم میں اندھیر نگری اور چوپٹ راج کی کہاوت کی مصداق بنی ۔ معلوم نہیں کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے ۔ جھونسی میں کسی ادبی اور تہذیبی روایت کا پتہ نہیں چلتا ۔

۱۵۷۵ء میں قلعہ کے قیام کے ساتھ ہی شہر میں ایک وسیع و عریض باغ کی بنیاد پڑی جو بعد کو خسرو باغ کے نام سے مشہور ہوا ۔ یہاں وقتاً فوقتاً مغل شہزادے اور ولی عہدانِ حکومت قیام کرتے رہے اور یہی جگہ ولی عہدانِ حکومت کی بغاوتوں کے لئے بھی مشہور رہے ۔ اکبر کے اکلوتے بیٹے شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف یہیں سے علمِ بغاوت بلند کیا ۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر[۱] اور ڈاکٹر فیوہرر ( Fuhrer ) کی کتاب تاریخ یادگارہائے قدیمہ اور ان کے کتبات[۲] کے مطابق شہزادہ سلیم کے حکم سے

---

[۱] تاریخ جہانگیر صفحہ ۳۴۰ ۔

[۲] تاریخ یادگارہائے قدیمہ اور ان کے کتبات جلد دوم صفحہ ۱۳۰ بہ حوالہ مقبول احمد صمدی مصنف تاریخ الہ آباد صفحہ ۴۸ ۔

قلعہ کی تعمیر سے جو ساماں اور مسالہ بچ رہا تھا اس سے خسرو باغ تعمیر ہوا۔ بلاک مین (Blochmann) نے بھی جہانگیر کے سوانحات کے سلسلے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بغاوتوں کی بات یہ ہے کہ سلیم کے بعد اس کے بیٹے خسرو کے متعلق بھی بغاوت کی ایک روایت یہیں سے ملتی ہے جو بعد کو ۱۶۲۱ء میں خرم کے اشارے سے دکن میں مارا گیا اور اسی باغ میں دفن ہوا۔ شاہ عالم ثانی بھی انگریزوں کے عتاب میں ۱۷۷۱ء تک یہیں تقریباً مقید رہے۔ جہانگیر مرزا کی اکبر ثانی سے بغاوت کا شاخسانہ بھی اسی خسرو باغ سے اٹھا۔ اور بعد کو ۱۸۵۷ء میں مولوی لیاقت علی کی تحریکات اور انگریزوں سے جنگ کا مرکز یہی خسرو باغ رہا۔ خسرو باغ میں قیام پذیر شہزادوں کے یہاں کسی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا پتہ تو نہیں چلتا مگر بہترین سنگ تراش، منبت کاروں اور معماروں کا یہاں ورود ہوتا رہا جنھوں نے فن تعمیر کا ایک ذوق پیدا کیا۔ مشہور خطاط اور سنگتراش۔ آقا رضائے، خسرو باغ کے دروازوں پر کتبوں اور مقبروں میں جالیوں نیز منبت کاریوں کے جو نمونے چھوڑے ہیں وہ اپنی آپ مثال ہیں جن میں خسرو اور ماں بائی کے مقبرے فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ ان میں راجپوت اور ایرانی فن تعمیر کا استعمال کیا۔ تعمیر کے ان نمونوں کا اثر الہ آباد کے چند باقی ماندہ دائروں کی عمارتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خصوصاً بہادر گنج کے دائرے پر مغل اور خاص طور پر خسرو باغ کے طرز تعمیر کی گہری چھاپ ہے۔ بہت سے قدیم محلوں کے کھنڈروں اور راجگان کی کوٹھیوں پر مغل فن تعمیر کے نقوش آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

غلام محمد نظام الدین مغربی

# اولین مغل۔ عثمانی مراسلت

محققین تاریخ ہند کے لئے یہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے کہ سلطنت مغلیہ ہند کے عہد میں دولت عثمانیہ ترکی کے ساتھ سفارت یا مراسلت کا آغاز کس شہنشاہ کے دور میں ہوا۔ عہد جدید کے اہم محققین تاریخ، جیسے ڈاکٹر جگدیش نارائن سرکار[1]، پروفیسر عزیز احمد[2] اور پروفیسر برنارڈ لیویس[3] بتاتے ہیں کہ ان تعلقات اور مراسلت کی ابتدا شہنشاہ اکبر کے دور میں ہوئی جبکہ عثمانی امیر البحر سیدی علی رئیس بحیرۂ عرب و بحر ہند کی مہم کے دوران اپنے بیڑہ کی تباہی کے سبب گجرات میں لنگر انداز ہوا اور بحری سفر کی بجائے خشکی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے براہ گجرات، سندھ، دہلی و پنجاب ترکی

---

جناب غلام محمد نظام الدین مغربی، صدر شعبۂ تاریخ، اردو آرٹس کالج۔ حیدر آباد۔

[1] ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار۔ "ایشین بیلینس آف پاور" ہارون خان شیروانی۔ تہنیتی جلد مطبوعہ اسٹیٹ آرکائیوز حیدر آباد ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۰۵

[2] پروفیسر عزیز احمد Studies in Islamic culture in the Indian environment آکسفورڈ ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۸

[3] پروفیسر برنارڈ لیویس "The Mughals and the ottomans" رسالہ سہ ماہی پاکستان ۱۹۵۸ء صفحہ ۷

واپس ہوا۔ اس سفر کے دوران شہنشاہ ہمایوں کے دربار میں باریاب ہوا اور ہمایوں کی وفات پر کلانور میں شہنشاہ اکبر سے ملاقات کر کے واپسی کی اجازت کے ساتھ سلطان ترکی قانونی سلیمان ذی شان کے نام ایک مکتوب حاصل کیا۔ ڈاکٹر جگدیش نارائین سرکار اور پروفیسر عزیز احمد نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اکبر اعظم نے سلطان ترکی کو خلیفہ بھی تسلیم کر لیا تھا۔

ہر سہ اصحاب کا ماخذ وان۔ہیمر کا وہ مضمون ہے جو رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں سنہ ۱۸۳۴ء میں شائع ہوا تھا[ع]۔ ہیمر نے اس مضمون کے منسلکات میں شہنشاہ اکبر کے مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی درج کیا ہے جس کے عنوان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

وہ خط جسے شاہ اکبر نے سلطان سلیمان کو سنہ ۹۶۴ھ
(سنہ ۱۶۵۶ء) میں لکھا اور ترکی کیپٹن سید علی نے بھیجا[ش]۔

---

ع "Memoir on the Diplomatic Relations between the courts of Delhi and constuntinople in Sixteenth and Seventeenth Centuries"
TRAS جنوری سنہ ۱۸۳۴ء صفحہ ۴۶۲ تا ۴۶۴

ش سنہ ۹۶۴ھ کے مطابق غالباً ہیمر عیسوی سنہ ۱۵۵۶ء ظاہر کرنا چاہتا تھا جو طباعت کی غلطی کے سبب سنہ ۱۶۵۶ء چھپ گیا۔ لیکن اصلاً سنہ ۹۶۴ھ بھی غلط ہے، کیونکہ علی رئیس نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ اس نے رجب سنہ ۹۶۴ھ میں ایڈریانوپل پہنچ کر سلطان سلیمان کی خدمت میں اس سفر کی روداد پیش کی تھی اور ربیع الاول سنہ ۹۶۳ھ میں شہنشاہ ہمایوں کی وفات ہوئی اور اکبر کی تخت نشینی انجام پائی۔ علی اس کے ایک ماہ کے اندر ہندوستان چھوڑ چکا تھا، اس لئے ہیمر کی بتائی ہوئی تاریخ بالکلیہ غیر صحیح ہے۔ سیدی علی کے ترکی واپس ہونے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیمر نے اس مکتوب کے ماخذ کا صرف اس قدر حوالہ دیا ہے کہ یہ مکتوب "Journal of Sulimans Compaigns" میں موجود ہے۔ افسوس کہ اس ماخذ کا ترکی یا فارسی نام، مرتب کا اسم یا کتب خانہ کا حوالہ کچھ نہیں بتایا۔ اس غیر واضح ماخذ کے ساتھ تحریر کردہ مضمون کی بنیاد پر مغل۔ ترکی تعلقات کی ابتدا کا سہرا شہنشاہ اکبر کے سر باندھ دیا گیا ہے۔ استانبول کے کتب خانوں میں بکثرت ایسے قلمی نسخے موجود ہیں جن میں سلطان سلیمان کی مہمات کا تذکرہ یا تفصیلات موجود ہیں، اس لئے وہاں ہیمر کا دیا ہوا اس قدر مختصر حوالہ قطعی ناکافی اور قطعی غیر اطمینان بخش ہے۔

مکتوب مذکور کی اصلیت کی تحقیق کے ضمن میں براہ راست استانبول پہنچ کر تحقیق و تلاش کی گئی تو حسب ذیل معلومات ترک ماخذات سے حاصل ہوئیں اور زیر بحث مکتوب شہنشاہ اکبر کا نہیں بلکہ شہنشاہ ہمایوں کا بھیجا ہوا ثابت ہوا۔

سیدی علی رئیس کے سفرنامہ کا ایک قلمی نسخہ جو خود سیاح موصوف کی زندگی میں اس سفر سے واپسی کے صرف چار سال بعد رمضان ۹۶۸ھ میں عبداللہ حسن آغازادہ نامی کاتب کے قلم سے لکھوایا گیا ہے، سلطان سلیمان کے محل توپ کاپی سرائی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ اس سفرنامہ "مراۃ الممالک" میں علی نے لکھا ہے کہ اس سفر سے واپسی کے بعد اس نے اٹھارہ بادشاہوں کے خطوط سلطان سلیمان کی خدمت میں پیش کئے لیکن ان کے اسار کی فہرست نہیں بتائی۔ شہنشاہ ہمایوں کے فرمان کا ذکر سیدی علی نے شہنشاہ اکبر سے ملاقات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کیا ہے البتہ اکبر کے کسی فرمان یا

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی تاریخ رجب ۹۶۴ھ کے لئے مزید ملاحظہ ہو: (۱) محمد بن محمد الادرنوی نخبۃ التواریخ والاخبار مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۲۷۶ھ (۲) حاجی خلیفہ کاتب چلپی۔ تحفۃ الکبار فی اسفار البحار۔ قلمی نسخہ کتب خانہ داماد ابراہیم پاشا، استانبول نشان ۹۰۸ صفحہ ۳۹۔

مکتوب کا ذکر نہیں کیا۔[۷]

اس سفرنامے کے بعد منشات کی کثیر چھان بین کی گئی۔ چنانچہ سلیمانیہ کتب خانہ استانبول میں جو خود سلطان سلیمان ذی شان کا قائم کردہ استانبول کا عظیم کتب خانہ ہے "دستور الانشار" کے عنوان سے ایک مجموعۂ منشات حاصل ہوا۔ "دستور الانشار" کو سلطان مراد چہارم عثمانی کے دور رئیس الکتاب صاری عبداللہ آفندی نے ۱۰۵۳ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس کا ایک خوبصورت مطلا نسخہ جس کی کتابت ۱۰۸۱ھ میں بوستانی زادہ نامی کاتب نے کی ہے سلیمانیہ کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ "دستور الانشار" کا حوالہ میر نے بھی اپنے اس زیر بحث مضمون میں شاہ جہاں اور مراد چہارم عثمانی کی مراسلت کے ضمن میں کیا ہے۔ "دستور الانشار" میں ہمایوں کا مکتوب فارسی متن اور ترکی زبان میں سرخی کے ساتھ موجود ہے۔ سرخی حسب ذیل ہے:

"مرحوم سلطان سلیمان خان طاب ثراہ یہ ہندوستان پادشاہی ہمایون شاہدن غلطہ لی سید علی چلبی ایلہ کلدن مکتوبدر کہ خواجہ محمود لاری انشاسیلہ دد" (مرحوم سلطان سلیمان خان کی خدمت میں ہندوستان کے بادشاہ ہمایوں شاہ کی طرف سے غلطہ والے سید علی چلپی کے ذریعے آنے والا مکتوب ہے کہ خواجہ محمود لاری کی انشار کے ساتھ ہے[۸])

---

۷؎ سفرنامہ سیدی علی رئیس (مراۃ الممالک) قلمی نسخہ۔ کتب خانہ توپ کاپی سرائے استانبول نشان ۱۴۲۷ ورق ۸۲ ؛ محمد بن محمد الادرنوی۔ نخبۃ التواریخ والاخبار مطبوعہ تقویم خانہ عامرہ قسطنطنیہ ۱۲۷۶ھ صفحہ ۹۰ ؛ عہد جدید کے ترک مورخ حکمت بایار نے "ہندوستان تاریخی" جلد دوم صفحہ ۷۱ پر ان واقعات کی تفصیل دی ہے۔

۸؎ صاری عبداللہ آفندی ۔ دستور الانشار۔ قلمی نسخہ سلیمانیہ کتب خانہ نشان ۳۳۲ ورق ۱۴۰ب تا ۱۴۱ا

"دستور الانشاء" کے اس مکتوب کے متن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہی مکتوب ہے جس کا ترجمہ وان ۔ ہیمر نے اپنے اس مضمون کے ساتھ منسلک کیا ہے اور بمشکل ایک جگہ ایک جملہ کی کمی اور آخر میں ایک فقرہ کا اضافہ کیا ہے ۔

"دستور الانشاء" کے بعد ایک اور مجموعہ منشات "بین الدول تواریخ ایدن مکاتیب" میں بھی یہ مکتوب من و عن فارسی متن اور مندرجہ بالا ترکی سرخی کے ساتھ نقل کردہ درج ہے : "بین الدول تواد ایدن مکاتیب" کا یہ نسخہ جو شاہی محل توپ کاپی سرائے استانبول کے کتب خانہ میں نشان ۱۹۲۴ پر محفوظ ہے دستور الانشاء سے زیادہ خوبصورت، خوشخط اور بڑے سائز پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ۔ افسوس کہ اس پر کاتب کا نام، مرتب کا نام، سنہ کتابت وغیرہ کہیں درج نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سلطان نے خاص طور پر اپنے لئے اسے لکھوایا تھا اور شاہی محل کے اس ذخیرہ میں شامل ہے جسے سلطان احمد ثالث نے جمع کیا تھا ۔ ممکن ہے کہ سلطان احمد ثالث نے اسے خاص طور پر تیار کروایا ہو ۔

"متذکرہ بالا دونوں نسخوں میں حسب ذیل متن مع سرخی درج ہے :

"مرحوم سلطان سلیمان خان طاب ثراہ یہ ھندوستان پادشاہی ھمایون شاھدن غلطہ لی سید علی چلبی ایلہ کلان مکتوبدرکہ خواجہ محمود لاری انشاسیلہ در"

تحفۂ دعای کہ ھر سحرگاہ ٥ از منظرۂ نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب ٥ چہرہ کشاید ٥ بلکہ درگاہ وبیگاہ از منصۂ ٥ وما النصر الا من عند اللہ العزیز الحکیم ٥ جلوہ نماید ٥ ایثار ملازمان سدۂ سینۂ عالیحضرت ٥ فلک رفعت ٥ خلافت منصبت ٥ سلیمان حشمت ٥ قطب فلک عظمت و بختیاری ؟

مرکز دایرهٔ ابهت وجهانداری ٥ مؤسس بنیان الاسلام ٥ منصور القواء والاعلام ٥ اصدق السلاطین قولاً وبناءً احق الملوک والخواقین ٥ معاقد العدل والانصاف ٥ هادم الجور والاعتساف ٥ آمر العباد باقامت النفل والفرض المخصوص ٥ هو الذی جعلکم خلایف فی الارض ٥ ملجاء سلاطین زمان ٥ معین خواقین ظفر قرآن ٥

بیت : شهی که نقش نگین جلال شد نامش
کمال یافت خلافت بفر ایامش

نثر: فاتح ابواب الحشمة والسلطنة بمفاتیح الهدایه مالک رقاب الاعادی بمحض التایید ممن له اللطف والعنایة مطلع انوار الهی ٥ زیبندهٔ اورنگ شهنشاهی ٥ ناصر الدین دین المتین ٥ حافظ الشرع المبین ٥ ابو الغازی سلطان سلیمان بهادر خان ٥ لا زالت رایات دولته ٥ مرفوعة الی قمة السماک ٥ رایات عظمته وشوکته مکتوبة علی صفحات الواح الافلاک گردانیده ٥ استعلاءِ مراتب دولت قاهره ٥ وارتقاء مدارج اعیان حشمت باهره را از حضرت واهب العطایا تقدست ذاته ٥ تنزهت صفاته ٥ مستدعی بوده ٥ دوام ایام سلطنت وشهریاری ٥ وخلود عهود خلافت وجهانداری ٥ که متضمن صلاح حال ٥ ونجاح آمال ٥ عباد الله المتعال است ٥ خواهان است ٥ ٥ صحایف آن مراد از دیوان امانی بطغرای ٥ اجیب دعوة الداع اذا دعانی ٥ مطرز و موشح لله الحمد والمنة که ٥ ابواب فتوحات

غیبی ٥ بمفتاح لاهوتی مفتوح گشت ٥ وبتوفیق الله تعالی ٥
دیگربار ٥ سریر سلطنت ٥ و اورنگ خلافت ٥ ممالک هند و
سند ٥ بیمین همت متعالی ٥ منزلت آن پادشاه سلیمان حشمت ٥
مفرّ اقامت ٥ ومستقر استقامت شد ٥ هرچند اتفاق مباسطت
مراسلات ٥ ومفاتحت مکاتبات ٥ بان خلافت منقبت معالی
مکانت نیفتاده ٥ اما تواتر مکارم اخلاق ٥ تظاهر آثار دوستی
وفاق ٥ ومحاسن اشفاق ٥ آن قدوۂ سلاطین آفاق ٥ همواره
محرک ودواعی اشواق ٥ بموافقت مرافقت بوده وهست ٥

بیت : میان کعبه ودل گرچه صد بیابانست
دریچۂ زحرم درسرا چه جانست

نثر : وهمه وقت مکنون ضمیر ٥ ومخزون خاطر خطیر خبیر
آن بود که ٥ ابواب رسل ورسایل مفتوح باشد ٥ وتا غایت
این مضمون از قوت بفعل نیامده بود ٥ وشاهد این مطلوب
ازجملهٔ مقصود ٥ بروفق مامول رخ نمی نمود ٥ درینولا شرافت
مآب ٥ معالی ایاب ٥ مکرمت انتساب ٥ سیّد علی قپودان ٥
که از اخلص خدام عالیمقام است بخدمتی ماموری شده ٥
باجمعی از عسکر مصر بحسب مقدرات الهی ٥ بولایت گجرات
آمده ٥ بعد استماع خبر فتح ممالک بدار الملک جنت حضرت
دهلی رسیده ٥ خبر خجسته از انتظام احوال خیر مآل ٥ واستقامت
ذات بابرکت لازم الاجلال رسانید ٥ ومعلوم شد که ٥
از آن خلاصة الملوک مرخص نشده ٥ بان شرافت مآب ٥

دریاب توقف تکلیف نشده و عازم آن صوب گشته بخاطر
فاتر گذشت که محرک سلاسل اتحاد ومحبت گشته بدین وسیله
سلوک طریق اختصاص نموده شد بناءبرآن لالی شاهوار اعتقاد
در رشته وداد کشیده بوانیت معدن خلوص باطن را چنانچه
شعار محبان خاص است در سلک موافقت ومخالصت انتظام
داده بابلاغ آن ارقام مسند اوقات بابرکات خدام
سپهر احتشام شد ترقب آن مراد چنانست که از آن جانب
نیز کشور اتباط بمقالید اختصاص انفتاح پذیرد و دائم الاوقات
ابواب مخاطبات ومراسلات مفتوح گشته بنیان رفیع الارکان
اتحاد بنوعی استحکام یابد که از شائبه خلل ونقصان محروس
ومصون ماند بزد اید مسند عرضی باشد اعلام خلافت و
عز وعلا در رایات عدالت عالم آرای دراطراف خافقین
مرتفع وخورشید عظمت واجلال از افق دولت بیزوال
طالع ولامع باد بمحمد وآله الامجاد ـ"

مکتوب بالا تاریخ ہند کی اہم ترین دستاویزات میں سے ایک ہے۔ شہنشاہ ہمایوں اور شاہ ایران طہماسپ صفوی کی مراسلت تو تاریخ ہند کے طلباء واساتذہ کے لئے کوئی نئی بات نہیں لیکن سلطان ترکی کے ساتھ متذکرہ بالا خط کے متن کا انکشاف ہندوستان میں آج تک نہ ہوسکا ہے۔ عہد دولت عثمانیہ کے اہم مورخ نشان جی احمد فریدون بے نے سلاطین عالم اور سلاطین ترکی کی باہمی مراسلت کا جو مجموعہ منشات السلاطین کے نام سے مرتب کیا تھا اس میں بھی شہنشاہ ہمایوں کا یہ مکتوب غلط سرخی اور تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ شریک ہے۔ فریدون کے مکتوب کی سرخی حسب ذیل ہے :

شاہ طہماسبدن سید علی قپودان ایلہ کلان نامہ تک صودتیدی

شاہ طہماسب کی طرف سے سید علی کپتان کے ذریعہ آنے والے مکتوب کی نقل ہے[۵۸]۔

اس طرح شاہ طہماسپ والیٔ ایران کا خط ظاہر کرکے فریدون بے نے خط کا متن وہی درج کیا ہے جو یہاں اوپر نقل کیا گیا ہے[۵۹]۔ البتہ تھوڑا سا فرق فریدون[۶۰] نے یہ کیا ہے کہ "ناصر الدین دین المتین حافظ شرع مبین" کے القاب کے بعد سلطان کا نام یعنی "ابوالغازی السلطان سلیمان بہادر خان" حذف کردیا ہے اور مکتوب کی اختتامی عبارت میں "بمحمد و آلہ الامجاد" کی بجائے "بمحمد و آلہ خیر العباد و بحق النون والصاد" لکھا ہے۔ اس مختصر کمی و بیشی کے علاوہ کوئی اور فرق مکتوب کے متن میں موجود نہیں۔

---

[۵۸] احمد فریدون بے۔ مجموعہ منشات السلاطین۔ قسطنطنیہ ۱۲۷۵ھ جلد ۲ صفحہ ۱۷

[۵۹] اس مکتوب کے بعد ہی فریدون نے ایک دوسرا مکتوب سلطان سلیمان کا موسومہ درج کیا ہے جس پر حسب ذیل سرخی ہے: "شاہ طہماسبدن زین الدین سید علی چلپی ایلہ کلان نامہ تک صورتیدر" (شاہ طہماسب کی طرف سے زین الدین سید علی چلپی کے ذریعہ آنے والے مکتوب کی نقل ہے) درحقیقت یہی مکتوب شاہ طہماسپ صفوی کی طرف سے بھیجا ہوا مکتوب ہے جو علی رئیس کے ذریعہ قسطنطنیہ گیا تھا اس کے متن کی تصدیق "دستور الانشاء" میں مندرجہ اس کی ایک اور نقل سے بھی ہوتی ہے۔ دستور الانشاء میں سرخی حسب ذیل ہے:

"سابق الذکر سید علی چلپی ایلہ طہماسب شاہدن کلان نامہ صورتیدر"

[۶۰] فریدون بے عثمانی سلطان مراد ثالث کے دور میں نشانجی کے عہدہ پر مامور تھا اور رستم پاشا وزیر اعظم کا داماد تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فریدون بے نے مکتوب کے متن میں جو کمی بیشی کی ہے وہی وان ہیمر نے بھی کی ہے۔ فریدون بے نے اس خط کو شہنشاہ اکبر کا مکتوب نہیں بتایا لیکن وان۔ ہیمر نے یہ اختراع کی ہے۔ دستور الانشاء اور بین الدول ...... مکاتیب کی واضح سرخیاں بتا رہی ہیں کہ یہ مکتوب شہنشاہ ہمایوں کا مکتوب ہے نہ کہ اکبر اعظم کا۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ مغل۔عثمانی مراسلت کا آغاز ہندوستان میں شہنشاہ ہمایوں نے کیا تھا نہ کہ اکبر اعظم نے۔ وان۔ہیمر اور فریدون دونوں نے کسی ایسے ماخذ سے استفادہ کیا ہے جس کے کاتب نے نقل میں کمی بیشی کر دی تھی۔ جس کے سبب ہندوستان، پاکستان اور یورپ کے محققین کو سخت غلط فہمیاں ہو گئیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ "سلطان ہند نے سلطان ترکی کو خلیفہ تسلیم کیا تھا اور اسی مکتوب کے ذریعہ تسلیم کیا تھا" تو اس مکتوب کا متن بالکل واضح ہے۔ مکتوب میں سلطان سلیمان کے لئے جہاں "عالیحضرت۔ فلک رفعت۔ خلافت منصبت" کے القاب استعمال کئے گئے ہیں۔

شہی کہ نقش نگین جلال شد نامش      کمال یافت خلافت لبفر ایامش

کے شعر میں تعریفاً لفظ خلافت استعمال ہوا ہے یا پھر "خلود عمود خلافت و جہانداری" اور "اعلام خلافت و عز و علا...... طالع و لامع باد" کے الفاظ میں دعا کی گئی ہے وہیں اپنی بادشاہت و سلطنت کے لئے لکھا ہے " دیگر بارہ سریر سلطنت و اورنگ خلافت ہند و سند...... استقامت شدہ" یعنی شہنشاہ ہندوستان خود کو بھی خلیفہ سمجھتا تھا اور "خلافت" کے لفظ کو عام سلطنت یا بادشاہت کے مفہوم میں استعمال کرتا تھا نہ کہ عباسی دور کے مفہوم میں۔ اس لئے یہ تصور صحیح قرار نہیں پاتا کہ شہنشاہ ہمایوں یا شہنشاہ اکبر نے سلطان ترکی کی خلافت کو تسلیم کیا تھا۔ البتہ جو القاب ہمایوں نے سلطان سلیمان کے لئے استعمال کئے وہ اس بات کا اعتراف ہیں کہ سلطان سلیمان اپنے ہم عصر سلاطین کے مقابلے میں دین اسلام کی حفاظت میں پیش پیش ہیں ہمایوں نے اپنے مکتوب میں سلطان

ترکی کے لئے شہنشاہ کا لقب بھی استعمال نہیں کیا تاکہ سلطان سلیمان کی بالادستی تسلیم کر لینے کا شائبہ پیدا نہ ہو۔ اس کے برخلاف ایران کے بادشاہ شاہ طہماسپ صفوی نے اسی سیدی علی رئیس کے ذریعے جو مکتوب سلطان سلیمان کی خدمت میں روانہ کیا تھا سلطان ترکی کو شہنشاہ کے لقب سے مخاطب کیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"بخدمت اعلیحضرت۔ عالی مرتبت۔ متعالی منزلت۔ کردوں بسطت۔ عالی شوکت۔
کیوان وقار۔ فلک اقتدار۔ عالم پناہی۔ شاہنشاہ ظل الہٰی۔ سکندر جاہی۔
خسرو دارای۔ فریدون سریر خاقانی۔ سلیمان شاہ ........ وغیرہ" [۱۱]

البتہ سیدی علی رئیس کی یہ کوشش تھی کہ وہ جن جن سلطنتوں سے گزرتا رہا وہاں کے حکمرانوں کو سلطان سلیمان ذی شان کی بالادستی۔ خلافت یا شہنشاہیت تسلیم کرنے کی ترغیب دیتا رہا۔ علی نے مراۃ الممالک کے آغاز میں سلطان سلیمان کی مدح میں جو اشعار لکھے ہیں وہ اس کی اس خواہش کے بخوبی آئینہ دار ہیں۔

| | |
|---|---|
| دعام اولدور شہ روملک الہٰی | میری دعا ہے کہ الہٰی ہو جائے ایسا شاہ روم پر |
| سعادت برلہ بچسوں سال و ماہی | کامیابی و کامرانی سے گزریں ماہ و سال اس پر |
| آلوٹ فرمان بری خاقانی چیننک | ان کی فرمان برداری میں آجائے شہنشاہیت چین کی |
| مطیعی ہند و سندک پادشاہی [۱۲] | اطاعت گزار ہو جائے سلطنت ہند و سند کی |

---

[۱۱] صاری عبداللہ آفندی۔ دستور الانشاء۔ قلمی نسخہ سلیمانیہ کتب خانہ استانبول ورق ۱۲۱ب تا ۱۲۲ب

[۱۲] مراۃ الممالک۔ قلمی نسخہ کتب خانہ توپ کاپی سرائے استانبول نشان ۱۴۲۵، صفحہ ۱

ڈاکٹر محمد اکرام خاں

# بچّوں کے جذباتی مسائل

موجودہ دَور میں یہ کہنا مشکل ہے کہ زندگی اطمینان اور سکون سے گزر رہی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک پریشان رہتا ہے اور ہر شخص کو زندگی کے سفر میں کسی نہ کسی منزل پر کوئی نہ کوئی دشواری ضرور پیش آتی ہے، اس لئے آجکل یہ کہنا بجا ہوگا کہ زندگی نام ہے تکلیفوں کا، پریشانیوں کا اور دشواریوں کا۔

ہم سب کو زندگی میں طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی کو وقت پر دفتر پہونچنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے تو کسی کو اسکول پہونچنا مشکل ہوتا ہے، کسی کو گھر پر مطالعہ کا وقت نہیں ملتا ہے تو کسی کو اسکول کا کام پورا کرنے سے فرصت نہیں ہوتی ہے، کسی کے بچے نہیں ہوتے ہیں تو کسی کو کثرت اولاد کی وجہ سے پریشانی رہتی ہے، کسی کو شادی کی فکر پریشانی کا باعث ہے تو کوئی شادی کرنے کے بعد خوشی اور آرام کو ترس جاتا ہے۔ غرض یہ کہ زندگی میں ہر شخص کو چھوٹے بڑے، آسان اور مشکل ہر قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان مسائل کو حل کرنا بذات خود ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انسان کی زندگی میں مسائل کبھی ختم نہیں ہوتے ہیں، زندگی اور مسائل کا چولی دام

ڈاکٹر محمد اکرام، لکچرر استادوں کا مدرسہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

کا تعلق ہے۔

## کوئی مسئلہ جذباتی مسئلہ کب بنتا ہے؟

اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم مسائل کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں۔ بعض مسائل معمولی کوشش اور بغیر کسی فکر کے حل ہو جاتے ہیں، بعض مسائل کو حل کرنے کے لئے نہایت صبر اور مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بعض لوگ مسائل کو حل کرنے کی بجائے بے جا فکر اور تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ معمولی سے مسائل کی وجہ سے زندگی بجائے خود وبال جان بن جاتی ہے۔ یہی وہ مسائل ہوتے ہیں جو ہمارے جذبات کو متاثر کرتے ہیں اور انھیں کو جذباتی مسائل کہتے ہیں مثلاً کام کی زیادتی کی صورت میں کام پورا کرنے کی بجائے غصہ ہونا یا مغموم رہنا، رونے لگنا یا بیمار بن جانا یا کام سے متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگوں سے نفرت کرنے لگنا وغیرہ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ مسائل کو حل کرنے میں عقل سے کام نہیں لیتے ہیں اور جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں وہ زندگی سے بددل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ انھیں دوسروں سے حسد اور رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی بیمار بن کر دوسروں کی ہمدردی حاصل کرتے ہیں اور کبھی خفا ہو کر اپنی جذباتی بیماری کو چھپاتے ہیں۔ در اصل ہمیں اپنی شخصی اور سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں کسی نہ کسی حد تک جذباتی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا، مشکل ہو یا آسان، ضروری ہو یا غیر ضروری جذباتی مسئلہ بن سکتا ہے۔ بس اس کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم مسئلہ کو کس طرح دیکھتے ہیں اور اس سے ہم کس قدر متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً حساب کا ایک معمولی سا سوال درج ذیل ہے۔ اس کو حل کرتے وقت جذباتی ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے تاہم یہی سوال اس طالب علم کے لئے جذباتی مسئلہ بن سکتا

ہے جو اس کو قاعدہ کے مطابق حل کرنے سے معذور ہوگا۔ وہ اپنی اس معذوری کو دور کرنے کے لئے اپنے استاد، ماں باپ یا ساتھیوں کی مدد حاصل کرنے کی بجائے غصہ کا اظہار کرے گا یا حساب کی کاپی گم کر دے گا، سر جھکا کر خاموش بیٹھ رہے گا یا کوئی بہانہ تراش کر رونے لگے گا۔

سوال: اگر ۱۰ آدمی کسی کام کو ۶ گھنٹہ روزانہ کام کر کے ۷ روز میں پورا کر لیتے ہیں تو اسی کام کو ۵ آدمی اسی رفتار سے ۱۲ گھنٹہ روزانہ کام کر کے کتنے دن میں پورا کریں گے؟

یا

ایک اور مثال لے لیجئے: آپ کے سالانہ امتحان کا زمانہ قریب ہے۔ امتحان کی تیاری خاطر خواہ نہیں ہوئی ہے۔ آپ کبھی سوچتے ہیں کہ امتحان دیا جائے اور کبھی سوچتے ہیں کہ امتحان نہ دیا جائے۔ اسی شش و پنج میں آپ کا وقت بغیر مطالعہ کے گزرتا رہتا ہے بالآخر امتحان کی تاریخ آجاتی ہے۔ ایسی صورت میں آپ پریشان ہوتے ہیں اور اپنی بیماری کا اعلان کر دیتے ہیں یا اپنے والدین پر ذمہ داری عاید کرتے ہیں کہ وہ آپ کو کچھ عرصہ پہلے سے امتحان کے لئے آمادہ کر لیتے تو اب اپنے ساتھیوں کے ساتھ امتحان دے کر کامیاب ہو سکتے تھے۔ ایسی صورت میں امتحان دینے کا مسئلہ جذباتی مسئلہ بن جاتا ہے۔

کوئی مسئلہ جذباتی مسئلہ اس وقت بنتا ہے جب وہ ہماری قوت فیصلہ اور قوت عمل پر غلط طریقہ سے اثر انداز ہوتا ہو۔ یا اس کی وجہ سے ہم اس طرح عمل کرنے پر مجبور ہوں تو اس سے ہمیں یا ہمارے ساتھیوں کو نقصان پہونچے۔ یا اس کی وجہ سے ہم کمزور یا بیمار محسوس کرنے لگیں یا اس سے ہماری زندگی اور معمولات زندگی میں ایک قسم کا انتشار پیدا ہو جائے۔

## جذبات کی اہمیت:

جذباتی مسائل سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے؟ کیا ہمیں اپنے جذبات کو دبانا چاہئے؟

کیا آپ کی رائے میں وہ لڑکی یا لڑکا زیادہ سمجھدار اور تن درست ہوتا ہے جو کبھی کسی سے محبت نہیں کرتا ہے۔ جس کے احساسات میں شدت نہ ہو، جو دوسروں کا ادب کرتا ہے، جو جھگڑالو نہیں ہے یا جو دوسروں کے جذبات کا احترام کرتا ہے؟ کیا ہمیں اپنے بچوں کو بالکل بے حس اور غیر جذباتی بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے؟ نہیں! اگر ہم اپنے بچوں کو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے صحت مند اور آزاد بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے جذبات کا جائز طور پر احترام کرنا ہوگا۔

## جذبات اور شخصیت کی تعمیر:

شخصیت کی تعمیر میں جذبات کی بہت اہمیت ہے۔ جذبات سے دنیا میں بہت سے کام بنتے ہیں۔ جذبات سے اپنی اور پرائی بستیاں بستی ہیں۔ شوق، محنت، جوش و خروش، اُمنگ، محبت، خوف، فخر اور ہمدردی وغیرہ ایسے جذبات ہیں جن کے بغیر دنیا میں کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دنیا جذبات سے خالی ہے۔ اچھے اور برے دونوں قسم کے کاموں کو انجام دینے میں جذبات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جذبات فی نفسہ بُرے، خطرناک اور ناپسندیدہ نہیں ہوتے ہیں۔ جب کبھی جذباتی مسائل کے متعلق کوئی بات چیت ہوتی ہے تو اس میں جذبات کا کوئی قصور نہیں ہوتا ہے۔ بس مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم جذبات سے کس طرح کام لیتے ہیں یا ہم جذبات سے کس حد تک مغلوب ہو کر مسائل کو اپنے ہی لئے عذاب جان بنا لیتے ہیں۔ مثلاً حساب کے مذکورہ بالا سوال کو مشکل سمجھنے والا طالب علم اپنے احساسِ کمزوری کو دور کر کے حساب میں ماہر اور قابل بن سکتا ہے اور اس کے جذبات مناسب رہنمائی کے بعد زیادہ سے زیادہ سیکھنے اور مہارت حاصل کرنے میں مددگار بن سکتے ہیں۔ سکے کی طرح ہر جذبہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ نفرت کے مقابلہ میں محبت۔ محنت کے مقابلہ

میں کاہلی، تعاون کے مقابلہ میں عدم تعاون، شوق کے مقابلہ میں بدشوقی اور جوش کے مقابلہ میں مردہ دلی پائی جاتی ہے۔ بس سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کو حل کرتے وقت آپ جذبہ کے کس پہلو کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

## جذباتی ہم آہنگی:

ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کے جذبات کو کچل دیا جائے۔ ہمارا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ بچوں کی قدم قدم پر نگرانی کی جائے اور انھیں زندگی کے سفر میں انگلی پکڑ کر چلایا جائے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بچوں کو جذبات کا صحیح طور پر استعمال کرنا سکھایا جائے۔ یا یہ کہ وہ اپنے مسائل کو منطقی طور پر حل کرنا سیکھیں۔ مختصر یہ کہ ہمیں اپنے بچوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

جذباتی ہم آہنگی کی تعریف بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ کیوں کہ ہمارے سماج میں کسی شخص کے لئے ہر موقعہ پر جذبات پر مکمل طور سے قابو پانا یا ان کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنا مشکل کام ہے۔ البتہ جذباتی اعتبار سے تن درست انسان میں مندرجہ ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں:

۱۔ حقیقت پسندی: وہ ہر موقعہ پر اصل مسئلہ کی حقیقت اور اصلیت پر نظر ڈالتا ہے۔ وہ مسئلہ کو اپنی خواہش کے مطابق نہیں بناتا اس کی زندگی میں جب مسائل پیش آتے ہیں تو وہ نہ تو ان سے گھبراتا ہے اور نہ ہی ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ وہ ان سے موجودہ حالات کے تحت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔

۲۔ بلند ہمتی: وہ زندگی میں پیش آنے والی ناکامیوں اور پریشانیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتا ہے نہ کہ ناکامیوں اور پریشانیوں کے وقت بلا وجہ غم و غصہ کا اظہار کرتا پھرے یا بیمار پڑ جائے۔

۳۔ خود اعتمادی: وہ ہر موقعہ پر نہایت بھروسہ اور اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے اور یہ سوچ کر کام کرتا ہے کہ اسے اپنی دنیا خود بسانی اور بسا کر آباد رکھنی ہے۔

۴۔ تعاون: وہ ہر چھوٹے بڑے کام میں بغیر کسی لالچ اور نام و نمود کے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتا اور خوش رہتا ہے

۵۔ اطمینان: اسے کام کرکے اطمینان اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ تعمیری کاموں میں استعمال کرکے اطمینان قلب حاصل کرتا ہے۔

۶۔ محبت: وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی محبت کرتا ہے۔ دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔

۷۔ دور اندیشی: وہ وقتی اطمینان اور خوشی کو آئندہ کی ترقی اور کامیابی پر قربان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ حال اور مستقبل دونوں کو مفید اور کامیاب بنایا جائے۔

جذباتی ہم آہنگی (اور پختگی) کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ بچوں کی نشو و نما پر جذبات کی نشو و نما کے طریقوں کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جذباتی عناصر جسمانی نشو و نما پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ محروم و مغموم بچوں کی جسمانی نشو و نما کی رفتار بامراد اور خوش و خرم بچوں کی نشو و نما کی رفتار کے مقابلہ میں خاصی سست ہوتی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ذہنی خارج قسمت جس کو کسی زمانہ میں جامد اور مستقل سمجھا جاتا تھا بڑی حد تک بچہ کے جذباتی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ جن بچوں کی پرورش اور تربیت مناسب اور موزوں جذباتی ماحول میں ہوتی ہے ان کی ذہنی استعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ جس بچہ کی پرورش اور نشو و نما جذباتی اعتبار سے ٹھیک ہوتی ہے اس کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما بہتر ہوتی ہے۔

### جذباتی نشوونما مشکل کام ہے :

ہم میں سے کسی کی بھی جذباتی نشوونما پورے طور پر صحیح نہیں ہو پاتی ہے۔ آپ کی عمر خواہ چالیس سال ہو یا پچاس سال، آپ سے بچوں کی سی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ خاص طور سے ایسے موقعوں پر جبکہ آپ تھکے ماندہ ہوں، پست ہمت ہوں یا پژمردہ ہوں۔ یہ بات اس اعتبار سے تو اچھی ہے کہ اس سے ہمیں اپنے بچوں کے ان مسائل اور ان مشکلات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن سے انھیں اپنے طالب علمی کے زمانہ میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ہمیں اپنی زندگی کے ان لمحات کو یاد کرنا چاہیئے جب ہم کسی سماجی غلطی پر جذبات سے مغلوب ہو کر لال پیلے ہو جاتے تھے۔ ہمیں اپنی زندگی کے اس دور کو بھی یاد کرنا چاہیئے جب ہم اپنے بعض ساتھیوں کی طرح اچھے کپڑے نہ پہن سکنے کی وجہ سے طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا شکار بن گئے تھے۔ اپنے امتحان یا کسی کھیل کے مقابلہ میں ناکام ہونے پر اپنی بے وقوفی اور کمزوری پر نادم اور نالاں تھے۔ ہم نے کبھی کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہماری اپنے گھر اور سماج میں کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے ہمیں گھر سے بھاگ کر کہیں اور چلا جانا چاہیئے۔ اگر آپ کو اپنی یہ باتیں یاد ہیں تو پھر اپنے بچوں کے اس قسم کے جذبات کو دیکھ کر کیوں افسوس ہوتا ہے۔

آئندہ مضمون میں ہم بچپن کے ان تجربات اور محرکات سے بحث کریں گے جن کی وجہ سے بچے جذباتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس بحث میں یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ ماں باپ اور استاد بچوں کے جذباتی مسائل کو کس طرح حل کریں کہ بچے جذباتی اعتبار سے صحت مند اور جسمانی اعتبار سے توانا بن سکیں۔

ڈاکٹر سید نیر مسعود

# سیّد وقار عظیم کے خطوط
## پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے نام

[پروفیسر سید وقار عظیم کا پچھلے سال ۷ار نومبر کو بدھ کے دن لاہور میں انتقال ہوا، جس کی اطلاع ماہنامہ جامعہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۶ء کے کوائف جامعہ میں شائع ہو چکی ہے۔ موصوف ایک روایت کے مطابق ۱۹۰۹ء میں اور دوسری روایت کے مطابق ۱۹۱۰ء میں یوپی کے ایک مشہور شہر الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے غالباً ۱۹۳۴ء میں بی اے، ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور ۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی ٹی کیا۔ کوئی دو سال (اندازاً ۴۰-۱۹۳۹ء میں) جامعہ کے مدرسہ ثانوی میں اور کوئی پانچ سال (اندازاً ۴۵-۱۹۴۱ء میں) گورنمنٹ پولی ٹکنک دہلی میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کیا، ایک سال سے کم، ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۶ء سے ۱۰ر جولائی ۱۹۴۷ء تک حکومت ہند کے پندرہ روزہ رسالہ "آجکل" (دہلی) کے اڈیٹر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے اور ان کی ہی ادارت میں سرکاری ماہنامہ "ماہ نو" (کراچی) اپریل ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا۔ ۸-۹ مہینے کے بعد اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اردو میں تقرر ہوا اور وہیں سے پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

متعدد کتابوں کے مصنف، مرتب اور مترجم ہیں۔ پہلی کتاب "افسانہ نگاری"

۱۹۳۵ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی تو ادبی حلقوں میں ایک تنقید نگار کی حیثیت سے روشناس ہوئے اور جب "ہمارے افسانے" (۱۹۳۵ء)، "نیا افسانہ" (۱۹۴۷ء) اور "ہماری داستانیں" (۱۹۴۸ء) شائع ہوئیں تو افسانوی ادب کے نقاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، عمر کے آخری دور میں دو کتابوں کی وجہ سے ایک "اقبال معاصرین کی نظر میں" (مشاہیر اردو کے مضامین کا مجموعہ) جو پہلی مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور سے دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی اور دوسری خود ان کے مضامین کا مجموعہ "اقبال ـــــ شاعر اور فلسفی" شائع ہوئی تو "اقبالیات" میں عزت و مرتبہ حاصل ہوا۔

مرحوم کی پہلی کتاب "افسانہ نگاری" میں ـــ جس کا نام ۱۹۴۹ء میں تبدیل ہوکر "فن افسانہ نگاری" ہو گیا، پروفیسر مسعود حسن ادیب (۱۸۹۳ــ ۱۹۷۵ء) کا ایک تعارف شامل تھا، جو بعد میں الگ کر دیا گیا۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب مرحوم سے خط و کتابت اسی پیش لفظ کے سلسلے میں شروع ہوئی۔ ہم فاضل مکتوب الیہ کے صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ان خطوط کی نقل بھیجکر قارئین جامعہ کو ان سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ عبداللطیف اعظمی

(۱)

۲۷۲ـ کٹرا۔ الہ آباد

مخدوم مکرم

کتاب کے چار باب آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ باقی باب آپ کے پاس ہیں۔ ان بابوں کی ترتیب حسب ذیل ہو گی۔

(۱) افسانے کی حقیقت (۲) افسانے کا پلاٹ (۳) افسانے کی سرخی (۴) ابتدا اور انتہا (۵) کردار نگاری (۶) افسانے کی فنی ترتیب (۷) حقیقت اور افسانہ (۸) محبت اور

افسانہ (۹) افسانہ نگار کا نقطۂ نظر (۱۰) اتحادِ اثر۔

چار باب میں بھیج رہا ہوں ۔ باقی چھ وہیں موجود ہیں۔ امید ہے کہ اب آپ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں سے فارغ ہو چکے ہوں گے ، اور کتاب کا کچھ حصہ پڑھ لیا ہو گا۔ میں نے پہلے اور دوسرے باب کی کتابت کروالی ہے اور یہ دونوں حصے پریس جا چکے ہیں۔ تیسرے باب کی نقل میرے پاس موجود ہے ۔ اس کی کتابت آج ختم ہو جائے گی۔ کل سے چوتھے اور پانچویں باب کی کتابت ہوگی۔ آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی لیکن اگر آپ یہ دونوں باب مجھے بواپسی ڈاک ارسال فرمادیں تو کام میں آسانی ہو جائے ۔ چھٹے باب کی نقل بھی میرے پاس موجود ہے ۔ جب تک اس کی کتابت ہو گی اس وقت تک یقین ہے کہ آپ پیش نامہ لکھ چکیں گے اور باقی باب میرے پاس آجائیں گے۔

کتاب کے دوسرے حصے کی کتابت ایک دوسرا کاتب کر رہا ہے ۔ اس کی تقسیم حسب ذیل ہوگی:

(۱) ہمارے افسانوں کی ابتدا اور ارتقا (۲) ہمارے افسانوں میں عورت (۳) اصلاحی مقصد (۴) ترجمے (۵) ہمارے افسانہ نگار

اس کا زیادہ حصہ آپ کے پاس موجود ہے ۔ میں کتابت کے بعد پہلا حصہ بھی فوراً ارسالِ خدمت کر دوں گا ۔

میں نے جن بابوں کے متعلق لکھا ہے وہ آپ خط ملتے ہی بھیج دیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔ زحمت دہی کی معافی چاہتا ہوں ۔ والسلام ۔ محمد حسین[1] صاحب کی خدمت میں آداب

خادم

وقار

---

[1] لکچرر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی

نوٹ:

جن بابوں کی مجھے ضرورت ہے ان میں سے پہلا یعنی ابتدا اور انتہا دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ 'یادگار' کے چھپے ہوئے اوراق پر مشتمل ہے (افسانے کی ابتدا) اور دوسرا حصہ خود میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی سرخی ہے "افسانے کا خاتمہ"۔ پانچویں باب کی سرخی 'کردار نگاری' ہے

وقار

(۲)

ع۱ نصر اللہ ہاسٹل۔ مسلم یونیورسٹی

۷/فروری [۱۹۳۸ء]

مخدومی۔ آداب عرض

بڑے دن میں حاضر خدمت ہوا تھا لیکن نیاز نہ حاصل ہو سکا۔ نیساں[۲] کی ایک کاپی نوکر کو دے آیا تھا۔ امید ہے کہ مل گئی ہوگی۔

میں آج کل علی گڑھ میں ہوں۔ بی۔ ٹی کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے بعد بھی معلوم نہیں کہ کیا ہوگا۔ اب بیکاری سے تنگ آچکا ہوں۔ آج ایک صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں اردو کا ایم۔ اے کھل رہا ہے۔ خدا جانے یہ خبر کہاں تک صحیح ہے۔ خدا کرے صحیح ہو۔ میں مدتوں سے اس دن کا منتظر ہوں کہ کسی طرح آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع نصیب ہو۔ لکھنؤ میں آپ کے اور محمد نواب[۳] صاحب کے سوا میرا کون ہے۔ میں نے آج ان کی خدمت میں بھی خط لکھا ہے۔ آپ سے بھی یہ درخواست ہے کہ

---

۲؎ الہ آباد یونیورسٹی کا اردو میگزین

۳؎ محمد حسین صاحب کا عرف

مجھے مشورہ دیجئے کہ میں اس سلسلے میں کیا کروں ۔ میں آج کل بے حد مصروف ہوں ، ورنہ خود حاضرِ خدمت ہوتا۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

خادم وقار

(۴)

آج کل ۔ ۱۵۔ راج پور روڈ۔ دہلی

یکم نومبر

مکرم و محترم ۔ آداب نیاز

میں بارہ بنکی اور الہ آباد ہوتا ہوا کل دہلی واپس آیا۔ یہ عریضہ "میر کے لطیفے" کی یاد دہانی کے لئے لکھ رہا ہوں ۔ مجھے آپ کی انتہائی مصروفیت کا احساس ہے ، اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ خط لکھ دوں تاکہ آپ تھوڑا سا وقت نکال کر منشی جی سے اُن صفحات کی نقل کروا دیں۔

مرزا محمد عسکری[۴] صاحب کے سلسلے میں آپ سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ ادھوری رہ گئی ۔ میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ اُن پر کچھ لکھیں ۔ جلدی نہ سہی تو تین چار مہینے کے اندر سہی ۔ یہ مضمون میں سالنامے میں شامل کرلوں گا ۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

خادم

وقار

---

[۴] مترجم تاریخ ادب اردو، مؤلف ادبی خطوط غالب اور نوادر وغیرہ

(۴)

آج کل - ۱۵ - راج پور روڈ - دہلی

۲۵ر نومبر [۱۹۴۶ء]

استادِ مکرم تسلیم

خیال تھا کہ آپ جامعہ کی جوبلی میں ضرور تشریف لائیں گے، لیکن شاید موجودہ حالات کی وجہ سے ارادہ بدل دیا۔

امید ہے کہ آپ نے "میر کے لطیفے" کی نقل کروالی ہوگی۔ میں ایک مرتبہ لاہور جاچکا ہوں۔ ہفتے عشرے میں پھر جانے کا خیال ہے۔ اگر مضمون اس سے پہلے مل جائے تو میں خالی جگہوں کو بھر لاؤں۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ حدِ ادب

خادم

وقار

(۵)

آج کل - ۱۵ - راج پور روڈ دہلی

۲۴ر دسمبر

استادِ مکرّم و محترم - تسلیم

میں نے آج صبح آپ کو خط لکھا تھا۔ دوپہر کی ڈاک سے رجسٹری مل گئی۔ شاید پہلا خط ابھی ڈاک میں بھی نہ پڑا ہو۔ میں نے دونوں چیزیں دیکھ لیں۔ غالب کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور کام کا بھی۔ میر کے لطیفوں کے سلسلے میں جو ہدایات آپ نے دی ہیں ان پر عمل کروں گا۔ توجہ اور عنایت کے لیے حد درجہ ممنون ہوں۔

حدِ ادب - خادم

وقار عظیم

عماد الحسن آزاد فاروقی

# مثنوی معنوی کا قدیم ترین نسخہ؟

جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، مولانا رومؒ سے دلچسپی اور عقیدت رکھنے والوں کے لئے ایک معروف ہستی بن چکے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں آپ نے مثنوی مولانا رومؒ کا سلیس اردو ترجمہ کرنے اور اس کو مع متن اعلیٰ درجہ کی کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کروانے کی جو مہم اپنے سرلی ہے اس نے مولانا رومؒ کے شائقین میں خصوصاً اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں عموماً آپ کی حیثیت مسلّمہ طور سے قائم کردی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ترکی نے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۶ء سے مولانا رومؒ پر ہونے والے سیمینار میں شرکت کے لئے آپ کو قونیا (ترکی) آنے کی دعوت دی اور آپ دسمبر ۱۹۷۶ء میں ترکی تشریف لے گئے۔ سیمینار میں شرکت کے سلسلے میں آپ کا تقریباً آٹھ روز قونیا میں بالکل مولانا رومؒ کے مزار شریف سے متصل ہوٹل میں قیام رہا اور آپ نے اس بابرکت ماحول سے پورا استفادہ کیا۔ ترکی اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کے اس سفر کی روداد جناب قاضی سجاد صاحب کسی اور موقعہ پر پیش کریں گے، فی الحال اس وقت مثنوی مولانا رومؒ کے ایک نادر نسخہ کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے جو کہ مزار شریف سے

---

جناب عماد الحسن آزاد فاروقی، لکچرر شعبۂ اسلامک دعرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ۔ دہلی۔

متصل مولانا رومؒ سے متعلق میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔

ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کے فوجی انقلاب کے بعد سے مولانا رومؒ کی درگاہ شریف اور اس سے متعلقہ امور کا انتظام حکومت ترکی نے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت ترکی نے یہ بھی اقدام کیا تھا کہ مولانا رومؒ کے سلسلے میں جو بھی نوادر درگاہ شریف یا ترکی میں موجود تھے ان کو اکٹھا کر کے مزار شریف سے متصل ایک میوزیم میں محفوظ کر دیا تھا۔ جناب قاضی سجاد حسین صاحب نے اپنے حالیہ قونیا کے قیام کے دوران مزار شریف کے علاوہ اس میوزیم کی بھی زیارت کی جہاں دوسرے نوادر کے ساتھ مثنوی شریف کا بھی ایک نایاب نسخہ محفوظ ہے۔ یہ نسخہ جو کہ شیشے کی ایک الماری میں محفوظ ہے، مولانا رومؒ کے بڑے صاحبزادے سلطان ولدؒ کے ہاتھ کا ۱۳۲۳ء کا رقم کردہ بتلایا جاتا ہے اور اس لحاظ سے ترکی کے علماء اور میوزیم کے منتظمین کی رائے میں یہ مثنوی مولانا رومؒ کا سب سے قدیم اور مستند ترین نسخہ ہے۔ نسخہ کا پہلا صفحہ جو شیشے کے اندر کھلا ہوا رکھا تھا فنِ خطاطی کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ متن کے چاروں طرف حاشیے پر بیل بوٹوں کی سجاوٹ کا نہایت عمدہ کام بھی کیا ہوا ہے۔ خطاطی اور دستکاری کی اس مہارت کے پیش نظر ترکی کے علماء اور منتظمین میوزیم کا یہ دعویٰ غور طلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود سلطان ولدؒ کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔ بہرحال یہ نسخہ میوزیم میں نسخۂ سلطان ولدؒ کے نام سے معنون ہے اور ان کے نزدیک اس کا تعلق سلطان ولدؒ سے متیقن ہے۔ اس صورت میں یہ نسخہ مثنوی مولانا رومؒ کا قدیم ترین اور مستند ترین نسخہ سمجھا جائے گا۔ اس نسخہ کے پہلے صفحہ پر جو کھلا ہوا تھا تقریباً ۲۲ اشعار تحریر تھے جو ہندوستان میں چھپے ہوئے مثنوی مولانا رومؒ کے مشہور نسخوں سے کہیں کہیں اختلاف رکھتے ہیں۔

ذیل میں مثنوی شریف کے مستند ہندوستانی نسخوں اور نسخۂ سلطان ولدؒ کے پہلے بائیس اشعار میں جو اختلافات ہیں ان کو پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں محمود المطابع کانپور کا چھپا ہوا مثنوی مولانا روم کا نسخہ مستند ترین اور اور مقبول عام نسخوں میں سے سمجھا جاتا ہے۔ مقابلہ کے لئے ہم نے پہلے بائیس اشعار اسی نسخہ سے نقل کئے ہیں۔ ہندوستان کے صحیح ترین نسخوں کے مطابق مثنوی معنوی کا پہلا شعر اس طرح ہے؛

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　　وز جدائیہا شکایت می کند

سلطان ولد کے نسخے میں پہلے مصرعے میں بجائے 'از' کے 'این' بجائے 'حکایت' کے 'شکایت' ہے اور دوسرے مصرعے میں 'وز' کی جگہ 'از' ہے اور بجائے 'شکایت' کے 'حکایت' ہے۔ اس طرح سلطان ولد کے نسخے کے مطابق پہلا شعر یوں ہے:

بشنو این نے چوں شکایت می کند　　　　از جدائیہا حکایت می کند

ہندوستانی نسخوں کا دوسرا شعر ہے:

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سلطان ولد کے نسخے کے مطابق اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بجائے 'از' کے 'در' ہے۔

ہندوستانی نسخوں کا پانچواں شعر ہے:

من بہر جمعیتے نالاں شدم　　　　جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم

سلطان ولد کے نسخے کے اعتبار سے دوسرے مصرع میں پہلے 'بدحالاں' آیا ہے اس کے بعد 'خوشحالاں' ہے

ہندوستانی نسخوں کے مطابق چھٹا شعر اس طرح ہے:

ہر کسے از ظنِ خود شد یار من　　　　وز درون من نہ جست اسرار من

سلطان ولد کے نسخے میں دوسرے مصرع کے اندر 'وز' کی جگہ 'از' آیا ہے۔

ہندوستانی نسخوں کے چودھویں شعر

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　　یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے

سے لے کر سترھویں شعر

دمدمہ ایں نائے از دمہائے اوست　　　ہائے ہوئے روح از ہیہائے اوست

تک کے چار اشعار سلطان ولد کے نسخہ میں موجود نہیں ہیں۔

ہندوستانی نسخوں کا اٹھارواں شعر ہے:

محرم ایں ہوش جز بیہوش نیست　　　مرزباں را مشتری چوں گوش نیست

سلطان ولد کے نسخہ کے مطابق اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بجائے 'چوں' کے 'جز' کا لفظ آیا ہے۔

ہندوستانی نسخوں کے پہلے بائیس اشعار میں مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ دوسرے اشعار سلطان ولد کے نسخے کے پہلے صفحہ پر منقول بائیس اشعار کے مطابق ہیں۔

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے میوزیم کے کارکنان سے استدعا کی ہے کہ حکومت ترکی کی مدد سے سلطان ولدؒ کے اس نسخہ کو چھپوانے کا انتظام کیا جائے۔

# کوائفِ جامعہ

## ڈاکٹر ذاکر حسین کی آٹھویں برسی

سابق امیر جامعہ اور صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی آٹھویں برسی کے موقع پر اساتذہ و کارکنان جامعہ اور معززین شہر نے حسب سابق مرحوم کے مزار پر اور خواتین نے ان کے مکان پر کئی قرآن ختم کیے اور مرحوم کے لیے دعائیں کیں۔ اس کے علاوہ قائم مقام راشٹرپتی جناب بی ڈی جتی نے عقیدت کے پھول چڑھائے اور ڈاکٹر ذاکر حسین میوزیم دیکھا۔ اس سادہ مگر پُروقار تقریب میں جامعہ کے اساتذہ، حیاتی اراکین اور کارکنوں کے علاوہ جن لوگوں نے شرکت کی، ان میں مرحوم کے عزیزوں میں بیگم ذاکر حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جناب خورشید عالم خاں، مرحوم کی بڑی صاحبزادی محترمہ سعیدہ خورشید اور معززین شہر میں جناب کرنل بشیر حسین زیدی، سردار بوٹا سنگھ سابق ڈپٹی منسٹر ریلوے، جناب رادھا رمن جی سابق چیف اکزکیٹو کونسلر، جناب میر مشتاق احمد سابق چیرمین میٹرو پولٹن کونسل اور مرحوم کے پی اے جناب جگن ناتھ سہائے قابل ذکر ہیں۔

جناب ایچ این بہوگنا مرکزی وزیر برائے پیٹرولیم، فرٹی لائیزر اور کیمیکلس اپنی علالت کی وجہ سے نہ آسکے، مگر ان کی بیوی صبح سویرے تشریف لائیں اور اپنی طرف سے اور بہوگنا صاحب کی طرف سے مزار پر گلدستہ پیش کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ صاحبزادہ مستحسن فاروقی صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت کلیم اللہ نے ہرے رنگ کی بہت خوبصورت چادر پیش کی۔

# شاعری اور شعری پیکر ــــــ ایک توسیعی خطبہ

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب نے ۱۴ اپریل کو "شاعری اور شعری پیکر" کے عنوان سے جامعہ ملیہ میں ایک توسیعی لکچر دیا، جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے کی۔ موصوف نے اپنے خطبے کا آغاز ان الفاظ میں کیا کہ: "شاعری اور شعری پیکر پر گفتگو، نقطۂ آغاز کے طور پر، ہمیں بعض مسلمات کی طرف توجہ دلاتی ہے، کیونکہ ہر موضوع کا تعلق ایک بنیادی استفسار سے ہے، ان مسلمات میں شعری عمل اور زبان کے شعری استعمال یعنی اس کی اظہاریت کی مخصوص شکل کو بڑا دخل ہے۔" شعری پیکر کے بارے میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے، موصوف نے فرمایا کہ: شعری کائنات میں جس عنصر کو ڈھانچے (STRUCTURE) کے نام سے منسوب کرتے ہیں، وہ دراصل باہمی رشتوں کی کلیت (TOTALITY) ہے۔ اگر ڈھانچے میں بالفرض سخت گیر اکائیاں موجود بھی ہوں، تب بھی ان کے درمیان ایک نرم محور (SOFT FOCUS) بھی ہوتا ہے اور شعری اظہار کی کونپلیں اس نرم محور کے اندر سے پھوٹتی ہیں ..... شعری اظہار کی سب سے بڑی خصوصیت ایک نوع کا ابہام (AMBIGUITY) ہے، یعنی اس سے مفاہیم کی نہ حد بندی کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی رسائیوں کو ناپا جاسکتا ہے.... شعری ڈھانچہ آپس میں گتھی ہوئی بہت سی اکائیوں سے ترتیب پاتا ہے، جنھیں لفظی، صوتی، محاکاتی اور مابعد الطبیعاتی اکائیوں کے نام سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔" خطبے کے آخر میں فرمایا کہ: "شعری پیکر کی تحقیق کا مقصد محض دیدہ زیب تحریروں کا نقش کرنا اور انھیں آویزاں کرنا نہیں ہے، بلکہ تجربے کے انضباط میں مدد دینا اور تجربے کا یہ انضباط وسیلہ بنتا ہے، حقیقت کے باہمی رشتوں کے ادراک کا۔ یہ ادراک اور تفہیم قدر کے احساس، یا معنویت کے احساس سے گہرے طور پر مربوط ہے۔ شاعری دریافت کا عمل ہے، اس کا مقصد نہ خیالات کا پیش کرنا ہے اور نہ جذبات و احساسات

کی ترسیل بلکہ اس نقطۂ ارتکاز کا نمایاں کرنا جہاں یہ دونوں متحد ہو جاتے ہیں... شاعری میں نہ تصور کی فی نفسہٖ کوئی اہمیت ہوتی ہے اور نہ تند و تیز اور غیر پختہ جذبات کو۔ یہاں پختگی، تطہیر اور تنظیم تینوں کا ہونا ضروری ہے اور اس کے لئے شاعر کے ادراک کا ڈھانچہ ایک معمول فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے سے عمل اپنے اتمام کو پہنچتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک وحدت اور UNIFYING عنصر کی سی ہے۔ اگر شعری کارنامے کو ایک موناد (MONAD) تصور کیا جائے جو قائم بالذات ہے اور اگر اس کے لئے کسی جواز کی ضرورت ہو سکتی ہے تو یہ جواز خارجی استشاروں (REFRENCES) کی بجائے شعری پیکروں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

مقالے کے بعد، صدر جلسہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اپنی تقریر میں صاحب مقالہ اور مقالے کی تعریف کرنے کے بعد اصل موضوع بحث پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب نے شعری پیکر پر ایک فکر انگیز مقالہ پیش کیا ہے مگر لسانیات کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ ضرور سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعری پیکر کا مطلب کیا ہے۔ اسلوب صاحب نے اپنے مقالے میں غالب اور اقبال سے اس کی جو مثالیں دی ہیں، ان میں ایک لفظ بھی ہے، مثلاً "آنکھ" یا "آئینہ"، ایک مصرع بھی، ایک شعر بھی اور ایک پوری غزل بھی، جیسے غالب کی ایک طویل غزل بطور مثال کے پیش کی ہے، چراغاں کیے ہوئے، مژگاں کئے ہوئے، نمکداں کئے ہوئے وغیرہ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زبان مسلسل انکشاف ہے اور ادبی زبان قواعد سے مسلسل انحراف ہے، جس زبان میں جس قدر قواعد سے انحراف کی قدرت ہو گی، اسی قدر اس کی شاعری میں یہ صلاحیت ہو گی کہ زبان کی گہرائیوں میں اتر کر انسان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ زبان عبارت ہے نارم سے اور فارم کے پیچھے ایک گنجینۂ معانی پنہاں ہے جو کائنات کے رموز سے معانی کی نئی دنیا کا انکشاف کرتا ہے۔ زبان اتنی ہی گہری ہے جتنی کہ کائنات۔

لفظ و معانی کا رشتہ وہی ہے جو مادہ اور روح کا۔ اگر ایک حقیقت کے دو پہلو ہیں تو دوسرا بھی۔ زبان اظہار بھی ہے اور امکان بھی۔ عام سطح پر زبان اظہار ہے۔ خاص اور انفرادی سطح پر یہ امکانات معانی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نقد ادب کا اصل حق، ناقد ادب کو پہونچتا ہے، لیکن ناقد ادب کے ارشادات و فرمودات میں وزن آتا ہے لسانی بصیرت سے۔

شروع میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبۂ اردو نے صاحب مقالہ کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا کہ: "پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا شمار ہمارے ان نقادوں میں ہوتا ہے جن کی تحریریں نظر کی جامعیت، معلومات کی روشنی اور رائے کے توازن کی وجہ سے دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ تربیت کے اعتبار سے انگریزی ادبیات کے ماہر ہیں، اسی وجہ سے اردو میں ان کا تنقیدی رویہ بین لسانی اور بین ادبیات بھی ہے۔ اگرچہ اردو میں ادبی تنقید کا وجود مغربی اثرات کی دین ہے، مگر پروفیسر اسلوب احمد انصاری ان نقادوں میں سے نہیں ہیں جو مغربی روشنی سے اتنے مرعوب ہوں کہ اپنے ادبی سرمایے کی ہر چیز فرومایہ اور حقیر دکھائے دینے لگے۔ اسلوب صاحب ایک انتخابی ذہن کے مالک ہیں وہ اپنی تنقید میں مختلف علوم سے مدد لیتے ہیں اور ان کے یہاں نظر کی موضوعیت کے ساتھ ساتھ معروضی اور سائنسی رویہ بھی ملتا ہے۔"

## انیسویں صدی میں شمالی ہند کے ادب میں فکری انداز

۱۵ اپریل کو دہلی میڈیول ہسٹری سوسائٹی کے تعاون سے شعبۂ تاریخ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے کی اور فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ سائنسز کے ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی اور صدر شعبہ پروفیسر اظہر اصغر انصاری کے علاوہ دوسرے اساتذہ نے شرکت کی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن صدر شعبۂ اردو

جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے پیش نظر عنوان پر ایک فکر انگیز مقالہ پڑھا۔ مغل سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد ملک میں جو صورت حال پیش آئی اس میں خاص طور پر انیسویں صدی کے اواخر میں ادیبوں اور شاعروں نے جس طرح اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اس پر صاحب مقالہ نے تفصیل سے بحث و گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا کہ انیسویں صدی کے شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنی بے بسی، بے اطمینانی اور مایوسی کا اظہار کیا۔ حاتم، نظیر اکبر آبادی، سودا، میر تقی میر کے دیوان یاسیت اور حسرت کے جذبات سے پر ہیں، قائم چاند پوری نے تو کھلے بندوں شاہ عالم پر نااہلی اور رشوت ستانی کا الزام لگایا ہے۔ نثر نگاروں نے قصۂ لیلیٰ مجنوں (۱۸۰۰)، فسانۂ عجائب (۱۸۲۴) اور قصۂ گل وصنوبر (۱۸۴۲) وغیرہ لکھکر اپنا حق قلم ادا کیا۔ اودھ کی دوعملی حکومت کی الجھنوں نے داستان امیر حمزہ (۱۸۰۱) اور ایک نئے صنف، مرثیہ گوئی کی بنیاد ڈالی، دوسری طرف زبان کی تشکیل پر دیہاتی اثر غالب آنے لگا، اودھی اور برج بھاشا کا رواج عام ہونے لگا، مولانا عبدالحلیم شرر کے پایہ کے ادیب و شاعر یورپ کی سائنسی ترقی سے بیحد متاثر ہوئے، بنگالی میں راجہ رام موہن رائے اور دوسرے مصلحین قوم پیدا ہوئے، ہندی میں بھارتیندو ہریش چندرا اور پنجابی میں ویر سنگھ نے غدر کے بعد کی یاسیت و محرومیت کو قلم بند کیا اور غالب اور شرر کی طرح گذشتہ عظمت کی یاد تازہ کر کے اپنی پستی پر آنسو بہائے، صرف غالب نے موجودہ تاریکی سے نکلنے اور نئی روش کو اختیار کر کے حالات پر قابو پانے کا سبق دیا، سرسید نے علی گڑھ کالج قائم کر کے عام مسلمانوں میں انگریزی زبان اور مغربی تہذیب و تمدن کو رواج دینے کی کوشش کی۔

آخر میں شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں منجملہ اور باتوں کے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ مقالے میں اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری

زبانوں کے رجحانات کے بارے میں بہت ہی اجمالی طور پر ذکر آیا ہے۔ مقالے سے پہلے جلسے کی کنوینر ڈاکٹر حمیدہ خاتون نقوی ریڈر شعبۂ تاریخ جامعہ نے دہلی میڈیول سوسائٹی کے تعارف میں، جس کے تعاون سے یہ جلسہ منعقد کیا گیا تھا، فرمایا کہ اس نوزائیدہ سوسائٹی کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

(۱) دہلی کے ان اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبار کے لئے جن کا مضمون عہد وسطی کی تاریخ ہو، ایک فورم مہیا کرنا (۲) دہلی کے بعض خاندانوں میں عہد وسطی سے متعلق مخطوطات یا ملفوظات یا مکتوبات یا مطبوعات کے ذاتی ذخیرے موجود ہیں، ان کی ایک توضیحی فہرست مرتب کرنا (۳) عہد وسطی کا ۱۲۰۶ء سے ۱۸۰۰ء تک کا ایک دہلی نامہ تیار کرنا (۴) ایک سالانہ رپورٹ شائع کرنا جس میں سوسائٹی کی کارروائیوں کے علاوہ وہ مقالے بھی شائع کئے جائیں جو اس کے جلسوں میں پڑھے جائیں۔

آخر میں پروفیسر اظہر اصغر انصاری صدر شعبۂ تاریخ نے صدر جلسہ پروفیسر مسعود حسین، جناب ضیاء الحسن فاروقی ڈین، مقالہ نگار ڈاکٹر محمد حسن، بنگلہ دیش کے تاریخ داں ڈاکٹر محمود اور دیگر حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

## مسلم مسائل پر غور کرنے کے لیے مجلس مذاکرہ کا قیام

پچھلے سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ" کے عنوان سے جو چار روزہ سمینار منعقد ہوا تھا، اس کی کامیاب اور مفید بحثوں کے پیش نظر بعض اساتذۂ جامعہ نے خاص طور پر جن کو اسلامی موضوعات اور مباحث سے دلچسپی ہے: شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز کے صدر پروفیسر مشیر الحق کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مستقل فورم یا مجلس مذاکرہ قائم کی جائے جس میں مسلم اور اسلامی مسائل پر مقالے پڑھے جائیں اور ان پر کھل کر بحث و گفتگو کی جائے۔ موصوف نے فیکلٹی کے ڈین جناب ضیاء الحسن

فاروقی اور اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد اس سال کے شروع میں مجلس مذاکرہ کے قیام کا اعلان فرمایا، چنانچہ پچھلے چار مہینوں میں حسب ذیل چار مقالے پڑھے گئے ہیں اور ان پر پوری آزادی مگر انتہائی نظم وضبط کے ساتھ بحث وگفتگو کی گئی ہے:

(۱) سرسید کا مذہبی فکر ان کی تفسیر کی روشنی میں از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی

(۲) مسلم دانشور اور فکر اسلامی از جناب ضیاء الحسن فاروقی

(۳) انسان کی وجودی کیفیت: مولانا روم اور سری راما کرشنا کی نظر میں از جناب عماد الحسن آزاد فاروقی (۴) اسلام میں اقتدار اعلیٰ کا تصور از ڈاکٹر ماجد علی خاں

اس مجلس مذاکرہ کے کنوینر، شعبے کے ایک ریڈر ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ہیں۔

## پاکستان کے چند ادیب جامعہ میں

پاکستان کے ممتاز افسانہ نگار جناب انتظار حسین کے اعزاز میں، ۹ اپریل کو شعبۂ اردو میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں جامعہ کے اساتذہ اور طلباء کے علاوہ شہر کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی۔ انتظار حسین صاحب کے ساتھ پاکستانی ٹیلیویژن کے ڈرامہ نگار اور پنجابی زبان کے شاعر جناب منیر حسین، جن کا قلمی نام منو بھائی ہے اور پاکستان کے ایک نوجوان شاعر جناب ریاض مجید بھی تشریف لائے تھے۔ انتظار حسین نے اپنی ایک کہانی "پرچھائیں" اور ریاض مجید نے کچھ نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ منو بھائی سے پاکستان کی ادبی صورت حال پر کچھ روشنی ڈالنے کی درخواست کی گئی تھی، مگر انھوں نے فرمایا کہ میں پنجابی کے علاوہ اردو میں نظمیں کہتا ہوں، اس لیے انھوں نے ایک نظم سے محظوظ فرمایا۔ شروع میں شعبے کے ریڈر ڈاکٹر شمیم حنفی نے انتظار حسین کے فن پر ایک تاثراتی اور تنقیدی مضمون پڑھا جس میں موصوف نے فرمایا کہ: "منٹو کے بعد انتظار حسین اردو افسانے کا سب سے زیادہ متنازع فیہ نام ہے۔" یہ مضمون ماہنامہ "آج کل" کے مئی کے شمارے میں چھپ گیا ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی صدارتی تقریر میں انتظار حسین کی افسانہ نگاری کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ: انتظار حسین اس وقت پاکستان میں سپہر افسانہ کے سب سے تابناک ستارہ ہیں اور تقسیم کے بعد ابھرنے والے ہندوستانی ادیب پاکستان کے جس افسانہ نگار کو سب سے زیادہ محبت اور عزت کے ساتھ یاد کرتے ہیں وہ انتظار حسین ہیں۔

# تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

**پوشکن** (زندگی اور فن کا مطالعہ) از ڈاکٹر ظ انصاری

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۲۳۲ صفحات، غیر مجلد، قیمت بارہ روپے، پہلا ایڈیشن: ۱۹۷۶ء

**چے خف** (زندگی اور فن کا مطالعہ) از ڈاکٹر ظ انصاری

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۱۲۹ صفحات، غیر مجلد، قیمت: گیارہ روپے، پہلا ایڈیشن: ۱۹۷۶ء

**تالستائے** (زندگی اور فن کا مطالعہ) از ڈاکٹر محمد لیٰسین

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۱۵۲ صفحات، غیر مجلد، قیمت: سوا نو روپے، پہلا ایڈیشن: ۱۹۷۶ء
مذکورہ بالا تینوں کتابوں کا ناشر: ترقی اردو بورڈ، حکومت ہند۔
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

پوشکن (۱۷۹۹ـ۱۸۳۶)، چے خوف (۱۸۶۰ـ۱۹۰۴) اور تالستائی (۱۸۲۸ـ۱۹۱۰) نہ صرف روس کے اہم ترین ادیبوں میں سے ہیں بلکہ دنیا کے ادیبوں میں ان کو اونچا مقام حاصل ہے اور اردو ادب پر ان کی گہری چھاپ ہے، مگر افسوس کہ ان کے بارے میں اردو میں کوئی اچھی اور معیاری کتاب نہیں تھی۔ سب سے پہلے اس طرف پروفیسر محمد مجیب صاحب

نے توجہ کی اور روسی ادب پر ایک مستند اور مبسوط کتاب لکھی جس کا بیشتر حصہ ۱۹۳۰ء میں لکھا جا چکا تھا، مگر نظرثانی کے بعد ۱۹۴۰ء میں دو حصوں میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بھرپور ہے، مگر اس میں صرف انقلاب روس تک کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہے، تیسرے حصہ میں زمانۂ انقلاب اور مابعد کے ادیبوں پر لکھنے کا ارادہ تھا، مگر کئی وجہوں سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ چند سال پیشتر جناب ظ انصاری صاحب نے ماسکو سے مجھے لکھا تھا کہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے کہئے کہ وہ تیسری جلد بھی لکھ دیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ پچھلے ۳۰۔۳۵ سال کے عرصے میں روسی ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اتنی نئی چیزیں دریافت ہوئی ہیں کہ دونوں جلدوں پر نظرثانی اور تحشیہ کی ضرورت ہے۔ جب میں نے مجیب صاحب تک یہ پیغام پہنچایا تو انھوں نے فرمایا کہ آجکل مجھے بالکل فرصت نہیں ہے، زیادہ بہتر ہوگا کہ ظ انصاری صاحب خود یہ دونوں کام انجام دیدیں۔ مجیب صاحب کے احترام میں نظرثانی اور حاشیہ نگاری کا کام تو وہ نہ کر سکے، مگر پوشکن اور چیخوف پر دو مختصر کتابیں لکھ دیں، چونکہ وہ روسی زبان سے واقف ہیں اور کئی سال تک روس میں رہ چکے ہیں، اس لیے نئی تحقیقات اور اصل مآخذ سے استفادہ کرنے کے انھیں پوری طرح مواقع حاصل تھے، جس کی وجہ سے یہ دونوں کتابیں نہایت مفید اور اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہیں۔

تیسری کتاب "تالستائے" ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب کی تالیف ہے جو مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہیں۔ انھوں نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ: "پیش نظر تصنیف تالستائے کی سوانح حیات اور ادبی تصانیف کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں شہزادہ، سپاہی، عاشق، فنکار، فلسفی، مصلح اور باغی تالستائے کے ذاتی تاثرات کے علاوہ خصوصی طور پر اس کے افسانوی شاہکاروں پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں تالستائے پر لکھی گئی اہم تنقیدی کتابوں

اور مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ان تینوں کتابوں کی اشاعت پر ہم ترقی اردو بورڈ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ قبول عام حاصل کریں گی۔

## آئینۂ ابوالکلام آزاد (مجموعۂ مقالات) مرتبہ: عتیق صدیقی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۰۸ صفحات، مجلد مع گرد پوش قیمت: بیس روپے۔ پہلا ایڈیشن: نومبر ۱۹۷۶ء۔ ناشر: انجمن ترقی، شاخ دہلی، علی منزل، کوچہ پنڈت۔ دہلی نمبر ۶
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

زیر تبصرہ کتاب دراصل تین ابواب میں منقسم ہے۔ تاثرات، مقالات اور انتخاب آزاد۔ پہلے باب میں جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ہمایوں کبیر، سجاد انصاری، نیاز فتحپوری اور سید حامد علی کے ذاتی تاثرات ہیں، دوسرے میں آٹھ مقالات ہیں جن میں سے ایک مرحوم کی اہلیہ زینجا بیگم کے بارے میں ہے، باقی سات مولانائے محترم کی ذات اور صفات کے مختلف پہلوؤں پر۔ تیسرے میں مولانا کے کچھ خطوط ہیں جن میں سے چار غیر مطبوعہ ہیں، دو مضمون۔ "مرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام"، "دیش بندھو چترنجن داس" اور ایک لکھنؤ مسلم کانفرنس (۱۹۴۷ء) کا خطبۂ صدارت۔ ان کے علاوہ سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد مرحوم کا مختصر پیش لفظ اور انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کی جنرل سکریٹری حمیدہ سلطان صاحبہ کے قلم سے حرف آغاز۔ اگرچہ اس مجموعے کے سبھی مضامین اس سے پہلے چھپ چکے ہیں لیکن سوائے میرے مضمون کے سبھی اتنے اہم اور بعض اتنے دلچسپ ہیں کہ انھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور جب بھی پڑھیے تو وہ نئے معلوم ہوتے ہیں، خاص طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون "ابوالکلام —— امام عشق و جنوں" بہت اچھا ہے۔ اس کے علاوہ نوادرِ ابوالکلام کے نام سے جو خطوط شائع کیے گئے ہیں وہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اس مجموعے کے مرتب جناب عتیق صدیقی صاحب متعدد اہم کتابوں کے مصنف اور اردو کے تجربہ کار صحافی ہیں اور مولانا آزاد مرحوم سے نہ صرف محبت اور عقیدت رکھتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بڑا وسیع ہے۔ یہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جو مولانا مرحوم پر کوئی کتاب لکھنے کی ذمہ داری لیں تو وہ اس کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے باوجود، مجھے ایک خامی بہت زیادہ محسوس ہوئی، وہ یہ کہ مولانا کے سوانح حیات پر کوئی مضمون نہیں ہے۔ اگر حالات زندگی کی اہم تاریخیں بھی دیدی جاتیں تو اس کی بڑی حد تک تلافی ہو جاتی۔ نیز اگر مضمون نگاروں کا مختصراً تعارف دیدیا گیا ہوتا تو اچھا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجمن ترقی اردو شاخ دہلی نے یہ کتاب شائع کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے اور اس سلسلے میں انجمن کی سکریٹری حمیدہ سلطان صاحبہ اور اس مجموعے کے مرتب عتیق صدیقی صاحب دونوں ہمارے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب آفسٹ کے ذریعہ بہت خوبصورت چھپی ہے اور مولانا آزاد کی ایک ایسی تصویر بھی شامل ہے جو بہت کم لوگوں کی نظر سے گذری ہوگی۔

## مخدوم علی مہائمی (حیات، آثار، افکار) مولفہ: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$، حجم ۳۱۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: سولہ روپے۔ اشاعت اول: جنوری ۱۹۷۶ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

پیش نظر کتاب ریاست مہاراشٹر کے ایک جید عالم اور بزرگ صوفی حضرت مخدوم علی مہائمی (۱۳۷۲-۱۴۳۱) کے بارے میں ہے، جس میں مرحوم کے حالات زندگی، عادات و خصائل، افکار و نظریات اور تعلیمات و ملفوظات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت مخدوم کے اخلاق کریمانہ اور زہد و عبادت کے بارے میں لکھا ہے کہ: "آپ بیحد فیاض اور کشادہ دست تھے، حاجت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے، باوجودیکہ ایک

دولت مند باپ کے بیٹے تھے لیکن دولتِ دنیا کو کبھی اہمیت نہ دی۔ آپ کے دولت کدے پر ہمیشہ ہجوم رہتا، آپ کے دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے اور مہمانوں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ آپ کے پسندیدہ اخلاق کے ہندو اور مسلمان دونوں گرویدہ تھے ۔۔۔ آپ بڑے زاہد، عابد، جامع علوم شریعت وطریقت، صاحب تصرفات ظاہری و باطنی تھے۔" (صفحہ ۴۲) حضرت مرحوم کے علمی و تصنیفی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ: "زندگی کا بڑا حصہ تصنیف و تالیف میں گزرا اور وہ ان مصنفین میں ہیں جن میں فلسفہ و تصوف کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے، انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں تصوف کے حقائق پر بحث کی اور اپنی گہری بصیرت سے فلسفہ و شریعت کو نئی آگاہی اور نیا شعور عطا کیا۔ ان کی تصنیفات کے ذریعے بہت سے ایسے مسائل کھل کر سامنے آ گئے ہیں جن پر برسوں انسانی ذہن غور و فکر کرتا رہا۔ وحدت الوجود، جبر و اختیار، ہستیِ مطلق، فنا و بقا، تنزلات ستہ، حقیقت محمدیہ اور اسرار شریعت اور اسی قسم کے تصوف کے دقیق مباحث پر قلم اٹھانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔" (صفحہ ۸۹) مرحوم نے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے جس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن میں نظم و ترتیب اور ایک آیت کا دوسری آیت سے ربط ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ: "ہندوستان میں قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کی ابتدا مخدوم علی مہائمی کے دور سے شروع ہوئی۔" (صفحہ ۱۴۰)

زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مولف ملک کی مشہور عربی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر۔ اعظم گڈھ) کے فارغ التحصیل ہیں اور ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے سبھی افراد تصنیف و تالیف اور تخلیق و تحقیق کا بڑا اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے موصوف کی یہ پہلی سنجیدہ کتاب ہے مگر ان کے علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی معیار کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی مادر علمی اور وطن کی لاج رکھ لی۔ امید ہے کہ یہ کتاب علمی و مذہبی حلقوں میں مقبول ہوگی۔

## مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا     مرتبہ : کالیداس گپتا رضا

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۱۷۵ اصفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت : ساڑھے انیس روپے - پہلا ایڈیشن : اگست ۱۹۷۶ء - ناشر : وِمَل پبلیکیشنز - ۱۰۷ جولی بھول ۲/۱ - ۱۰ نیو مرین لائنز چرچ گیٹ - بمبئی - ۴۰۰۰۲۰

زیر تبصرہ کتاب اردو کے مشہور اور استاد شاعر پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (۱۸۸۳-۱۹۷۶) کے ۳۷۵ خطوط کا مجموعہ ہے جو ان کے عزیز شاگرد جناب کالیداس گپتا رضا کو لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہ جو اس مجموعہ کے مرتب بھی ہیں، ایک خوشگو شاعر ہیں اور اب تک ان کے کلام کے چار مجموعے، شعلۂ خاموش، شورِ پنہاں، شاخِ گل اور اجالے (نعتیہ کلام) شائع ہو چکے ہیں، انگریزی نظموں کا بھی ایک مجموعہ "دی سائیلینٹ فلیم" شائع ہوا ہے۔ شروع کے تین مجموعوں پر انعامات بھی دیئے گئے ہیں۔

اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ تین مضامین بھی شامل ہیں، دو فاضل مکتوب نگار کے لائق صاحبزادے حضرت عرش ملسیانی کے قلم سے ہیں، ایک میں مکتوب الیہ کا تعارف کرایا گیا ہے جس میں موصوف کے بارے میں کہا گیا ہے کہ : "نہ صرف یہ کہ شعر گوئی میں شہرت پائی بلکہ ایک بیدار مغز ادیب کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ تحقیق میں موصوف نے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں پر بہت سے انکشافات کا باعث بنے۔" دوسرے میں اپنے والد ماجد کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک مضمون فاضل مرتب کے قلم سے ہے جس میں انھوں نے اپنے استاد کی زندگی پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

یہ خطوط زیادہ تر غزلوں کی اصلاح کے سلسلے میں ہیں، اس لیے ان میں بہت ہی اہم ادبی اور شعری نکات زیر بحث آئے ہیں اور ان خطوط کے مطالعے سے حضرت جوش کے شعری و ادبی خیالات و نظریات پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعہ اردو کے ادبی حلقوں میں خاطر خواہ مقبول ہوگا۔

# جامعہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ



| شمارہ ۶ | بابت ماہ جون ۱۹۷۷ء | جلد ۷۴ |
|---|---|---|

## فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی • ٹائٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

علمی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی کہ ۲۹ر مئی ۷۷ء کو پروفیسر سونیتی کمار چٹرجی کا کلکتہ کے ایک نرسنگ ہوم میں انتقال ہو گیا، اُن کی وفات علمی و ادبی دنیا کا ایک بڑا سانحہ اور ملک و قوم کا ایک بھاری نقصان ہے، محققوں، مصنفوں، عالموں اور ادیبوں کی صف میں ایک ایسی جگہ جو آسانی سے پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک ممتاز معلم، ماہر لسانیات اور اچھے انشا پرداز تھے، اصحاب قلم میں کم ایسے ہوتے ہیں جن میں اتنی خوبیاں جمع ہو جائیں، اس لئے جب بھی اور جہاں بھی علم و ادب کا ذکر ہوگا، خاص طور سے علوم انسانی (ہیومانیٹیز) کے رمز شناسوں کی محفل میں جب بھی کوئی بحث چھڑے گی، پروفیسر سونیتی کمار کو ضرور یاد کیا جائے گا۔ ان کے پسماندگان میں علوم انسانی کے عالموں اور طالب علموں کے علاوہ، ان کے ایک بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ادارہ جامعہ ان سب کے سوگ میں برابر کا شریک ہے۔

---

پروفیسر چٹرجی ۲۶ نومبر ۱۸۹۰ء کو کلکتہ کے قریب شیب پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کلکتہ، لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں حاصل کی، انھوں نے ۱۹۱۹ء میں بنگال گورنمنٹ سنسکرت ایسوسی ایشن کا ویدک سنسکرت کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور اسی سال انھیں پریم چند رائے چند ریسرچ اسٹوڈنٹ شپ اور کلکتہ یونیورسٹی کا ریسرچ پرائز بھی ملا تھا۔ لندن میں وہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک رہے اور ڈی، لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں وہ لسانی مطالعات کے لئے حکومت ہند کے وظیفہ پر گئے تھے۔ ان کے مقالے کا موضوع The Origin and Development of the Bengali Language تھا اور ۱۹۲۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے اسے شائع کیا تھا، دوسرا ایڈیشن جارج ایلن اینڈ انون نے ۱۹۷۰ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں روپا اینڈ کمپنی نے شائع کیا۔ سر جارج ابراہیم گریرسن نے اس پر پیش لفظ لکھا تھا اور کہا تھا کہ "یہ تصنیف گہرے اور بسیط مطالعے اور عالمانہ تحقیق کا بہترین نمونہ ہے"۔ پروفیسر چٹرجی نے پروفیسر تاراپور والا کے ہمراہ اوستا کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ایک معلم کی حیثیت سے ہندوستان اور ہندوستان سے

باہر وہ بہت کامیاب رہے تھے۔ علمی وتحقیقی موضوعات اور لسانیاتی مسئلوں پر اُن کے لکچرز بہت پسند کیے گئے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان وادب کے علاوہ انھوں نے سنسکرت، پالی، فرانسیسی، جدید ہندوستانی زبانیں، تاریخ وتمدن اسلام اور تقابلی لسانیات بڑے اعتماد اور مہارت ومشاقی سے پڑھائی اور شعبۂ علم میں کامیاب رہے۔ ۱۹۲۲ء ہی میں ان کا تقرر ہندوستانی لسانیات کی کیرا پروفیسرشپ پر ہوگیا تھا، ۱۹۳۶ء میں انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا فیلو منتخب کیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں پدم وبھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ علوم انسانی میں ریسرچ کے نیشنل پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد انھیں ساہتیہ اکیڈیمی کا صدر منتخب کیا گیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو اُن سے ایک خاص تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا، ٹیگور نے جب جاوا اور ملایا وغیرہ کا سفر کیا تھا تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے پروفیسر سونیتی کمار کی علمی لیاقت کا اعتراف اس طرح کیا کہ اپنی کتاب بنگلا بھاشا پرچیہ کا انتساب ان کے نام کیا اور ہندی زبان کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں اہم خدمات کے لیے انھیں ساہتیہ واچسپتی کا اعزاز ملا۔ اس طرح علم وادب کی ٹھوس اور مسلسل خدمت کے سلسلے میں پروفیسر سونیتی کمار کو ملک اور بیرون ملک میں نہ معلوم کتنے اہم اعزازی عہدے، خطابات اور انعام واکرام ملے، بلاشبہ علم وادب کی دنیا میں بھارت کا نام اونچا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

---

لیکن ہمارے نزدیک اہم بات یہ بھی ہے اور لائق تقلید بھی کہ اتنے بڑے عالم اور ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود ان کے مزاج میں بلا کی سادگی تھی اور طرز زندگی صوفیوں سنتوں کی طرح کا تھا، ان کے ایک جاننے والے نے کبھی لکھا تھا کہ "وہ سرتاپا، سادگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ میں اُن کے گھر پر بھی جاتا رہا ہوں، وہ صرف ایک لنگی پہنے مجھ سے ملنے آجاتے ہیں۔ مکان کی تیسری منزل پر تین کمرے انھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لئے ہیں، یہیں ان کا کتب خانہ ہے اور مطالعہ کا کرہ، انھیں کمروں میں وہ عموماً لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر کوئی نیا آدمی ملنے آئے تو نیچے ہی دلیہ ان خانے میں بٹھایا جاتا ہے اور ڈاکٹر چٹرجی ایک معمولی قمیص پہنے اس سے ملنے چلے آتے ہیں۔" پروفیسر چٹرجی نے بڑا بیش قیمت کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں سنتے ہیں کہ انگریزی، بنگلہ، عربی، فارسی، اردو، ہندی، لاطینی، سنسکرت

یاؔلی، آسامی، جرمن، فرنچ، یونانی، جاپانی، چینی اور ان کے علاوہ دوسری زبانوں کی بھی بیش قیمت کتابیں ہیں۔ خیال ہے کہ ان کتابوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہی ہوگی۔ اور کتابیں ہی نہیں بلکہ تاریخی و ادبی اہمیت کی تصویریں، کتبے اور دوسرے نوادرات بھی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کا یہ ذخیرہ کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں محفوظ کر دیا جائے۔

---

اپریل ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے، جب وہ بہار کے گورنر تھے، پروفیسر سونیتی کمار چٹرجی کا استقبال، ریاست بہار کی سنسکرت کمیٹی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جب پروفیسر موصوف اس اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے ــــ ان الفاظ میں کیا تھا: "ڈاکٹر چٹرجی کا اس ملک یا غیر ممالک کے تعلیم یافتہ حلقوں سے تعارف کرانا ایسا ہی ہے جیسا کہ آفتاب کو چراغ دکھانا، ڈاکٹر چٹرجی مشرقی اور مغربی علوم کا ایک کمیاب سنگم ہیں۔ مختلف زبانوں کے آپس کے تعلقات پر ان کی جیسی عمیق اور بسیط نظر بہت ہی کم لوگ رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر تمام دنیا میں ان کا لوہا مانا جاتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر چٹرجی کی سب سے اہم خصوصیت اس میں نظر آتی ہے کہ وہ زبانوں کی بنیادوں کو جانتے ہیں اور تہذیبوں کی روحوں کو پہچانتے ہیں۔ انھوں نے علم سے یہ کام نہیں لیا کہ علم کو جدا جدا کریں بلکہ وہ علوم کے باہمی رشتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں .... تاریخی تفرقہ اور بعید بھائی کے پاگل پن میں پھنس کر وہ راہ سے بھٹکتے نہیں بلکہ علم کا سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر لئے ہوئے یکجہتی اور اتحاد کا خواب دیکھتے ہیں جو ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔"
یہ تھا ایک اچھے اور شریف انسان کا خراج تحسین ایک اچھے اور شریف انسان کے لیے۔

---

بنگالی زبان میں اُن کا ایک مضمون "نمازی" چھپا تھا، میں نے اس کا ترجمہ پڑھا ہے اور اس مضمون کا اثر آج تک مجھ پر ہے۔ اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ ڈھاکہ سے اسٹیمر پر واپس آتے ہوئے ایک بار انھوں نے اپنا بستر ہٹا کر چند غریب مسلمان کسانوں کو نماز پڑھنے کی جگہ دی تھی۔ نماز کے بعد ان میں سے ایک سفید ریش بوڑھے غریب مسلمان نے پروفیسر چٹرجی سے جو اس وقت جوان تھے، کہا تھا کہ "ہماری نماز کے لئے آپ نے بستر اٹھالیا اور ہمیں جگہ دے دی، آپ بھلے مانس لگتے ہیں، اللہ آپ کی مدد کرے گا، اس نماز سے ہمیں جو ثواب ہوا آپ بھی اس کے حصہ دار ہوئے، خدا سے ہم آپ کی بہتری کی دعا کرتے ہیں۔" انھوں نے پوچھا تھا ایک غیر مسلم کو نماز کے ثواب کا حصہ

کیسے مل سکتا ہے۔ اس کسان نے جواب دیا تھا کہ 'بابو! اونچ نیچ کا علم نہیں ہے، ہم کسان ہیں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ جو چیز اچھی ہے وہ اللہ کو بھی پیاری ہے۔ اچھے کام میں کافر اور مسلمان میں فرق نہیں... ہم مسلمان ہیں، آپ نے جو بھلائی کی ہے اگر اس کے لئے ہم شکریہ ادا نہ کریں تو ہم گنہگار ہوں گے۔'

ایک عالم اور ایک کسان کا یہ مکالمہ بہت ہی دلچسپ اور فکر انگیز ہے، جو پڑھے گا اس کے دل پر اثر ہوگا۔ اور پروفیسر چترجی پر تو اس کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے اپنے مضمون کو جس طرح ختم کیا ہے اس سے ایک موحّد اور ایک دردمند دل رکھنے والے انسان کی روح کا کرب ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "تیس سال بیت گئے لیکن دریائے پدما کے بہتے سینے پر اسٹیمر پر بیٹھے ہوئے، ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں، سرخ آسمان تلے یہ جو معمولی سا ماجرا پیش آیا تھا، اس کی تصویر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس بوڑھے نمازی کسان کے دل کی باتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔ نہ معلوم کیوں اتنے اچھے خیالات آج ہمارے ملک سے مٹتے جا رہے ہیں؟ کیا اس جوہر کو واپس لانے کی قوت بھگوان ہمیں عطا نہیں کرے گا؟ جو اچھا ہے، بہتر ہے، افضل ہے، اگر وہ ایک بار چلا جائے تو پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ برسوں گذر گئے، یقیناً وہ بوڑھا نمازی اللہ کو پیارا ہو گیا ہوگا۔ اس کے بارے میں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ــــ بڑے میاں! اپنے عقیدے کے مطابق اب تم ضرور بہشت میں ہوگے۔ ہم جو ابھی تک پیچھے رہ گئے، تم سے التجا کرتے ہیں کہ تم ہماری طرف سے دل کھول کر ایک بار خدا سے کہو کہ وہ پھر سے ہم میں انسانیت کی خو اور انصاف کی نظر پیدا کر دے۔ تمام انسانوں کا جو خدا ہے وہی خدا تمام انسانوں میں مساوات بھی قائم کر دے اور ابن آدم کو نجات کا راستہ دکھا دے۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو اس دنیا میں کوئی قوم، کوئی ہستی، کوئی شخص امن اور خوشحالی سے زندہ نہیں رہ سکے گا۔ آدمی جہنم میں چلا جائے گا۔"

افسوس! اتنی خوبیوں کا حامل ایک شریف انسان جو میرے خیال میں یقیناً موحّد تھا اور مدت العمر کے غور و فکر کے بعد جس کا کیش ترکِ رسوم بن چکا ہوگا، ہماری بزم سے اٹھ کر ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل

# الہ آباد — ایک ادبی اور تہذیبی مرکز

## (۲)

الہ آباد کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں صوفیہ کے دائروں کی جن کا ذکر گزشتہ قسط میں کیا گیا ہے، بڑی اہمیت رہی ہے۔ ان دائروں کے ساتھ خانقاہیں بھی شامل تھیں جن میں بہت سی باقی ہیں لیکن کچھ مرورِ ایام سے ختم ہو چکی ہیں۔ یہاں ہمیشہ صوفیائے کرام کا اجتماع رہا جن کے توسل سے ان کے مریدوں نے اس شہر کی سماجی زندگی میں فقر و قناعت اور انسان دوستی کی فضا پیدا کی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی اصول اور شعار کی ترویج و اشاعت میں سختی سے پابندی بھی اختیار کی۔ زندگی میں مصلحت کوشی سے پرہیز، سیاستِ وقت سے بے نیازی، یہاں تک کہ بادشاہوں کی قربت سے بھی پرہیز، اپنے اصول پر سختی سے قائم رہنا، سیاستِ زمانہ سے ٹکر لے کر برباد تک ہو جانے کا مزاج مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی زندگی میں عجب نہیں کہ انھیں دائروں کے نعیر منش بزرگوں نے ہی پیدا کیا، جس پر سلیم، خسرو اور جہانگیر مرزا وغیرہ کے بغاوتوں کے جذبے مستزاد ہو گئے۔ الہ آباد کے یہ دائرے حقانیت، آزاد منشی، سلوک، تسلیم و رضا کی منزلوں سے گذرنے کے لئے عرسوں، محافلِ سماع اور قوالیوں کی محفلیں منعقد کرتے رہے اور آج تک یہ محفلیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی دستار بندی کی رسم ہے تو کبھی خرقہ پوشی کی تو کبھی محفل سماع، کبھی میلاد شریف اور قوالیوں کا جذب دردل عالم کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ محفلیں نغمہ و غنا کی قائل ہیں اور سماع کے شرعی جواز سے

ان کیفیات کا تحفظ کرتی ہیں۔ دراصل تصوف کی اصطلاح نے 'سماع' کو خدا کی ذات سمیع وبصیر کے نزدیک لے جا کر ان کے لئے ایک شرعی جواز حاصل کر لیا اور پھر یہ کہا کہ چونکہ خدا سمیع ہے اس لئے اس کا جزو بندوں میں شامل ہونا چاہیئے اور اس طرح مطلق سماع اور خارجی بنیاد پر نغمہ و موسیقی سے متعلق سماع دونوں شرعی طور پر جائز سمجھے گئے۔ اگرچہ امام غزالی کے مطابق دوسری قسم بہت معمولی ہے۔ اپنی کتاب احیاء العلوم میں امام غزالی نے اس موضوع پر دلچسپ بحث کی ہے۔

الہ آباد کے تمام دائرے اب باقی نہیں ہیں۔ کچھ امتدادِ زمانہ سے مٹ گئے، کچھ محلّوں اور بعض حجول تک محدود ہو گئے، کچھ نے درس تدریس کا دنیاوی سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے لیکن کچھ اب بھی اسلامی تعلیم اور صوفیہ کا مرجع اور مرکز بنے ہوتے ہیں۔

الہ آباد کی تہذیبی زندگی میں تعلیم و تعلّم کو ہمیشہ بڑی حیثیت حاصل رہی ہے۔ رشی بھاردواج کے تعلیمی آشرم سے لے کر آج تک کے تعلیمی اداروں کا جائزہ اس حقیقت کو واضح کرے گا۔ یہ حُسنِ اتفاق بھی عجیب ہے کہ الہ آباد کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ الہ آباد یونیورسٹی جو آکسفورڈ آف انڈیا کہلاتا ہے تقریباً اسی جگہ قائم ہوا جہاں رشی بھاردواج کا تعلیمی آشرم تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی نے ہندوستان کے بہت سے انمول رتن پیدا کئے۔ پروفیسر میگھ ناتھ ساہا، پروفیسر راناڈے، پروفیسر دھر، ڈاکٹر کرشنن، سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر رش بروک ولیم، ڈاکٹر ایشوری پرساد، رام پرشاد ترپاٹھی، ڈاکٹر بینی پرشاد، ڈاکٹر امرناتھ جھا، ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا، پروفیسر ڈان، پروفیسر ای۔ جی ہابس، پروفیسر ستیش چندر دیب، ڈاکٹر دستور، پروفیسر ہیرنبا مائے گھوش، پروفیسر رسول، پروفیسر رام کمار ورما، فراق گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر مہتا، پروفیسر نورالحسن، اور بہت سے شاعر و ادیب سیاست میں اہم رول ادا کرنے والے اسی مادرِ علم سے متعلق رہے ہیں جن کی آتش و رنگ کی گونج آج بھی ذہنوں

میں محفوظ ہے۔ معلوم نہیں کتنے ذہن علم کے اس روشن منارے سے کسب ضیا کر کے ہر طرف روشنی بکھیر رہے ہیں۔

الہ آباد اگرچہ مختلف مکاتب خیال اور مختلف حکومتوں کے سماجی اور سیاسی اثرات سے متاثر ہوتا رہا ہے مگر بہت سی باتوں میں اُس نے خود اپنا ایک مزاج پیدا کر لیا ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس شہر کی تہذیبی زندگی پر ایک خاص دور کے نقوش بہت گہرے ہوگئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے مل جل کر اس شہر کا ایک مزاج خاموش اور قناعت پسند زندگی بن گیا ہے جسے اس شہر نے غالباً رشیوں، مُنیوں اور صوفیائے کرام سے حاصل کیا ہے۔ ایک ایسی امن اور شانتی کی زندگی جس میں زندگی کی رویں (currents) بہت گہری اور گمبھیر طور پہ بہا کرتی ہیں۔ شاید اسی پرسکون اور شانتی کی فضا کو دیکھ کر بہت سے لوگ اس شہر کو ایک خوابیدہ شہر (A sleeping town) سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ ایک تیاگ اور قناعت کا شہر ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو اس کی یہی ادا پسند ہے جو دوسروں کو عجیب محسوس ہوتی ہے۔

یہاں کے مسلمانوں کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر اس شہر کے علاوہ باہر کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ کچھ حلقوں پر اگر دلی کی چھاپ ہے تو کچھ لکھنؤ کے اودھ شاہی سے متاثر ہیں۔ مغلوں کے انتزاعِ سلطنت کے وقت دلی میں جو پیری مریدی کی فضا بہت عام ہو گئی تھی جس سے لال قلعہ کے شہزادگان اور سلاطین سب متاثر تھے اس نے الہ آباد کے ایک حلقے کو روایتی طور پر متاثر کیا ہے۔ لیکن محرم کی تقریبات، جلسے جلوس سب اودھ شاہی روایت کے مظہر ہیں۔ محرم کی مجلسوں کے طور طریقے، ذاکری، مرثیہ خوانی، سوز خوانی کا طرز، ماتم اور نوحہ خوانی، جلوس اٹھنے کا انداز سب پر لکھنوی طرز معاشرت کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن کچھ حلقوں میں، محرم کا دہلوی طرز بھی رائج ہے۔ تاہم جو چیز الہ آباد کے محرم کو لکھنؤ سے الگ کرتی ہے وہ یہاں کے مسلمانوں

کے دونوں فرقوں کا آپس کا اتحاد ہے۔ یہاں محرم کے جلوس میں سنی مسلمانوں کے جلوس شیعہ مسلمانوں کے جلوس سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بڑا تعزیہ، بڈھا تعزیہ، حضرت علی اصغر کا جھولہ، حضرت قاسم کی مہندی، الہ آباد کے محرم کے خاص جلوس ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دہلی اور لکھنؤ دونوں سے الگ ہیں، اسی طرح سماجی طور پر بھی مغلوں کے آخری دور میں جو ایرانی اور تورانی افراد کی چپقلش پیدا ہوگئی تھی اس کا کوئی اثر الہ آباد کے مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا۔

اس تہذیبی اور ثقافتی سرگرمی کے ساتھ الہ آباد میں شعر و ادب کا ہمیشہ بڑا چرچا رہا ہے۔ غیر مرئی سرسوتی شاید اپنی جون بدل کر باشندگان الہ آباد کے رگ و ریشے میں تحلیل ہوگئی ہے۔ اردو شعر و ادب کی بساط کم و بیش الہ آباد میں بھی اسی وقت بچھتی ہے جب دلّی میں ریختہ گوئی کا عروج ہوا۔ یعنی محمد شاہی دور میں اگر امیر احمد خاں انجام کے وہ اشعار جو تذکروں میں مل جاتے ہیں الحاقی نہیں ہیں تو یہیں سے الہ آباد میں اردو شاعری کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ امیر خاں انجام جو حکومت دلّی کی طرف سے کچھ دنوں تک الہ آباد کے ناظم رہے اور جن کا قیام دریاآباد کے گرد و پیش تھا۔ دریا آباد جہاں میر اسحاق ارادت خاں سوئم کی اولاد آج بھی آباد ہے۔

انجام ہی کے زمانے میں بیتاب کے نام کے شاعر گذرے، پھر مُعیب ہیں جو صاحب دیوان شاعر تھے جن کا انتقال ۱۷۷۳ء میں ہوا، اُن کا ایک شعر نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو:

کون گلشن میں کہو مشک کی بو لاتی ہے
کہتے ہیں زلف کے کوچے میں صبا جاتی ہے

اس کے بعد منشی سدا سکھ نثار، شاگرد سودا جو بھاشا اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اسی زمانے میں بھکاری داس عزیز۔ شاگرد خواجہ میر درد نے الہ آباد میں محفل شعر و سخن

محروم کردیا گیا تھا۔ ۱۸۱۷ء کے قریب ان کا الہ آباد میں رہنا تھا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ملیں کیونکر بھلا اُس شوخ طفلِ لاابالی سے[1]
کہ سوتے سوتے جو چونکے ہے تصویر خیال سے

اس کے بعد شاہ محمد اجمل، اجملؔ الہ آبادی جو مصیبؔ کے چھوٹے بھائی تھے، کافی مشہور ہوئے۔ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہوگیا تھا کہتے کہتے ان دنوں کچھ ہوشیار
پھر جو دیکھا کل میں اجملؔ کو وہی دیوانہ تھا

یہ دور الہ آباد کی شاعری کا روشن دور ہے۔ اسی درمیان ناسخؔ استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں الہ آباد وارد ہوئے اور شاہ اجملؔ کے مہمان ہوئے۔ تقریباً ڈھائی برس تک قیام کیا۔ شاگردوں کی اچھی تعداد ہوگئی اگرچہ ان میں قابل ذکر کوئی نہ ہوسکا۔ جانکی بائی احقرؔ۔ معالیؔ جو شاہ ابوالمعالی کے نام سے مشہور ہوئے، افضلؔ، تابشؔ، منشی موتی لال، جٹ مل اسی دور کے خاص شعراء ہیں۔

غدر کے بعد کچھ دنوں کے لئے منیرؔ شکوہ آبادی نے بھی الہ آباد کے محلہ پتھر گلی میں سکونت اختیار کی۔ وہ ناسخؔ اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی وجہ سے پھر الہ آباد میں شعر و سخن کی محفلیں چمک اٹھیں۔ لالہ سمبھو رام آساںؔ، محمد جان خاں حیرتؔ الہ آبادی۔ میر سجاد علی سجادؔ، اشرف علی خاں (دریا آباد) فیاض علی خاں (دریا آباد)، افسرؔ، شاہ امین الدین قیصرؔ، میر عباد علی نیساںؔ اور اکبرؔ الہ آبادی نے الہ آباد کی محافل شعر و سخن

---

[1] چراغ محفل فصاحت مرتبہ پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن

میں چار چاند لگا دیئے۔ حیرت الہ آبادی کا ایک شعر آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

حیرت کا دیوان "آئینۂ حیرت" کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے اور اب بھی کہیں کہیں دستیاب ہے۔ اکبر کی شاعری کا وہ ڈنکا بجا کہ اب الہ آباد کے نام کے ساتھ اکبر اور اکبر کے نام کے ساتھ الہ آباد اس طرح پیوست ہو گئے ہیں جنھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ میر عباد علی نسیاںؔ کو استاد کی حیثیت حاصل رہی۔ آج بھی اُن کے بہت سے شاگرد الہ آباد میں موجود ہیں مگر اردو شاعری کی تاریخ میں انھیں کوئی بڑی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

بیسویں صدی الہ آباد کے لئے بڑی فال نیک ثابت ہوئی۔ زندگی کی تیز گامی نے دور دراز کے فاصلوں کو اس قدر نزدیک کر دیا کہ آئے دن باہر سے شعرائے کرام آتے رہے اور اپنے رنگ سخن سے یہاں کی محفلوں کو متاثر کرتے رہے اور خود بھی یہاں کے رنگِ سخن کا اثر لیتے رہے۔ صفیؔ، ثاقبؔ، عزیزؔ، رسواؔ (مرزا محمد ہادی)، سائلؔ دہلوی، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ سب یہاں آئے۔ خود الہ آباد میں نوحؔ ناروی نے ایک قطب کی حیثیت حاصل کر لی جن کی وجہ سے بہت سی ادبی انجمنیں بن گئیں۔ غالباً اس وقت سے الہ آباد میں ادبی انجمن سازی کا دستور ہوا جو بعد کو انجمن بازی میں تبدیل ہو گیا۔ اس وقت سفینۂ ادب، انجمن روحِ ادب، انجمن فردوسِ ادب قائم ہوئیں۔ سفینۂ ادب کے ناخدا نوحؔ ناروی تھے۔ جن کے ممتاز شاگرد شکملا پرشاد بسملؔ الہ آبادی، سراجؔ الہ آبادی، پنڈت مادھے ناتھ کول گلشنؔ الہ آبادی نے اچھی شہرت حاصل کی۔ انجمن روحِ ادب کے روحِ رواں سر تیج بہادر سپرو تھے۔ اس انجمن

کی بنیاد محلہ دریا آباد میں رکھی گئی۔ سر تیج بہادر کی دلچسپیوں کے باعث انجمن ادب کے جلسے بڑی پابندی سے ہوتے جن میں دور دور سے شعرائے کرام شرکت کے لئے تشریف لاتے۔ شعرائے الہ آباد میں بہت سے شاعر آج بھی اس انجمن سے وابستہ ہیں۔ آج بھی یہ انجمن زندہ ہے اگرچہ اس کی سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی قیادت میں انجمن ترقی پسند مصنفین بھی کچھ دنوں تک کام کرتی رہی۔ سجاد ظہیر نے اس انجمن کی تشکیل سب سے پہلے الہ آباد ہی میں کی تھی۔ بعد کو اس کا مرکز لکھنؤ ہو گیا۔ پریم چند اور سمترانندن پنت اسی وقت اس انجمن میں شامل ہوئے۔ ہندی کے باغی شاعر سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کو بھی اس انجمن ترقی پسند مصنفین سے دلچسپی رہی۔

پروفیسر احتشام حسین کے الہ آباد میں مستقل قیام کے بعد شعرا کی ایک اور انجمن بنی جس کے تاسیس کرنے والوں میں اردو کے مشہور شاعر حبیب احمد صدیقی اور نرائن پرشاد استھانا سابق چیف جسٹس تھے۔ اس انجمن کے جلسے بڑی پابندی سے ہوتے اور اس کی حیثیت الہ آباد کے ادبی حلقے میں کافی موقر ہو گئی۔ اس کے مشاعروں اور جلسوں میں فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین، سراج الہ آبادی، مومن حسین شعلہ، زوار الہ آبادی، ثمر ہلدری، طالب ججے پوری، شمس الرحمٰن فاروقی، حامد حسین حامد شریک ہوتے۔ اس انجمن کی نشستوں سے اردو کی ایک نئی تحریک کا آغاز ہوتا ہے اور شب خون رسالے کی اشاعت کا خیال بھی یہیں سے پیدا ہوا۔ پہلے اس رسالے کا نام تیشہ تجویز ہوا۔ اس وقت کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ اس رسالے کے ساتھ کسی تحریک کی وابستگی ہوگی چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اس کے پہلے مدیر قرار پائے۔ لیکن بعد کو تیشہ شبخون میں بدل گیا۔ شبخون کے ساتھ ہی ایک اور رسالہ شب رنگ بھی شائع ہوا لیکن کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ شبخون کسی نہ کسی طرح آج بھی زندہ ہے اور یہ بڑی بات ہے کہ اردو کا کوئی رسالہ اتنے دنوں تک زندہ رہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے دورانِ ملازمت میں ایک ادبی انجمن تھرس ڈے کلب کے نام سے یونیورسٹی میں قائم کی جس نے بڑا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ اس ادبی کلب میں طلبار کے علاوہ مختلف مکاتب خیال کے لوگ شامل ہوتے رہتے تھے۔ یونیورسٹی کے پرانے طلبار بھی اس میں وقتاً فوقتاً شامل ہوتے۔ تمام اساتذہ اور شرکار کے لئے ایک مقالہ پڑھنا لازمی ہوتا تھا۔ اس ادبی کلب سے بہت سے لوگ اہلِ قلم ہوکر نکلے۔ اس انجمن نے ہم سب لوگوں کی ذہنی نشوونما میں مدد کی۔ احتشام صاحب کی وفات کے بعد۔ احتشام حسین میموریل سوسائٹی قائم ہوئی جس کی نشستیں وقتاً فوقتاً ہوا کرتی ہیں۔

اتنے قدیم ادبی پس منظر، اتنے شعرار اور اتنے ادیبوں اور اہلِ الہ آباد کی تمام دلچسپیوں کے باوجود بھی الہ آباد کا کوئی خاص ادبی مزاج نہیں بن سکا ہے۔ کم از کم اردو کے لئے تو یہی کہنا پڑتا ہے۔ ادبی مزاج سے میرا مطلب اس مزاج سے ہے جس نے لکھنؤ کو ایک اسکول کی حیثیت عطا کی ہے۔ الہ آباد کو اس حیثیت سے مرکزیت نہیں مل سکی ہے۔ اس کا سبب چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن سماجی نقطۂ نظر سے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف الہ آباد کا مزاج تیاگ اور تصوف کا ہے تو دوسری طرف اس پر عسکریت کی فضا غالب رہی ہے۔ صوبہ داروں اور گورنروں کو اپنی مملکت بچانے اور دلّی سے نیک نامی کی سند حاصل کرنے کی فکر زیادہ رہی۔ اس لئے علم و ادب کو فروغ دینا اور اہلِ علم کی سرپرستی کو انھوں نے اہم نہیں سمجھا۔ کچھ یہی ہے کہ یہاں کسی عملے کے مستقل قیام کی صورت کبھی نہیں رہی برخلاف اس کے اودھ میں صورت مختلف رہی ہے۔ صفدر جنگ کے بعد ایرانی حکام اودھ کی زندگی میں ایک استحکام پیدا کرتے ہیں اور اُسے اپنی موروثی ملک سمجھ کر زندگی کے ہر شعبے کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ علم و ادب کی سرپرستی بھی دلی کی شہنشاہیت کی ادبی سرپرستیوں کا جواب ہوسکتی ہے۔

جو مرکزیت دلی کو حاصل ہوئی اس کا جواب لکھنؤ بنتا رہا۔ شعرائے دلی کی وقتاً فوقتاً منتقلی نے اس کوشش اور رجحان پر مزید مہرِ توثیق ثبت کر دی۔ الہ آباد اس سرپرستی اور حکمرانوں کے ایسے شغف سے ہمیشہ محروم رہا۔ یہ درست ہے کہ حکومتیں ادبی مزاج نہیں بناتیں مگر ان کی سرپرستی اور دلچسپی یقیناً علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور مرکزیت میں ہمیشہ مددگار ہوتی ہے۔ دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور کسی قدر رام پور اور بھوپال میں یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر یہ تجزیہ درست نہیں تو یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ الہ آباد میں شعر و سخن کی محفلوں کا وجود تقریباً اسی وقت سے ملتا ہے جب دلی اور لکھنؤ میں شعر و سخن کا چرچا زوروں پر شروع ہوتا ہے لیکن آج تک شعرائے الہ آباد میں صفِ اول کے شعراء نہیں ملتے۔ نوح صاحب نے خود کو الہ آباد کے بجائے اپنے قصبہ نارہ سے وابستہ کیا۔ اگرچہ ان کی شاعری کی جولانگاہ تمام تر یہی شہر رہا۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی الہ آباد میں موجود ہے۔ اصغر گونڈوی کی زندگی کا بہت بڑا حصہ الہ آباد میں ہی گزرا اور یہیں وہ پیوندِ خاک ہوئے۔ مگر ہمیشہ خود کو گونڈوی ہی لکھتے اور سمجھتے رہے۔ فراق صاحب کی شاعری الہ آباد ہی سے شروع ہوئی یہیں پروان چڑھی اور یہیں سے فراق صاحب کو فروغ حاصل ہوا ان کی تمام تخلیقات یہیں وجود میں آئیں اور عمر کی آخری منزل میں بھی وہ یہیں قیام پذیر رہے لیکن خود کو ہمیشہ گورکھپوری ہی لکھتے رہے۔ یہ الہ آباد کی بدنصیبی ہے کہ آج بھی یہاں کی زندگی کیمپ کی زندگی ادب و تہذیب کے معاملے میں سمجھی جاتی ہے۔

الہ آباد میں مشاعروں کی رسم البتہ بہت قدیم رسم رہی ہے۔ یہاں مقامی مشاعروں سے لے کر کل ہند مشاعروں اور کبھی کبھی ہند و پاکستان پیمانے کے مشاعرے بھی ہوئے۔ مسلم ہوسٹل، یونیورسٹی اور شہر میں بڑے اچھے اچھے مشاعرے ہوئے

اور اب بھی ہوتے ہیں۔ آج بھی کبھی کبھی مشاعروں میں اچھا کلام شعرائے الہ آباد کا سننے میں آتا ہے۔ شاگردی اور استادی کا دور جس طرح ہر جگہ سے ختم ہو گیا اسی طرح الہ آباد سے بھی یہ رسم اُٹھ چکی ہے۔ نئے شعرا میں کچھ حضرات اچھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اگر ان کا یہ ذوق مشاعرہ بازی اور انجمن بازی کی نذر نہ ہو گیا (جس کا ہر وقت امکان رہتا ہے) تو جوہر قابل کے پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ابھی یہ نسل تجربوں کی منزل میں ہے۔ ان کی ادبی حیثیت کا تعین، ان کی کوشش پیہم آنے والا زمانہ ہی کر سکتا ہے۔

الہ آباد کے ادبی ماحول میں یہاں اس ادبی پس منظر کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے جو سنتوں اور سادھوؤں کے ادب نے پیدا کیا تھا۔ الہ آباد کے جنوب میں پرنامی فرقے نے اپنے مت کے پرچار میں ادب کا اچھا خاصا ادبی ذخیرہ فراہم کیا جن کی تفصیل اس فرقے کی سب سے اہم کتاب تلزم سروپ اور معرفت ساگر میں دیکھی جا سکتی ہے۔[1] ساتھ ہی ساتھ وہ ماحول بھی کام کر رہا تھا جو سوامی رامانند کی تصنیفات وشنو بھاسکر، سری رام چرن پترمی، گیتا بھاسیہ، رام اشٹک، گیان لیلا اور ادھیاتم رامائن سے ہوتا ہوا کبیر کی بانیوں تک پہنچا تھا۔ کبیر کی بانیاں جو ۱۸۰۵ء میں پہلی بار بیجک کے نام سے دھرم داس نے مرتب کی تھیں۔ اگرچہ الہ آباد میں رام بھگتی کی فضا زیادہ حاوی رہی ہے۔ رشی بھاردواج کے قیام نے ممکن ہے اس فضا کو قائم رکھنے میں مدد دی ہو۔ اگر الہ آباد کے صوبہ میں آباد تلسی داس راجہ پور کے رہنے والے تھے یا ایودھیا کے تو رام چرت مانس۔ یا ریتی منگل جانکی منگل سبھی الہ آباد کے ادبی پس منظر کا عظیم ورثہ بنتی ہیں۔

---

[1] اتری بھارت میں سنت پرم پرا۔ مصنف پی۔ آر۔ چترویدی

ایک طرف تو بھگتوں کی ارادت اور معرفت کی یہ فضا تو دوسری طرف صوفیوں کے جذب و دروں اور والہانہ پن نے راہِ سلوک، عرفان اور ہمہ اوست کی راہیں ہموار کر رکھی تھیں۔ شیخ غوث نے بحرالحیات، جواہرِ خمسہ اور رودادِ غوثیہ لکھ کر بھگتوں کی اس فضا میں اسلامی انوار کی جھلکیاں پیدا کیں۔ ان کے شاگرد منجھن نے اودھی میں مدھو مالتی لکھ کر ملک محمد جائسی کی ادبی بنیاد رکھی۔ غازی پور کے شیخ عثمان نے چترادی اودھی میں ۱۶۹۳ء میں لکھی۔ شیخ نبی نے اودھی میں گیان دیپ لکھی۔ شاہجہاں کے ہم عصر شیخ محب اللہ الہ آبادی نے اپنے دائرے میں درس و تدریس کا شوق بھی روحانی درس اور سماع کے ساتھ قائم کر رکھا تھا۔ ان کی تسویہ جو عربی زبان میں لکھی ہے کافی شہرت رکھتی ہے۔ صوبۂ الہ آباد کے حدود میں جونپور علم و ادب کا بڑا مرکز رہا ہے جو شرقیوں کے زمانہ میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ اس طرح الہ آباد کے گرد و پیش بھی تقریباً ہمیشہ ایک ادبی فضا قائم رہی جس میں تصوف اور بھگتی کی ہی کارفرمائی رہی۔

بیسویں صدی میں جن ہندی کے شعراء اور ادیبوں نے الہ آباد کی ادبی زمین کی آبیاری کی ہے اور آج تک ان میں بہت سارے ادیب کارِ تخلیق میں منہمک ہیں ان میں نرالا، پنت، مہادیوی ورما، ایلا چند جوشی۔ بھیرو پرساد گپت، امرت رائے، لکشمی کانت، نریش مہتا، مارکنڈے، سری کرشن داس، دودھ ناتھ سنگھ، رگھوونش، لکشمی ساگر وارشنے، رسال، رام کمار ورما اور جگدیش گپت خاص ہیں۔ ان میں سے کچھ ہندی دنیا کے روشن ستارے ہو چکے ہیں اور کچھ ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔

آخری بات الہ آباد کے لئے یہاں کا سیاسی مزاج ہے۔ سیاست کے میدان میں جو مرکزیت الہ آباد کو حاصل ہوئی ہے وہ ہندوستان کے کسی شہر کو حاصل نہیں ہے۔ سیاست میں الہ آباد کا مزاج بغاوت کا مزاج ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں

پیش کیا گیا ہے۔ خود بانیٔ شہر اکبر کے خلاف بغاوت یہیں سے شروع ہوئی۔ انگریزی حکومت کے خلاف یہاں کے لوگوں نے بغاوت کر کے چوک میں پھانسی پائی۔ قاضی محسن علی اور ادرلیا قت علی کی سرگرمیوں سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں۔ پھر خود کانگریس نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت اسی شہر سے بلند کیا۔ نہرو خاندان کی سرگرمیاں چندر شیکھر آزاد، مالوی جی، لال بہادر شاستری اور پرشوتم داس ٹنڈن کی سیاسی تنظیمیں اور باغیانہ سرگرمیاں روز روشن کی طرح صفحۂ ہستی پر چمک رہی ہیں۔

---

"الہ آباد میں شاعر اور شاعروں کی قدردانی تو تاریخی اہمیت حاصل کر چکی تھی، حتیٰ کہ شیخ ناسخ بھی لکھنؤ سے بھاگ کر پناہ لینے اسی شہر میں آئے تھے، لیکن اس سے پہلے بھی یہاں شعر و شاعری کا چرچا تھا، عہد قدیم میں بھی کئی نام اچھا کہنے والوں کے مل جاتے ہیں، مثلاً افضل الہ آبادی، مصیب وغیرہ۔۔۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ الہ آباد میں بڑے معرکے کے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شاہ امین الدین قیصر، علی عباد نیساں، آخگر اس وقت کے استادوں میں تھے، لیکن کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ ادبی صحبتیں بجائے شعر و شاعری کے ہاتھا پائی کا مرکز بن گئیں تو اہل علم نے مشاعروں سے ہاتھ اٹھا لیا، اچھے شاعر گوشہ نشین ہو گئے، مشاعروں کی سرپرستی کرنے والے رؤسا نے بھی ہاتھ کھینچ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ شعر و شاعری کا تذکرہ گھروں میں محدود ہو گیا۔ کوئی بڑا اجتماع مشاعرہ کی صورت میں عرصہ سے نہیں ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں جب اردو آئی تو از سر نو مرجھائے ہوئے چمن کو مژدۂ بہار لے کر آئی۔ طالب علموں کی قابل قدر کوششوں سے مشاعروں کو حیات نو ملی، شہر والوں کو بھولے دن یاد آ گئے، دبی ہوئی آگ پھر سلگنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ تمام شہر میں نرمِ گفتار نے چہل پہل پیدا کر دی۔"

(سید اعجاز حسین از میری دنیا صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

قاضی افضال حسین

# مجنوں کے ناولوں پر ایک نظر

ہر عہد اپنے مخصوص فکری مزاج اور تہذیبی میلانات کی بنا پر ادب کی مروجہ اصناف میں سے کسی ایک کو فروغ دیکر اسے اظہار کا ایک اہم اور مقبول وسیلہ بنا دیتا ہے یا بعض نئی اصناف کی ابتدا کرتا ہے کہ اس مخصوص عہد کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا اظہار و ابلاغ ممکن ہو۔ اکثر شاعر اور ادیب اپنے عہد کے مخصوص مزاج اور عصری میلانات سے متاثر ہو کر مروجہ صنف کو ایک فطری وسیلہ اظہار کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر خود کو اپنے عہد کے مخصوص تہذیبی و ادبی رجحانات سے ہم آہنگ نہیں پاتے پھر بھی اپنے فطری میلان کے خلاف مقبول عام صنف کو وسیلہ اظہار بنا لیتے ہیں۔ مجنوں اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی افسانہ نگاری کسی داخلی تحریک یا انفرادی رجحان کا نتیجہ نہ تھی بلکہ انھوں نے عصری تقاضوں ہی کے زیر اثر افسانہ نگاری شروع کی۔ چنانچہ اپنے ناول "سوگوارِ شباب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ہر چند اپنی طبیعت کا میلان ادب کی دوسری اصناف کی طرف تھا۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ میرے بعض احباب نے احساس دلایا کہ میں افسانہ نگاری کی صلاحیت رکھتا ہوں

---

جناب قاضی افضال حسین، لکچرر شعبۂ اردو، رانا پرتاپ ڈگری کالج۔ سلطان پور (یو پی)

اور کچھ اس لئے کہ مجھے خود یہ خیال رہا کہ اگر میں افسانہ
لکھوں تو اپنی آواز کو زیادہ تعداد تک پہنچا سکوں گا
میں نے بھی افسانے[1] لکھنے شروع کیے[2]۔"

اور "نقش ناہید" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

"مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اپنے دور کی تحریک سے اثر قبول
کر کے میں بہت جلد افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گیا"

مجنوں نے ابتداً مختصر افسانے لکھے اور پھر رفتہ رفتہ ناول نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "من درچہ خیالم وفلک درچہ خیال" ۱۹۲۸ء میں "نگار" میں بالاقساط شائع ہوا اور ترمیم و اضافے کے بعد "صیدِ زبوں" کے نام سے نومبر ۱۹۴۴ء میں کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ہارڈی کے ناول Wood Landers کا اردو روپ تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے مجنوں نے "صیدِ زبوں" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"یہ افسانہ ہارڈی کے ایک ناول Wood Landers کو پڑھنے کے بعد لکھا گیا ہے۔
لیکن نہ اسے ترجمہ کہہ سکتے ہیں نہ ماخوذ۔ "واقعات" اور ان کی "ترتیب"، ماحول
اور فضا سب اپنے گرد و پیش کے ہیں۔ ہارڈی کا ناول پڑھ کر میرا افسانہ پڑھئے
تو آپ کو زیادہ سے زیادہ یہ احساس ہوگا کہ ہارڈی کے ناول کی یاد باقی ہے
جو میرے افسانے میں کام کر رہی ہے۔"

"سوگوارِ شباب" "گردش" اور "بازگشت" بھی ہارڈی کے ناولوں سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ "سوگوارِ شباب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

---

[1] مجنوں صاحب ناول اور مختصر افسانہ دونوں ہی کے لئے "افسانہ" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

[2] مجنوں: دیباچہ "سوگوارِ شباب"۔

اس وقت جو افسانہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ہارڈی کے ایک ناول سے ماخوذ ہے جس کا عنوان "Two on a tower" ہے۔"

اور "گردش" کے متعلق لکھتے ہیں :

"یہ افسانہ طامس ہارڈی کے مشہور تمثیلی ناول The Mayor of Casterbridge کے نمونے پر لکھا گیا ہے اور اس دور کی یادگار ہے جبکہ میرے اندر یہ جذبہ جنون کی طرح کام کر رہا تھا کہ جہاں تک ہو سکے مغرب کے بہترین افسانوں کے نمونے پر اردو میں بھی افسانے لکھ ڈالے جائیں۔"

"بازگشت" کی تصنیف کے متعلق لکھا ہے :

"بازگشت" ہارڈی کے شہرۂ آفاق ناول "The Return of the native" سے متاثر ہو کر اسی کے نمونے پر لکھا گیا ہے لیکن واقعات، افراد اور مناظر اور فضا سب اپنے گرد و پیش سے ماخوذ ہے۔"

مذکورہ بالا اعترافات میں یہ بات لائق توجہ ہے کہ مجنوں صاحب اپنے ناولوں کو ہارڈی کے ناولوں کا ترجمہ یا چربہ نہیں کہتے صرف ان سے متاثر ہونے کا ذکر کرتے ہیں "صیدِ زبوں" کے دیباچے ہی کی طرح ایک اور جگہ بہت واضح الفاظ میں لکھتے ہیں :

میرا اصل میلان ترجمہ کی طرف کبھی نہیں رہا اور مجھے اس کا احساس تھا کہ ہمارے ملک میں ہمارے اردگرد بھی ایسے واقعات و حالات موجود ہیں جن کو اگر انھیں مغربی افسانوں کو سامنے رکھ کر اور انھیں کو نمونہ بنا کر افسانوں کی صورت میں تبدیل کیا جائے تو اچھے افسانے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے جہاں بہت سے طبع زاد افسانے لکھے ہیں وہاں ایسے افسانوں کی تعداد بھی خاصی ہے جس کو لکھنے کی تحریک میرے اندر مغربی مشاہیر کے لکھے ہوئے افسانوں کو پڑھ کر پیدا ہوئی۔"[1]

---

[1] دیباچہ سوگوارِ شباب ،

لیکن ہارڈی کے ناولوں کو سامنے رکھکر مجنوں کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ مجنوں نے اپنے ناول صرف ہارڈی کے ناولوں کے "نمونے" پر نہیں لکھے بلکہ واقعات اور ان کی ترتیب ہارڈی ہی سے مستعار لی ہے۔ محض بعض جزئیات مثلاً کرداروں کے جذبات کی عکاسی، ان کے طویل مکالمے یا مناظر کا بیان وغیرہ حذف کر دیئے ہیں جن سے ناول کے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے صرف اتنا کیا ہے کہ محذوف شدہ حصوں کو پُر کرنے کے لئے اپنی طرف سے چند جملوں کا اضافہ کر دیا ہے یا ہارڈی سے ماخوذ واقعات میں کہیں کہیں معمولی تبدیلی کر لی ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے میری بات واضح ہو جائے گی:

"وُڈلینڈرس" میں ملبری اپنی دوسری بیوی سے اپنی بیٹی کی شادی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جو جملے کہتا ہے[1] ان کو سامنے رکھ کر مجنوں کی اس عبارت سے موازنہ کیجئے:

"قربان علی۔ رضیہ کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد اپنے کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگے تھے۔ عنایت علی کے ضبط اور عمل نے ان پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ اب نہ صرف اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے باپ نے احسان علی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی بھی تلافی کرنا چاہتے تھے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کفارہ ادا کرنا تو ایک طرف گناہوں کا ارتکاب بھی انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ بہرحال وہ خلوص دل سے تلافی مافات کا ارادہ کر چکے تھے اور اس کی بہترین صورت وہ یہ سوچے ہوئے تھے کہ اپنی بدروا کے ساتھ احمد کی شادی کر دیں گے وہ دیکھ رہے تھے کہ بچپن سے احمد اور بدروا میں بے انتہا محبت ہے اور جہاں تک موقع مل سکتا ہے دونوں لازم و ملزوم کی

---

[1] ملاحظہ ہو: The Woodlanders Macmillans Co (1951): Page 18–20

طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں اس طرح ان کو پوری امید تھی کہ عنایت علی اور ان کے باپ کے ساتھ جو ظلم ہوئے ہیں ان سب کا کفارہ ہو جائے گا۔

قربان علی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتے تھے کہ بدروا کی زندگی کو احمد کے سپرد کرنا کہاں تک مناسب ہوگا اس لئے کہ اگرچہ احمد کی مالی حالت سدھر چکی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی طرز معاشرت کے لحاظ سے صرف ایک دہقان کہے جانے کا مستحق تھا اور ان کی بدروا اس قابل تھی کہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مدنی الطبع کی رفیق بنے یہ خیال قربان علی کو اب اکثر ستاتا رہتا لیکن جب کبھی وہ اس پر غور کرتے تو ان کو اپنا عہد یاد آجاتا، اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا اور اس کو اپنی ذات سے شرم آنے لگتی۔ مختصر یہ کہ وہ ابھی تک اپنے ارادے پر قائم تھے اور احمد کو اپنا داماد سمجھتے تھے"[1]

"میر آف کاسٹر برج" کے ہیرو Michel Henchered نے مرنے سے قبل جو وصیت کی تھی اس کا موازنہ "گردش" کے ہیرو اختر کے آخری خط سے کیجئے:

"میری آخری وصیت ہے کہ اگر میری لاش کسی کے ہاتھ لگے تو مجھے اس جگہ نہ دفن کیا جائے جہاں خدا کے نیک بندے دفن ہوئے ہیں۔ میں نے نہ خدا کے احکام مانے نہ اس کے نیک بندوں کے ساتھ کوئی بھلائی کی۔ مجھے کسی ویران اور سنسان جگہ مٹی کے نیچے دبا دیا جائے میری قبر پر کوئی فاتحہ نہ پڑھنے پائے اور نہ پھول چڑھائے جائیں۔ کوئی مجھے یاد کر کے آنسو نہ بہائے۔ میں کسی کے آنسوؤں کا مستحق نہیں ہوں۔ تم اور لطیف خاص کر مجھے بھول جاؤ۔ اور اگر کبھی یاد آجاؤں تو میرا ماتم ہرگز نہ کرنا۔ مگر ہاں للہ مجھے معاف ضرور کر دو۔ بس اب خدا حافظ....

تم پر دم دینے والا "اختر"[2]

---

[1] مجنوں، صید زبوں، ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد (۱۹۴۴) ، ص ۱۷-۱۹

[2] مجنوں، گردش، کتب خانہ علم و ادب دہلی، طبع دوئم (۱۹۴۵) ص ۱۰۵-۱۰۶

اسی ناول میں بیوی سے بچھڑ جانے کے بعد ہیرو کے حرکات وسکنات کا نقشہ ہارڈی نے جن الفاظ میں کھینچا ہے، اسے پیش نظر رکھیئے اور "گردش" میں مجنوں کے یہ جملے دیکھیئے:

پل پر آ کر اختر رک گیا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ دفعتاً اس کو کچھ خیال آیا اور وہ سڑک کے نیچے اتر کر ندی کے کنارے کنارے آگے کی طرف چلا۔ تھوڑی دور پر ندی کے کنارے ایک پرانی مسجد تھی جس کی بوسیدہ دیواریں اور گرے پڑے گنبد اور مینار سے اعلان کر رہے تھے کہ نماز گذار بندے اب اس کو خدا کا گھر نہیں بھوت پریت کا اکھاڑا سمجھنے لگے ہیں۔ اختر اس مسجد میں گھس گیا اور منبر کے سامنے سر بہ سجود ہو کر کہنے لگا "اس مسجد میں جتنی روحیں ہیں ان کو حاضر وناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ کم از کم بیس برس تک تاڑی یا کسی نشہ کے قریب نہیں جاؤں گا۔ یہ قسم کھانے کے بعد اس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا ہے"[1]

مندرجہ بالا اقتباسات مکمل ترجمہ نہ سہی لیکن ایسا بھی نہیں کہ محض ہارڈی کے ناولوں کی یاد باقی ہے جو ان ناولوں میں کام کر رہی ہے اگر ہم بہت رعایت سے کام لیں تو انھیں ہارڈی کے ناولوں کی "اردو تلخیص" کہہ سکتے ہیں۔ اقتباس نمبر ۳ میں مجنوں صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے ہن چرڈ (Henchered) کی تمام ضروری حرکات وسکنات کو اردو روپ دیا ہے صرف ان حصوں کو نظر انداز کیا ہے جن سے پلاٹ کے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ "تلخیص" کی اس کوشش میں ہارڈی کے ناولوں کے مجموعی تاثر ان کی ڈرامائی کیفیت اور کرداروں کے مخصوص احساسات وجذبات کی ترجمانی کا خون ہو گیا ہے۔

---

[1] مجنوں، گردش، کتب خانہ علم وادب دہلی (طبع دوئم) ۱۹۴۵ء ۱۸-۱۹

"ڈرامائیت" ہارڈی کے ناولوں خصوصاً "وُڈلینڈرس" اور "میر آف کاسٹر برج" کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہارڈی کے ناولوں کی یہ ڈرامائیت جہاں ایک طرف فن پر اس کی مضبوط گرفت کا پتہ دیتی ہے وہیں دوسری طرف دلچسپی اور تاثر کے عناصر بھی ناول کے خمیر میں داخل کر دیتی ہے۔ "میر آف کاسٹر برج" میں بیوی کے نیلام کرنے کا منظر یا ہن چرڈ کے میئر ہو جانے کے بعد ہوٹل میں ہونے والے جشن کی تصویرکشی یا Farfrae سے جنگ کے لئے آمادہ ہن چرڈ کا اپنا ایک بازو باندھنے اور پھر لڑنے کا بیان ملاحظہ ہو، مجنوں کے اکتا دینے والے بے جان بیانیہ فصول سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہارڈی کے ناولوں میں ڈرامائیت کا یہ وصف قاری کو رفتہ رفتہ اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ہم ناول کے مختلف واقعات اور ان کے بیان میں گم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ڈرامائیت ہارڈی کی ناول کے فن پر مضبوط گرفت اور قوت مشاہدہ کے بہترین ثبوت ہیں جبکہ مجنوں صاحب نے ناول کی تلخیص کرتے ہوئے ایسے تمام حصے نکال دیئے جن سے اردو روپ میں بھی ہارڈی کے ناولوں کی یہ مخصوص ڈرامائیت برقرار رہ سکتی تھی۔

کردار نگاری کو بھی مجنوں کی اس روش سے نقصان پہنچا خصوصاً "میر آف کاسٹر برج" کے اردو روپ 'گردش' میں یہ خامی بہت واضح ہے۔ "میر آف کاسٹر برج" ہارڈی کے ان تین ناولوں میں سے ایک ہے جن میں کسی ایک کردار کی کشمکش حیات کی ترجمانی پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے اس سے قبل کے ناولوں میں ہارڈی نے اپنے مخصوص نظریات کو افراد کے ذریعہ پیش کرنے کے بجائے "مجمع یا سماج" کے توسط سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اس لئے "وُڈلینڈرس"، "ٹو آن اے ٹاور" اور Far From The Madding Crowd وغیرہ میں مخصوص "طبقات" کے احساسات و افکار کی ترجمانی نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ "میر آف کاسٹر برج" میں ناول نگار کی توجہ ناول کے ہیرو ایم ہن چرڈ پر ہی مرکوز رہی ہے اس لئے یہ کردار ہارڈی کے ناولوں

کے دوسرے کرداروں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ دوسرے ناولوں کے برخلاف یہاں
ہین چرڈ کا کردار خود ہی ان اسباب کا منبع و مرکز ہے جو افراد کے المیہ نتائج کے ذمہ دار
ہیں چنانچہ Abercrombie لکھتا ہے۔

"وہ دو خاص عناصر جو المیہ کو وجود میں لانے کے لئے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں خود اس کی (ہین چرڈ) اپنی ذات میں بہم ہیں۔ جب کہ ہارڈی کے باقی دوسرے ناولوں میں شخصیت اور ماحول جس کی شخصیت پر گرفت ہو۔ الگ الگ فراہم کر دیئے گئے ہیں لیکن اساسی تناقص جو ہارڈی کے المیہ کی بنیاد ہے کلی طور پر ہین چرڈ کا اپنا ہے: تناقص جو اس قوت حیات کے خلاف ـــ جو شعوری خواہش کے ایک نظام میں شکل پذیر ہوگئی ہے۔ وجود کے اصل غیر یقینی جبر کی بیرحمانہ پیش رفت سے عبارت ہے ہین چرڈ کے شعوری عزائم کو غیر شعوری توانائیوں کی وہ تندرو درہم برہم کر دیتی ہے جو اس کے اپنے وجود میں مضمر ہے اور ہلاکت زا طور پر مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود تمام ڈرامائی ناولوں کے المیہ کا اصل وجوہر کا علامتی نقیب ثانی معلوم ہوتا ہے[1]"

جبکہ "میر آف کاسٹر برج" کا اردو روپ پڑھ کر یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ ناول نگار کسی ایک کردار کے اوصاف وعیوب کی نمائش پر توجہ دینا چاہتا ہے یا یہ کہ کردار خود اپنے افعال و اعمال کے ذریعہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہارڈی نے اپنے کرداروں کے متعلق کم سے کم کہا ہے بلکہ افراد قصہ کے افعال اور مخصوص حالات کے تحت ان کا اپنا ردّ عمل ان کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ مجنوں صاحب اکثر کرداروں کی طرف سے خود بولنے لگتے ہیں اور اس طرح کرداروں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کے بجائے اپنے خیالات کا اظہار

---

[1] Laselles Abercrombie Thomas Hardy: (Russles Russle Co New York 1926 Page No 125-126

شروع ہو جاتا ہے مثلاً ایک جگہ اختر کی بیوی فاطمہ کی بیماری کا ذکر ہو رہا ہے یہاں مجنوں صاحب رقم طراز ہیں:

"دوا ہوتی رہی اور فاطمہ کا مرض بڑھتا رہا، اختر دن رات اداس رہنے لگا اب وہ پھر اپنے مقدر پر غور کر رہا تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ اختر واہمہ پرست تھا اور تقدیر کا قائل تھا۔ سر نوشت میں جو لکھ گیا ہے وہ پتھر کی لکیر ہے انسان کی تدبیر میں اتنی سکت نہیں کہ اس کو مٹا سکے اور مالکِ تقدیر انسان کی سر نوشت میں جو کچھ لکھتا ہے وہ اس کی اپنی مصلحت یا مشیت کی بنا پر ہوتا ہے اور اس میں انسان کے جذبات و خیالات کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا[1]"

"یہ بتایا جا چکا ہے" کا نقرہ قابلِ غور ہے پورے ناول میں اختر نے خود کچھ نہیں کہا یہ ہر جگہ مجنوں صاحب "بتاتے ہیں" کہ اختر یہ کرنا چاہتا ہے یا اختر نے یہ کہا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کردار کا خاکہ سطحی اور نامکمل ہونا ہی چاہیئے تھا اور وہ ہے۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کہ مجنوں صاحب کا ان لوگوں سے براہ راست واسطہ نہیں رہا جن کی انھوں نے تصویر کشی کی بلکہ صرف ہارڈی کے ناول پڑھ کر ان کا ایک دھندلا سا خاکہ انھوں نے تیار کر لیا۔ جبکہ ہارڈی نے فرضی کردار گڑھنے کے بجائے اپنے اطراف کے لوگوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے ان کی حرکات و سکنات کا گہرا مطالعہ کیا، اور تب نہایت فنکارانہ طور پر اپنے ناولوں میں پیش کیا[2] اسے دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے

---

[1] مجنوں، گردش، ص ۲۵

[2] ہارڈی نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ وہ ovle - Galinal کو بچپن سے جانتا ہے Bathsheba Everdanae اس کی Aunt's میں سے ایک کا خاکہ ہے Joseph Poorgrass ؛ Eustacia اور Susan اس کے بخوبی جانے پہچانے کردار ہیں (بحوالۂ Thomas Hardy by Edmund Blunden Page 68)

ہیں کہ ان کرداروں کے متعلق ہارڈی کا علم گہرے مشاہدے کا نتیجہ تھا جب کہ مجنوں کے اکتسابات کتابی تھے۔

کرداروں کے علاوہ مناظر و مقامات وغیرہ کے بیان میں بھی مجنوں نے ترمیم و تنسیخ روا رکھی ہے جبکہ مجنوں صاحب خود بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہارڈی کے ناولوں میں مناظر محض باہر سے شامل نہیں ہوتے بلکہ واقعات اور افراد کے ساتھ لازمی نسبت رکھتے ہیں[1]۔ اب اگر ان ناولوں سے پلاٹ تو لے لیا جائے اور ان مناظر کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس فنکاری اور تاثیر کا کیا حشر ہوگا جو ہارڈی کے ناولوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مجنوں صاحب نے "دی ریٹرن آف نے ٹیو" کے اردو روپ "بازگشت" میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے طویل سلسلے کا ایڈن ہیتھ (Egden Heath) کو کسی حد تک اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ صید زبوں میں تو انھوں نے وڈ لنڈرس کے اس درخت کا ذکر بھی نہیں کیا ہے جسے بقول مجنوں صاحب، ہارڈی نا مکمل مشیت سمجھتا تھا۔ ناول میں منظر اور پس منظر وغیرہ نظر انداز کر دینے کے نتیجے میں ہارڈی کے ناولوں کے یہ اردو روپ اپنی معنویت اور افادیت دونوں سے بڑی حد تک محروم ہو گئے ہیں۔

ہارڈی کے ناولوں میں اس کانٹ چھانٹ کی تحریک مجنوں صاحب کو اس جذبے کے تحت ہوئی کہ واقعات اور ان کی ترتیب، ماحول اور فضا سب اپنے گرد و پیش کے رہیں۔ یعنی مجنوں صاحب بھی ہارڈی کی طرح اپنے ناولوں میں مقامی رنگ پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک خاص خطۂ ارض کے نمائندے بن جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات لائق توجہ ہے کہ ادب پارہ میں کسی ملک کی بوباس محض اس ملک کے شہروں یا

---

[1] مجنوں، افسانہ اور اس کی غایت، ص ۱۸

محلوں کے نام لکھ دینے سے پیدا نہیں ہو سکتی ہے اگر یہ بات اس قدر آسان ہوتی تو ہارڈی کے سارے ناولوں کے شہروں اور سڑکوں کا نام بدل کر کسی دوسرے ملک کے نمائندہ ناولوں میں تبدیل کر لیا جاتا۔ مگر ظاہر ہے یہ ممکن نہیں کیونکہ ناول میں کسی خاص ملک کی فضا کے معنی اس خطۂ ارض کی مخصوص تہذیب اور اس کے باشندوں کے مخصوص مزاج اور ان کی روایات کی ترجمانی و تصویر کشی ہے اس اعتبار سے مجنوں صاحب کے ناولوں میں "مقامیت" کہیں نہیں پیدا ہو سکی ہے۔ نہ تو ان کے کردار اپنے افکار اور طرز عمل کے اعتبار سے "گھگر" کے لگتے ہیں اور نہ ہی ان ناولوں میں ان رسوم و روایات کا کہیں پتہ چلتا ہے جو اس علاقے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہارڈی نے اپنے ناولوں میں wessex کی مخصوص فضا پیدا کرنے کے لئے مقامی لوگوں کے پورے پورے گروہ کے مزاج و افکار کی ترجمانی و تصویر کشی کی ہے چنانچہ far from the Madding crowd میں oak کے احباب اور "میر آف کاسٹر برج" میں Three Mariner ہوٹل کے مستقل ممبران اس کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں ہارڈی نے پورے گروپ کے طرز فکر اور انداز گفتگو کی نقلیں اتار کر رکھ دی ہیں۔ تلخیص کی کوشش میں مجنوں صاحب نے اس مخصوص بود باش کی ترجمانی تو کھوئی ہی، جیسے اعلیٰ نمونے ہارڈی کے ناولوں میں ملتے ہیں ان میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ مجنوں کے ناولوں میں لبستی یا اس کے مضافات کا عکس بھی دکھائی نہیں پڑتا۔ جہاں کہیں کردار کی زبان سے چند کلمات کہلوائے گئے ہیں وہاں نہایت صاف اور شستہ اردو استعمال کی گئی ہے جب کہ اس فصاحت کو ان بولیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں جو خلیل آباد اور گھگر وغیرہ علاقوں میں رائج ہیں ظاہر ہے کہ محض اشخاص و مقامات کے نام کی تبدیلی سے مقامی رنگ نہیں پیدا ہو جاتا۔

مجنوں نے ہارڈی کے ناولوں کو اردو روپ کیوں دیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے "صید زبوں" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"میں بارہا اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ جس زمانے میں مجھے افسانے لکھنے کا شوق تھا میرے اندر صرف ایک جذبہ کام کر رہا تھا اور وہ یہ کہ کسی طرح اور زبانوں کے بہترین افسانوں کے سطح کے افسانے اردو میں بھی آجائیں بعض افسانہ نگاروں کو اس غرض کے لئے میں نے اپنی نظر میں رکھا تھا، ان میں ہارڈی بھی تھا۔"

اور "سوگوارِ شباب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میں جب کبھی ڈکنس، ڈر ٹفتکی، باتھارن، فلابیر، ٹولسٹائے، تورگنیف، چیخوف، موپاساں، ہارڈی، ڈی۔ ایچ لارنس کے ناول پڑھتا تو پڑھکر گھنٹوں بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہ جاتا اور اس وقت سے یہ فکر گریباں گیر رہتی کہ کسی طرح ایسے ہی افسانے اردو میں بھی آجائیں۔"

لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے واضح ہے مجنوں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجنوں صاحب فضا اور ماحول سب اپنے گرد و پیش کے رکھنا چاہتے تھے جس کے لئے انھیں اصل ناول کے ترجموں میں قدرے تبدیلی کرنی پڑی جس نے ناول کا تمام حسن ضائع کر دیا اور اس حذف اور اضافے کے بعد جو چیز اردو میں منتقل ہوئی وہ نہایت معمولی بیانیہ قصے تھے جنھیں ہارڈی کے ناولوں سے صرف واقعات اور اس کی ترتیب کی نسبت باقی رہ گئی تھی۔

(۲)

مجنوں نے بعض طبع زاد ناول بھی لکھے ہیں جن میں ایک نکمے کی سرگذشت[1] اور

---

[1] یہ ناول ایوان ۱۹۳۲ء کے شماروں میں ایک نکمے کی سرگذشت کے عنوان سے شائع ہوا تھا کتابی صورت میں شائع ہونے پر مجنوں نے اس کا نام بدل کر "سرنوشت" رکھ دیا۔

سراب کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ خصوصاً ایک نکمے کی سرگذشت کو عوام نے تحسین کی نظر سے دیکھا کیونکہ یہ ڈائری کے ذریعہ قصہ بیان کرنے کی ابتدائی کوششوں میں سے ایک تھا۔

مجنوں کے اس طبع زاد ناول کا محرک ان کا اپنا ایک ذاتی تجربہ تھا وہ خود وجع الفواد یعنی دردِ دل کے مرض میں مبتلا رہ چکے تھے، اس زمانے کے تجربات پر انھوں نے ناول کے پلاٹ کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس کا عنوان اور اس کی ہیئت ٹورگینف کے ناول The Diary of a Superfluousman سے مستعار ہے۔

ناول اگر مکتوبات اور روزنامچوں کی شکل میں لکھے جاتے ہیں تو بیشتر فرد واحد کی شخصیت بھی اس کا موضوع ہوتی ہے اور واقعات کا بیان صرف افراد، قصہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ہی کیا جاتا ہے۔ اردو کے رومانی ناول نگاروں میں اس طرز کی مقبولیت کا سبب بھی یہی ہے کہ اس طرح اپنی شخصیت کو موضوعِ بحث بنانے یا کسی اور کردار کی شکل میں خود کو پیش کرنے کے مواقع دیگر فنی وسائل کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے میسر آتے ہیں یا ان بالائی قصّے کے توسط سے نیم فلسفیانہ اور ادبی تصورات کے اظہار و ابلاغ کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے ناولوں میں پلاٹ کی کمزوری اور واقعات کی ترتیب میں نقص قطعی فطری اور ناگزیر ہے۔

دوسرے رومانی ناولوں کی طرح یہ کمزوریاں "سرنوشت" میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس ناول میں بھی واقعات اس ہیجان یا انتشار کے اظہار کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں جس سے ناول کا ہیرو منظہر دوچار ہے۔ یہاں بھی ہیرو کے ادبی و نیم ادبی خیالات کا اظہار کئی کئی صفحات میں کرتا چلا جاتا ہے گویا سامنے بیٹھے ہوئے دوستوں سے بات نہ کر رہا ہو کسی ادبی جلسے میں تقریر کر رہا ہو۔ یہاں بھی ہیرو کو کاروبارِ عشق کے علاوہ دنیا کے کسی اور کام سے کوئی تعلق نہیں۔

بقول ڈاکٹر محمد حسن "دوسرے رومانوی ادیبوں کی طرح مجنوں کے کردار بھی ایک غیر دلچسپ اور کاروباری دنیا میں گھری ہوئی اجنبی اور تصور پرست روحیں ہیں جو یہاں خواب دیکھنے آئی ہیں جن کی تعبیر میں درد والم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاس جذبہ ہے جو ناکامیوں سے تھک کر خود اپنے کو تباہ کر لیتا ہے۔[1]"

"یہ اجنبی اور تقدیر پرست روحیں" قوتِ عمل سے قطعی محروم ہو چکی ہیں یہ صرف سوچتی یا آرزو کرتی ہیں ذوقِ عمل ان سے بالکل چھین چکا ہے۔ یہ تقدیر کو کوستی اور اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری سماج کے سر تھوپ کر خود مطمئن ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے دیگر اہم معاملات کا تو ذکر ہی کیا، عشق کی چھیڑ چھاڑ میں بھی زہرِ عشق کے ہیرو کی طرح معشوق کی طرف سے پہل کی منتظر ہوتی ہیں تخیل کی دنیا کے یہ باشندے معشوق سے جدا ہو کر اسے پانے کی سعی کرنے کے بجائے روتے اور شعر پڑھتے ہیں۔

چنانچہ "سرنوشت" کے پلاٹ میں نہ تو کوئی منطقی ربط ہی ملتا ہے اور نہ ہی اس ناول کے کرداروں کی کوئی واضح اور مکمل تصویر ہی ابھر کر سامنے آتی ہے ان میں زندگی کا صرف ایک رخ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق عشق و رومان سے ہے اور اس کے نقوش بھی اس قدر دھندلے ہیں کہ مجنوں کے تصورِ عشق کے متعلق کوئی واضح رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہاں ایک ناول کے دیباچے میں مجنوں صاحب نے اپنے تصورات حسن و عشق پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

"میں نے اب تک جتنے افسانے لکھے ہیں ان کو مجموعی طور پر رومانی افسانہ

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن، اردو ادب میں رومانوی تحریک، دانش محل لکھنؤ ۱۹۵۵ء ص ۴۳
(ڈاکٹر صاحب نے یہ بات مجنوں کے افسانے کے متعلق کہی ہے مگر یہ ان کے ناولوں پر بھی صادق آتی ہے)

کہا جاتا ہے اور جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے وہ سب انسان کی زندگی کا اس مخصوص رُخ سے واسطہ رکھتے ہیں جس کو عشق و محبت کے پراسرار اور مرعوب کرنے والے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن جس کو سیدھی سادی انسانی زبان میں "جذبہ جنسی" کہا جاتا ہے۔ میں نے زندگی کے اس رُخ کو کیوں منتخب کیا؟ سب سے پہلے تو یہ جذبہ ہے جو دورِ بہیمت سے لیکر تمدن اور عمرانیت کے موجودہ دور تک انسان پر یکساں مسلط رہا ہے اور انسان نے اس کا ایک مقدس بت بنا رکھا ہے جس کو توڑنے کی ضرورت ہے میرے افسانوں میں اور کچھ ملے یا نہ ملے اس سے شاید انکار نہ کیا جا سکے کہ جس زنگی کا رنگ کا فوری بتایا جا رہا تھا اس کو اس کے اصل رنگ میں بے نقاب کرنے کی میں نے مسلسل کوشش کی ہے اور عشق و وفا کے غلط مگر رائج تصوّر کا پردہ جس قدر فاش کر سکتا تھا میں نے کیا ہے...... میرے افسانوں میں عشق و محبت کے بلند بانگ دعوے آخر میں ایک ہی جذبے کے تقاضے .......... ثابت ہوئے ہیں جو بھوک پیاس کی طرح معمولی اور عام ہے جو ابھرتا ہے اور آسودگی کے بعد فرد ہو جاتا ہے اور جو ایک مرکز کو چھوڑ کر اپنی خاطر خواہ آسودگی کے لئے دوسرے مرکز کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔[1]"

"سرِ نوشت" کی سلطانہ مجنوں کے اس تصورِ عشق پر پوری اترتی ہے، جو جنسی تعلقات کے معاملے میں پوری طرح آزاد ہے۔ اس کی شادی پہلے پروفیسر نذیر سے طے ہوتی ہے (پروفیسر نذیر کا انتخاب بھی سلطانہ نے خود کیا تھا) مگر ناول کے ہیرو شعر و ادب کے

---

[1] مجنوں، سوگوارِ شباب، دیباچہ ص ۶

شیدائی مظہر سے ملنے کے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ نباتات کا پروفیسر اس کے لئے مناسب مرد نہیں ہے وہ خود ہی مظہر سے جلد ہی بے تکلف ہوجاتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے اس عشق کو خود مشتہر کرتی ہے بلکہ اپنے والدین کو اس کے لئے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی پروفیسر سے طے ہوئی شادی کو منسوخ کردیں لیکن یہی مظہر جب بیمار ہوکر گاؤں واپس جاتا ہے تو سلطانہ کے لئے مظہر میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی اور وہ اپنے خالہ زاد بھائی رفیق سے عشق کی پینگیں بڑھانا شروع کردیتی ہے اور طلاق لیکر الہ آباد آجاتی ہے۔

لیکن اس ناول کا ہیرو مظہر جو اپنی کمسنی میں ایک شادی شدہ لڑکی روشن آرا سے عشق کرتا ہے اور زندگی بھر روشن آرا ہی کے عشق کا دم بھرتا رہتا ہے، مجنوں کے اس تصور عشق کی نفی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود مجنوں صاحب کے قلم نے یہ سطور اس کی جانب منسوب کی ہیں:

"میں نے اپنے دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیا تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دراصل روشن آرا کی یاد ابھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری زندگی میں یہ روشن آرا ہی کی کمی ہے جس کو میں بغیر پوری کئے ہوئے نہیں رہ سکتا۔[1]"

اور ۲۶ مارچ کو اپنی ڈائری کے آخر صفحہ پر مظہر نے لکھا:

"میں کہہ چکا ہوں کہ روشن آرا کا نقش کبھی میرے دل سے مٹا نہیں[2]" مرتے ہوئے مظہر نے اپنی ساری جائداد روشن آرا کے نام لکھدی جس سے بظاہر اب کوئی تعلق باقی

---

[1] مجنوں، سرنوشت، ص ۸۹ ـ ۹۰

[2] ایضاً ص ۱۳۲

نہیں رہ گیا تھا۔ دوسری طرف روشن آرا بھی باوجود شادی شدہ ہونے کے صرف منظہر کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتی ہے منظہر شہر سے الہ آباد پڑھنے چلا جاتا ہے وہاں شادی کرتا ہے اور بیمار ہوکر گھر واپس آجاتا ہے مگر روشن آرا اس کی پرستش نہیں چھوڑتی یہاں تک کہ منظہر کے انتقال کی خبر سن کر اس کے گاؤں آجاتی ہے اور ساری زندگی صرف اس کی یاد میں گذار دیتی ہے۔

یہ عشق دوفا کا وہی غلط مگر رائج تصور ہے جس کا پردہ فاش کرنے کی کوشش مجنوں صاحب ہمیشہ کرتے رہے۔ دراصل باوجود شعوری کوشش کے مجنوں خود کو عشق کے اس مشرقی تصور سے آزاد نہ کر سکے جس کے متعلق انھوں نے بچپن سے شعراء کے دواوین میں پڑھا اور اپنے بزرگوں سے قصہ کہانیوں کی شکل میں سنا تھا۔ یہ مشرقی تصور عشق ہی مجنوں کے لاشعور کی پنہائیوں پر قابض رہا اور شعور کی پختگی کے بعد جہاں کہیں بھی مجنوں نے عشق کے حوالے سے کوئی بات کہی اس مشرقی تصور کی حمایت کی ہے:

"محبت دراصل ایک ہمہ گیر خلاق کائناتی قوت کا نام ہے۔ قرنہا قرن سے زبردستی ہم نے اس کو مخصوص اور محدود ذاتی اور زوال پذیر تجربے کے دائرے میں قید کر رکھا ہے محبت صرف اس جنس فروش کا نام نہیں ہے جس کو ایک رومان نگار یا شاعر یا عاشق اپنے لئے ایک فردوس عالم بنائے رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس عالم کو کوئی زوال نہیں"[1]

مجنوں کا عشق کے متعلق یہ خیال ہمارے مشرقی مزاج کے قریب بھی ہے اور ان کے ناول "سرنوشت" میں جاری وساری بھی۔ پورا ناول عشق کے اسی تصور کی ترجمانی کرتا ہے اور اسی اعتبار سے اس ناول کو کامیاب بھی کہا جاسکتا ہے ورنہ اس ناول کے

---

[1] پردیسی کے خطوط۔ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ (۱۹۷۵ء) ص ۵۳

کے پلاٹ، کردار یا اسلوب میں ایسی بات نہیں جو اس عہد کے دوسرے رومانی ناول نگار مثلاً نیاز کے ناولوں میں نہ پائی جاتی ہو۔

مجنوں نے ایک اور طبع زاد ناول 'سراب' لکھا جس کی پہلی قسط الیوان مئی و جون ۱۹۳۳ء اور دوسری قسط الیوان جولائی ۱۹۳۴ء کے شماروں میں 'محبت کی فریب کاریاں' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ تین افراد کے بیس خطوط پر مشتمل یہ ناولٹ مجنوں صاحب کے تصورِ حیات میں ایک نمایاں تبدیلی کا غماض ہے۔ اس ناول میں پہلی بار مجنوں کے ترقی پسند خیالات ان کی ادبی تخلیق میں نمایاں ہوئے۔

دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح مجنوں کے یہاں بھی ناول کا ہیرو یوسف رومان اور حقیقت کی کشمکش میں مبتلا ہے ایک طرف نسرین ہے جو مہر و وفا کی دیوی اور حسن کا مجسمہ ہے وہ اپنے خطوط میں بار بار منتیں کرتی ہے کہ یوسف واپس اس کی دنیائے عشق میں لوٹ آئے اور دوسری طرف گاؤں کے زمیندار عزیز میاں ہیں جو بیشتر زمینداروں کی طرح بے رحم، عیاش اور ظالم ہیں۔ گاؤں والوں پر ان کے مظالم یوسف کو جاگیردارانہ نظام حیات کی بغاوت کرنے اور اسے یکسر بدل ڈالنے پر اکساتے ہیں۔ چنانچہ وہ نسرین اور نسرلا (نسرلا یوسف کے دوست منوہر کی بہن ہے) کو ان کے عشقیہ خطوط کے جواب میں اس زمیندارانہ نظام کے خلاف نہایت نفرت انگیز جملے لکھتا ہے اور عملی طور پر بھی بزور بازو اس نظام کو بدل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوسف مجنوں کے رومانی ناولوں کے کرداروں کے مقابلے میں اس قوت عمل کی بنا پر ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ رومانی کرداروں کی طرح تصورات اور آرزوؤں کی دنیا میں رہنے کے بجائے نفرت، استحصال اور افلاس کی اس دنیا میں یوسف کا جابرانہ قوتوں سے برسرِپیکار ہونا مجنوں کے ناولوں میں ایک زبردست اور خوش آئند تبدیلی تھی اگر مجنوں صاحب ناول نگاری ترک نہ کرتے تو یہ تبدیلی ان کو بعض اچھے

ناولوں کے اضافے کا سبب بنتی۔

مجنوں صاحب نے کم و بیش دس سال تک ناول لکھے[1]۔ اس دس سال کے طویل عرصے میں انھوں نے انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی کئے اور طبع زاد ناول بھی لکھے لیکن انھیں اردو ناول کی تاریخ میں بحیثیت ناول نگار کوئی نمایاں جگہ نہ مل سکی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجنوں صاحب کا مزاج جس قدر تنقید کے لئے موزوں تھا غالبًا ناول نگاری کے لئے نہیں تھا۔ گویا ان پر وہی بات صادق آتی ہے جو M. Murry نے Messenger کے لئے کہی تھی

"اس نے محض اس وجہ سے زندگی کا بڑا حصہ المیہ لکھنے میں صرف کیا کہ مصنف کی حیثیت سے فی الواقع با صلاحیت تھا اور المیہ نگاری اس دور کا فیشن تھا۔[2]"

---

[1] میری زندگی کے جس دور کو واقعی افسانہ نگاری کا دور کہہ سکتے ہیں وہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک رہا (مجنوں، دیباچہ سوگوار شباب)

[2] M. Murry , Problems of Style Oxford University Press (1973) P 55

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

# جدید افسانوی ادب اور ماضی

مسرت انسان کا پیدائشی حق ہے اور حقیقی مسرت سعی پیہم اور ایثار سے حاصل ہوتی ہے لیکن جب تہذیبی اور جذباتی رشتے ٹوٹ جائیں اور عقائد، تصورات اور اعتبارات کی دیواریں متزلزل نظر آنے لگیں، حال ماضی سے بدتر اور مستقبل غیر یقینی ہو تو عمل و ایثار اور الفاظ بھی وقتی طور پر اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں اور ماضی کی طرف مراجعت یقینی ہو جاتی ہے، جس کے سایے نہ صرف شکستہ دلوں کے لیے مرہم سازی کا کام کرتے ہیں بلکہ حال کو سمجھنے و سلجھانے میں بھی مدد دیتے ہیں، نیز جذبہ و خیال کو ایسے پیکر، پیرایہ بیان اور توانائی عطا کرتے ہیں جسے حال کی دہشت ناکی سلب کر لیتی ہے۔

ماضی پرستی کی یہ روایت مشرق و مغرب کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے اس کے نقوش داستان اور ناول میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن ماضی کی طرف مراجعت کا یہ جدید رجحان یورپ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد جنگ کی وسیع پیمانہ پر تباہ کاریوں کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا تھا، جس کے اظہار کے لیے مختلف سانچے اور انداز وضع کرنے پڑے، لیکن برصغیر ہند و پاک میں یہ رجحان مغربی ادب کے اثرات سے زیادہ ان تباہیوں کا نتیجہ ہے جو آزادی کی نعمت کے طور پر ملی تھیں، جس نے نہ صرف ارض ہند کو ایک ٹیڑھی لکیر سے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔

---

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، لکچرر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ، دہلی۔

بلکہ انسانوں کے مابین بھی مذہب کی ایک بلند دیوار کھڑی کردی۔ مذہبی تنافر، علاقائی عصبیت اور لسانی تنگ نظری سے قطع نظر انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا آبائی وطن کو چھوڑ کر ایسی سرزمین کو اپنا وطن کہنا پڑا جس کی تہذیب و اقدار سے وہ قطعی طور پر ناآشنا تھے۔

تقسیم ملک کے بعد انتقال آبادی، شکست وریخت اور تباہی و بربادی اس وسیع پیمانے پر ہوئی کہ برصغیر ہندو پاک کا تقریباً ہر ادیب وشاعر اور فنکار متاثر ہوا اور اس نے اپنی تخلیقات میں کھل کر اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا اور مذہبی منافرت اور ظلم و بربریت کی مخالفت کی، لیکن چونکہ نتائج کے اعتبار سے جملہ ادیب وفنکار اس سانحہ سے یکساں طور پر متاثر نہیں ہوئے تھے یا انھوں نے نظریاتی سطح پر اس غیر حقیقی تقسیم کو قبول نہیں کیا تھا اس لیے ان کے یہاں ردعمل بھی یکساں نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر وہ ادیب وشاعر جن کا سیاسی شعور پختہ تھا اس تقسیم کو بین الاقوامی سازش، سامراجی چال اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی کرشمہ سازی سمجھتے تھے اور ہجرت عدم ہجرت ہر دو صورتوں میں جذباتی ہیجان اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتے رہے اور ماضی کو ایک زندہ روایت کی حیثیت سے تسلیم کرتے رہے۔

ان ادیبوں اور فنکاروں کے برعکس وہ ادیب وشاعر جو ہجرت کے باعث اپنے ہی وطن میں مہاجر یا بے وطن ہو گئے تھے اور جن کی معاشرتی زندگی، تہذیبی تسلسل اور سلامت روی کو سخت صدمہ پہنچا تھا کچھ دیر کے لیے ذہنی انتشار کا شکار تو ہوئے لیکن ان کے یہاں بقا، مستقبل کے تحفظ کی خواہش، مقابلہ کی دوڑ، سماجی، تہذیبی اور معاشی کشمکش کی فضا اس قدر شدید اور ایسی فطری تھی کہ ماضی کی طرف مراجعت کرنا تو درکنار وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، چنانچہ ان کے یہاں ماضی پرستی کی روایت پروان نہیں چڑھ سکی۔ اس کے برعکس ان نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے یہاں روایت کا

عدم تسلسل اور زبان کی شکست وریخت اور تجربوں کے لیے نئے سانچوں کی تلاش کا احساس زیادہ قوی ہے۔

وہ ادیب و فنکار جو ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے اگرچہ اس سانحہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے تھے لیکن ان کے یہاں تہذیبی و جذباتی رشتوں کی شکست وریخت کا احساس روشن مستقبل کے یقین اور تعمیر کی شدید خواہش کے سامنے ماند پڑ گیا، جس کے امکانات ان کے اپنے وطن کے مقابلہ میں نئے وطن میں کہیں زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ انھیں ایسے خطوں میں آباد ہونے کا موقع ملا تھا جہاں کی زبانیں ان کے علاقے کے ہر ممکن تہذیب کے مختلف مراحل طے کرکے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں اس لیے انھیں نئے ترقی یافتہ تہذیبی ماحول میں خود کو ڈھالنے میں کسی ذہنی تردد یا کشمکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نراجیت کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ اگرچہ ماضی کی طرف مراجعت کا رجحان ان ادیبوں اور شاعروں کے یہاں بھی جھلکتا ہے لیکن اس کی نوعیت مریضانہ نہیں ہے بلکہ وہ روشن مستقبل کی تلاش و تعمیر کا جز بن گیا ہے اور انقلابی رومانیت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

اس فلاکت زدوں میں جو طبقہ انتقال آبادی سے بہت زیادہ متاثر ہوا وہ متوسط اور تعلیم یافتہ طبقہ تھا جو اپنے آبائی وطن ہندوستان میں نہایت اطمینان و فراغت اور خوشحالی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اور ماضی میں جدوجہد کے مختلف مراحل سے گزر کر اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ مستقبل کی سمت و رفتار کا تعین آسان نظر آنے لگا تھا۔ وہ تہذیبی و سماجی اعتبار سے بھی اپنے معاشرے میں نہ صرف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، بلکہ اسے رہنمائی کا بھی شرف حاصل تھا۔ لیکن تقسیم ہند کی شکل میں وہ سہ طرفی سازش کا شکار ہو گیا اور صدیوں پرانے تہذیبی، جذباتی، تاریخی اور مادی رشتوں کو توڑ کر ایسی سرزمین پر اقامت

کے لیے مجبور ہو گیا جو ہر اعتبار سے اس کے لیے اجنبی تھی۔ ابتدائی دور میں اگرچہ اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی اور اسے اس لیے خوش آمدید کہا گیا کیونکہ اس کے بغیر نئے ملک کا نظام چلانا ممکن نہیں تھا، لیکن اس پرتپاک خیر مقدم کا طلسم پہلے وزیر اعظم کے قتل کے بعد اس طرح ٹوٹا کہ نوزائیدہ مملکت کی تعمیر نو کے معماروں کے حوصلے پست ہو گئے اور نہ صرف یہ بلکہ علاقائی تعصب اور لسانی تنگ نظری نے انھیں سیاسی اقتدار اور اعلیٰ عہدوں سے بھی محروم کر دیا اور زبان و تہذیب کی سطح پر بھی انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

تہذیبی اور لسانی اعتبار سے ان مہاجرین کی کثیر تعداد ایسے خطے کی وارث تھی جس کی تہذیبی اقدار اپنی بلندی اور زبان ادبی لطافت کے باعث برصغیر ہند و پاک میں برتر تسلیم کی جاتی تھی لیکن اب انھیں ایسی تہذیب کے سامنے سربسجود ہونا پڑ رہا تھا جس کی بولیوں نے ابھی ادبی زبان کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ چنانچہ اس سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی تصادم اور کشمکش نے اس طبقہ کو ایسے ذہنی انتشار اور کرب میں مبتلا کر دیا کہ ہجرت کا واقعہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ بن گیا، جو کسی طرح ان کے حافظہ سے فراموش نہیں ہوتا، بلکہ انھیں اپنا ماضی زیادہ قریب، زیادہ عزیز اور زیادہ پرعظمت اور زیادہ پرشکوہ نظر آنے لگا جس کی یاد ان کی زندگی بن گئی ہے۔ ان میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جن کا تجربہ اگرچہ ان مہاجرین سے مختلف ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے وہ یکساں اسی بحران کا شکار رہیں۔ چنانچہ اسی تجربے کے کرب نے پاکستان میں غزل کی تجدید نو کے لیے فضا سازگار کی اور ناصر کاظمی سے ایسی غزلیں لکھوائیں جس میں ماضی گونجتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی کرب قرۃ العین حیدر کے "آگ کے دریا"، عبداللہ حسینی کے ناول "اداس نسلیں"، خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" اور انتظار حسین کے افسانوں میں انھیں ماضی کی طرف مراجعت کے لیے

مجبور کرتا ہے۔

ان سب کے یہاں ماضی پرستی، بچپن کی خوشگوار یادیں، خوشحال ماضی کا احساس اور حال سے بے اطمینانی اور مستقبل کی غیر یقینی کا احساس قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب کا مرکز و محور بھی ہجرت کا تجربہ ہے۔

یہ مہاجرین ایسی غلطی کے مرتکب ہوئے تھے جس کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہیں رہی تھی اس لیے ماضی کی یاد ان کے لیے نہ صرف ایک سکون عطا کرنے والا استعارہ بن گئی بلکہ وہ خود کو اس عمل کے لیے بھی مجبور پاتے تھے کہ ہجرت کے اس تجربے کی ایسی فلسفیانہ توجیہ و تعبیر کریں جو نہ صرف ان کے لیے ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کر سکے بلکہ نئے وطن میں بھی انھیں سربلندی عطا کر سکے اور جس سے وہ زندگی میں نئی معنویت کی تلاش اور تہذیبی و جذباتی رشتوں میں ترتیب نو کا کام بھی لے سکیں۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر اپنے اس تجربے کی معنویت کی تلاش ماضی اور وقت کے تسلسل میں کرتی ہیں اور اس تلاش میں ان کی نظر گوتم بدھ پر جا کر ٹھہرتی ہے جس نے روحانی سکون کے لئے دنیا کو ترک کر دیا تھا اور جو ماضی میں ہجرت اور مسرت کی تلاش کی سب سے بڑی علامت بھی تھا۔ لیکن قرۃ العین حیدر کو گوتم سے قیام پاکستان تک انسانی زندگی مختلف داخلی و خارجی جبر کے تحت "آگ کے دریا" میں تیرتی نظر آتی ہے۔ اس تلاش و جستجو میں مستقبل کے نقوش بھی ابھرتے ہیں یعنی مہاجرین نئے وطن اور اس کی فضا میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ اپنا نام بھی بھول جاتے ہیں، لیکن عِلّینی کو تاریخ کا یہ فیصلہ منظور نہیں تھا اس لیے وہ ہجرت کر کے پھر واپس ہندستان آجاتی ہیں۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں اگرچہ وہ اب بھی کھوئی ہوئی ہیں لیکن اب وہ اپنی نسلی رشتوں کی تلاش اور دورِ عروج سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔

"آگ کا دریا" کے برعکس "اداس نسلیں" میں گذشتہ ایک صدی کی تین نسلوں

پس منظر میں جڑوں کی تلاش اور حال کی معنویت کی جستجو کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا ہیرو ذہنی انتشار کے عالم میں اپنے مصنوعی ہاتھ کے ساتھ پاکستان کی سرحدوں کے قریب پہنچ کر گم ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں پہلی جنگ عظیم کے دوران ہاتھ کا گنوا بیٹھنا اور ایک جرمن سپاہی کا لکڑی کا مصنوعی ہاتھ لگانا ایسا استعارہ ہے جو غالباً ترکوں کی شکست کی علامت بن جاتا ہے۔ لیکن عبداللہ حسین کی سعی رائیگاں نہیں جاتی وہ سیدھے سادے عام انسانوں میں زندگی کا راز محبت و ایثار کو پالیتے ہیں۔

"آنگن" میں یہ تلاش ایک خاندان کے سیاسی و سماجی پس منظر میں سکڑ کر رہ گئی ہے اور ایک دھند کی کیفیت کو پیش کرتی ہے جس میں تقسیم ہند کے بعد کچھ نظر نہیں آتا۔

انتظار حسین نے اگرچہ مسرت کی تلاش میں ماضی کی طرف مراجعت کی تھی لیکن یہ تہذیبی ورثہ جلد ہی ان کی زندگی کی علامت بن جاتا ہے اور حال و مستقبل کے اندیشے اس قدر ہیبت ناک ہیں کہ وہ شتر مرغ کی طرح ماضی کے دامن میں پناہ لے کر خود کو محفوظ سمجھ لینے پر مجبور پاتے ہیں اور وہ اپنی ذات کے الاؤ کو اس لیے روشن رکھتے ہیں کہ اس کے بغیر انھیں اپنی شخصیت اور انفرادیت مٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ بھی مرگھٹ کی طرف واپسی کے خواہشمند ہیں لیکن جب مراجعت تمام راہیں مسدود نظر آتی ہیں تو وہ اپنی ماضی پرستی کو مہاجرین کے اتحاد، تہذیبی انفرادیت اور برتری کا استعارہ بنا دیتے ہیں۔

انتظار حسین کے یہاں سماجی برتری کی خواہش اتنی شدید ہے کہ اس کے حصول کے لیے وہ کبھی اپنی سیادت و شیعیت کا اور کبھی روحانیت اور پان اسلام ازم کا سہارا لیتے ہیں جس کے باعث انھیں ۱۹۴۷ء کے انتقال آبادی ہجرت کا ایسا واقعہ نظر آنے لگتا ہے جس کی جڑیں ماضی میں مسلمانوں کے مدینہ میں مہاجر بننے یا حضرت حسین کے کوفہ کی طرف ہجرت کرنے اور واقعہ کربلا پیش آنے میں ملتی ہیں۔ اسی طرح

بن جاتی ہے۔ چونکہ وہ اخلاق کا درس یا نفرت کا اظہار حال کی زبان میں نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے ماضی کا پیرایہ بیان اور علامتوں کا انتخاب کیا ہے۔

اردو کے موجودہ افسانوی ادب میں ماضی پرستی کا یہ جدید رجحان ایک وقتی اور جذباتی رویے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ ماضی کی توانا روایات کے باوجود حال کی آسودگی اور روشن مستقبل کی تعمیر حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور عمل کی بے پناہ قوتوں کو بروئے کار لانے پر ہی ممکن ہے۔ مرثیہ خوانی کی مریضانہ ذہنیت سے قوموں کی تقدیریں نہیں سنورا کرتیں، بقول فیض:

یادوں کے گریبانوں کے رفو سے دل کی گزر کب ہوتی ہے
ایک بخیہ اُدھیڑا ایک سیا یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

لیکن المیہ کی بھی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ واقعات کو بار بار دہرانے سے جہاں انسان کے خیالات اور جذبات میں وسعت پیدا ہوتی ہے، وہاں خارجی اثرات کا جبر صاحب قصہ کی غلط کاریوں کو فراموش کر کے درد کے سرمایہ کو مشترک بنا دیتا ہے۔ چنانچہ جب انصار ان مہاجرین کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگیں گے اور یہ دولت سب کی ملکیت بن جائے گی اور نئے تہذیبی و جذباتی رشتے وجود میں آ جائیں گے تو ماضی کی طرف اس مراجعت کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور یہ تجربہ نئے دور اور ادب کی تخلیق میں ڈھل جائے گا۔

# وحدت دین اور اسلام کا مخصوص موقف

اور

# اسلام کے متعلق مغرب کے تصورات کی تشریح و تصحیح

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ادارے ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کے زیر اہتمام ۱۸ فروری ۱۹۷۷ء کو جامعہ میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا، جس میں مشہور مستشرق جناب ولیم اے بیلے فلاڈ، پروفیسر علوم قرآنیہ میکگل یونیورسٹی مانٹریال (کناڈا) اور مدیر اعلیٰ "دی مسلم ورلڈ" (ہارٹ فورڈ سیمینری فاؤنڈیشن۔ امریکہ) نے مذکورہ بالا عنوانات پر دو مقالے پڑھے جن پر بحث و گفتگو ہوئی۔

سیمینار کا افتتاح شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے کیا۔ اس کے دو اجلاس ہوئے، پہلا صبح ۱۰½ بجے سے ۱۲½ بجے تک جس کی صدارت مولانا سید عبدالدائم الجلالی (استاد مدرسہ عالیہ، فتحپوری۔ دہلی) نے کی اور دوسرا ۳½ بجے سے ۵ بجے شام تک جس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبرآبادی (مدیر برہان دہلی) نے کی۔

شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں پروفیسر بیلے فلاڈ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: آپ اسلامی علوم کے مشہور مستشرق ہیں اور آپ کا تعلق

دو اسلامی ممالک سے رہ چکا ہے ان میں سے ایک ملک انڈونیشیا ہے جہاں آپ پیدا ہوئے تھے اور دوسرا ملک نائیجیریا ہے جہاں آپ ابادان یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز اور عربی کے پروفیسر رہے ہیں۔ اس طرح علمی اونچی سطح کے ساتھ مسلم معاشرہ سے براہ راست تعلق رکھنے کی وجہ سے پروفیسر بیلے فلڈ اس مقام پر ہیں کہ وہ زیادہ صاف اور گہری نظر سے ان حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کر سکتے ہیں جو عالم اسلام میں اندرونی اور بیرونی سطح پر رونما ہو رہے ہیں۔ ان کا یہ علمی شوق اور خلوص اور حق کی تلاش و جستجو کا یہ جذبہ مسلم اور دیگر حلقوں میں ان کی مقبولیت کا سبب ہے۔

پچھلی دو صدیوں میں مختلف مستشرقین نے اسلام کے بارے میں جو غلط بیانیاں کی ہیں، فاضل مقالہ نگار نے انھیں تفصیل سے بتلاتے ہوئے فرمایا کہ: ٹوئن بی اور دوسرے مستشرقین کا یہ خیال تھا کہ عیسائیت اور اسلام دونوں ہی یہودیت سے نکلے ہیں۔ جہاں تک خدا کے تصور کا سوال ہے وہ عیسائیت اور یہودیت میں تقریباً ایک ہی جیسا ہے لیکن اسلام ایک طرف تو Jealous God (غالباً قہار کو انھوں نے انگریزی میں jealous کہا) اور دوسری طرف اُس کو رحمٰن اور رحیم بتایا۔ اس طرح اس کے مطابق اسلام میں خدا کے تصور کے بارے میں یہ بنیادی تضاد پایا جاتا ہے۔ اس قسم کے مستشرقین نے یہ بھی بتایا کہ سورۃ البقرہ کا الٓمٓ دراصل المسیح کا مخفف ہے۔ اُن کے خیالات دراصل بارہویں صدی کے عیسائی عالموں کے خیالات کا عکس تھے۔ اُن لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ قرآن عیسائیت کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی دلیل میں سورۂ آل عمران، المائدہ، یونس، مریم، الحج، العنکبوت اور الشوریٰ وغیرہ کی وہ آیات پیش کیں جن میں عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی تعلیمات کا تذکرہ ہے۔ سورۂ البقرہ کی مندرجہ ذیل آیت کی بنیاد پر اُن لوگوں نے یہ بھی کہا کہ قرآن نہ صرف عیسائیت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ سب عیسائی جو اپنے اپنے عقائد پر قائم ہیں اور ان کے مطابق عمل کر رہے ہیں نجات کے

مستحق ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ
وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥

"بیشک جو لوگ ایمان لائے اور وہ یہودی، عیسائی
اور صابی جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے
اور (جنھوں نے) نیک عمل کئے اُن کا اجر ان کے
رب کے پاس ہے اور وہ نہ غمگین ہوں گے اور
نہ رنجیدہ۔" (البقرہ : ٦٢)

پروفیسر بیلے فلڈ نے ان خیالات کی خود بھی تردید کی اور اُن مستشرقین کے بھی حوالے دئے جنھوں نے اپنے خیالات کی تصحیح کی ہے۔ مسلم مفکرین اور علماء اسلام کے خیالات پیش کرتے ہوئے پروفیسر بیلے فلڈ نے کہا کہ شیخ ابوبکر حمزہ نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس آیت میں ذکر کئے گئے یہود، نصاریٰ اور صابی وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے پیغمبروں کے زمانوں میں اُن پر ایمان لائے تھے اور پچھلے زمانے میں نیک اعمال کئے تھے۔ اس دور میں (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) صرف اسلام ہی ان کے نزدیک قابل قبول اور نجات کا ذریعہ ہے۔ اس طرح اس آیت سے کوئی کلامی اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے (یعنی شیخ ابوبکر حمزہ نے) سورۂ آل عمران کی مندرجہ ذیل آیت اپنی دلیل میں پیش کی ہے:

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ
مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔"

"جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار
کرے گا وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں
وہ ناکام ونامراد رہے گا۔" (آل عمران: ۸۵)

پروفیسر بیلے فلڈ نے کہا اس طرح قرآن میں موجودہ عیسائیت اور یہودیت کو تسلیم کرنے کی کوئی سند موجود نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۳ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ہاشم امیر علی، ڈاکٹر حمید اللہ اور محمد مارما ڈیوک پکتھال کے نظریات بھی پیش کئے اور آخر میں یہ کہا کہ "مسلمان علماء کے مطابق جو کوئی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کرے گا وہ غیر مسلم ہے اور نجات نہیں پا سکتا۔ چونکہ موجودہ عیسائی اور یہودی پیغمبر آخرالزماں پر ایمان نہیں لائے ہیں اس لئے وہ غیر مسلم کے زمرہ میں ہی آتے ہیں۔ اور قرآن کی کسی ایک آیت کی بنیاد پر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا جو اس کے بنیادی عقائد کے خلاف ہو۔ اس کے لئے آپ کو قرآن کی دوسری آیات بھی سامنے رکھنا ہوں گی"۔ دوران تقریر میں پروفیسر بیلے فلڈ نے "احد" اور "واحد" کے فرق کو بھی واضح کیا اور کہا کہ "احد" کا بہتر ترجمہ انگریزی لفظ One سے اور واحد کا انگریزی لفظ Only سے کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "میں یہ خیال کرتا ہوں کہ قرآن تمام نبوی مذاہب (Prophetic Religions) کو تسلیم کرتا ہے لیکن جب مسلم اور غیر مسلم میں فرق کا سوال آتا ہے تو وہ اُس کا فیصلہ خود اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور صاف صاف بتاتا ہے کہ مسلمان کون ہے اور غیر مسلم کون ہے"۔

پروفیسر بیلے فلڈ نے مسلمان علماء کو اس کی دعوت دی کہ وہ آگے بڑھیں اور عیسائی دنیا کی ان غلط فہمیوں کو دور کریں اور اسلام کے بارے میں جو غلط تصورات اُن کے ذہنوں میں قائم ہیں اُن کو اُن کے ذہنوں سے نکالیں۔

دوسری نشست میں پروفیسر بیلے فلڈ نے اسلام خصوصاً سیرت نبوی کے متعلق

مغرب کے تصورات کی تشریح و تصحیح کرتے ہوئے پچھلی صدیوں کے مستشرقین کے ان غلط خیالات کی ایک تاریخ پیش کی جس کا اظہار انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بارے میں اپنی تصنیفات میں کیا تھا۔ پروفیسر بیلے فلڈ نے بتایا کہ اٹھارویں صدی تک جو کچھ اس موضوع پر لکھا گیا وہ خالص علم کلام کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا تھا اور اس میں مذہبی مباحث شامل تھے۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں انھوں نے پرائی ڈوکس (Prideaux) کی کتاب "لائف آف دی پرافٹ" (مطبوعہ ۱۶۹۷ء) اور ہوٹی گار (Hottinger) کے کام کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے جون فرانسن (John Fransin) کے ترجمۂ قرآن کے مسودہ کا بھی تذکرہ کیا جس میں شروع میں سیرت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۶۴۰ء میں کیا گیا تھا۔ پروفیسر بیلے فلڈ نے رولڈوس (Rolundus) کی ایک تصنیف کا بھی ذکر کیا جس میں اس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں "۲۵ افواہیں" جمع کی تھیں۔

اس کے بعد سیرت پر تاریخی اعتبار سے کئے گئے کاموں کے ذیل میں انھوں نے گسٹو ویل (Gustav Weil) کی اس سیرت نبوی کا تذکرہ کیا جسے اس نے ۱۸۴۳ء میں عربی مراجع کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ولیم میور (William Muir) کی تصنیف کا بھی تذکرہ کیا جو اس نے سیرت نبویہ پر چار جلدوں میں لکھی ہے اور جس میں حضورؐ پر کئے گئے اعتراضات کا جواب سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب خطبات احمدیہ میں دیا ہے۔

پروفیسر بیلے فلڈ نے بتایا کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سیرت پر معاشرتی اور سیاسی نقطۂ نظر سے کام کیا گیا۔ گریم (Grimme) نے ۱۸۹۲ – ۱۸۹۵ء میں خاص اسی نقطۂ نظر سے سیرت پر ایک کتاب لکھی۔ اسی طرح کے دوسرے کام سوک ہجرونج (Snouck Hugronje) اور میکڈونلڈ (Macdonald)

نے بھی کئے ہیں۔ اس سلسلے میں جن دوسرے مستشرقین نے کام کئے ہیں ان میں پاسکل (Pascal) مارگولیتھ (Margoliouth)، اسپرنجر (Springer) اور منٹگمری واٹ (M. Watt) کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

آخر میں پروفیسر بیلے فلاڈ نے کہا کہ دراصل نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات کا مطالعہ وحی قرآنی کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔

اس اجلاس میں سینیگال کے سفیر ڈاکٹر بابا کنتجو (Dr. Baba Kantju) بھی موجود تھے۔ موصوف نے پروفیسر بیلے فلاڈ کے مقالہ کو بہت غور سے سنا اور آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہوئی کوئی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ وہ اللہ کی کتاب ہے اور آپؐ کی حیثیت اس ایک درمیانی شخص کی سی ہے جس نے اس کو اللہ سے لیکر لوگوں تک پہنچایا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ قرآن آپ کی سوانح (Autobiography) ہے صحیح نہیں ہے۔"

آخر میں جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ نے اور جناب سید اوصاف علی صاحب سکریٹری انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (نئی دہلی) نے معزز مقرر اور دونوں اجلاس کے صدر اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاکٹر ماجد علی خاں)

# تعارف وتبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

## نوح ناروی حیات اور شاعری    از ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۴۸ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۱۶ روپیہ، تاریخ طباعت: نومبر ۷۶ ۱۹ء، تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لیمٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نوح ناروی[1] کا شمار اردو کے ممتاز اور قادر الکلام شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کلیتاً زبان اور محاورے کی شاعری ہے۔ خیال بندی یا تصور آفرینی ان کے یہاں اگرچہ نایاب نہیں ہے لیکن کم یاب ضرور ہے۔ داغ دہلوی کے شاگرد اور صحبت یافتہ ہونے کے سبب ان کے لئے شاعری میں زبان کی تراش وخراش اور محاوروں کی صحت وعدم صحت کا مسئلہ اور بھی زیادہ اہم ہوگیا تھا، داغ اسکول اپنی اسی صفت کے لئے

---

[1] پیدائش: ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء بروز جمعہ بوقت صبح بہ مقام بھوانی پور ضلع رائے بریلی (نقوش۔ آپ بیتی نمبر، صفحہ ۱۴۴۸) یہی تاریخ اس کتاب میں بھی ہے۔

وفات: ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء بوقت شب بہ مقام نار ماہنامہ جامعہ بابت ماہ مئی وجون ۱۹۶۳ء صفحہ ۸۰ اور ماہنامہ صبا (حیدرآباد) ماہ اکتوبر ونومبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۴) مگر زیر تبصرہ کتاب میں تاریخ وفات ۱۰ اکتوبر درج ہے (صفحہ ۶۱) اور غالباً یہ تاریخ رسالہ "رہنمائے تعلیم" (نوح نمبر) جلد ۸ شمارہ ۱۰ صفحات ۴۹ و ۵۰ سے ماخوذ ہے۔ لطیف اعظمی

آگے چلکر مشہور بھی ہوا۔ نوح ناروی نے اپنی پختہ مشق اور شاعرانہ بلاغت کا خراج اکبر تک سے حاصل کیا، اکبر جیسا شاعر جو شاعری میں صرف تصوّر کی رفعت کا دلدادہ تھا اور جس کے نزدیک شاعری کم و بیش الہام کا درجہ رکھتی تھی وہ نوح ناروی کو پسند کرتا تھا تو محض اس بنا پر کہ نوح فن کے گہرے رموز سے آشنا تھے اور اپنی بات کو مختلف انداز سے پیش کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ظفرالاسلام ظفر کی تصنیف "نوح ناروی ــــ حیات اور شاعری" نوح ناروی کے فن کی پرکھ کا ایک غیر جانبدارانہ اور قابل قدر معیار پیش کرتی ہے۔ ظفر کی یہ تصنیف اس لحاظ سے بھی نہایت اہم اور دستاویزی قدر و قیمت کی حامل ہے، کہ انھوں نے نوح ناروی کے حالات زندگی کی فراہمی میں بڑی دلسوزی اور دلچسپی سے کام لیا ہے، اعلیٰ تحقیق کا دراصل منشا بھی یہی ہے کہ ہمارے سامنے جو بھی مواد آئے ہم اسے اسی شکل میں قبول کر لینے کے بجائے مختلف طریقوں سے اس کی جانچ پڑتال کریں، حقائق کی دریافت میں دور رس نتائج کو پیش نظر رکھیں۔ ظفرالاسلام کے اس تحقیقی مقالے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف نوح ناروی کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات مستند مآخذ سے حاصل کی ہیں بلکہ اس دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے جو نوح کی شاعری کی تفہیم میں کافی معاون ہو سکتا ہے اس لئے کہ کسی بھی فن کار کو اس کے ماحول اور معاشرہ سے جدا کر کے سمجھنا محال ہے۔

ہمارے زمانے میں داغ اور اس قبیل کے شعراء بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے، نوح ناروی بھی اتفاق سے اسی قبیل میں آتے ہیں جن کو موضوعِ بحث بنانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں یک رُخا پن اور بے رنگی ہے جو یکسر بصیرت سے بھی عاری ہے، جبکہ شاعری کا کام زندگی کی تصویر کشی نہیں بلکہ اس کی تہہ داری دریافت کرنا ہے، اس کی ہر لرزش اور ہر جنبش

سے ایک نئے معنی کا انکشاف ہے، ظاہر ہے کہ نوح ناروی کی شاعری اس بار کی متحمل نہیں ہوسکتی، اس کا رجحان زندگی کی سطح پر موجود حقیقتوں کی عکاسی اور زبان کے کرشمے دکھاتا ہے۔ البتہ اس خاص تناظر میں نوح ناروی کی غزلوں کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے۔

نوح ناروی کی شاہد پرستی کے ضمن میں ظفر نے بہت سے اشعار پیش کئے ہیں، اتفاق سے کوئی بھی شعر ایسا نہیں ہے جو دل کے تار ملا کو چھوسکے۔ اثر سے خالی اور فکر سے عاری اشعار کے ہجوم میں یہ شعر نسبتاً غنیمت معلوم ہوتا ہے:

ملتا رہا سکوں کا مزہ اضطراب میں
یادش بخیر وقت جو گزرا شباب میں

نوح ناروی کی زبان دانی کا ثبوت فراہم کرنے والے چند اشعار اس طرح ہیں:

قبروں کے مناظر نے کروٹ نہ کبھی بدلی
اندر وہی آبادی باہر وہی ویرانہ

ترے در سے تو سب اٹھائے گئے
یہ کس طرح چلمن پڑی رہ گئی

شکوۂ غیر پہ کیوں آپ بگڑ جاتے ہیں
بات کہنے کی جو ہوتی ہے کہی جاتی ہے

کہتے ہیں وہ جھجک کے وہ سائے سے راہ میں
یہ کون ہے کہاں سے مرے ساتھ ہو گیا

اقرار کر کے پھر وہی انکار کر دیا
فرمائیے رہی کہ گئی بات آپ کی

اے نوح اور دو انھیں پہلو میں تم جگہ
سینے سے لے گئے وہ کلیجہ نکال کر

ملا بھی حشر کا موقعہ جو انتظار کے بعد
مری پکار ہوئی آپ کی پکار کے بعد

اس قسم کے لاتعداد اشعار ہیں جو غزل میں نوح ناروی کی مخصوص آواز کو پیش کرتے ہیں، ان میں جو لطف ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا، یہ ان اشعار کا سب سے نمایاں وصف ہے۔

(ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی)

## افکار و اقدار از طیب عثمانی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۲۲۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۱۲ روپے، تاریخ طباعت: جولائی ۷۶ء۔ ناشر: ناظم دارالکتاب، نیا کریم گنج۔ گیا (بہار)

'افکار و اقدار' میں شامل مضامین طیب عثمانی کی ادبی کاوش، دلآویزی فکر، خلوص نیتی اور راست خیالی پر قابلِ قدر روشنی ڈالتے ہیں۔ ابتدائی چند مضامین نظریاتی نوعیت کے ہیں اور بقیہ مضامین عملی تنقید سے متعلق ہیں۔ طیب عثمانی کے پورے تنقیدی رویے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ادب کی پرداخت میں اخلاق اور مذہب کو اہمیت دیتے ہیں، اس کی وضاحت کے لئے انھوں نے 'روحانی آزادی' کی

اشارہ کیا ہے جس سے غالباً ان کا مدّعا PURGATION سے ہوگا اور جو انسان کو خدا یا دوسرے لفظوں میں اپنے اصل منبع سے کٹ جانے کے سبب کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ انھوں نے اقدار کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور ادب کے لئے دینی قدر کو ناگزیر قرار دیا ہے جس کی نمائندگی ان کے نزدیک اقبال، جگر، رشید احمد صدیقی، آختر اورینوی، نذیر احمد اور ابوالکلام آزاد وغیرہ سے ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دینی قدر اپنی کسی نہ کسی شکل میں ہر بڑے فن پارے میں موجود رہی ہے اور موجود رہے گی۔ اس لئے کہ غور و فکر کا سفر جب تک غائب نہیں ہوتا اس وقت تک دین بھی باقی رہتا ہے۔ ادبی تخلیق میں غور و فکر کی یہ روایت کہیں گیان کی ہم معنی ہے تو کہیں اپنی روحانی اور مابعد الطبیعاتی اساس رکھتی ہے۔ فکر کا یہ عنصر اگر اقبال کے یہاں ملتا ہے تو میر یا غالب کے یہاں ناپید نہیں ہے۔ یہ چیز اگر دانتے، گیٹے، ملٹن اور ایلیٹ کی شاعرانہ فکر میں موجود ہے تو شیکسپیر اور ڈرائیڈن کے یہاں بھی ملتی ہے، یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگوں کے ادبی و شاعرانہ افکار ایک باقاعدہ منضبط تصوراتی کائنات سے علاقہ رکھتے ہیں اور کچھ لوگوں کے یہاں اس کی حیثیت ایک دانشورانہ جھلک کی ہے، البتہ اس طور پر بھی ہیں جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ کم معنی خیز نہیں ہوتی۔

طیب عثمانی کا یہ خیال کہ ادب کو افادی اور اصلاحی نوعیت کا ہونا چاہیئے، ادب کے قاری کو تشویش میں مبتلا کر سکتا ہے، اس لئے کہ ادب اپنے خاص حدود اور جمالیاتی معیار کا تابع رہ کر ہماری بصیرت میں کشادگی پیدا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک خاص انداز سے آدمی کو انسان بننے میں معاون بھی ہوتا ہے۔ ادب سے اس [illegible]ت گوئی کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا جو صحافت اور دوسرے علمی شعبوں میں انسان کو [illegible]تی ہے، ادب سماجی سطح پر کسی انقلاب یا تنظیم کا نقیب نہیں ہو سکتا، اس کے [illegible] اور سیاسی علوم ان کی منطق اور فارمولے ہی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ادب شعر

میں راست اظہار غیر مستحسن بھی خیال کیا جاتا ہے، اس میں مظہر خیال یا بصیرت پال والیری کے الفاظ میں اس جوہر کی مانند ہے جو پھل میں پوشیدہ ہوتا ہے، جس کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ ادب سے ماورائے ادب کسی افادیت، پیغام یا نظریے کا تقاضا کرنا صریح زیادتی کی بات ہوگی۔

طیب عثمانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے اس لئے کہ اس میں سچا انسانی خلوص ہے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ ایک نصب العین کے حامی ہیں جو نہ صرف انھیں عزیز ہے بلکہ ان کے وجود کے رگ و ریشے میں خون کی مانند گردش کرتا ہے۔ (ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی)

---

# جامعہ کے خریداروں سے

۱۔ ماہنامہ جامعہ عموماً ہر ماہ کی ۷ ریا ۸ رکو پوسٹ کیا جاتا ہے، اگر اتفاق سے کسی ماہ کا شمارہ نہ ملے تو براہ کرم اسی مہینے میں اس کی اطلاع فرما دیجئے، ورنہ ہمارے لیے اس کی تعمیل مشکل ہوگی۔

۲۔ بعض حضرات رسالے کا چندہ ماہنامہ جامعہ کو براہ راست بھیجنے کے بجائے، کسی اور شخص یا کسی اور ادارے کے نام بھیج دیتے ہیں اس کی وجہ سے مختلف قسم کی زحمتیں پیش آتی ہیں، لہٰذا درخواست ہے کہ زرچندہ براہ راست رسالہ جامعہ کے پتے پر بھیجا جائے۔

۳۔ اپنے پتوں کو غور سے دیکھ لیجئے، اگر پن نمبر نہ ہو یا کوئی اور غلطی ہو تو ضرور اطلاع دیجئے، ورنہ ممکن ہے رسالہ آپ کو نہ ملے یا تاخیر سے ملے۔

مینیجر ماہنامہ جامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔ ۲۵-۱۱۰۰

# جامعہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ


| جلد ۷۴ | بابت ماہ جولائی ۱۹۷۷ء | شمارہ ۷ |
|---|---|---|


## فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر مسعود حسین　　پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین　　ڈاکٹر سلامت اللہ

مدیر

**ضیاء الحسن فاروقی**

مدیر معاون

**عبداللطیف اعظمی**

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

---

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی • ٹائیٹل: ویل پریس دہلی

# شذرات

ایک طویل جد وجہد اور بے شمار جانی و مالی قربانیوں کے بعد ملک کو آزادی ملی تو اس سے سبھی کو فائدہ پہنچا۔ پچھڑے علاقوں نے ترقی کی، پس ماندہ قوموں کی قسمت جاگی اور وہ زبانیں بھی جن سے کوئی واقف نہیں تھا یا بہت کم لوگ واقف تھے، دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش نظر آنے لگیں، لیکن اگر کسی کو نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اس کی ترقی رک گئی تو وہ اردو ہے یعنی یہی نہیں ہوا کہ اس کی ترقی رک گئی، بلکہ اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی اور یہ اس زبان کے ساتھ ہوا جو ملک کی مقبول ترین زبانوں میں سے ہے، جو ملک کے تمام حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جو اسی سرزمین میں پیدا ہوئی اور جسے سبھی فرقوں اور قوموں نے، چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، سر آنکھوں پر بٹھایا، آج یتیم و لسیر کی سی زندگی بسر کر رہی ہے، نہ اس کا کوئی علاقہ ہے اور نہ مستقبل۔ تیس سال سے صرف طفل تسلیوں پر زندہ ہے۔

---

پچھلے سات آٹھ برسوں میں کچھ حالات بدلے تھے، مایوسی کے بادل چھٹے تھے، لسانی تعصب کا زور کم ہوا تھا اور حکومت نے کچھ توجہ کی، مختلف ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہوئی تھیں اور یوپی اور بہار کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر ہوا تھا۔ ایک کمیشن بھی قائم ہوا تھا جس نے ملک گیر پیمانے پر اس کے موقف کو سمجھنے اور صحیح صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اردو والوں کو اس کمیشن سے جو گجرال کمیٹی کے نام سے مشہور ہے، بڑی امیدیں تھیں، وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاید خود کانگریسی حکومتیں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کریں اور اردو کو اس کا جائز حق مل جائے۔ لیکن یکایک صورت حال بدل گئی، کانگریس، جو آزادی سے اب تک ملک کے سیاہ و سپید کی مالک تھی، اقتدار سے محروم ہو گئی اور حکومت کی باگ ڈور جنتا پارٹی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس پارٹی نے یقین دلایا کہ پچھلی حکومت نے جتنا انصافیاں کی ہیں، یہ اس کو دور کرے گی، اس نے جمہوریت کا گلا گھونٹا ہے، یہ اسے بحال کرے گی اور ہر ایک کو وہ دے گی جو اس کا قانونی دستوری اور جمہوری حق ہے۔ اردو والوں کو بھی امید بندھی کہ اب حالات بدلیں گے اور اردو کو اس کا جمہوری اور دستوری حق ملے گا،

مگر وائے قسمت جلد ہی ان کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ ۳۱ مئی کو وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے لکھنؤ میں جو اردو تحریک کا مرکز رہا ہے، پریس کانفرنس میں فرمایا: "اردو کو کہیں بھی دوسری زبان بنانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس کے بعد جنتا پارٹی کے دوسرے اہم رہنما اور مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ جناب چرن سنگھ نے ۹ جون کو کانپور میں ارشاد فرمایا کہ: "اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان نہیں بنایا جا سکتا جیسا کہ ہندی کو غیر ہندی ریاستوں میں بنایا جا رہا ہے۔" سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا اردو اس ملک کی زبان نہیں ہے؟ کیا اس کا یہ جائز اور جمہوری حق نہیں ہے کہ اسے بھی زندہ رہنے اور آزادی سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے؟ کیا جنتا پارٹی نے انتخابات کے مواقع پر یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ جمہوری روایات کو زندہ کرے گی اور جہاں جہاں ظلم و زیادتی ہوئی ہے، اس کی تلافی کرے گی۔ اردو کچھ بھی نہیں چاہتی سوائے اپنے جائز حق کے۔ ہندی سے اس کا کوئی جھگڑا نہیں ہے، ہندی ملک کی سرکاری اور قومی زبان ہے، وہ اس کی حیثیت کو صدق دل سے تسلیم کرتی ہے، وہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ جس طرح ہندی کو غیر ہندی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا رہا ہے، اسی طرح ان ہی خطوط پر اردو کو ہندی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ کیا اس کی یہ خواہش یا مطالبہ صحیح اور جائز نہیں ہے؟ جنتا پارٹی کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کو اقتدار دلانے میں اردو والوں کا بھی حصہ ہے اور یہ توقع کرنے میں وہ حق بجانب ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے گا اور ماضی میں اردو کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کی تلافی کی جائے گی۔ امید کہ جنتا حکومت کے معزز وزرا اردو کے بارے میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے اور اردو کو اس کا جائز حق دلا کر ملک کی سب سے بڑی لسانی اقلیت کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

جون کے تیسرے ہفتے میں حکومت ہند کے ایک تصنیفی و اشاعتی ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے، سری نگر میں ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے کی، اس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے اردو کے استادوں، ادیبوں، صحافت نگاروں اور لائبریرین نے شرکت کی اور اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کے مسائل پر غور کیا۔ اس سیمینار میں بیس سفارشات پر مشتمل ایک جامع تجویز متفقہ طور پر منظور کی

گئی ہے جس کے شروع میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ: "اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے جو ملک کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں اردو زبان نے بہت اہم رول ادا کیا ہے، لیکن اس زبان کی بدقسمتی ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد اس کے جائز حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا اور قانونی و دستوری حیثیت سے اس کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق تھی۔" نیز یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ: "اس زبان کو دستوری اعتبار سے اب وہ حق دیا جائے جس کو ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔"

---

افسوس کہ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں برسر اقتدار پارٹی اور حزب مخالف کے طویل اور شدید اختلافات کا نتیجہ فوجی حکومت اور پورے ملک میں مارشل لا کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان اختلافات نے جو صورت اختیار کر لی تھی اس کے پیش نظر یہ حادثہ قطعاً غیر متوقع نہیں تھا، البتہ جس طرح ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، انتہائی پرامن طریقے پر اتنا بڑا فوجی انقلاب ہوا، وہ حیرت انگیز ضرور ہے اور فوجی انقلابات کی عالمی تاریخ میں شاید اپنی مثال آپ ہے، اسی وجہ سے پاکستان میں بھی اور باہر بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ یہ انقلاب بھٹو صاحب کے ایما پر اور ان کے حق میں کیا گیا ہے اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کو خاص طور پر اس کی تردید کرنا پڑی۔

پاکستان میں پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فوجی حکومت قائم ہوئی تھی، پہلے سربراہ سکندر مرزا تھے، مگر جلد ہی ان کو ہٹا کر مارشل ایوب خاں نے ان کی جگہ لے لی، ایک طویل عرصے کے بعد جنرل یحییٰ خاں برسر اقتدار آئے۔ مشرقی پاکستان میں فوجی شکست اور بنگلا دیش کے قیام کے بعد، ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو برسر اقتدار آئے۔ انھوں نے اقتدار میں آنے کے بعد سب سے پہلے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ آئندہ پاکستان میں فوجی انقلاب نہ آنے پائے۔ انھوں نے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ صدر پاکستان کے بجائے وزیر اعظم کو یعنی خود اپنے آپ کو فوج کا سپریم کمانڈر مقرر کیا تھا اور گذشتہ سال جنرل ٹکا خاں کی سبکدوشی کے بعد سب سے جونیر میجر جنرل ضیاء الحق کو چیف آف دی آرمی اسٹاف مقرر کیا، جس کی وجہ سے متعدد سینیر آفیسر نے فوج سے علیحدگی اختیار کر لی، مگر بالآخر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور یہی جنرل

ضیاء الحق بھٹو صاحب کے زوال کا سبب بنے۔
ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ فوجی انقلاب پاکستان کا خالص داخلی معاملہ ہے جس میں مداخلت کا نہ ہمیں اختیار ہے اور نہ ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں، مگر ہماری خواہش اور دعا یہ ضرور ہے کہ پڑوسی ملک میں امن و امان قائم رہے اور دونوں ملکوں میں دوستی اور محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو۔

---

پچھلے چند برسوں میں ہندوستانی مسلمان جن مسائل اور واقعات پر بہت زیادہ بے چین و مضطرب تھے اور ہیں ان میں سے ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا موجودہ ایکٹ ہے، خوشی کی بات ہے کہ تعلیم اور سوشل ویلفیر کے مرکزی وزیر نے ۱۱ر جولائی کو لوک سبھا میں اصولی طور پر تسلیم کرلیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ ایکٹ پر نظر ثانی کی جائے گی اور اس کے جمہوری اور اقلیتی کردار کو بحال کیا جائے گا۔
دوسرا مسئلہ متبنیٰ بل ہے جس میں متبنیٰ کو وراثت میں وہی حق تجویز کیا گیا ہے جو حقیقی لڑکے کو حاصل ہوتا ہے چونکہ اسلام میں متبنیٰ کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے اس لیے مسلمانوں کی قدرتی طور پر یہ خواہش ہے کہ اس سے انھیں مستثنیٰ کردیا جائے۔ علماء کے ایک وفد نے سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملک کے مسلمانوں کے ان جذبات وخیالات سے آگاہ کیا تھا چنانچہ سابق وزیر اعظم نے اسے ملتوی کردیا تھا اور اس وقت سے یہ بل اب تک ملتوی چلا آرہا ہے۔ ۵ر جولائی کو انڈین کونسل آف سوشل ویلفیر دہلی کا ایک جلسہ مرکزی وزیر تعلیم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اس بل کو قانونی شکل دینے کا مطالبہ کیا گیا لیکن وزیر تعلیم نے واضح لفظوں میں اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ اکثریتی فرقے کو یہ بالکل حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ یکساں سماجی قانون کو اقلیتوں کی مرضی کے خلاف ان پر تھوپ دے۔
اس سے پہلے ۲۷ر جون کو شادی بیاہ کے یکساں قانون سازی کے سلسلے میں وزیر قانون نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ حکومت اس طرح کی کسی تجویز پر غور نہیں کررہی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مرکزی وزیر تعلیم اور وزیر قانون نے اپنے بیانات سے مسلم اقلیت کو فی الحال ایک حد تک مطمئن کردیا ہے۔
امید ہے کہ جنتا حکومت اسی طرح تمام مذہبی، تہذیبی اور لسانی معاملات میں اقلیتوں کے جذبات وروایات کا، خواہ یہ اقلیتیں لسانی ہوں یا مذہبی، احترام کرے گی۔

سید زاہد علی

# سترھویں صدی کا طرز معاشرت

## چند پہلو

(ا)

دورِ متوسط میں تاریخ نولیسی کا ایک مخصوص نظریہ تھا جسے درباری مورخین نے اختیار کیا۔ دربار کے قصیدہ گو شعراء اور مورخین کے نزدیک تاریخ کا اصل مقصد کسی دور کی مخصوص سیاست تک محدود تھا، حالانکہ تاریخ ایک ہمہ گیر مضمون ہے جس کے مختلف پہلو ہیں، مثلاً سماجی، اقتصادی، علمی اور انتظامی وغیرہ۔ سیاست بھی ان ہی میں سے ایک ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ سب سے اہم ہے۔ لیکن ہم کسی دور کے سیاسی حالات کو اس وقت تک بخوبی نہیں سمجھ سکتے جب تک اُس دور کی روش، پس منظر اور معاشرہ کا مطالعہ نہ کریں کہ کن حالات میں مختلف سیاسی اشکال رونما ہوئیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس دور کے معاشرے کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے۔ درباری مورخین نے صرف تخت نشینی، بادشاہ کی دریا دلی، بغاوتوں اور فتوحات کو ہی تاریخ کا اہم جز سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں صرف سیاسی حالات ایک خاص رنگ کے ساتھ ملتے ہیں جس کی وجہ سے معاصر مورخین کی کتابوں میں ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے۔ جدید

---

جناب سید زاہد علی، لکچرر شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مورخین نے بھی سیاسی حالات کو بغیر کسی تنقید کے بیانیہ انداز میں پیش کیا۔ لین پول، اسمتھ، ہیگ اور سر جادو ناتھ سرکار نے بھی ہندوستان کے دور متوسط کی تاریخ کو جنگ وجدل ایک طویل داستان کی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے بھی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت کے پس منظر کو نظر انداز کیا۔ یہاں کی ذات پات، طبقہ جاتی اختلافات، قبیلہ جاتی اور نسلی امتیازات اور زراعتی نظام کی طرف دھیان نہ دیا[1]۔ موجودہ مورخین کے مطابق سماج کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ تاریخ نویسی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ عوامی زندگی، تہذیب و تمدن، داخلی اور بیرونی اثرات خصوصی طور پر ہندوستان کے عہد متوسط کی تاریخ نگاری کے لئے لازمی ہیں[2]۔ اس سلسلہ میں یورپ کے سیاحوں کے سفرنامے بے حد مفید ہیں جن کی مدد سے ہمیں اس دور کی سماجی تصویر ملتی ہے۔ ہندوستانی مورخین یہاں کے رسم ورواج سے آشنا تھے اس لئے انھوں نے اس کو غیر ضروری سمجھا۔ درباروں کی وابستگی کی وجہ سے وہ وقت کے تقاضے اور سلطان کی مرضی کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ یورپ کے سیاح اجنبی تھے اس لئے یہاں کے رسم ورواج کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے برخلاف معاصر مورخین نے بادشاہِ وقت کی تعریف و توصیف اور حقائق کو بیان کرنے میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے[3]۔ برنیئر، ٹیورنیئر، فنچ، ٹیری، سرٹامس رو، منوچی اور مینڈک وغیرہ نے ہندوستانی رسم ورواج، ملبوسات، مشروعات، خورد و نوش اور تفریح کے مختلف ذرائع پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ برنیئر سیاحوں کا شہزادہ مشہور ہے۔

---

۱۔ پی۔ ہارڈی۔ ہندوستان کے دورِ متوسط کے مورخین ۔۲

۲۔ ایضاً۔ ۳۔۴۔

۳۔ وائی کرشن۔ مغل دور کے یورپ کے سیاح۔ اسلامک کلچر۔ حصہ ۲۱۔ نمبر ۳۔ جولائی ۱۹۴۷ء۔ ۲۱۸

سر ٹامس رو نے آگرے میں دو سال نو ماہ قیام کیا۔ برنیئر دارا شکوہ کا معالج تھا۔ منوچی نے دارا شکوہ، راجہ جے سنگھ، راجہ کرت سنگھ اور شاہ عالم کے یہاں ملازمت کی۔ ٹیبزی اور کوریاٹ نے برنیئر سے فارسی سیکھی۔ برنیئر کا سفرنامہ اُس کی ذہانت اور علمیت کی وجہ سے دوسرے سفرناموں سے زیادہ اہم ہے۔

ملبوسات، زیورات اور آراستگی کے مختلف طریقے، ملک کی آب وہوا، جغرافیائی حالات اور پیداوار کے مطابق ہوتے ہیں لیکن ہندوستان میں غیر ملکی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اورمؔ کے مطابق وہ کپڑوں کا فیشن جو موجودہ دور میں رائج ہے، دراصل وہ ہزاروں اور سیکڑوں سال پُرانا فیشن ہے۔ مجموعی طور پر ان سیاحوں نے یہاں کے لباس کو صاف ستھرا اور پاکیزہ کہا ہے۔ دولت مند لوگ ہر روز لباس تبدیل کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک دن میں کئی بار لباس بدلتے تھے۔ ڈیلاویل کو ہندوستانی لباس بہت پسند آیا وہ ایک جوڑا اپنے وطن اٹلی لے گیا اور وہاں عوام کو دکھایا۔[۴] غریبوں کا لباس عمدگی اور قیمت میں امراء اور رؤسا سے مختلف ہوتا تھا۔ علماء عام طور پر صافہ، قبا اور پائجامہ پہنتے تھے۔ برنیئر نے شاہجہاں کے دور کے ایک ہندو عالم کے لباس کی تفصیل لکھی ہے جس سے وہ بنارس میں ملا تھا۔ اس نے سفید سلک کا گلوبند اپنی کمر کے چاروں طرف باندھ رکھا تھا اور دوسرا حصہ ٹانگوں کے قریب لٹک رہا تھا اور دوسرا بڑا گلوبند (مفلر) جو سرخ رنگ کی سلک کا تھا وہ اپنے کاندھوں پر ڈال رکھا تھا۔[۵] مغل بادشاہ نئے نئے لباس ایجاد کرنے کے شوقین تھے۔ ہمایوں نے ایک لباس ایجاد کیا تھا۔ بادشاہوں کا لباس سلک کے

---

۴۔ سفرنامہ ڈیلاویل۔ صفحہ ۲۳۔ حصہ اول

۵۔ سفرنامہ برنیئر۔ صفحہ ۳۴۱۔

زردوزی ہوتے تھے۔ ہیرے جواہرات کے زیورات پہنتے تھے۔[6] شلوار اور برجس کا بھی رواج تھا قبا عام طور پر ٹخنوں تک ہوتی تھی۔ بچوں کو سونے کی زنجیریں پہنائی جاتی تھیں۔ جراب پہننے کا رواج بہت کم تھا۔ برنیئر کے بقول ہندوستان میں اتنی سخت گرمی پڑتی ہے کہ یہاں پر بادشاہ بھی موزے نہیں پہنتے۔[7] لیکن کہیں کہیں موزے پہننے کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ ترکی فیشن کے جوتے پہنے جاتے تھے تجارتی طبقہ (خاص طور پر دکاندار اور بنئے وغیرہ) اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے تاکہ تیزی سے چل سکیں۔ کالی کٹ (کلکتہ) میں موسم سرما میں چمڑے کے سلیپر اور گرمی میں کھڑاویں پہنی جاتی تھیں۔[8] عورتوں کا لباس ساڑی اور بلاؤز تھا جو عام طور پر دھاری دار یا سرخ رنگ کا ہوتا تھا۔ مسلمان عورتیں گھاگرا پہنتی تھیں۔ منوچی کے مطابق عورتیں دو یا تین کپڑے پہنتی تھیں جو وزن میں ایک اونس سے زیادہ نہ ہوتے تھے اور قیمت میں چالیس یا پچاس روپیہ سے کم نہ ہوتے تھے۔[9] مسلمان عورتیں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں سفید چادر یا برقعہ کا استعمال کرتی تھیں۔ دولت مند عورتیں انواع و اقسام کے جوتے پہنتی تھیں جن میں سونے اور چاندی کے پھول لگے ہوتے تھے۔[10] عطر و صندل کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ صابن قدیم زمانے سے ہندوستان میں رائج ہے، بنگال کا تیار شدہ خوشبودار تیل دہلی اور اس کے نواح میں کافی مقبول تھا، مفلس لوگ ناریل کا تیل ڈالتے تھے جب کہ

---

۶۔ سفرنامۂ مانزریٹ۔ صفحہ ۱۹۸

۷۔ سفرنامۂ برنیر صفحہ ۲۴۰۔ سفرنامۂ تھیونانٹ، باب ۲۰، صفحہ ۳۷۔

۸۔ سفرنامۂ مینڈسلو، صفحہ ۵۱۔

۹۔ سفرنامۂ تھیونانٹ، باب ۲۰، صفحہ ۳۸-۳۷۔

۱۰۔ آئی۔ اے۔ ای تصاویر نمبر ۵۱۹ ۔ ۱۷۲۰ عیسوی

امراء اور رؤساء اپنے جسم کو صندل سے معطر کرتے تھے۔[11] سرمہ اور خضاب کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ عورتیں اور مرد دونوں پان کھاتے تھے۔ لکڑی، دھات اور سینگ کے کنگھے استعمال ہوتے تھے۔ بال کئی طرز سے سنوارے جاتے تھے۔ بعض لوگ پیروں میں بھی خوشبو لگاتے تھے۔[12] دلچسپ بات ہے کہ اُس دور میں نائی آئینہ اور تولیہ لئے بازاروں میں گھوما کرتے تھے، ان کے پاس قینچی، استرا، ناخن تراش اور کان صاف کرنے کی سلائی ہوتی تھی، اس کی اُجرت ایک یا دو پیسہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔[13] عورتیں زیورات کا نہ پہننا بدشگونی سمجھتی تھیں۔ بازوبند، گجرہ، کنگن، جوا اور چوڑیاں اس وقت کے عام زیور تھے۔ گجراتی ہندو زیورات بنانے میں مہارت رکھتے تھے اس کے علاوہ یہ ہیرے جواہرات کی تجارت بھی کرتے تھے۔[14] ہندو عام طور پر گوشت نہ کھاتے تھے لیکن منوچی کے بقول پنجاب اور بنگال کے لوگ گوشت بھی کھاتے تھے۔[15] ہوسکتا ہے کہ منوچی نے افواہوں کو بھی اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہو۔ دلی، آگرہ اور لاہور میں مسلمان انواع و اقسام کے کھانے تیار کرتے تھے۔ برنیر اور منوچی نے مغل کھانوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ سرٹامس رو کے مطابق جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں امراء اپنے مہمان کے سامنے ایک وقت میں پچاس قابوں سے زیادہ پیش کرتے تھے۔ شاہی مطبخ خانہ میں مشہور شہروں سے خاص اشیاء فراہم کی جاتی تھیں۔ منوچی کے مطابق شاہ جہاں

---

۱۱۔ سفرنامۂ منوچی، باب دوم، صفحہ ۴۳۰۔

۱۲۔ سفرنامۂ ڈیلاویل، دوم، صفحہ ۳۷۷ - ۳۷۶۔

۱۳۔ اوونگٹن۔ صفحہ ۳۲۱۔

۱۴۔ سرٹامس رو، صفحہ ۹۲

۱۵۔ سفرنامۂ منوچی، باب دوم، صفحہ ۴۰ - ۳۳۹

اور اورنگ زیب کے زمانہ میں شاہی مطبخ خانہ میں ایک دن میں ایک ہزار روپیہ سے زیادہ خرچ ہوتا تھا۔ منوچی نے آگرے کی مٹھائی کی دکانوں کی بھی تعریف لکھی ہے لیکن برنیر نے دلّی کی دکانوں کی صفائی اور تعریف لکھی ہے۔ آم، رس بھریاں، سنترے، کھجور، انجیر اور انگور وغیرہ بکثرت بازاروں میں فروخت ہوتے تھے۔ پھلوں کی درآمد بھی ہوتی تھی۔ مہمانوں کی تواضع میں امرار ایک وقت کے ناشتہ پر ۲۰ کراؤن سے زیادہ صرف کرتے تھے (برنیر) برنیر دلّی کے بازاروں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کیونکہ یہاں پر سمرقند، بلخ اور ایران کے پھل بھی ملتے تھے۔ مغل بادشاہ گنگا جمنا کا خالص پانی پیتے تھے۔ عام لوگوں کا کھانا سادہ ہوتا تھا۔ کھچڑی ایک مقبول خوراک تھی جو مکھّن کے ساتھ کھائی جاتی تھی[۱۶]۔ جوار، باجرہ اور گیہوں کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ اعلیٰ متوسط طبقہ گیہوں، آٹا، اُبلے ہوئے چاول اور سبزیاں کھاتے تھے۔ گوشت کے علاوہ مچھلی بھی کھائی جاتی تھی۔ اچار، سیاہ مرچ اور گرم مصالحہ کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ قبولی اور پلاؤ کشمش اور بادام اور مکھن کے ساتھ کھائی جاتی تھی۔ حلوہ اور فالودہ میں خوشبو کا استعمال ہوتا تھا۔ کھانے کے آداب سخت نہ تھے۔ ایک دسترخوان فرش پر بچھایا جاتا تھا جس پر تمام قابیں رکھی جاتی تھیں، تمام افراد اُس کے چاروں طرف بیٹھتے تھے[۱۷]۔ دسترخوان سلک کے ہوتے تھے جن کو خوشنما بیل بوٹوں سے مزین کیا جاتا تھا۔ چمچوں کا استعمال عموماً نہ ہوتا تھا۔ شراب کا استعمال ہندو مسلمان ظاہری طور پر نہ کرتے تھے۔ عام لوگ نشیلی اشیاء میں تاڑی وغیرہ استعمال کرتے تھے، افیون کھانے کا بھی رواج تھا۔ مفلس لوگ بھنگ بھی کھاتے تھے[۱۸]۔ ۱۶۰۵ء کے بعد ہندوستان میں تمباکو بہت مقبول ہوگیا تھا۔ لوگ

---

۱۶۔ سترھویں صدی کے سیاح ۔ فوسٹر ۔ صفحہ ۲۶۳

۱۷۔ سفرنامۂ منوچی ۔ باب سوم ۔ صفحہ ۴۳۔

۱۸۔ لینس چوٹن کا سفرنامہ ۔ باب دوم ۔ صفحہ ۱۱۶ ۔ ۱۱۵۔

آلتی پالتی مار کر حقہ بھی پیا کرتے تھے کبھی کبھی عورتیں بھی حقہ پیتی تھیں ۔منوچی کے مطابق صرف دلی میں تمبا کو پر پانچ ہزار روپیہ کا ٹیکس لگتا تھا۔ اس ٹیکس کی منسوخی پر غریبوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پان چائے اور کافی بھی مختلف طریقوں سے استعمال ہوتی تھی ۔ دولت مند لوگ پان میں مشک اور قیمتی خوشبوئیں استعمال کرتے تھے ۔ دلی اور احمد آباد میں کافی کی دکانیں بکثرت موجود تھیں لیکن موجودہ قہوہ خانوں کے مانند نہ تھیں۔[19]

سترھویں صدی میں تفریح کے ذرائع موجودہ دور کے مانند نہ تھے ۔شطرنج ، چوسر مقبول کھیل تھے ۔ امرا اور رؤسا شکار کے شوقین تھے ۔چوگان کا کھیل گیارہویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ میں مقبول ہے۔ تماشہ گر اور بازی گروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اس سلسلہ میں سیاحوں نے ہندوستان کو سپیرے اور جادوگروں کا ملک کہا ہے ۔منوچی نے شہزادیوں اور امرا کی مستورات کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے ۔عورتوں کو ہنسی مذاق کی اجازت نہ تھی ۔باغات میں چہل قدمی کی بھی اجازت نہ تھی ۔صرف بہتے ہوئے پانی کی آواز سے اور پرندوں کے نغموں سے لطف اندوز ہو سکتی تھیں[20] تاش ، شطرنج ، چوسر ، چنڈل منڈل (ایک قسم کی چوسر جس میں ۱۶ سے ۳۶ آدمی کھیل سکتے ہیں) نرد (۲۴ خانوں پر پندرہ پندرہ آدمیوں کے دو گروپ کھیل سکتے ہیں) اور پچیسی کے کھیل اکبر کے دور میں کافی مقبول تھے ۔گلیوں کا کھیل بھی ہر دلعزیز تھا۔ دو گٹی ، تری گٹی ، نو گٹی اور بارہ گٹی کا کھیل ہوتا تھا۔ کشتی کا بھی رواج تھا ، مکے بازی بھی ہوتی تھی جس میں ایرانی اور ترکی مکے باز حصہ لیتے تھے ۔تیر اندازی

---

۱۹۔ منوچی صفحہ ۴۵۰

۲۰۔ سفرنامۂ منوچی ۔ دوم ۔ صفحہ ۵۳ ۔ ۲۵۲

تلوار چلانا اُس دور کے اعلیٰ طبقہ کا فیشن تھا۔ بابر نے تزکِ بابری میں گینڈے کی لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ شاہ جہاں نے کشمیر کے سفر کے دوران مختلف جانوروں کی لڑائی سے لطف اٹھایا۔ نیل گائے، ہرن، چیتا اور شیر کا شکار ہوتا تھا۔[۲۱] کتوں اور بازوں کو بھی شکار کی تربیت دی جاتی تھی جو شاہی شکار میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ بکریاں، مرغ، بٹیر، بارہ سنگے، ہرن، کتے، بلبل اور بیل وغیرہ جانوروں کی بھی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ کبوتر پالنے کا شوق بھی تھا جو عشق بازی کے نام سے مشہور تھا۔ شاہ جہاں اور دوسرے مغل بادشاہ جانوروں اور انسانوں کی لڑائی سے بھی خوش ہوتے تھے۔[۲۲] دلی اور آگرے میں اس قسم کی لڑائیوں کے لئے مخصوص میدان بنوائے گئے تھے۔ برنیر نے ہاتھیوں کی لڑائی کی دلچسپ تفصیل لکھی ہے۔ ہاتھیوں کے درمیان ایک دیوار بنوائی جاتی تھی اور کچھ وقفہ کے ساتھ ہاتھیوں کی لڑائی ہوتی تھی، دانت اور سونڈ زخمی ہوتے۔ مٹی کی دیوار توڑ کر ہاتھی اپنے مقابل دشمن کو زخمی کرتا۔ ہاتھیوں کو علیحدہ کرنے کے لئے چرخی (آتش بازی) کا استعمال ہوتا تھا۔ یہ ہاتھی سیلون سے آتے لیکن ان کو جنگ میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔

(باقی آئندہ)

---

۲۱۔ سفر نامۂ برنیر، صفحہ ۲۱۸۔

۲۲۔ میں ڈیلسلو کا سفر نامہ، صفحہ ۴۳۔

عماد الحسن آزاد فاروقی

# بھکتی اور بھگت کبیر

ہندوستانی مذاہب میں 'بھکتی' اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس کی بنیاد انسانی روح اور ذات الٰہی کے درمیان براہ راست تعلق پر قائم ہے۔ 'بھکتی' میں، دوسرے ہندوستانی مذاہب کی بہ نسبت، انسانی روح جو رشتہ خدا سے قائم کرتی ہے اس کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اپنے ماخذ کے لحاظ سے 'بھکتی' لفظ کا سراغ مشہور سنسکرت نحوی پنینی کے سوتر (3.95 .17) تک ملتا ہے اگرچہ اس جگہ اس کے معنوں میں انفعالیت شامل ہے اور 'بھکتی' کا استعمال ایسی چیز کے لئے کیا گیا ہے 'جس سے محبت کی جائے' یا 'اس کا خیال رکھا جائے' بہ نسبت 'محبت کرنے' یا 'خیال رکھنے' کے جن معنوں میں کہ یہ اب استعمال ہوتا ہے۔ 'یاسکا' نے بھی اس کو انھیں انفعالی معنوں میں استعمال کیا ہے۔[1]

بہرحال، پنینی، پتانجلی، میگاستھینز اور ان کتبوں کی بنا پر جو راجپوتانہ میں گھوسنڈی اور بیسانگر کے مقام پر پائے گئے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں شمالی ہندوستان میں ایک ایسا مذہب پایا جاتا تھا جس میں صرف 'واسودیو'

---

جناب عماد الحسن آزاد فاروقی، لکچرر شعبۂ اسلامک اور عرب و ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱۔ بھنڈارکر، آر، جی، وشنوازم شیوازم اینڈ مائنر ریلیجیس سسٹمس، انڈولوجیکل بک ہاؤس وارانسی، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۹۔

کو عبادت کے لائق، سمجھا گیا ہے۔ اس مذہب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف ایک خدا واسودیو کی پرستش ہوتی تھی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عقیدت اور محبت کو ذریعہ سمجھا گیا تھا۔ اس کو ایکانت دھرم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا اور اس میں اہنسا پر بھی کافی زور تھا[1]۔ قیاس ہے کہ یہ ایکانت دھرم اُسی مذہبی اُتھل پتھل کے نتیجے میں رونما ہوا ہوگا جو کہ ہندوستان کے مشرقی حصے میں بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب کے پیدا ہونے کا باعث ہوا۔ اسی نے ہندوستان کے مغربی حصّے میں ایک وحدانیت پرست مذہب ایکانت دھرم کو جنم دیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نئے پیدا ہونے والے یہ سارے کے سارے مذاہب قربانی اور بھینٹ کو، جو کہ برہمنوں اور ویدوں کے مذہب کی خصوصیت تھی، نجات کا ذریعہ سمجھنے کے مخالف ہیں اور اہنسا کی تعلیم دیتے ہیں۔ پرانے ویدوں کے مذہب سے بنیادی اختلاف رکھنے کے باوجود، ایکانت دھرم برہمنی مت کے حلقۂ اثر میں ہی شامل ہے بلکہ اس کو برہمنی حلقہ کے ایک ترقی پسند عنصر کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جس نے کہ اپنے زمانہ کے نئے روحانی تجربات سے فائدہ اٹھایا اور برہمنی نقطۂ نظر کے مطابق ان ملحدانہ، عناصر سے تحرّلی جو بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب کی شکل میں نمودار ہو رہے تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر بھگوت گیتا کے منظم کئے جانے تک کا ایکانت دھرم کا زمانہ بھگتی مارگ، کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔

بھگوت گیتا میں پہلی دفعہ اس قدیم وحدانیت پرست مذہب کو بھگتی مارگ، کی حیثیت سے منظم کیا گیا اور اسکے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، بھگوت گیتا کی تعلیم بنیادی طور سے زندگی میں حصّہ لینے اور فرض کو بغیر کسی ذاتی نفع کے لئے محض فرض کی حیثیت سے پورا کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس میں بھی ایک خدا کی پرستش کی تعلیم دی گئی ہے البتہ

---

۲۔ ایضاً صفحہ ۷۔

بھگوت گیتا کے مطابق سری کرشن جی اس ایک خدا کے اوتار[۳] یعنی اس کا انسانی روپ ہیں اس لئے ان سے عقیدت اور محبت خدا کی عقیدت اور محبت ہے۔ بھگوت گیتا میں اگرچہ 'نجات' حاصل کرنے کے مختلف طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ مگر بہرحال سری کرشن جی سے محبت اور عقیدت کو ان سب دوسرے طریقوں پر افضلیت حاصل ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بھگوت گیتا میں جس قسم کی 'بھکتی' کی تعلیم دی گئی ہے اس کو ہم 'داسیہ رس' سے متعلق سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی اس 'بھکت' (بندے) اور 'بھگوان' (خدا) کا رشتہ آقا اور غلام جیسا ہے۔ بھکت کا مقام بھگوان سے بہت نیچے ہے اور دونوں کے درمیان بہت فصل ہے۔ تصور یہ ہے کہ بھکت اپنی عقیدت کا اظہار بھگوان کی بندگی اور خدمت کے ذریعہ کرے۔ مختصراً یہ کہ بھگوت گیتا میں خدا کی صفت جلال زیادہ نمایاں ہے اور یہ اُس کرشن بھکتی سے بہت مختلف ہے جو کہ قرون وسطیٰ میں بھگوت پران کی تصنیف کے بعد زور و شور سے جاری رہی، اس کے بعد کے دور میں بھکت اپنے آپ ورنداون کی گوپیاں سمجھتے تھے جو سری کرشن جی کی محبت میں سرشار تھیں اور بھکت کے بجائے بھگوان کی خدمت و عقیدت کے اس کی محبت اور وصال کی باتیں کرتے ہیں۔

بھگوت گیتا کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں باوجود 'بھکتی' کی تعلیم کے ذات پات کی تقسیم کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر شخص کو اُس کی اپنی 'جاتی' (ورن) کے مطابق فرائض کو ادا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ ہر شخص اپنی جاتی (ورن) کے

---

۳۔ بھگوت گیتا کے چوتھے باب میں سری کرشن جی ارجن سے کہتے ہیں "میں پیدائش سے بالاتر، لافانی، سب جانداروں کا پروردگار ہوتے ہوئے بھی اپنی فطرت کے مطابق خود اپنی مایا سے پیدا ہوا۔ اے بھارت! جب کبھی حق کو زوال آتا ہے اور باطل کو فروغ ہوتا ہے تو میں نمایاں ہو جاتا ہوں۔" احمد حسن الدین (مترجم) شریمد بھگوت گیتا نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۷۵، صفحہ ۳۸۔۳۹۔

مطابق زندگی گذارتے ہوئے سری کرشن جی کی بھکتی کرکے اُن کو پاسکتا ہے۔ اسی راسخ العقیدگی کے ساتھ بھگوت گیتا نے ویدوں کی مذہبی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے حالانکہ قرون وسطٰی کے بھکتوں میں ہمیں ذات پات کے خلاف اکثر اور ویدوں کے خلاف کبھی کبھی شدید ردعمل ملتا ہے۔ قرون وسطٰی یعنی گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے[4] بھکتی تحریک کا جو رنگ ہندوستان میں رہا اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'بھکتی' کا یہ انداز بھگوت گیتا کی نہج سے کافی مختلف تھا اور اس طرح ہم بھگوت گیتا کے منظم کئے جانے سے لے کر گیارہویں صدی عیسوی تک کے زمانے کو بھکتی کا دوسرا دور قرار دے سکتے ہیں۔

'بھکتی مارگ' کے تیسرے دور کو رامانج اچاریہ سے شروع کرنا مناسب ہوگا۔ سری رامانج اچاریہ کی پیدائش مدراس کے علاقہ میں ۱۰۱۶ء میں ہوئی اور ان کے تعلیم کردہ فلسفہ کو 'وشِشٹ ادویتا' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سری رامانج نے اپنے فلسفہ میں تین بنیادی حقیقتوں مادی دنیا، روح اور خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ پہلے دونوں وجود یعنی مادی دنیا اور روح اگرچہ الگ اپنی حیثیت رکھتے ہیں لیکن وہ خدا کے وجود کا حصہ ہیں[5]۔ سری رامانج کے فلسفہ نے اپنے بعد آنے والے بھکتوں کو بہت متاثر کیا اور ان میں سے بہت سے بھکتوں نے اپنی فلسفیانہ بنیادوں کے لئے سری رامانج کے فلسفہ 'وشِشٹ ادویتا' کو ہی استعمال کیا ہے۔

---

۴۔ بھگوت گیتا سے مختلف انداز کی یہ بھکتی جنوبی ہندوستان میں 'الور' نام کے بھکتوں کے ذریعہ ساتویں اور آٹھویں صدی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اور وہاں سے پھر یہ طرز شمالی ہندوستان میں منتقل ہوا جہاں دھیرے دھیرے اس نے ایک عظیم تحریک کی شکل اختیار کرلی۔

۵۔ اس صورت حال کی تمثیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جس طرح درخت میں شاخیں اور پتّے وغیرہ الگ اپنی حیثیت رکھتے ہیں لیکن وہ سب ایک وجود یعنی درخت کے بھی حصّے ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ جب ہندوستان کی سرزمین میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو رہا تھا جو ہندوستان کی آئندہ تاریخ کے لئے نہایت اہم ثابت ہونے والا تھا۔ ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری کی فتح دہلی اور اجمیر کے ساتھ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑنے سے پہلے بھی مسلمان جنوبی ہندوستان میں کالی کٹ اور شمال مغرب میں سندھ و پنجاب میں موجود تھے البتہ ان کے اثرات محدود تھے اور وہ اپنے حلقۂ اثر کو کبھی بھی زیادہ نہیں بڑھا سکے۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد سے اس ملک میں باہر سے آنے والے مسلمانوں اور مقامی آبادی کے اسلام قبول کرتے رہنے کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی اثرات محسوس ہونے لگے۔

اگرچہ سری رامانج کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کو کبھی اسلامی عقائد کے متعلق معلومات ہوئی ہوں گی، لیکن رامانند جی اور ولبھ اچاریہ جو کہ چودھویں اور پندرہویں صدی میں ہوئے اگر اسلام اور صوفیاء کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ صوفیاء کرام اسلامی تہذیب میں روحانیت کے علم بردار تھے اور ہندوستان آنے سے پہلے ہی وہ اپنے میدان میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ علاوہ تصوف کے دوسرے گوشوں کے صوفیاء کرام کے نزدیک انسان کا خدا سے عشق و محبت کا تصور بھی ایک ایسا باب تھا جو تصوف کے ہندوستان منتقل ہونے سے پہلے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ رامانج کے بعد شمالی ہندوستان کی بھکتی تحریک میں جو عشق و محبت کے جذبات کی شدت اور والہانہ کیفیت پائی جاتی ہے وہ کسی حد تک صوفیانہ اثرات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ اگر وسطی ہندوستان کے بھکتوں میں عشق حقیقی کے اس نشہ کو رامانج کی فلسفیانہ اور بھگوت گیتا کی تقدس آمیز بھکتی کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے قرون وسطیٰ کے بھکتوں میں ذات پات کی مخالفت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے کہ تمام انسان آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں

اسلام انسانوں کے درمیان رنگ ونسل یا ذات پات کی بنیاد پر قائم کسی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ رامانند جی نے اپنے زمانہ اور بھگتی کی روایات کے خلاف ہر ذات وخاندان کے افراد کو اپنے حلقہ میں شامل کرنے کا جو انقلابی قدم اٹھایا تھا اس میں اسلامی اقدار کا بھی کچھ اثر ہو سکتا ہے۔ بہرحال رامانند جی بھی ویدوں کو تسلیم کرتے تھے اور ذات پات کے بندھنوں سے مکمل طور سے آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ یہ سہرا ان کے شاگرد اعظم بھگت کبیر کے سر بندھنے والا تھا کہ انھوں نے ویدوں اور ان پر مبنی ذات پات کی تقسیم کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا بلکہ ان خیالات کی مخالفت اور ان کا کھوکھلا پن ثابت کرنے میں اپنی تمام تر توانئیں صرف کر دیں۔

رامانند کے تمام شاگردوں میں کبیر صاحب، اپنے روحانی تجربے کی گہرائی اور ان اثرات کی بنا پر جو انھوں نے آنے والی نسلوں پر چھوڑے، نہایت ممتاز ہیں۔ وہ ایک رُوحانی عبقری تھے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی روحانی شخصیات میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ ایولین انڈرہل جو انگریزی میں علم تصوف پر ایک نہایت مبسوط کتاب کی مصنف ہیں نیز مذاہب عالم کے متصوفانہ ورثہ پر گہری نظر رکھتی ہیں کبیر صاحب کے بارے میں لکھتی ہیں: "کبیر، کامل ترین صوفیا، کے اُس محدود حلقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سینٹ آگسٹائین، رِزبراک اور جلال الدین رومیؒ وغیرہ نہایت اہم ہیں جنھوں نے اس مقام تک رسائی حاصل کی تھی جسے ہم اُلوہیت کے ایک مربوط وجدان سے تعبیر کر سکتے ہیں[6]۔"

درحقیقت بھگت کبیر کی شخصیت میں یہی باہم متضاد عناصر کا ربط ہے جو کہ

---

۶۔ ایولین انڈرہل۔ مقدمہ ون ہنڈرڈ پومیس آف کبیر۔ میک میلن اینڈ کمپنی لندن۔ ۱۹۶۲ ـ صفحہ xxiii

ان کے مخصوص روحانی تجربہ کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ روایت کے مطابق وہ ۱۳۹۸ء
میں ایک بیوہ برہمنی کے گھر پیدا ہوئے اور ان کی پرورش بنارس میں ایک مسلمان جولاہے
نورو کے ہاتھوں ہوئی۔ اس طرح ان کی زندگی کی ابتدا سے ہی ان کے وجود میں مختلف
عناصر کا وہ امتزاج شامل ہو گیا تھا جو کہ آگے چل کر ان کا روحانی سرمایہ بننے والا تھا۔
کم عمری میں ہی اپنے زمانہ کے مشہور بھکت رامانند سے شاگردی کا شرف حاصل کیا اور
ایک خدا کی بھکتی میں لگ گئے۔ ان کی روحانی تربیت کے سلسلے میں ایک شیخ تقی کا بھی
نام لیا جاتا ہے جن کو کبیر صاحب کے مسلمان نام لیوا (کبیر پنتھی) کبیر صاحب کا پیر بتلاتے ہیں[7]۔
بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ کبیر صاحب اپنے زمانے کی مشہور ہندو و مسلمان روحانی
شخصیتوں سے بنارس میں یا اپنے مختلف سفروں کے دوران، جس کے بارے میں ہماری
معلومات بہت محدود ہیں، ملے ہوں گے۔

کبیر صاحب کی روایتی سوانح عمریوں میں سلطان سکندر لودھی کے ساتھ
کچھ ناخوشگوار واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں سلطان سکندر لودھی کے زمانے
میں کچھ مذہبی جھگڑوں کا ذکر ہے جو ہو سکتا ہے کبیر صاحب کی شخصیت سے متعلق رہے ہوں[8]۔
ایک رامائنی اور بھکت مالا کی بنیاد پر عوام نے اس میں بہت کچھ اضافے کر لئے۔ سارا قصہ
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں جماعتوں کا با اثر طبقہ کبیر صاحب کے
سماج کی مسلّمہ روایتوں کے خلاف باغیانہ خیالات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ سکندر لودھی
کے دورۂ اودھ کے موقع پر اس طبقہ نے کبیر صاحب کے خلاف اُس کے کافی کان بھرے
اور کبیر صاحب پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی بے عزتی اور عوام کو گمراہ کرنے کے الزامات

---

۷۔ جی، ایچ، ویسٹکاٹ، کبیر اینڈ کبیر پنتھ، سشیل گپتا لمیٹڈ، کلکتہ، ۱۹۵۳، صفحہ ۲۵۔

۸۔ ایچ، ایچ، ولسن، ریلیجس سیکٹس آف دی ہندوز، سشیل گپتا لمیٹڈ، کلکتہ، ۱۹۵۸، صفحہ ۳۸۔

لگائے۔ بہر حال تمام روایتیں اس پر متفق ہیں کہ کئی آزمائشوں کے بعد سکندر لودھی پر کبیر صاحب کی روحانیت واضح ہوگئی اور اس نے انھیں عزت اور احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔

کبیر صاحب نے اپنی عمر کا آخری حصہ مگہر ضلع گورکھپور میں گذارا جہاں ان کا مزار آج بھی موجود ہے۔ کچھ لوگ اس میں بھی کبیر صاحب کے رسم پرستی کے خلاف جذبہ کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جبکہ ہندوؤں میں بنارس میں وفات، پانا بہت بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے اور سارے ہندوستان سے لب مرگ لوگ بنارس پہنچنے کی آرزو کرتے ہیں۔ کبیر صاحب ساری زندگی بنارس میں گذار کر اپنی موت کے قریب مگہر چلے آئے۔ بنارس میں بھی کبیر چورا کے نام سے ایک جگہ مشہور ہے جہاں کہ ان کے ہندو ماننے والے کبیر صاحب کی خاک کو مدفون بتلاتے ہیں میکالف کی روایت کے مطابق کبیر صاحب کا انتقال ۱۵۱۸ء میں ہوا۔

کبیر صاحب کے سلسلے میں متعدد تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایچ، ایچ، ولسن نے اپنی کتاب 'ریلیجس سیکٹس آف دی ہندوز' میں کبیر صاحب کی بیس تصانیف کا ذکر کیا ہے جو کہ ان کی پانچ ہزار مقبول عوام ساکھیوں اور اُن کے اُس کلام کے علاوہ ہیں جو سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔ مذکورہ بالا تصانیف کا مجموعہ 'خاص گرنتھ' کے نام سے مشہور ہے اور بنارس میں چورا کے مقام پر رکھا ہوا ہے۔

پہلی اور دوسری رامائنی سے جہاں کبیر صاحب نے تخلیق کائنات کے متعلق گفتگو کی ہے نیز ان کے کلام کے دوسرے حصوں کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کبیر صاحب شنکراچاریہ کے وحدۃ الوجود یا ادویتا کے قائل نہ تھے۔ انسانی روح کا خدا سے وصال جو کہ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد ہے ایسا عرفان

نہ تھا جس میں کہ انسانی روح اپنی شخصیت کو کھو دیتی ہے بلکہ کبیر صاحب کے لئے یہ ایک عاشق کی اپنے محبوب سے ملاقات تھی جس میں بہرحال دونوں کی شخصیات الگ باقی رہتی ہیں۔ اس طرح کبیر صاحب کی بھگتی نہ تو شنکر اچاریہ کے فلسفۂ وحدۃ الوجود سے متأثر تھی نہ وہ رامانج کے انداز پر تھی جہاں فلسفیانہ گتھیاں اور اصطلاحات و تعریفوں کی تراش خراش جذبۂ محبت کی گرمی پر غالب نظر آتے ہیں اور نہ ہی ان کی بھگتی گیتا کے انداز کی تھی جسے 'داسیہ رس' کے نام سے پکارا جاتا ہے بلکہ کبیر صاحب کی بھگتی 'مدھر رس' کی قسم میں شامل سمجھی جائے گی۔ 'مدھر رس' کے اندر بندے کا خدا سے اس انداز کا تعلق ہوتا ہے جو کہ ایک عاشق کا اپنے محبوب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس انداز کی خصوصیت، جذبۂ محبت کی شدت، عشق کا والہانہ پن اور خدا کے ساتھ بے تابانہ محبت کا اظہار وغیرہ ہیں۔ یہ خصوصیات ہمیں کبیر صاحب کے کلام میں بخوبی نمایاں نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے:

"ابنا سی دولہا کب ملہو ، بھکتن کے رچھپال
جل اُپجی جل ہی سوں نیہا ، رٹت پیاس پیاس
میں ٹھاڑی برہن مگ جو واں پریتم تری آس
چھوڑے گیہہ نیہہ لگ تم سوں ، بھئی چرن لولین
تالابیلی ہوت گھر بھیتر جیسے جل بن مین
دِوَس بھوکھ رین نہیں ندرا گھر انگنا نہ سہائے
سیجریا بیرن بھئی ہم کو جاگت رین بہائے
ہم تو تری داسی سجنا ، تم ہرے بھرتار
دین دیال دیا کر آؤ ، سمرتھ ہار
کے ہم پران تجت ہیں پیارے ، کے اپنی کرلیو

داس کبیر برہا ات باڑھیو ہم کو درس دیو

(میرے لازوال دولہا کب ملوگے، تم تو بھگتوں کے رکھوالے ہو۔ پانی میں پیدا ہوئی اور پانی ہی سے محبت ہے، پھر بھی میں پیاس پیاس چلاتی ہوں۔ میں برہ کی ماری کھڑی ہوئی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں، میرے پریتم بس تمہاری ہی آس ہے۔ تمہاری محبت میں گھر چھوٹ گیا اور میں تمہارے قدموں میں آگئی۔ گھر کے اندر میں ماہئ بے آب کی طرح تڑپتی ہوں۔ دن کو بھوک نہیں لگتی، رات کو نیند نہیں آتی اور گھر کا آنگن سہانا نہیں لگتا اب تو میری سیج میری دشمن ہو گئی ہے، ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ ساجن میں تو تمہاری کنیز ہوں۔ تم میرے مالک ہو۔ اے غریب نواز اب رحم کرو اور آجاؤ۔ تم قادر مطلق اور خالق ہو۔ یا تو مجھے اپنا بنالو یا میں اپنی جان دے دوں گی۔ داس کبیر کے لئے جدائی حد سے بڑھ گئی ہے، اب مجھے اپنا جلوہ دکھا دو۔"[9]

ایک اور جگہ اسی انداز میں لکھتے ہیں :

"تن من دھن باجی لاگی ہو

چوپڑ کھیلوں پیو سے رے تن من باجی لگایا

ہاری تو پیہہ کی بھئی رے، جیتی تو پیہہ مور ہو"[10]

ایک اور پد کے بول ہیں :

سمجھ دیکھ من میت پیر دا

عاسک ہو کر سونا کیا رے

پایا ہو تو دے لے پیارے

پائے پائے پھر کھونا کیا رے

---

۹۔ متن اور ترجمہ سردار جعفری، کبیر بانی، ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی ۱، ۱۹۶۵، صفحہ ۲۲۲۔
۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۴

جب انکھین میں نیند گھنیری
تکیہ اور بچھونا کیا رے
کہیں کبیر پریم کا مارگ
سر دینا تو رونا کیا رے"[11]

ایک پد میں کبیر صاحب بھکتی مارگ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"بھکتی کا مارگ جھینا رے
نہیں اچاہ نہیں چاہنا، چرنن لو لینا رے
سادھن کے رس دھار میں، رہے نس دن بھینا رے
راگ میں سُرت ایسے بسے جیسے جل مینا رے
سائیں سیون میں دیت سر، کچھ بلم نہ کینا رے
کہیں کبیر مت بھکتی، پرگٹ کر دینا رے

(بھکتی کا راستہ باریک ہے وہاں چاہنا اور نہ چاہنا بیکار ہے، صرف مالک کے قدموں پر نثار ہو جانا ہی سب کچھ ہے۔ وہاں بھگت اپنی سادھنا کی رس دھارا میں ہر وقت ڈوبا رہتا ہے۔ اُس کے راگ میں محبت ایسی رچی اور بسی ہوئی ہے جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ وہ سائیں (حق) کی سیوا میں بنا کسی غم کے اپنا سر دے دیتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ میں نے اس بھکتی کے راز کو ظاہر کر دیا ہے۔"[12])

کبیر صاحب کی روحانی زندگی کا ایک اور پہلو جو ان کے کلام میں بہت زیادہ نمایاں ہے وہ ظاہری اعمال اور رسوم اور ان کی بنیاد پر قائم کردہ مختلف مذاہب اور فرقوں

---

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۰

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۰

کی تقسیم کی شدید مخالفت ہے۔ کبیر صاحب کے خیال میں بنی نوع انسان کو مختلف قسموں میں بانٹنے کی ذمہ دار ظاہری رسم و رواج اور مذاہب کی ظاہری شکل وصورت ہے۔ داخلی اعتبار سے سبھی لوگوں کا مقصود وہی حقیقت اعلیٰ ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کیے گئے اور جب یہ ظاہری طریقے بذات خود مقصود ہو گئے تو یہی رسم پرستی اور روایت پرستی بن گئی جو سوائے لوگوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ کرنے کے اور سچی روحانیت سے ان کو دور رکھنے کے علاوہ کسی اور مصرف کی چیز نہیں ہے۔ کبیر صاحب کے نزدیک انھیں ظاہری رسومات پر زور دینے کی وجہ سے ہندو مسلمان اور مختلف ذاتوں کے لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں جبکہ ان کا حقیقی مقصود حقیقت الٰہیہ ان رسومات سے بالاتر چیز ہے۔ ان کے خیال میں لوگ اگر ان ظاہری اعمال اور رسومات پر زور دینے کے بجائے مقصود حقیقی سے لو لگائیں تو وہ سچی خوشی حاصل کرسکیں گے اور ان کے درمیان ایک دوسرے سے نفرت کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی۔ ان خیالات کا اظہار کبیر صاحب نے جگہ جگہ اپنے کلام میں مختلف انداز سے کیا ہے۔ ایک پد میں کہتے ہیں:

"موکوں کہاں ڈھوڑے بندے، میں تو تیرے پاس میں
نامیں دیول، نامیں مسجد، نا کعبے کیلاس میں
ناتو کونو کریا کرم میں، نہیں یوگ بیراگ میں
کھوجی ہوئے تو ترتے، ملیہوں پل بھر کی تالاس میں
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، سب سوانسوں کی سوانس میں"

(اے بندے تو مجھ کو کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہے، میں تو تیرے پاس ہی ہوں۔ نہ میں مندر میں ہوں، نہ مسجد میں، نہ کعبہ اور کیلاش میں، نہ کسی ظاہری عبادت میں، نہ یوگ بیراگ میں۔ اگر سچے دل سے کھوجنے والا ہو تو پل بھر کی تلاش میں مل جاؤں گا۔ کبیر کہتے ہیں بھائی سادھو سنو، وہ تو ہر سانس

میں موجود ہے۔)[۱۳]

ایک اور جگہ ظاہری مذہب کے نام پر انسانوں کی تقسیم کے خلاف اس طرح آواز بلند کرتے ہیں:

"سادھو دیکھو جگ بورانا
سانچی کہو تو مارن دھاوے جھوٹے جگ پتیانا
ہندو کہت ہے رام ہمارا مسلمان رحمانا
آپس میں دوؤ لڑے مرت ہیں مرم کوئی نہیں جانا
بہت ملے مونہی نیمی دھرمی پرات کرے اسنانا
آتم چھوڑ پشانیں پوجیں، تنکا تھوتھا گیانا
بہتک دیکھے پیر اولیا، پڑھیں کتاب کرانا
کریں مرید کبر تبلاویں انھوں کھدا نہ جانا
یا بدھ ہنست چلت ہیں ہمکو آپ کہاویں سیانا
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، ان میں کون دِوانا"[۱۴]

(سادھو دیکھو دنیا پاگل ہوگئی ہے۔ سچی بات کہو تو مارنے دوڑتے ہیں اور جھوٹ پر دنیا والوں کا ایمان ہے۔ ہندو کہتا ہے رام میرا ہے مسلمانوں نے رحمان کو اپنا لیا ہے۔ دونوں آپس میں لڑے مرتے ہیں لیکن بھید کسی کو پتہ نہیں (کہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں) مجھے بہت سے دھرمی اور دھرم کے قوانین ماننے والے ملے جو کہ روز صبح کو اشنان کرتے ہیں اپنی روح کو چھوڑ کر پتھر کی پوجا

---

۱۳۔ ایضاً صفحہ ۶۶

۱۴۔ ایضاً صفحہ ۲۱۸

کرتے ہیں۔ ان کا سب علم جھوٹا ہے ۔ بہت سے پیر اولیا ر بھی جو قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں لوگوں کو قبر بتلاتے ہیں اور مرید کرتے ہیں لیکن انھوں نے بھی خدا کو نہیں جانا۔ یہ ہمارا اس طرح مذاق اڑاتے ہیں اور اپنے کو عقلمند سمجھتے ہیں سادھو بھائی تمھیں بتاؤ کہ ہم دونوں میں کون پاگل ہے۔)

کبیر صاحب جس طرح ان مذہبی رسومات کے خلاف تھے جو لوگوں کو آپس میں جُدا رکھتی ہیں، اسی طرح وہ ذات پات اور خاندانی اعتبار سے انسانوں میں تفریق کے بھی بہت سخت دشمن تھے۔ اس پورے تصور کا وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ مذاق اڑاتے رہتے ہیں اور اس نظام کا کھوکھلا پن ثابت کرتے رہتے ہیں۔ اونچی ذاتوں کے لوگ خاص طور پر برہمن چھوت چھات کی پابندیوں کی وجہ سے اکثر ان کے تیکھے طنز کا نشانہ بنتے رہتے ہیں،

"پانڑے بوجھ پیہو تم پانی
جہی مٹیا کے گھر ماں بیٹھے، تا ماں سسٹ سمانی
چھپن کوٹ جادو جہاں بھینجے منی جن سہس اٹھاسی
پیگ پیگ پیگمبر گاڑے، سو سب سر بھو مانٹی
تے ہی مٹیا کے بھانڑے پانڑے، بوجھ پی ہو تم پانی"[15]

(پانڈے پہلے ذات پوچھ کے تب تم پانی پیتے ہو (حالانکہ) جس مٹی کے گھر میں تم بیٹھے ہو اس میں ساری خلقت سمائی ہوئی ہے۔ چھپن کروڑ یادو اور اٹھاسی ہزار منی یہاں غرق ہو گئے ہیں اور قدم قدم پر گڑے ہوئے پیغمبروں کی لاشیں سڑ کر مٹی ہو گئی ہیں اسی مٹی کے برتنوں میں تم ذات پوچھ کر پانی پیتے ہو۔)

---

۱۵۔ ایضاً صفحہ ۲۱۰

اپنے جذبۂ محبت کی گرمی، مذہب کی ظاہری رسومات کی جگہ اُس کی معنویت پر زور اور انسانوں کے درمیان کسی طرح کی تفریق کی شدت سے مخالفت کے لحاظ سے کبیر صاحب کے اندر بہت سے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی صوفیاء کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے کلام میں اسلامی عقائد کے حوالے اور عربی و فارسی اصطلاحات کا استعمال بھی ان کے اسلامی ماحول سے اچھی طرح واقف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن ان اسلامی عناصر کی جھلکیوں کے علاوہ جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، کبیر صاحب کا بقیہ پورا ماحول خالص ہندوستانی اور ہندوانہ ہے۔ خدا کے لئے ان کا محبوب نام رام ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی تخلیق اور روح کا خدا سے تعلق اور نجات جیسے تصورات بھی ہندوستانی فلسفوں سے ماخوذ ہیں۔ اس طرح ہم کبیر صاحب کو رامانند کے وسیلے سے بھکتی تحریک کے بنیادی دھارے میں شامل سمجھ سکتے ہیں جن کی وسیع النظری اور روحانیت انھیں دوسرے حلقوں سے استفادہ کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ کبیر صاحب کے روحانی تجربہ کا سب سے بڑا پیغام یہی معلوم ہوتا ہے کہ سچی روحانیت کبھی لوگوں کو تقسیم نہیں کرتی بلکہ ان کے درمیان تفریق کی دیواروں کو ڈھانے کا کام سرانجام دیتی ہے۔

جان اوبریان
ترجمہ شہاب الدین انصاری

# اسٹریلیا میں اسلام کی اشاعت

اسٹریلیا میں اسلام تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ ۱۸۶۰ء کے مقابلہ میں جبکہ یہاں صرف ایک مسلمان تھا آج ایک لاکھ مسلمانوں کی آبادی کا اندازہ ہے۔ مختلف سماجی اور نسلی روایات کے حامل یہ مسلمان ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں اور ملک کے اطراف میں نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔

ملک میں اسلام کے اولین نام لیواؤں میں شتربانوں کے قابل ذکر گروہ کے ارکان تھے جن کا سلسلہ ۸۰ برس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ اُن کے بعد ملیشیا اور انڈونیشیا سے موتی نکالنے والے غوطہ خور، بلقان کے مہاجرین، ایشیائی ممالک کے طالب علم، مختلف ملکوں کے سفراء، دانش ور اور تجار آئے۔

دوست محمد، ایک کشمیری پٹھان، سب سے پہلا اور غالباً معروف ترین ساربان تھا۔ یہ اُن تین ساربانوں میں سے ایک تھا جو ۱۸۶۰ء میں برک اور ولس (Burke and wills) کی سربراہی میں مہم کے لئے ۲۴ پشاوری اونٹوں کے قافلے کے ساتھ اسٹریلیا آئے تھے۔

---

جناب شہاب الدین انصاری، لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

دوسرے دوساربانوں کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ غالباً یہ لوگ ملک کو جنوبی سمت سے شمالی سمت تک پار کرنے کی اس بدنصیب مہم کے پہلے سفر کے شروع ہونے کے فوراً بعد ہی اپنے وطن کو مراجعت کر گئے۔ لیکن دوست محمد مہم کے رکن کی حیثیت سے اناّمنکا (Inna minnka) کے قریب کوپرس کریک (Coopers Creek) تک ساتھ رہے اور چار اشخاص پر مشتمل مہم کے ہراول دستہ نے جب یکایک اپنا رخ خلیج کاپینٹاریہ کی جانب موڑ دیا تو دوست محمد کو سخت تنگ دستی سے دوچار ہونا پڑا۔ واپسی کے سفر میں برک اور ولس کوپرس کریک کے مقام پر فوت ہو گئے اور دوست محمد کا انتقال کچھ عرصہ بعد مینڈی (Menindee) میں اپنے وطن کا دوبارہ دیدار کئے بغیر ہو گیا۔

جنوبی آسٹریلیا کے ایک ممتاز مالک چراگاہ سر تھومس ایلڈر (Sir Thomas Elder) نے ۱۲۰ اونٹ کراچی سے درآمد کئے اور ان کے ساتھ ۱۲ ساربانوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان کے بعد سے دوسرے ساربان آتے۔ آسٹریلیا کی ترقی میں ان لوگوں کا رول اُن کی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ تھا۔ ساربانوں میں کچھ افغانستان سے آئے اور کچھ ایران، ہندوستان اور بلوچستان سے۔ لیکن اِن میں اکثریت اُس علاقے سے آنے والوں کی تھی جو آج پاکستان ہے۔ آنے والوں میں اولیت افغانیوں کو حاصل تھی اس لئے آسٹریلیا میں سب اسی نام سے معروف ہوئے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ نام مختصر ہو کر "غان" رہ گیا۔

نصف صدی تک یہ لوگ نہ صرف کثیر تعداد میں ساربان، غوطہ غور اور بڑے پیمانہ پر مویشی پالنے والے تھے بلکہ تاجر، رسل و رسائل کے ٹھیکہ دار، پھیری والے اور پیغام رسانی کا کام کرنے والے بھی تھے ان سب کے متفقہ سردار عبدالوادی تھے جن کا کاروبار اتنے بڑے پیمانے پر تھا کہ وہ ۵۰۰ اونٹ ایک دفعہ میں درآمد

کیا کرتے تھے۔ مضبوط اور باوسائل ہونے کی وجہ سے یہ لوگ آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کی نظر میں ایک وقار کے مالک تھے۔ یہ اسلام کے عقیدہ پر عامل تھے اور انھوں نے مساجد کا ایک سلسلہ آسٹریلیا کے ریگستانی وسط میں پھیلا دیا تھا۔ ان میں ایڈیلیڈ (Adelaide) فارینا (Farina) مری (Maree) اوناڈتا (Oonadatta) اور ایلس اسپرنگ (Alice Spring) کی مسجدیں شامل ہیں۔ دوسرے اشخاص کان کنی کے بڑے مراکز بروکن ہل (Broken Hill) اور کول گارڈی (Coolgardie) میں کاروبار کرتے تھے اور انھوں نے ان مقامات پر مسجدیں تعمیر کیں۔ سفر میں وہ اونٹوں پر جا نماز لیکر چلتے تھے اور اگر کوئی مسجد نہیں ملتی تو راستے ہی میں ایک سوا ونٹوں کے خیموں میں نماز ادا کر لیتے تھے۔ جنوبی آسٹریلیا سے یہ لوگ اندرون ملک کے خشک علاقوں تک پھیل گئے۔ ۱۸۷۰ کے دہے میں ایلس اسپرنگ اور پرتھ کے بیچ ہونے والی تین مطالعاتی مہمات میں شریک رہے۔ خشکی کے راستے ایڈیلیڈ سے ڈارون تک جانے والی ٹیلیگراف کی لائن کی تعمیر میں بھی معاون رہے اور نصف صدی بعد کال گوری سے پرتھ تک جانے والی ٹرانس آسٹریلین ریلوے کے بنوانے میں بھی مدد کی۔ ۱۸۹۶ میں جب مغربی آسٹریلیا کے گورنر نے پرتھ سے کال گوری تک کی ریلوے لائن کا افتتاح کیا تو پگڑیاں باندھے ہوئے سینکڑوں ساربانوں نے ایک پرشکوہ گارڈ آف آنر پیش کیا۔

اونٹوں کے خیموں کے دور کے خاتمے پر یہ لوگ ختم نہیں ہو گئے۔ ان میں سے اکثریت زمین کی مالک، موٹر ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرنے والی، پھلوں کی کاشت یا ہوٹل کی مالک اور تاجر بن گئی۔ مثال کے طور پر حاجی محمد عالم جو افغانستان کے قدیم دارالحکومت قندھار میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۸۵ء میں آسٹریلیا بحیثیت ساربان کے آئے۔ آپ نے براعظم کے طول و عرض میں سنسان بے برگ و گیاہ راستوں پر اپنے کاروان چلائے

چلائے یہاں تک کہ بروم، ٹرانسوائیل اور ونکانیہ جیسے دور افتادہ مقامات تک گئے؛ کال گورلی کی سونے کی اور بروکن ہل کی چاندی کی کانوں میں بھی کام کیا، کچھ عرصہ قالینوں کی تجارت کی، درزی، قصائی، نانبائی اور زمین کی پیمائش کا بھی کام کیا۔ جڑی بوٹی کے ماہر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اور ایڈی لیڈ میں قیام سے پہلے ایک معالج اور داعی اسلام کی حیثیت سے بھی مشہور رہوئے۔ ایڈی لیڈ میں اس بوقلمونی شخصیت کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں مریض آتے تھے۔ غریب اور بیکس پر خاص شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۶۴ء میں ۱۰۶ سال کی مبینہ عمر میں ہوا ہے۔ ان کے ایک نوجوان ساتھی صالح محمد تھے جن کے ساتھ حاجی محمد عالم اپنے بیٹے کا سا برتاؤ رکھتے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب حکومت نے سعودی عرب کو ۳ نسلی اونٹ تحفۃً دینے کا ارادہ کیا تو صالح محمد کو ایلیس اسپرنگ کے نواحی صحرا سمپسن سے اونٹوں کو پکڑنے انھیں تربیت دینے اور انھیں لیکر ریاض جانے کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ صالح محمد کے لئے یہ ذمہ داری بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس طرح وہ اپنی حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کر سکے۔

آسٹریلیا نے ان قدیم ساربانوں کی یاد ایک بڑے اچھوتے انداز سے منائی ہے چنانچہ ڈیزل انجن اور ایرکنڈیشنڈ کار کے اس دور میں بھی ایڈی لیڈ سے ایلیس اسپرنگ کو قدیم کاروان کے راستے جانے والی ٹرین کو "غان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ دوسری یادگاریں بھی ہیں۔ ایڈی لیڈ کی قدیم مسجد اس وقت سے اب تک برابر استعمال میں ہے اور اس کا تحفظ جنوبی آسٹریلیا کے نیشنل ٹرسٹ کے ذریعہ بحیثیت ایک تاریخی اور نمونے کی عمارت کے کیا جاتا ہے۔ مستقبل قریب میں اس کے پاس ایک افغان میموریل اسلامک سینٹر قائم کیا جائے گا۔ بروکن ہل میں اگرچہ اب مسلمان نہیں رہے لیکن بروکن ہل ہسٹوریکل سوسائٹی نے قدیم مسجد کی پوری

مرمت کردی ہے۔ دوست محمد کی قبر میلنڈی کے مقام پر لب سڑک ہے جس کی دیکھ بھال ۱۱۵ سال گزر جانے پر بھی اسٹریلیا کے لوگ کر رہے ہیں۔

ڈارون اور تھرسڈے کے جزائر تقریباً سو برس تک دنیا میں پیدا ہونے والے موتی اور سیپ کا ۸۰ فیصدی حصہ مہیا کرتے رہے۔ غواصی کا کام کرنے والے بیشتر غوطہ خور انڈونیشیا اور ملیشیا سے آئے۔ ان میں سے اکثر یہیں کے ہو کر رہ گئے ان لوگوں نے ڈارون، بروم، پورٹ ہیڈلینڈ میں آبادیاں بسائیں۔ کوکوس اور کرسمس کے جزائر سے بہت سے اشخاص مغربی اسٹریلیا کو مراجعت کر گئے۔ اور اب پرتھ، گیبرالڈٹن اور کتاننگ میں مسلمانوں کی معتدبہ تعداد موجود ہے۔ بیرون ملک خصوصاً شام اور لبنان سے ۱۹۰۶ اور ۱۹۲۹ کے درمیان بہت سے مسلمان اسٹریلیا آئے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے آنے والوں کی رفتار بڑھ گئی اور اب ان کی تعداد ۲ لاکھ تک پہونچ چکی ہے۔ مراجعت کے دور عروج یعنی جنوری ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران اسلامی ممالک سے آنے والوں میں ترکی سے ۲ ہزار، مصر سے سولہ ہزار، شام سے پندرہ سو اور انڈونیشیا سے ۱۲۰۰ شامل ہیں۔ مسلم آبادی والے علاقوں سے آنے والوں میں یوگوسلاویہ سے ۹۱ ہزار، لبنان سے ۳۲ ہزار، قبرص سے ۱۱ ہزار، ملائشیا سے ۱۰ ہزار اور سنگاپور سے ۸ ہزار شامل ہیں۔

۱۹۵۱ سے ایشیائی ممالک سے بڑی تعداد میں طلبا آئے ہیں۔ عموماً ۱۰ ہزار بیرونی طالب علم بیک وقت ملک میں زیر تعلیم رہتے ہیں ان میں سے آدھے سے زیادہ اسلامی ممالک سے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اسٹریلیا میں موجود مسلمانوں میں سفرا، سفارتی اور تجارتی مشن کے افراد شامل ہیں۔ مسلم آبادی کے ملک جن کی سفارتی سطح پر نمائندگی اسٹریلیا میں ہے بنگلہ دیش، مصر، ہندوستان، انڈونیشیا، ایران، لبنان، ملیشیا، پاکستان، فلپائنز، سنگاپور، تھائی لینڈ، ترکی اور یوگوسلاویہ ہیں۔

آج اسٹریلیا میں مسلم بستی کا انداز ساربانوں کے دور کے مقابلے میں بہت بدل چکا ہے، ریل اور کار کی آمد نے اونٹوں کے قدیم پڑاؤ کے مقامات کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا ہے اگرچہ کہیں کہیں نئے شہر پڑاؤ کے مقام کے گرد ہی بسے ہیں۔

نے ور نے ور، فارینہ، مری، اُوونہ دتّہ، الیس اسپرنگ اور کول گارڈی کی مسجدیں اب نہیں رہیں۔ کول گارڈی کے مقامی ٹورسٹ بیورو نے مسجد کی جگہ کو ایک نشان اور سائین بورڈ سے نمایاں کر دیا ہے۔

اسٹریلیا کے بیرونی علاقوں کی مسجد کی عمارتوں میں صرف ایک عمارت سلامت ہے اسے بروکن ہل کی تاریخ کی انجمن نے محفوظ کر دیا ہے۔ پرتھ اور اڈی لیڈ کی مسجدیں اب بھی موجود ہیں۔

پرتھ کی مسجد جو ۱۹۰۵ میں بنکر تیار ہوئی تھی ایک خوشنما باغ کے پس منظر میں ہے۔ مسلمانوں کو مزید سہولت کی ضرورت کے پیش نظر اندرون شہر میں ایک پرانی سرکاری عمارت میں اسلامک سینٹر کا قیام عمل میں آیا۔ سینٹر کا افتتاح ۱۹۷۶ء میں ہوا۔ اس سے قبل مغربی اسٹریلیا اسلامک کونسل بنائی گئی تھی۔ اس کے صدر ڈاکٹر انوار القدیر راٹھور ہیں۔ ڈاکٹر راٹھور ویسٹرن اسٹریلین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں جیالوجی کے استاد ہیں۔

اڈی لیڈ کی مسجد کی تعمیر ۱۸۸۹ میں ساربانوں کی ضرورت کے پیش نظر ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ میں اس میں پابندی سے نماز پڑھنے والے صرف دو اشخاص رہ گئے تھے اسی سال یہاں احمد صقاقہ تشریف لائے۔ احمد صقاقہ یوگوسلاویہ کے ایک مسلم کالج میں استاد تھے۔ ۱۹۵۳ میں انھیں مسجد کا امام مقرر کیا گیا اور ان کی کوششوں سے نمازیوں کی تعداد ۷۰۰ تک پہونچ گئی۔ پرانی عمارت اب مسلمانوں کی تقریبات کے لئے ناکافی ہے۔ مسجد کی توسیع موجودہ عمارت کی ڈیزائن اور طرز تعمیر کو نقصان پہنچائے

بغیر ممکن نہیں ہے۔ جنوبی اسٹریلیا کی اسلامک کونسل اس سے ملحق زمین پر ایک افغان میموریل ہال تعمیر کرنا چاہتی ہے۔

برسبین کی مسجد ایک دوسری پرانی مسجد ہے جو ایک نواحی مکان کو تبدیل کر کے بنائی گئی تھی۔ یہ مکان ۱۹۰۷ سے مسجد کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۰ کے دہے میں




کوئینس لینڈ یونیورسٹی میں فن تعمیر کے ایک پاکستانی طالب علم نے اس مسجد کے لئے ایک نئی عمارت کا نقشہ تیار کیا۔ اس کی تعمیر میں ۷۵ ہزار ڈالر کی لاگت کا اندازہ تھا لیکن مقامی مسلم باشندوں نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کر دیں جس کی

وجہ سے خرچ کا یہ تخمینہ گھٹ کر ۲۰ ہزار ڈالر رہ گیا اور تقریباً ساری رقم عطیات کی صورت میں جمع ہوگئی۔ مسجد کی نئی عمارت کا افتتاح ۱۹۷۰ء میں ہوا اور جناب آر۔ اے۔ رانے کوئینس لینڈ کے امام مقرر ہوئے۔ اسی سال ایک اور نئی مسجد مریبا کے مقام پر البانوی نسل کے باشندوں نے تعمیر کی۔ مریبا کوئینس لینڈ کے شمال بعید میں تمباکو کی کاشت کا مرکزی مقام ہے۔

ملک کے دار الحکومت کینبرا میں انڈونیشیا، ملیشیا، اور پاکستان کی حکومتوں کے تعاون سے ایک مسجد تیار ہوئی جہاں اب سفارتی عملہ کے اشخاص اور طلباء نماز ادا کرتے ہیں۔ صوبہ وکٹوریہ میں شیپارٹن پھلوں کی کاشت کا مرکز ہے۔ یہاں البانوی نسل کے کاشتکاروں نے ۱۹۶۰ میں ایک نئی مسجد بنائی۔ اس کی عمارت کا نقشہ پاکستان کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے رکن سید عالم شاہ نے بنایا تھا۔

ان مساجد کی تعمیر سے پہلے اسٹریلیا کے بڑے شہروں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بھی کثیر تھی مسجدیں نہیں تھیں۔ سب سے بڑی روکاوٹ ان شہروں میں عمارات بنوانے پر کثیر خرچہ تھا۔ ۱۹۷۵ میں اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے شاہ فیصل نے اسٹریلیا میں اسلامی عقائد اور ثقافت کی ترویج کے لئے ۱۲ لاکھ ڈالر کی رقم بطور عطیہ عنایت کی۔ وکٹوریہ کی اسلامک کونسل اس رقم کے ملنے کے ساتھ ہی پرسٹن کے مقام پر ایک وسیع و عریض مسجد بنانے کے منصوبے پر سرگرم عمل ہوئی۔ نئی عمارت میں دفاتر کے علاوہ مختلف سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کے لئے بھی سہولت مہیا کی گئی ہے۔ مقامی ارکان کی رضاکارانہ مدد اور بیرون ملک سے وافر عطیات کی بدولت یہ عمارت ۵ لاکھ ڈالر کی لاگت سے مکمل ہوئی۔ عطیات دینے والوں میں شاہ فیصل فنڈ، بحرین اور کویت کی حکومتیں اور ملیشیا کی ریاست صباکے وزیر اعلیٰ شریک ہیں۔ مسجد کا افتتاح ۱۹۷۶ء میں عالمی مسلم لیگ کے نائب سکریٹری جنرل شیخ محمد صفوات السقا امینی نے کیا۔

ملبورن میں البانیہ اسلامک سوسائٹی نے ایک مسجد ۱۹۶۹ میں تعمیر کی۔ ترکی اسلامک سوسائٹی ایک دوسری مسجد ۱۹۷۷ تک مکمل کر لے گی۔ سائپرس ترکش اسوسی ایشن کے ارکان ایک کمیونٹی ہال کو بطور مسجد استعمال کرتے ہیں۔ سڈنی میں مسلمانوں کی آبادی ۵۰ ہزار ہے۔ یہاں جلد ہی ملک کی سب سے بڑی نئی مسجد تعمیر ہونے والی ہے۔ ملبورن کی طرح اس پر بھی ۵ لاکھ ڈالر کی لاگت کا تخمینہ ہے۔ شاہ فیصل فنڈ سے ۲ لاکھ ڈالر کا عطیہ مل رہا ہے۔ مسجد کے لئے زمین نیوسا ؤتھ ویلز کی لبنانی مسلم سوسائٹی نے دی ہے۔ سڈنی کے نواح میں لاکیمبا کے مقام پر یہ عمارت تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے اس کے علاوہ سڈنی کے نواح میں تین سادہ عمارتیں مسجد کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ایک عمارت ارسکا ئین وائیل میں ترکی اسلامک سوسائٹی کے تصرف میں ہے دوسری سَری ہلز میں نیوسا ؤتھ ویلز اسلامک سوسائٹی کی تولیت میں ہے اور تیسری سڈنی سے ۶۰ میل دور پورٹ کیمبا میں ہے یہاں ترکی سے آئے ہوئے مزدور مقامی لوہے کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں سائیکلون کی تباہ کاری کے بعد ڈاروِن میں تعمیر کا کام بہت وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ نئی عمارتوں میں ایک مسجد بھی شامل ہے۔ شاہ خالد کے مشیر اور ریاض یونیورسٹی کی قانون کی فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر عبداللہ الزید کی قیادت میں ایک کمیٹی ۱۹۷۶ء میں ڈارون میں مسجد کے لئے جگہ اور اس کا پلان دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ کمیٹی کے اعلان کے مطابق حکومت اسٹریلیا کی جانب سے دی گئی زمین پر یہ مسجد ایک لاکھ ۵۰ ہزار ڈالر کی لاگت سے بنے گی۔ شاہ فیصل فنڈ سے اس کام کے لئے ۴۰ ہزار ڈالر کی امداد ملے گی۔ قاہرہ یونیورسٹی کے سابق گریجویٹ اور ڈارون کمیونٹی کالج میں شعبہ فنون لطیفہ کے صدر یوسف اے۔ آثار تعمیر کے کاموں کی نگرانی کریں گے۔ آپ اسلامک سوسائٹی خطہ شمالی کے صدر رہیں۔ ایلس اسپرنگ میں جہاں ایک صدی قبل ساربانوں کے گروہ نے

سب سے پہلی مسجد تعمیر کی تھی۔ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے جس کے لئے سعودی عرب نے ۲۰ ہزار ڈالر کی امداد کا اعلان کیا ہے۔

ایک منضبط مُسلم معاشرہ کی تعمیر محض مساجد کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اسٹریلوی محققین اور سفراء نے مسلم ممالک کے سفر کئے ہیں اور اس طرح اسے تقویت بخشی ہے۔ سڈنی یونیورسٹی میں شعبہ سامی مطالعہ کے صدر پروفیسر ای۔ سی۔ بی میکلارین جو عقیدہ کے اعتبار سے عیسائی ہیں ۱۹۷۴ء میں سعودی عرب کے دورہ پر گئے اور وہاں سے مسلمانوں کے لئے اسٹریلیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بارہ وظائف منظور کرائے۔ انھوں نے سڈنی یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم کے لئے دو اساتذہ کی اسامی کے لئے بھی مالی امداد حاصل کی۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے ڈاکٹر نصرالرشید اور ڈاکٹر حسن بجودہ ان جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔

اسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کینبرا میں عربی کے لئے ایک ابتدائی کورس شعبہ انڈونیشیا میں ہے۔ اس کے علاوہ اس شعبہ میں اسلام اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مذاکرے منعقد کئے جاتے ہیں۔ ایشیائی ثقافت کے شعبہ میں ہندوستان میں اسلام کا موضوع مطالعہ کا جز و ہے۔ علوم مشرقیات کی فیکلٹی کے ڈین پروفیسر اے۔ ایچ جونس نے انڈونیشیا اور ہندوستان کے سترھویں صدی کے عربی متون کی تدوین کی ہے اور انڈونیشیا میں اسلام کے موضوع پر ایک تصنیف مکمل کی ہے۔

مغربی اسٹریلیا کی ریاست میں اسلام کی تاریخ پر ڈاکٹر انوار القدیر راٹھور تحقیقی کام کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں سونے کی کان کنی کے قدیم مرکز کول گارڈلی کے میوزیم اور کتب خانے میں مواد کی تلاش بہت جوش وخروش سے کر رہے ہیں۔

اسٹریلیا کے مسلم باشندوں پر یہ بات بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ یہ ملک

مذہبی آزادی اور مواقع میں مکمل مساوات کا ملک ہے اور یہاں بیک وقت اسٹریلیا کا شہری اور مسلمان ہونا ممکن ہے۔ پچھلے سالوں کے حکومت کے موثر اقدام کی بدولت مختلف النسل مسلمان اپنے پرانے وطن کی تہذیبی اور سماجی روایات کو بھی پروان چڑھا سکیں گے۔ باہمت دوست محمد کے ایک اجنبی اور غیر مانوس ملک میں اپنے اونٹ سمیت آنے کے بعد سے آج پہلی بار اسٹریلیا کے مسلمان یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کے مختار ہیں۔

عبداللطیف اعظمی

# ہندوستان کی یونیورسٹیاں

## (سال تاسیس اور اردو، فارسی یا عربی کی تعلیم)

ابھی حال میں، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے "یونیورسٹی ڈیولپمنٹ ان انڈیا" کے نام سے ایک ضخیم رپورٹ موصول ہوئی ہے، جس میں ۷۲-۱۹۷۱ء کے بنیادی حقائق اور اعداد وشمار درج ہیں۔ اس کی مدد سے ایک مختصر مضمون تیار کرکے قارئین جامعہ کی معلومات کے لئے شائع کیا جارہا ہے، جس میں یونیورسٹیوں کے سنہ تاسیس کے علاوہ اس کی بھی وضاحت ہوگی کہ کن کن یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس میں صرف ان یونیورسٹیوں کا ذکر ہے جو ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء تک قائم ہوئی ہیں۔

| یونیورسٹی | سنہ تاسیس | اردو، فارسی یا عربی کی تعلیم |
|---|---|---|
| ۱۔ کلکتہ یونیورسٹی | ۱۸۵۷ | عربی |
| ۲۔ بمبئی یونیورسٹی | " | |
| ۳۔ مدراس یونیورسٹی | " | عربی |
| ۴۔ الہ آباد یونیورسٹی | ۱۸۸۷ | اردو۔ عربی |
| ۵۔ بنارس ہندو یونیورسٹی | ۱۹۱۶ | اردو |
| ۶۔ میسور یونیورسٹی | " | اردو۔ فارسی۔ عربی |

| | | |
|---|---|---|
| ۷۔ پٹنہ یونیورسٹی | ۱۹۱۷ | اردو۔ فارسی۔ عربی |
| ۸۔ عثمانیہ یونیورسٹی | ۱۹۱۸ | اردو۔ فارسی۔ عربی |
| ۹۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ | ۱۹۲۰[1] | اردو۔ فارسی۔ عربی |
| ۱۰۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی | ۱۹۲۱[2] | اردو۔ فارسی۔ عربی |
| ۱۱۔ لکھنؤ یونیورسٹی | " | فارسی۔ عربی |
| ۱۲۔ دہلی یونیورسٹی | ۱۹۲۲ | اردو۔ فارسی۔ عربی |
| ۱۳۔ ناگپور یونیورسٹی | ۱۹۲۳ | |
| ۱۴۔ اندھرا یونیورسٹی (والٹیر) | ۱۹۲۶ | |
| ۱۵۔ آگرہ یونیورسٹی | ۱۹۲۷ | |
| ۱۶۔ اَنّا ملائے یونیورسٹی (اَنّا ملائے نگر۔ تامل ناڈ) | ۱۹۲۹ | |
| ۱۷۔ کیرالا یونیورسٹی (تریونڈرم) | ۱۹۳۷ | |
| ۱۸۔ اُتکل یونیورسٹی (بھوبنیشور) | ۱۹۴۳ | |
| ۱۹۔ ساگر یونیورسٹی | ۱۹۴۶ | اردو |
| ۲۰۔ راجستھان یونیورسٹی (جے پور) | ۱۹۴۷ | اردو |
| ۲۱۔ پنجاب یونیورسٹی (چنڈی گڑھ) | " | اردو |
| ۲۲۔ گوہاٹی یونیورسٹی | ۱۹۴۸ | عربی |
| ۲۳۔ کاشمیر یونیورسٹی (سری نگر) | " | اردو۔ فارسی |
| ۲۴۔ رڑکی یونیورسٹی | ۱۹۴۹ء | |

---

[1] صحیح تاریخ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء ہے۔

[2] یو جی سی کی اس کتاب میں یہی سنہ درج ہے لیکن منظور شدہ ایکٹ کی صحیح تاریخ ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۰ء ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۲۵۔ پونا یونیورسٹی | ۱۹۴۹ | |
| ۲۶۔ ایم۔ ایس یونیورسٹی آف برودا | 〃 | |
| ۲۷۔ کرناٹک یونیورسٹی (دھارواڑ) | 〃 | اردو۔ فارسی |
| ۲۸۔ گجرات یونیورسٹی (احمد آباد) | ۱۹۵۰ | عربی |
| ۲۹۔ ایس۔ این۔ ڈی۔ ٹی ویمنس یونیورسٹی۔ (بمبئی) | ۱۹۵۱ | |
| ۳۰۔ وشوابھارتی (شانتی نیکتن) | 〃 | |
| ۳۱۔ بہار یونیورسٹی (مظفرپور) | ۱۹۵۲ | اردو۔ فارسی |
| ۳۲۔ سری ونکٹیشور (تروپتی) | ۱۹۵۴ | اردو |
| ۳۳۔ سردار پٹیل یونیورسٹی (ولبھ ودیانگر) | ۱۹۵۵ | |
| ۳۴۔ جادوپور یونیورسٹی (کلکتہ) | 〃 | |
| ۳۵۔ کرکشیتر یونیورسٹی | ۱۹۵۶ | |
| ۳۶۔ اندرا کلاسنگیت وشوودیالہ (کھیراگڑھ) | 〃 | |
| ۳۷۔ وکرم یونیورسٹی (اجین) | ۱۹۵۷ | اردو |
| ۳۸۔ گورکھپور یونیورسٹی | 〃 | اردو |
| ۳۹۔ جبلپور یونیورسٹی | 〃 | |
| ۴۰۔ ورناسیا سنسکرت وشوودیالیہ[۳] (ورناسی) | ۱۹۵۸ء | |

---

[۳] پہلے اس کا نام سمپورانند سنسکرت وشوودیالہ تھا۔

| | | |
|---|---|---|
| ۴۱۔ مرتھواڑا یونیورسٹی (اورنگ آباد) | ۱۹۵۸ | |
| ۴۲۔ یوپی اگریکلچرل یونیورسٹی[۱] (نینی تال) | ۱۹۶۰ | |
| ۴۳۔ بردوان یونیورسٹی | ״ | |
| ۴۴۔ کلیانی یونیورسٹی | ״ | |
| ۴۵۔ بھاگلپور یونیورسٹی | ״ | فارسی |
| ۴۶۔ رانچی یونیورسٹی | ״ | اردو ۔ فارسی |
| ۴۷۔ کے۔ ایس دربھنگہ سنسکرت وشوودیالہ | ۱۹۶۱ | |
| ۴۸۔ پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی | ۱۹۶۲ | |
| ۴۹۔ پنجابی یونیورسٹی (پٹیالہ) | ״ | فارسی |
| ۵۰۔ اڑیسہ یونیورسٹی آف اگریکلچر اینڈ ٹکنالوجی (بھوبنیشور) | ״ | |
| ۵۱۔ نارتھ بنگال یونیورسٹی (سلیگوری) | ״ | |
| ۵۲۔ رابندر بھارتی (کلکتہ) | ״ | |
| ۵۳۔ مگدھ یونیورسٹی (گیا) | ״ | اردو۔ فارسی |
| ۵۴۔ جودھپور یونیورسٹی | ״ | |
| ۵۵۔ اودے پور یونیورسٹی | ״ | اردو |
| ۵۶۔ شیواجی یونیورسٹی (کولھاپور) | ״ | |
| ۵۷۔ اندور یونیورسٹی | ۱۹۶۴ | |
| ۵۸۔ جیواجی یونیورسٹی (گوالیر) | ״ | |

---

[۱] پہلے اس کا نام گوبندھ ولبھ پنت یونیورسٹی آف اگریکلچر اینڈ ٹکنالوجی تھا۔

۵۹۔ روی شنکر یونیورسٹی (رائے پور) ۱۹۶۴

۶۰۔ یونیورسٹی آف اگریکلچرل سائنس

(بنگلور) "

۶۱۔ اندھرا پردیش اگریکلچرل یونیورسٹی

(حیدر آباد) "

۶۲۔ بنگلور یونیورسٹی "

۶۳۔ جواہر لال نہرو کرشی وشو ودیالہ

(جبلپور) "

۶۴۔ ڈبروگڑھ یونیورسٹی ۱۹۶۵

۶۵۔ کانپور یونیورسٹی "

۶۶۔ میرٹھ یونیورسٹی "

۶۷۔ مدورائے یونیورسٹی "

۶۸۔ سوراشٹر یونیورسٹی (راجکوٹ) " فارسی

۶۹۔ ساؤتھ گجرات یونیورسٹی (سورت) "

۷۰۔ برہان پور یونیورسٹی ۱۹۶۷

۷۱۔ سمبل پور یونیورسٹی "

۷۲۔ گجرات آیور ویدیونیورسٹی (جمنا گڑھ) ۱۹۶۸

۷۳۔ جواہر لال یونیورسٹی (نئی دہلی) "

۷۴۔ مہاتما پھولے کرشی ودیا پیتھ

(راہوری) "

۷۵۔ کالی کٹ یونیورسٹی "

| | | |
|---|---|---|
| ٧٦۔ اوادیش پرتاپ سنگھ یونیورسٹی (ریوا) | ١٩٦٨ | |
| ٧٧۔ آسام اگریکلچرل یونیورسٹی (جورہٹ) | ״ | |
| ٧٨۔ گرو نانک یونیورسٹی (امرتسر) | ١٩٦٩ | |
| ٧٩۔ جموں یونیورسٹی | ״ | اردو |
| ٨٠۔ پنجاب راؤ کرشی ودیا پیٹھ (اکولہ) | ״ | |
| ٨١۔ ہریانہ اگریکلچرل یونیورسٹی (حصار) | ١٩٧٠ | |
| ٨٢۔ ہماچل پردیش یونیورسٹی (شملہ) | ״ | اردو |
| ٨٣۔ بھوپال یونیورسٹی | ״ | |
| ٨٤۔ راجندر اگریکلچرل یونیورسٹی (پٹنہ) | ״ | |
| ٨٥۔ تامل ناڈو اگریکلچرل یونیورسٹی (کوئم بٹور) | ١٩٧١ | |
| ٨٦۔ کوچین یونیورسٹی | ״ | |
| ٨٧۔ کرالا اگریکلچرل یونیورسٹی (ترچور) | ١٩٧٢ | |

اس مضمون میں ہم یہ بھی دکھلانا چاہتے تھے کہ کن کن یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم کا انتظام ہے، مگر یوجی سی کی رپورٹ میں اس کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

اپریل ١٩٦٨ء کے جامعہ میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "علوم اسلامیہ ہندوستان میں"۔ اسی سال کے مئی کے شمارے میں پروفیسر سید امیر حسن عابدی کا ایک مضمون: "آزاد ہندوستان میں عربی اور فارسی کا مطالعہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ان دونوں مضامین سے کسی حد تک ان تینوں مضامین کی تعلیم اور ان کی موجودہ صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے ہم ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کے تعلیمی اور تحقیقی مراکز کے بارے میں ایک جامع مضمون لکھوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

# تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

## مثنوی مولانائے روم (دفتر سوم) ترجمہ: مولانا قاضی سجاد حسین

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۵۶۴ صفحات، مجلد، کتابت وطباعت وکاغذ عمدہ، قیمت ۲۲ روپے۔
پہلا اڈیشن: ۱۹۷۶ء۔ ناشر: سب رنگ کتاب گھر۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

برصغیر ہند وپاک میں فارسی زبان جس طرح پہلے رائج اور مقبول تھی، اب باوجودیکہ بہت سی یونیورسٹیوں میں فارسی کے باقاعدہ شعبے قائم ہیں اور لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں، مگر نہ فارسی کا وہ ذوق ہی رہا اور نہ اتنی تعداد میں فارسی جاننے والے ہی رہے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے فارسی کی بعض مقبول ترین کتابوں کے ترجمے کی اہم ذمہ داری لی ہے۔ چنانچہ چند سال پہلے انھوں نے دیوان حافظ کا ترجمہ کیا تھا اور وہ اس قدر مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں، اس کے بعد مثنوی مولانائے روم کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ دفتر اول اور دفتر دوم کے ترجمے کئی سال پہلے چھپ چکے ہیں، دفتر سوم جو اس وقت پیش نظر ہے، پچھلے سال ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے اور دفتر چہارم زیر ترجمہ ہے اور بقول فاضل مترجم بیشتر حصہ مکمل ہو چکا ہے۔

اس ترجمے کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ان اشعار میں تصوف کی جن اصطلاحات

اور اہم واقعات و اشخاص کا ذکر آیا ہے، مقدمے میں ان کی وضاحت کردی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے ترجمے کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب اُن تمام لوگوں کے شکریے کے مستحق ہیں جو فارسی سے ناواقف ہونے کی بنا پر دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم جیسی گراں قدر تخلیقات سے استفادہ کرنے سے قاصر تھے۔ اللہ تعالیٰ اس نیک اور مفید کام پر انھیں جزائے خیر دے اور ان کی محنت وکوشش کو کامیاب کرے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی پچھلی کتابوں کی طرح مقبول ہوگی۔

## تذکرۂ علمار اعظم گڑھ — از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۳۵۰ صفحات، غیر مجلد، قیمت: اٹھارہ روپے، ناشر: جامعہ اسلامیہ۔ بنارس۔ فاضل مولف سے جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب ورناسی (یوپی) ۲۲۱۰۰۲ کے پتے پر کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

ضلع اعظم گڑھ یوپی کا ایک مردم خیز علاقہ ہے، جہاں جید علمار اور مشہور ادیب وشاعر پیدا ہوئے، مثلاً علمار میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی اور ادیبوں اور شاعروں میں اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد بیگ وغیرہ۔ بقول مولانا سہیل:

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلّی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے، وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

اس کے علاوہ برصغیر ہندوپاک کا مشہور اور موقر تصنیفی ادارہ دار المصنفین اسی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے، اس کے علاوہ عربی، مذہبی اور جدید علوم کی متعدد درسگاہیں ہیں جو مذہب اور علم وادب کی بڑی مفید خدمات انجام دے رہی ہیں۔ افسوس کہ ایسے علاقے کی اب تک کوئی مفصل اور مبسوط علمی وادبی تاریخ مرتب نہیں کی گئی، خوشی کی

بات ہے کہ اسی علاقے کے ایک نوجوان عالم دین مولانا حبیب الرحمان قاسمی صاحب نے اعظم گڈھ کے مرحوم علمار کا ایک تذکرہ مرتب کرکے شائع کیا ہے، جس میں ۱۸۲ علمار کا تذکرہ ہے ان کے علاوہ حاشیے میں ۸۷ حضرات کا ذکر ہے، جن میں اعظم گڑھ کے غیر علمار اور دوسری جگہ کے علمار اور غیر علمار شامل ہیں۔ اپنے دور یا قریبی دور کے لوگوں کا تذکرہ لکھنا بڑا مشکل کام ہے، کتنی ہی احتیاط کی جائے، اعتدال اور توازن برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے، مگر میرا خیال ہے کہ فاضل مولف بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں صرف ایک آدھ جگہ میں نے محسوس کیا ہے کہ قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے۔ مثلاً مولانا فراہی کے عزیز شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحی کے تذکرے میں مولانا کے محترم کا قلم کچھ غیر محتاط ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی موٹی کچھ اور خامیاں نظر آئیں، مثلاً مولوی محمد ایوب جیراجپوری (صفحہ ۳۰۵) جامعۃ الفلاح میں نہیں درسگاہ جماعت اسلامی رام پور میں استاد ہیں، مولانا عبدالاحد مرحوم کی علالت اور وفات کے بارے میں (صفحہ ۲۱۹) لکھا ہے کہ: "یہیں (مدرسۃ الاصلاح) بیمار ہوکر گھر تشریف لائے اور دس بارہ یوم بیمار رہکر ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۸ء (۱۳۴۷ھ) میں وفات پائی۔" یہ صحیح نہیں ہے، وہ علاج کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے اور وہیں انتقال ہوا تھا، البتہ مٹی اپنے گاؤں کی ملی، مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری (صفحہ ۲۵۲) کی تاریخ وفات درج نہیں ہے، جو بہت آسانی سے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر حکیم محمد معظم جیراجپوری (مقیم اعظم گڑھ) سے معلوم کی جاسکتی تھی، بندی خورد کے ایک عالم دین مولانا عبدالجلیل اصلاحی کا تذکرہ جو حیدرآباد میں رہتے تھے، مجھے نہیں ملا، شاید رہ گیا ہے۔ دو ایک غلطیاں کتابت کی معلوم ہوتی ہیں، مثلاً ۱۰۵ کے آخر میں مولانا شبلی کا سنہ وفات ۱۹۱۴ء کے بجائے ۱۹۲۴ء چھپا ہے، سنہ ہجری بھی صاف نہیں ہے ۲۲؟ معلوم ہوتا ہے، صحیح ۳۲ ہے، صفحہ ۲۷۶ کے شروع میں مولانا فراہی کا سنہ وفات ۱۹۳۰ء کے بجائے ۱۹۱۲ء چھپا ہے، یہی سنہ صفحہ ۸۳ پر صحیح ہے۔ ان معمولی خامیوں سے قطع نظر

....

کتاب محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ ہر کتب خانے میں رکھی جائے۔

## پُرانوں کی کہانیاں    از پروفیسر گوپی چند نارنگ

سائز ۳۰×۲۰/۱۶، حجم ۱۵۱ صفحات، قیمت : سوا آٹھ روپے۔ تاریخ اشاعت ۱۹۷۶ء

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

ہندوستانی اساطیر میں پُرانوں کی کہانیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر میرے علم کے مطابق یہ کہانیاں اردو میں کتابی صورت میں نہیں ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر نارنگ صاحب کی توجہ سے یہ کمی دور ہو گئی۔ نیشنل بک ٹرسٹ (نئی دہلی) نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد میں آسان اور عام فہم اردو میں مختلف موضوعات پر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فاضل مولف نے اس کتاب کے مقدمے میں ان کہانیوں کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "پُران ہندوستانی دیو مالا اور اساطیر کے قدیم ترین مجموعے ہیں۔ ہندوستانی ذہن و مزاج کی، آریائی اور دراوڑی عقائد اور نظریات کے ادغام کی اور قدیم ترین قبلِ تاریخ زمانے کی جیسی ترجمانی پُرانوں کے ذریعے سے ہوتی ہے، کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ یہ الہامی کتابوں سے بھی زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہیں، مشہور رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت کو بھی لوک کتھاؤں کے ماٰخذ کے اعتبار سے اسی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے، ان میں اس برصغیر میں نسلِ انسانی کے ارتقا کی داستان اور اس کے اجتماعی لاشعور کے اولین نقوش کچھ اس طرح محفوظ ہو گئے ہیں کہ ان کو جانے اور سمجھے بغیر ہندوستان کی روح کی گہرائیوں تک پہنچنا مشکل ہے۔"

کہانیاں اتنی دلچسپ ہیں اور زبان اتنی آسان اور اسلوب اس قدر رواں ہے کہ نوعمر طالب علم اور نوخواندہ بالغ بھی انھیں بڑے شوق سے پڑھیں گے اور لطف اٹھائیں

گے۔ امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہو گی اور علم و ادب کے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

## زبان و قواعد    از رشید حسن خاں

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۵۰۳ صفحات۔ غیر مجلد۔ قیمت: ۱۷ روپے۔ تاریخ طباعت: اگست ۱۹۸۷ء۔ ناشر: ترقی اردو بورڈ۔ وزارت تعلیم اور سماجی بہبود، حکومت ہند۔ ویسٹ بلاک ۸۔ راما کرشنا پورم۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۲

زیر تبصرہ کتاب پیش لفظ اور حرف آغاز کے علاوہ حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے:
صحت الفاظ، مشترک الفاظ، لغت اور استعمال عام، ملائی۔ بالائی، ترکیب مہند، سقوط حروف علت، اعلان نون، مختارات امیر مینائی، سحر البیان، اور فاضل مصنف کے بیان کے مطابق: "اس مجموعے میں شامل مضامین، مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے؛ اب ان پر نظر ثانی کی گئی ہے اور بعض کو[1] از سر نو لکھا گیا ہے۔" (حرف آغاز)

جناب رشید حسن خاں صاحب اردو کے معروف ادیب ہیں، ان کی شہرت زیادہ تر تنقیدی مضامین سے ہوئی لیکن کچھ عرصے سے انھوں نے اردو زبان اور اس کے مسائل کی طرف بھی توجہ کی ہے، ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر ان کی نظر ہے اور جو مسائل اٹھاتے ہیں وہ اہم اور قابل توجہ ہیں مگر عام خیال یہ ہے کہ زبان و بیان کے بارے میں ان کے خیالات فرسودہ ہیں اور ان سے عام طور پر یہ شکایت ہے کہ وہ ہر معاملے میں انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں اور

---

[1] "کو" کا یہاں استعمال صحیح نہیں ہے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم اسی طرح کے مواقع پر "کو" کے استعمال پر رشید حسن خاں صاحب کو ٹوک چکے ہیں، جہاں تک مجھے یاد ہے "انتخاب ناسخ" (مرتبہ: رشید حسن خاں) کے تبصرے میں مرحوم نے یہ اعتراض کیا تھا۔

کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض باتیں وہ محض بحث اور گرمی محفل کی خاطر لکھتے ہیں مثلاً زیر تبصرہ کتاب میں وہ ایک آزاد خیال اور ترقی پسند کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں اور لغات اور فصحا کے فیصلوں کے خلاف رواج عام کی بڑی شدومد کے ساتھ حمایت کی ہے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: "لیق، مرغن، شکریہ، خراج، مکتب، مشکور، فوق البھڑک جیسے بہت سے لفظ، عربی الفاظ کے انداز پر بن گئے ہیں اور عام طور پر مستعمل ہیں؛ اب اگر ایسے الفاظ کو غلط سمجھا جائے تو یہ اندازِ فکر، اردو زبان کی خصوصیات کو اور زبانوں میں لفظوں کے بننے بگڑنے کے مسلّمہ اصولوں کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہوگا۔ دنیا کی زندہ زبانوں میں ایسا نہیں ہوتا اور ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ متعدد صاحب نظر حضرات ہر زمانے میں استعمالِ عام کو سند مانتے رہے ہیں اور اردو الفاظ کے لئے صراح وقاموس سے سند لینے کو غلط طرزِ عمل سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔" (صفحہ ۱۲) "میّت" عربی کا لفظ ہے اور اصل میں "ی" پر زبر ہے یعنی مَیّت ہے، مگر اردو میں میِّت بولتے ہیں یعنی "ی" پر زیر۔ مولانا نظم طباطبائی، مولانا عبدالباری آسی، مولف نور اللغات، مولف رسالہ اصلاح وغیرہ نے بہ کسرِ یا کو صحیح قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق بولنے کی تاکید کی ہے، مگر رشید حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ: "فصحائے مرحوم نے کچھ ہی کہا ہو، گفتگو میں یہ لفظ بہ فتح یائے مشدد آتا ہے اور اب یہی صحیح، بل کہ فصیح ہے۔" (صفحہ ۴۲) لفظ "متوفّیٰ" صحیح ہے مگر اردو کے بہت سے لوگ "متوفِّی" بولتے ہیں، میرے نزدیک ایسے لوگوں کا شمار جہلا میں ہوتا ہے، مگر رشید حسن خاں صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ اردو میں "متوفِّی" ہی صحیح ہے۔ (صفحہ ۲۸)

اسی طرح عربی کا ایک لفظ ہے مُعَنْوَن۔ اردو کے ایک ادیب کا ارشاد ہے کہ اردو میں مُعَنوِن بولا جاتا ہے اور یہی صحیح ہے، رشید حسن خاں صاحب کی اس کتاب میں مجھے یہ لفظ نہیں ملا، لیکن جب وہ متوفِّی کو صحیح سمجھتے ہیں تو یقیناً معنوِن کو بھی صحیح سمجھتے ہوں گے۔ مگر میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ کوئی معقول پڑھا لکھا شخص نہ تو متوفِّی بولتا ہے اور نہ معنوِن۔

اب اس آزاد خیالی اور ترقی پسندی کے برعکس رشید حسن خاں کی قدامت پسندی اور کٹّرپن کی مثال ملاحظہ ہو۔ پچھلے ہی سال جب زیرِ تبصرہ کتاب شائع ہوئی ہے، پٹنہ کے سہ ماہی رسالہ "زبان و ادب" کے جولائی کے شمارہ میں "زبان و بیان" کے عنوان سے رشید حسن خاں صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا آغاز یوں ہوتا ہے: "فلم، ٹیلی ویژن، جاسوسی ناول، چھوٹے چھوٹے اخبار، فلمی رسالے، زبان کے فروغ میں ان کا بڑا حصہ ہے، خاص کر موجودہ حالات میں۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے روزمرہ اور اردو کے محاوروں کا چہرہ مہرہ جس طرح بگڑ رہا ہے، اُس میں بھی ان کا حصہ کچھ کم نہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد ایک طرف تو وہ قیامت برپا ہوئی کہ نہ معلوم کتنے ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور دوسری طرف زمین کی طنابیں اچانک اس طرح کھینچ گئیں کہ بے شمار لوگ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس دوری و قربت نے معاشرتی زندگی کے اور مظاہر کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی اثر ڈالا۔ بڑے شہر خاص طور پر رنگا رنگی کے آئینہ خانے بن گئے۔ اب نئے نئے محاورے اور عجیب الخلقت جملے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں اور ذہن کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ فلمی ہمہ گیری کا زمانہ بھی تقسیم کے بعد کا ہے، فلمی رسالوں اور جاسوسی ناولوں کی یہ ریل پیل بھی پہلے نہیں تھی اور ٹیلی ویژن تو خیر سے ابھی آیا ہے۔ وہ عناصر ختم ہو چکے ہیں یا کم زور پڑ چکے ہیں جو زبان و بیان کی درستی میں مدد کرتے رہتے تھے۔" (صفحہ ۸) آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے غلط بول چال کی چند مثالیں دی ہیں، پہلی مثال ہے: "آج کل 'چھوڑنے جا رہا ہوں' سننے میں آتا رہتا ہے، جیسے: "میں ان کو اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں"۔ اردو کے لحاظ سے یہ پسندیدہ انداز بیان نہیں۔" اس طرح کے اور بہت سے فقرے لکھے ہیں جو انگریزی کے اثر سے اردو کی بول چال میں رائج ہو گئے اور لوگ بے تکلف تحریروں میں لکھنے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے متعدد ادیبوں اور شاعروں کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے، حتیٰ کہ مولانا حالی اور مولانا ابو الکلام آزاد بھی نہ بچ سکے۔

میرا احساس یہ ہے کہ خاں صاحب کا رویہ دونوں جگہ، زیر تبصرہ کتاب میں اور سہ ماہی "زبان و ادب" کے مضمون میں مختلف ہے، وہاں ہر وہ غلط لفظ صحیح ہے جو رواج پا چکا ہے اور یہاں ہر وہ چیز غلط ہے جو قدیم سے مختلف ہے۔ یہ تضاد اگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

یہ مسئلہ کہ اصل لفظ صحیح ہے یا مروج، کبھی مسئلہ تھا مگر اب نہیں رہا۔ اب اس بات کو قطعی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اردو میں جو الفاظ اور محاورے مستعمل اور مروج ہیں اور جنھیں مستند ادیبوں اور شاعروں نے استعمال کیا ہے، وہی صحیح ہیں۔ آجکل اگر کوئی اختلاف ہے تو اس میں ہے کہ اہل علم کسی لفظ کو کس طرح بولتے ہیں۔ مثلاً رشید حسن خاں صاحب نے لکھا ہے کہ: "بعض لوگ ناواقفیت کے سبب سے یا محض کم احتیاطی کے باعث "مُتَرَجِّم" (بہ تشدید جیم) کہہ دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں، اسم فاعل "مُتَرجِم" تشدید کے بغیر ہے۔" اس کے برعکس میرا تجربہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے اور قابل اعتبار لوگ "مترجّم" (بہ تشدید جیم) بولتے ہیں۔ میں خود بھی یہی تلفظ کرتا ہوں اور موصوف کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہ تو ناواقفیت کے سبب سے ہے اور نہ کم احتیاطی کے باعث، بلکہ اسی طرح جس طرح لوگ نقد اور انتقاد کی جگہ تنقید بولتے اور لکھتے ہیں۔ اسی طرح میں مُترجّم بولتا ہوں۔ اسی طرح میں نے پڑھے لکھے لوگوں سے "عَفْو" (بہ فتح اول و بہ سکون فا) سنا ہے، "عَفُوْ" (بہ ضمِ فا) نہیں۔ لفظ "لئیق" کے بارے میں خاں صاحب کا ارشاد ہے کہ: "مولفین قاموس نے لئیق کو بھی غلط بتایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ لفظ عربی میں نہیں پایا جاتا، فارسی والے بھی اس سے واقف نہیں؛ یہ لفظ اردو میں بنا ہے اور اردو میں بنے ہوئے ایسے بہت سے لفظوں کی طرح، بالعموم مستعمل ہے۔" (صفحہ ۱۴۸) میری نظر سے اردو کی کسی مستند کتاب میں "لائق" کے معنی میں "لئیق" کا لفظ نہیں گذرا ہے اور میرے نزدیک "نور اللغات" نے صحیح لکھا ہے کہ: "فصحا اس جگہ لائق بولتے ہیں"۔ لیکن اگر رشید حسن خاں صاحب کے خیال میں "لئیق" صحیح ہے تو انھیں کوئی سند پیش کرنی چاہئے، اس طرز سے کام نہیں چلے گا کہ: "غالباً فصحا لئیق احمد اور لئیق الرحمان کو بھی لائق احمد اور

لائق الرحمان کہتے ہوں گے۔" ناموں کا معاملہ بالکل جدا ہے اور انھیں سند کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کی ضرورت سے زیادہ طوالت اور ضخامت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تصنیف نہیں مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اور موضوع اور قاری کے ساتھ انصاف کرنے کی بجائے، زیادہ سے زیادہ مضامین کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ پانچ سو صفحات کے بجائے بڑی آسانی سے دو ڈھائی سو صفحے میں یہ کتاب مکمل کی جا سکتی تھی۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے اس مجموعے میں ۹ مضامین شامل ہیں، ان میں سے حسب ذیل چار مضامین کا میرے خیال میں اصل موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں، ان میں سے بعض ناممکل بھی ہیں، اس لیے انھیں الگ کر دیا جاتا تو اصل موضوع پر کوئی خاص اثر نہ پڑتا:

(۱) طلائی۔بلائی، ۵ا صفحات (۲) سقوطِ حروفِ علت، ۷۱ صفحات (۳) اعلان نونؐ ۱۶ صفحات (موصوف کی دوسری کتاب "اردو املا" میں جو ترقی اردو بورڈ ہی سے چھپی ہے، "ن" کی بحث بہت تفصیل سے آچکی ہے جو ۷۳ صفحات پر مشتمل ہے، اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو اس کا موقع وہیں تھا۔) (۳) مختارات امیر مینائی، ۱۲۲ صفحات (۴) بحر البیان ۷۷ صفحات۔ کل ۲۴۷ صفحات۔

ایک آخری بات اور عرض کرنی ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کو ترقی اردو بورڈ کے مقاصد کا جو علم ہے، اس کے مطابق اس کی حیثیت عام تصنیفی اور اشاعتی اداروں سے مختلف ہے اور میرے خیال میں اس کے مقاصد میں مضامین کے مجموعے نہیں آتے ۔ اگر ترقی اردو بورڈ کو "اردو زبان و قواعد" پر کوئی کتاب شائع کرنی تھی تو اسے کتاب لکھوانی چاہیے تھی، نہ کہ مختلف مضامین کا کوئی مجموعہ چھاپ دے۔ اس مجموعے میں جتنے مضامین شامل ہیں، وہ انفرادی طور پر بہت ہی قابل قدر ہیں، مگر ان کا مجموعہ تصنیف یا تالیف کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا، اس لیے ترقی اردو بورڈ کی شہرت اور مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ اس موضوع پر

مختلف مضامین کے مجموعے کے بجائے ایک ایسی کتاب شائع کرتا جو اس کی ہدایات اور ضروریات کے مطابق لکھی جاتی، چاہے اس کے لیے خود رشید حسن خاں صاحب ہی کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ وہ بہرحال اس موضوع پر لکھنے کے لیے بہت موزوں ہیں۔ کتاب بڑی صاف ستھری اور خوبصورت چھپی ہے جس کے لیے ہم ترقی اردو بورڈ کو مبارک باد دیتے ہیں۔

٭

## سہ ماہی معیار مرتب: بلراج مینرا ۔ شاہد ماہلی

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ ، حجم ۲۹۰ صفحات، قیمت: ۱۵ روپے ۔ پتہ: سی $\frac{2}{94}$ صفدر جنگ ڈیولپمنٹ ایریا، حوض خاص۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶۔ تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

پیش نظر رسالے کا پہلا شمارہ مارچ میں شائع ہوا ہے اور یہ تمام تر افسانوں اور نظموں یا ان سے متعلق مسائل اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور تخلیق کار شامل ہیں۔ شروع میں "سمت" کے عنوان سے ڈیڑھ پونے دو صفحے کی ایک تحریر ہے جس کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے: "سماجی وابستگی کا ادب، در اصل سماج کو بدلنے کی تحریک کا ادب ہے، سماج کو بدلنے کے معنی ہیں، انسان کے مقدر کو بدلنے والی قوت سے وابستگی، انسان کے مقدر کو بدلنے والی قوت سے وابستگی کے معنی ہیں، زندگی کی گہری معنویت کی تلاش اور خوابوں کی حقیقت بنا دینے کی جدو جہد۔ اسی جدو جہد میں انسانی المناکیوں کا راز بھی پوشیدہ ہے اور مسرت و تسکین کی تلاش کا راز بھی۔ اسی تلاش و جستجو سے، جس میں دکھ درد بھی ہے اور انبساط و سرشاری بھی، ہمارے ادبی معیار کی سمت متعین ہوتی ہے۔" غالباً اسی ادبی معیار کا تعین اس سہ ماہی رسالے کی غرض و غایت ہے اور غالباً اسی لیے اس کا نام معیار رکھا گیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زیر تبصرہ شمارہ اپنی شکل و صورت اور مضامین و مباحث کے لحاظ سے اسم با مسمّٰی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کی اٹھان بڑی امید افزا اور قابل تعریف ہے، مگر نظموں کی بھرمار، وہ بھی ایک مخصوص انداز کی اور افسانوں کے یک رخے پن کی وجہ سے اس میں وہ تنوع پیدا نہ ہو سکا، جس کی بنا پر ہر حلقے میں مقبول ہو سکے۔ اس شمارے میں بہت سی تخلیقات پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کی ہیں، جن سے ہندوستان کے بہت سے لوگ ناواقف ہیں، اس لئے آئندہ ان کا مختصراً تعارف کرا دیا جائے تو اس رسالہ کی افادیت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

(عبداللطیف اعظمی)

# جامعہ





جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ

| شمارہ ۸ | بابت ماہ اگست ۱۹۷۷ء | جلد ۷۴ |
|---|---|---|



## فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی • ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

ابھی حال میں مصر اور لیبیا کے درمیان جو فوجی تصادم ہوا وہ عرب اتحاد کے حامیوں کے لئے باعث تعجب و افسوس تو تھا ہی، ان لوگوں کے لئے بھی حیرت کا باعث تھا جنھیں ان دونوں ملکوں کی باہمی کشاکش کا بہت زیادہ علم نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ مغربی ایشیا اور افریقہ کی سیاسی صورت حال پر نظر رکھتے ہیں انھیں اس تصادم میں کوئی غیر متوقع بات نظر نہیں آئی، یہاں تک کہ کچھ ارباب بصیرت تو اس صورت حال کے کسی وقت بھی متوقع تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دو عرب پڑوسی ملکوں کے مابین شدید اختلافات ان سب کے لئے تشویش کا سبب ہیں جو مغربی ایشیا میں امن کے خواہاں ہیں، جو یہ چاہتے ہیں کہ فلسطینیوں کا مسئلہ پرامن طور پر گفت و شنید کے ذریعہ طے ہو جائے اور اس علاقے میں بڑی طاقتوں کی سیاسی و معاشی ریشہ دوانیوں کے کم سے کم مواقع رہیں۔

---

جمال عبد الناصر مرحوم کے عہد عروج کے ایک حصہ میں مغربی ایشیا کی سیاسی صورت حال میں ایک حد تک استحکام رہا، لیکن بعد میں ان کے بعض اندازے غلط ثابت ہوئے اور پھر جو عدم استحکام کی صورت پیدا ہوئی وہ اب تک موجود ہے اور مستقبل قریب میں اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی کہ مغربی ایشیا میں پائدار امن کا قیام عمل میں آسکے۔ اس سلسلے میں لیبیا کی قومی دولت میں روز افزوں اضافہ، افریقہ کے بعض علاقوں میں اس کے بڑھتے ہوئے عزائم اور مصر سے اس کی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے مسئلہ کی کچھ اور جہتیں ابھر آئی ہیں۔ مغربی ایشیا اور افریقہ کی سیاست میں کرنل قزافی کی شخصیت ایک ایسا عامل ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس عامل کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بذات خود ایک سیمابی کیفیت کی حامل ہے اور پھر اس کیفیت کا رنگ دنیا کی بعض بڑی طاقتوں کے عمل اور رد عمل سے چوکھا ہوتا رہتا ہے۔

---

لیبیا کی جنوبی سرحد چاڈ سے ملتی ہے اور ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ چاڈ کے اس علاقے میں لوہے اور یورینیم کا ذخیرہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ سے لیبیا کی نظر اس علاقے پر ہے۔ گذشتہ سال حکومت لیبیا نے اپنی جنوبی سرحدوں کا جو نقشہ تیار کیا تھا اس میں اس علاقے کو شامل کر لیا تھا۔ اس کی شکایت چاڈ نے OAU (آرگنائزیشن آف افریکن یونیٹی) سے کی اور یہ بھی کہا کہ تقریباً ۱۴۱ مربع میل کی پٹی پر لیبیا نے پہلے ہی قبضہ کر رکھا ہے۔ او، اے، یو نے اس تنازعہ کو حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر اور سوڈان نے اس سلسلے میں کچھ اور طے کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ چاڈ کی حکومت کی فوجی امداد نہ کی گئی تو لیبیا کا ناجائز قبضہ قائم رہے گا اور شمالی چاڈ میں علاحدگی پسندی کا جو رجحان اُبھر رہا ہے یا اُبھارا جا رہا ہے اُسے مزید تقویت ملے گی۔ سادات تو غالباً سوڈان کی راہ سے مصری فوج بھیجنا بھی چاہتے تھے لیکن حکومت فرانس نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ایسا نہ کریں۔

---

دوسری طرف لیبیا کا الزام یہ ہے کہ مصر لیبیا کی جمہوریہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس علاقے میں اپنی برتری کو بحال رکھنے کے لئے اس کے خلاف جارحانہ منصوبے بناتا رہتا ہے۔ لیبیا میں مصری افواج کی کارروائی سے کوئی دس روز قبل ٹریپولی ریڈیو نے اعلان کیا تھا کہ مصر کے نائب صدر حُسنی مبارک اور مصری افواج کے چیف آف اسٹاف سوڈان گئے تھے۔ لیبیا اس واقعہ کو اپنے خلاف اعلان جنگ تصور کرتا ہے۔ ۱۱ر جولائی کو یہ نشریہ بھی سننے کو ملا کہ لیبیا کی جنوبی سرحدوں پر کچھ ہونے والا ہے۔ ٹریپولی میں یہ خبر عام تھی کہ جنوبی لیبیا پر حملہ ہوگا۔ لیبیائی ریڈیو نے اعلان کر دیا تھا کہ اس صورت حال میں جمہوریہ لیبیا اپنا یہ حق محفوظ رکھتی ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لئے جارحانہ اقدام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے نشریے اور ساری رجز خوانیاں مصر اور ایک حد تک سوڈان کے خلاف تھیں، اور اس سب کا نتیجہ مصر اور لیبیا کے مابین کسی نہ کسی علاقے میں فوجی تصادم کی شکل میں رونما ہونا تھا۔

---

گذشتہ چار سال سے مصر اور لیبیا دونوں ایک دوسرے پر سازش کا الزام لگاتے رہے ہیں، صدر سادات نے کبھی کرنل قذافی کو اپنا بھائی کہا تھا، لیکن اب وہ انھیں لیبیا کا ' مرد جنوں کار'

کہتے ہیں۔ صدر سادات کے خلاف مصر میں جب کبھی کوئی آواز اٹھتی ہے، سمجھا جاتا ہے کہ اس میں کرنل قزافی کا ہاتھ ہے اور اسی طرح لیبیا میں جب کوئی سازش پکڑی جاتی ہے تو سادات کہیں قریب ہی کھڑے نظر آتے ہیں، ابھی حال ہی میں مصر کے مذہبی امور کے وزیر کو اغوا کر لیا گیا تھا اور انھیں شہید بھی کر دیا گیا۔ دریائے نیل کے کنارے کئی جگہ بم پھٹے، ان واقعات کے سرے تریپولی سے جوڑ دیے گئے۔ ایک ایسی تناؤ کی فضا میں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، حالیہ فوجی تصادم حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس خیال میں کہ اس واقعہ سے عرب اتحاد کو سخت صدمہ پہونچا ہے، اب کوئی ندرت نہیں رہی، اس لیے کہ ابھی ماضی قریب میں ایسا بارہا ہو چکا ہے، عرب اتحاد ایک آدرش، ایک آرزو تو ہو سکتی ہے لیکن عملاً ممکن نظر نہیں آتی، خاص طور سے اس عہد میں جب مقامی اور قومی مفاد باقی تمام مادی اور روحانی رشتوں سے زیادہ قوی اور بالا ہیں۔

---

ہمیں کوئی حیرت تو نہیں ہوئی لیکن ہم نے دلچسپی اور توجہ سے یہ خبر پڑھی کہ جب مصر کی ہوائیہ لیبیا کے جمال عبد الناصر نامی ہوائی فوجی اڈے پر بمباری کر رہی تھی تو اسرائیل کے وزیر اعظم نے سادات کو اطمینان دلایا کہ وہ سنائی میں اپنی سرحدوں کی طرف سے مطمئن رہیں۔ یہ خبر اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اسرائیل اور امریکی لابی والے دوسرے ملک سمجھتے ہیں کہ لیبیا کی کمزوری سے بحیرۂ روم اور مغربی ایشیا میں سوویٹ یونین کے وقار کو صدمہ پہونچے گا اور اس کے اثرات کم ہوں گے۔ اس وقت اسرائیل اور مصر دونوں کو یہ شکایت ہے کہ سوویٹ یونین کرنل قزافی کی سرپرستی اور ہمت افزائی کر رہا ہے۔

---

لیبیا کی قومی دولت بڑھ رہی ہے، اس کے معاشی حالات مستحکم اور ترقی پذیر ہیں، دوسری طرف مصر کے معاشی حالات کمزور ہیں، وہ اس معاملہ میں اپنے دوسرے عرب بھائیوں کا ایک حد تک دست نگر ہے۔ صدر سادات نے 'انفتاح' یعنی کھلے دروازے کی پالیسی کا اعلان کیا تھا، مقصد یہ تھا کہ مصر میں باہر کا سرمایہ لگے اور اس سے مصر کی جنگ کی ماری معاشیات میں سدھار ہو۔ لیکن یہ پالیسی بڑی حد تک ناکام رہی۔ اُدھر انھوں نے امریکہ کا اتنا سہارا لیا کہ سوویٹ یونین سے قطع تعلق ہو کر رہ گیا، لیکن اس سے بھی انھیں وہ چیز نہ ملی جس کی

انھیں تلاش تھی، یعنی یہ کہ اسرائیل سے کوئی پائدار معاہدۂ امن نہ ہو سکا۔ خود مصر میں کمیونسٹ اور بعض اسلامی حلقے ان کے شدید مخالف ہو گئے ہیں۔ کمیونسٹوں نے بحیثیت ایک جماعت کے ناصر کے دور حکومت میں اپنی انفرادیت کو گم کر دیا تھا، لیکن اب وہ پھر چپکے چپکے اپنی تنظیم کو مضبوط کر رہے ہیں اور سادات کے خلاف کسی بھی ایجی ٹیشن میں شریک ہونے کے لئے تیار رہتے ہیں اس منصوبے کے ساتھ کہ "انتشار اور ابھی، اور ابھی، اور ابھی" فلسفہ یہ ہے کہ جتنا انتشار بڑھے گا موجودہ سیاسی، معاشی اور سماجی ادارے اتنا ہی کمزور ہوں گے اور کشاکش اور تضادات کے افق ہی سے سرخ سویرا طلوع ہوگا۔

---

اس طرح صدر سادات کے اپنے مسائل ہیں اور ان مسائل کے حل کی سردست کوئی صورت نظر نہیں آتی، مجموعی طور پر وہ مصر کو ایک مستحکم معاشی ڈھانچہ دینے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کی خارجہ پالیسی بھی تذبذب کا شکار رہی ہے۔ بڑی طاقتوں سے سے معاملہ کرنے میں بھی انھوں نے اس درجہ کے استقلال، جرارت اور خودداری کا ثبوت نہیں دیا جس کی کہ مصر جیسے اہم اور شاندار روایات کے حامل ملک سے بجا طور پر امید کی جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صدر سادات کو اپنی پوری پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور مصر کو ایک بار پھر اس قابل بنانا چاہئے کہ وہ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی سیاسی و ثقافتی قیادت کا حق ادا کر سکے۔

سید عبدالرحمٰن برکتی

# پروفیسر سُونیتی کمار چٹرجی

## حیات اور کارنامے

متوسط قد ـــــ لیکن انفرادیت کا حامل، رنگ گندمی ـــــ ایک نایاب انمول مسودے کی طرح، چہرہ کتابی ـــــ متانت سنجیدگی اور خود اعتمادی سے بھرپور، لمبی اونچی ناک ـــــ بھارت کے علم و ادب کی ناک، آنکھیں بڑی اور پُرکشش ـــــ فنکارانہ جلال و جمال کی مظہر، ان آنکھوں پر کبھی ہلکے نیلے رنگ کی عینک، اور کبھی پاور والا چشمہ ـــــ گہری بصیرت و بصارت سے مزیّن، جسم ہمیشہ دھوتی اور کرتہ میں ملبوس ـــــ ایک مثالی بنگالی اسکالر کی شان، گلے میں ایک خاص قسم کا نیلے دھاری والا پٹکا اور ہاتھ میں تپلی چھڑی ـــــ خاکساری اور انکساری کا مجسمہ ـ چلتے تو معلوم نہ ہوتا کہ اس انسان نے زندگی کی چھیاسی منزلیں طے کرلی ہیں، بولتے تو ضعف، پیری کا شائبہ دور دور تک نظر نہ آتا ـــــ یہ شبیہ ہے اس شہرۂ آفاق ماہرِ لسانیات، ہندوستانی زبان و ادب کے بادہ خواروں کے پیرِ مغاں متبحر اسکالر، دیدہ ور محقق، عظیم دانشور، علوم انسانی کے رمز شناس، مثالی استاد، بلند پایہ نقّاد، شعلہ مقال، مجاہد العلم، رئیس القلم، نکتہ سنج نکتہ شناس، ذی فہم ذی وقار، یکتائے فن، یگانۂ روزگار انسان کی، جسے

---

جناب سید عبدالرحمٰن برکتی، کلکتہ میں مقیم اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

علم وادب کا معمولی سا شائق بھی کسی علمی یا ادبی کانفرنس یا سمینار میں دور سے بولتے ہوئے دیکھ لیتا تو اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا "پروفیسر چٹرجی از اسپیکنگ" (پروفیسر چٹرجی بول رہے ہیں)۔

پروفیسر چٹرجی ایک عرصے سے بول رہے تھے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں ان کی زبان کی طرح ان کا قلم بھی متحرک تھا۔ جہاں انھوں نے اپنی زندگی میں بیسیوں قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر کے انھیں رنگ و نور بخشا، وہاں ساڑھے تین سو سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کر کے لاکھوں کی ذہنی آبیاری کی۔ انھوں نے وقت کی اور وقت نے ان کی جس طرح قدر کی، اس کی مثال بنگال کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اپنے دور کا یہ عبقری چند گھنٹے کی علالت میں موت سے پنجہ کشائی کرنے کی جگہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دے گا۔

## علالت اور وفات

پروفیسر چٹرجی زندگی کی ستاسیویں منزل سے گذر رہے تھے لیکن اس کبرسنی میں بھی وہ جوانوں جیسی انرجی رکھتے تھے۔ مطالعہ سے اس عمر میں بھی از حد شغف رکھنا اور دن بھر میں بارہ بارہ گھنٹے علمی و ادبی کاموں کے لیے نذر کرنا شاید جوانوں سے بھی ممکن نہیں۔ شاید وہ ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے ہاتھ میں قلم اور کاغذ لیکر ہی اس دنیا میں وارد ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ اس عمر میں بھی جیسے وہ تھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں اپنے چیمبر میں وہ بلا ناغہ آتے اور بڑے ہشاش بشاش اپنے کاموں میں منہمک رہتے اس کے علاوہ اپنے دولتکدے وہ اپنے ملنے والوں سے تین منزلہ عمارت کے زینے آسانی سے طے کر کے نیچے دہلیز میں ملتے۔ ۲۹ رمئی کا وہ دن کتنا منحوس تھا جب دوپہر سے کچھ قبل اچانک انھیں سینے میں کچھ درد کا احساس ہوا۔ خاندانی معالج کے بروقت

پہونچنے اور دیکھنے سے عارضی طور پر انھیں کچھ آرام سا ہوگیا لیکن دو گھنٹے بعد پھر ان پر عارضہ قلب کا حملہ ہوا۔ اس دفعہ ماہر قلب ڈاکٹر پی کے سین بلوائے گئے۔ انھوں نے موقعہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انھیں نرسنگ ہوم منتقل کرنے کی صلاح دی چنانچہ انھیں اسی وقت ووڈلینڈ نرسنگ منتقل کردیا گیا۔ پروفیسر موصوف اس سے قبل ۸ار مئی کو آنکھ کے اپریشن سے کامیابی کے ساتھ گذر چکے تھے لیکن اس دفعہ وہ نرسنگ ہوم سے بحیات واپس نہ آسکے۔ ۳بجکر ۱۲ منٹ کی وہ گھڑی تھی جب عمر بھر کروڑوں کو اپنی تقریر وتحریر سے مسحور کرنے والا خود موت کی لوری کے سحر میں کھو گیا ع

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

## خاندان، پیدائش اور ابتدائی تعلیم

پروفیسر سونیتی کمار چیٹرجی بنگال کے ایک برہمن خاندان کے گنج گرانمایہ تھے۔ ان کے آباء واجداد کا سلسلہ برہمنوں کے کسپیہ قبیلے کے کنقومی شاخ سے ملتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس شاخ کے وتارگ سماویدین نامی ایک برہمن کچھ دوسرے برہمن خاندان کے ساتھ ان کی تیئسویں پشت میں شمالی ہندوستان (اترپردیش) وارد ہوئے تھے۔ اور گیارھویں یا بارہویں صدی میں مغربی بنگال آکر بود و باش اختیار کرلی تھی۔ وتارگ سماویدن کے پرپوتے میں سلوچنا نامی ایک شخص جو دِسکا نامی برہمن کے صاحبزادے تھے بنگال کے راجہ بلال سین (۱۱۵۸ــ ۱۱۷۹) سے اپنی خدمات کے صلے میں چترتی (یا چٹوتی) نامی ایک گاؤں بطور اکرام پایا تھا۔ اسی گاؤں کے نام پر ان کے خاندان کا نام ذرا بگڑ کر چیٹرجیا یا چیٹرجی پڑا جسے انگریزی میں ویسے ہی اور سنسکرت میں چٹوپادھیا لکھا جاتا ہے تیرھویں صدی میں جب ترکوں نے مغربی بنگال پر حملہ کیا تو یہ خاندان ہجرت کرکے مشرقی بنگال چلا گیا۔

وتارگ سماویدن کی بیسویں نسل میں یادوسربھا بھوما نامی ایک برہمن سنسکرت کے

بہت بڑے عالم ہوئے۔ چھبیسویں نسل میں بھیر بھا چندر کا خاندان گذرا جو پروفیسر چٹرجی کے جدِ امجد تھے۔ یہ خاندان مشرقی بنگال کے ضلع فریدپور سے مغربی بنگال کے ضلع ہوگلی میں آکر بس گیا۔ ان ہی کے لڑکوں میں الیشور چندر (متوفی ۱۹۰۶) جو فارسی اور انگریزی سے بخوبی واقف تھے بلکہ اچھی استعداد رکھتے تھے، ڈاکٹر چٹرجی کے دادا تھے۔

الیشور چندر نے کلکتہ میں رہائش اختیار کر لی تھی ان ہی کے لڑکوں میں بابو ہری داس چٹرجی کے یہاں، جو بنگال کے ایک اچھے شاعر اور موسیقار سمجھے جاتے تھے، شیپ پور (ضلع ہوڑہ) میں پروفیسر موصوف نے ۲۶ نومبر ۱۸۹۰ء میں آنکھیں کھولیں۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم کا آغاز موتی سِلس فری پرائمری اسکول سے کیا۔ اس کے بعد اسکاٹش چرچ کالج میں کچھ دنوں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۱۱ء میں مشہور درسگاہ پریسیڈنسی کالج سے بی۔ اے انرز (انگریزی) اور ۱۹۱۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کے امتحانات فرسٹ کلاس فرسٹ سے پاس کر کے اپنی ذہانت و فطانت کا سکہ جما دیا۔ ۱۹۱۳ء میں آپ کلکتہ کے ودیا ساگر کالج میں انگریزی کے استاد مقرر کئے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے بنگال سنسکرت الیوسی ایشن کا ویدک سنسکرت امتحان پاس کیا۔ اسی سال انھیں دو قابلِ قدر انعامات سے نوازا گیا۔ پہلا پریم چند رائے ریسرچ اسٹوڈنٹ شپ، اور دوسرا کلکتہ یونیورسٹی جوبلی ریسرچ پرائز۔

## اعلیٰ تعلیم اور یورپ کا سفر

۱۹۱۹ء میں حکومت ہند کی جانب سے لسانیات کے اسکالر کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیج دیے گئے جہاں آپ لندن یونیورسٹی میں لسانیاتی مطالعے میں

دو سال تک غرق رہے ۱۹۲۰ء میں آپ نے علم صوتیات (PHONETICS) پر ڈپلوما حاصل کیا اور ۱۹۲۱ء میں لندن یونیورسٹی نے آپ کو آپ کے تحقیقی مقالے

"THE INDO- ARYAN LINGUISTICS —THE ORIRIN AND DEVELOPMENT OF THE BENGALI LANGUAGE"

پر ڈی۔ لٹ کی گرانقدر ڈگری سے نوازا۔ جن اساتذہ کی زیر نگرانی آپ نے یہ ریسرچ مکمل کی ان میں ڈینیل جونس کا نام بہت اہم ہے۔ لندن سے تکمیل مقالے کے بعد وہ فرانس چلے گئے جہاں پیرس یونیورسٹی، کالج دی فرانس اور دوسری دانشگاہوں میں لسانیاتی تحقیق میں مصروف رہے۔ اسی سال انھوں نے اٹلی، یونان اور جرمنی کا سفر کیا۔

## چند اہم عہدوں پر

ڈاکٹر موصوف ۱۹۲۲ء میں جب ہندوستان واپس آئے تو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسی سال انھیں کلکتہ یونیورسٹی میں ہندوستانی لسانیات اور صوتیات کا کھیرہ پروفیسر بنایا گیا، جہاں وہ تقریباً بیس سال تک اپنے فرائض بڑے حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں کھیرہ پروفیسرشپ سے سبکدوش ہونے کے بعد اس شاندار اور طویل خدمت کے صلے میں انھیں کلکتہ یونیورسٹی میں ہی ایمیریٹس (EMIRITUS) پروفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اسی سال وہ مغربی بنگال لیجسلیٹو کونسل میں پہلے ممبر اور پھر اس کے چیرمین منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر بار بار منتخب ہو کر تقریباً ۱۳ سال تک رہنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ خواص و عوام دونوں میں بہت عزیز و مقبول تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب وہ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں مصروف سفر تھے کہ حکومت نے انھیں علوم انسانی کے ریسرچ نیشنل پروفیسر کی حیثیت سے چُنا۔ ۸ر فروری ۱۹۶۵ء کو وہ کونسل کے عہدے سے مستعفی ہو کر اس نئے عہدے کی ذمہ داری قبول کی جس پر وہ آخری عمر تک قائم رہے۔

# متعدد قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت

پروفیسر چٹرجی نے ہزاروں چھوٹی بڑی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی! دوران میں اپنے فاضلانہ لکچرز سے پوری دنیا میں دھوم مچادی۔ انھوں نے بہت سی کانفرنسوں کی صدارت بھی کی اور بیشتر کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی۔ یہاں ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں انھوں نے لندن میں صوتیاتی علوم پر منعقدہ دوسری بین الاقوامی کانفرنس میں کلکتہ یونیورسٹی کی نمائندگی کی اور ہندوستانی سیکشن کی صدارت بھی کی۔ یورپ کے اس سفر میں انھوں نے آسٹریا، ہنگری، زیکوسلاویہ، فرانس اور جرمنی کی سیر کی۔ دوران سفر انھوں نے برلن یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں کئی لیکچر دیئے۔

۳۷-۱۹۳۶ء میں رنگون میں ہونے والی آل انڈیا لٹریری کانفرنس کی صدارت کی۔ صوتیاتی سائنسیز کی تیسری بین الاقوامی کانفرنس جس کا انعقاد ۱۹۳۸ء میں بلجیم میں ہوا تھا اس میں بھی پروفیسر صاحب کلکتہ یونیورسٹی کے نمائندہ بنکر گئے تھے۔ اسی سال ماہرین علوم انسانی کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ کوپن ہیگن، مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ براسیلز، دونوں میں کلکتہ یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اسی سفر میں انھوں نے ناروے، سویڈن، فن لینڈ، پولینڈ، جرمنی، بلجیم اور اٹلی کی سیر کی۔

۱۹۴۰ء میں انھوں نے گجرات ورناکولر سوسائٹی کی دعوت پر پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں کئی لیکچر دیئے۔

۱۹۴۶ء میں ۳۴ ویں آل انڈیا ہندی لٹریری کانفرنس منعقدہ کراچی میں نیشنل لنگویج

سیکشن کی صدارت کی۔

۱۹۴۸ء میں پیرس میں ہونے والی ماہرین انسانیت اور مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں اور براسیلیز میں ماہرین انسانیت کی بین الاقوامی کانفرنس میں کلکتہ یونیورسٹی اور ہندوستانی حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس زمانے میں انھوں نے قاہرہ کا بھی سفر کیا۔

۱۹۴۹ء میں یونسکو کی بلائی ہوئی ایک عالمی کمیٹی کی مجلس میں شریک کار رہے۔

۱۹۵۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے اٹلی، انگلینڈ، ہالینڈ اور ترکی کا ایک تعلیمی اِنکوائری ٹور کے تحت سفر کیا۔ اسی سال مارچ کے مہینے میں پیرس میں منعقدہ یونسکو کانفرنس میں شرکت کی اس کے علاوہ ۱۹۵۰ء میں ہونے والی یونسکو کی دوسری کانفرنس اور تیسری کانفرنس جو عربی اور فارسی کے سلسلے میں بیروت (لبنان) میں ۱۹۵۱ء میں منعقد ہوئی تھی، سبھوں میں پروفیسر صاحب شریک تھے۔

۱۹۵۲ء میں پھر وہ یونسکو کی ایک کانفرنس میں تشریف لے گئے جس کے بعد انھوں نے میکسیکو، اور دوسرے قریبی شہروں کا دورہ کیا اور ۳۱ر مارچ کو ہندوستان واپس آگئے۔

۱۹۵۳ء میں وہ سترھویں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

جولائی ۱۹۵۴ء میں انھوں نے مغربی افریقہ، گولڈ کوسٹ، نائیجریا وغیرہ کا ایک سبولنشن کے تحت سفر کیا۔ دوسرے مہینے میں انھوں نے کیمبرج میں ہونے والی مستشرقین کی ۲۳ ویں کانگریس میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی جانب سے نمائندہ بنکر گئے۔ اسی سال انڈونیشیائی زبانوں پر ہونے والی ایک کانگریس میں حکومت انڈونیشیا کی دعوت پر ہندوستانی حکومت کی طرف سے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

مئی ۱۹۵۵ء میں وہ حکومت چین اور پیکنگ یونیورسٹی کی دعوت پر ہندوستانی یونیورسیٹیز ڈیلیگیشن (Indian Universities Delegation) کے ممبر کی حیثیت سے چین کا سفر کیا۔

ستمبر ۱۹۵۹ء میں وہ سوویٹ اکاڈیمی آف سائنسیز کی دعوت پر ماسکو میں چوتھی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئے اور مقالہ پڑھا۔ اس کے علاوہ ماسکو، لینن گراڈ اور کئی جگہوں پر لیکچر دیئے۔ اسی سال تاشقند میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی ایک کانفرنس میں بھی حصہ لیا اور ایک سیکشن کی صدارت بھی کی۔

۱۹۵۹ء میں کامن ویلتھ پارلیامنٹری کانفرنس میں، جس کا انعقاد کنبرا (آسٹریلیا) میں ہوا، ہندوستانی نمایندہ کی حیثیت سے شریک کار رہے۔

۱۹۶۰ء میں ماسکو میں ۹ راگست سے ۱۶ راگست تک ہونے والی مستشرقین کی ۲۵ ویں بین الاقوامی کانفرنس میں بھی حکومت ہند کی نمایندگی کی۔ اس میں انھوں نے جو ایک مقالہ پڑھا وہ یہ تھا "ہندوستان اور چین —— اپنے قدیمی تعلقات کے آئینے میں نیز ہندوستان نے چین سے کیا لیا۔"

۱۹۶۱ء میں وہ روم یونیورسٹی کی دعوت پر روم کا سفر کیا جہاں انھیں مذکور یونیورسٹی نے "HONORIS CAUSA" (ڈاکٹریٹ) کی ڈگری سے نوازا۔ اسی سا[ل] وہ تہران گئے اور وہاں تہران یونیورسٹی میں ایرانینزم (IRANIANISM) پر اپنا مقا[لہ] پڑھا۔

۱۹۶۲ء میں ماہرین لسانیات کی نویں بین الاقوامی کانفرنس جو ہارورڈ یونیورسٹی ا[ور] کئی دوسری بڑی تنظیموں کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی اس میں بھی انھوں نے اپنا تحقیقی [مقالہ] پڑھا اور ایک پورے سیشن کی صدارت کی۔

۱۹۶۴ء میں وہ مستشرقین کی ۲۶ ویں بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ دہلی میں

تنظیمی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے شریک کار رہے۔ اسی سال ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی ایک کانفرنس جس کا انعقاد ماسکو میں ہوا تھا، میں بھی شریک ہوئے۔

۱۹۶۶ء میں وہ نو افریقی اور یورپی ممالک کے ایک دو ماہی ٹور میں "ہندوستانی تاریخ اور اس کی ثقافت" پر اپنی تحقیقات پیش کرنے کے لئے مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں تشریف لے گئے۔ اس ٹور کا نظم ہندوستانی سرکار اور چند دوست ممالک کی طرف سے ہوا تھا جس میں انھوں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا۔

۱۹۶۶ء میں انھیں حکومت ایران نے تہران میں ہونے والی ایرانولوجسٹ (IRANOLOGISTS) کی عالمی کانگریس میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا جس میں انھوں نے "ایرانی ثقافت اور اس کا اثر دنیا پر ــــ (زمانہ آرکمینیڈین سے)" پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اسی سال انھوں نے "ہندوستانی ادب میں جدیدیت" کے سمینار میں بھی حصہ لیا جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی میں منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے انڈو یورپین کلچر اور لسانیات کی چند پہلوؤں پر کئی لکچر دیئے۔

ڈاکٹر صاحب قاہرہ یونیورسٹی بھی تشریف لے گئے تھے جہاں انھوں نے ہند ــــ عرب ثقافتی تعلقات اور ان تعلقات کے ذریعہ انسانی نسل کی تکمیل" پر اپنے گرانقدر آرا پیش کئے۔ ادیس ابابا میں ہیل سلاسی یونیورسٹی میں انھوں نے جس موضوع پر اپنی عالمانہ تقریر سے بہت متاثر کیا ــــ وہ موضوع تھا "ہندوستان اور اتھوپیا کے رشتے شروع قدیم سے"

۱۹۶۷ء میں انھوں نے مستشرقین کی ۲۷ ویں بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کی۔ اسی سال رومانیہ میں ہونے والی ماہرین لسانیات کی ۱۰ ویں بین الاقوامی کانگریس میں بھی وہ حاضر ہوئے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں انھوں نے سنٹرل ایشیا کی بین الاقوامی کانفرنس جو یونسکو اور

آئی۔سی۔سی۔آر (نئی دہلی) کی مدد سے منعقد کی گئی تھی، میں بھی حصہ لیا۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں انھوں نے دہلی میں ہونے والے گرونانک کے پانچ سو سالہ جشن میں مدعو کیے گئے اور اس میں ۹، ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کے تمام سمیناروں کی صدارت کی۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں ہونے والے جشن میں ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ دسمبر کو بحیثیت صدر فرائض انجام دیئے۔

۱۹۷۰ء میں گرونانک کے پانچ سو سالہ جشن کے موقع پر سمینار (منعقدہ مدراس) کی رسم افتتاح ان ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس سمینار میں بھی انھوں نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

## چند اہم کتابوں پر ایک نظر

یوں تو پروفیسر موصوف کی تصنیفات و تالیفات کی مجموعی تعداد تین سو اسی کے قریب ہے جو مختلف زبانوں میں ہیں لیکن یہاں ایک تو رسالے کی تنگ دامنی پیش نظر ہے دوسری طرف "جامعہ" کے قارئین کا علمی ذوق بھی ملحوظ نظر ہے لہٰذا صرف چند کتابوں کا مختصر حال تعارفاً درج ذیل کیا جاتا ہے :

۱۔ The Origin and Development of Bengali Language

یہ کتاب بنگلہ زبان کی جنم اور اس کی ابتداء و ارتقاء پر ایک بڑی ہی ضخیم اور مستند کتاب ہے۔ دراصل فاضل محقق نے لندن یونیورسٹی میں اپنا جو تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا اور جس پر انھیں ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔ اسی مقالے کو کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۹۲۶ء میں پہلی بار کتابی شکل میں پیش کیا۔ ۱۹۷۰ء میں جارج اینڈ اَنون لمیٹڈ نے دوسری بار اور ۱۹۷۵ء میں روپا اینڈ کمپنی نے تیسری بار مذکورہ کمپنی کے انتظام و اہتمام میں شائع کیا۔

۲۔ Indo Aryan and Hindi

پروفیسر چٹرجی نے گجرات ورناکولر سوسائٹی (عالیہ ودیا سبھا) کے ریسرچ اور پوسٹ

گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہندی پر کئی اہم لکچرز دیئے تھے جسے اسی سوسائٹی نے پہلی بار ۱۹۴۰ء میں طباعت سے آراستہ کیا۔ دوسرا ایڈیشن تصحیح اور اضافہ کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں اور تیسرا ایڈیشن میں ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ Languages and Literatures of Modern India

ہندوستانی زبان و ادب پر پروفیسر چیٹرجی کی یہ کتاب بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر ٹچی (Dr. TUCCI) جو روم میں ISTITUTE ITALIANO PER IL MEDIO ED ESTRENO ORIENTE کے ڈائرکٹر تھے اور پروفیسر موصوف کے بہت پرانے دوست بھی تھے ۱۹۵۰ء میں انھوں نے پروفیسر صاحب سے گذارش کی تھی کہ وہ LE CIVILTA DEL ORIENTE کی دوسری جلد کے لئے ہندوستان کی زبانوں اور ان کے آداب پر ایک طویل تحقیقی مقالہ لکھیں۔ پروفیسر صاحب نے ۱۹۵۱ء میں اسے مکمل کر کے روم بھیج دیا جہاں وہ مقالہ اطالوی زبان میں منتقل طور پر منظر عام پر آیا۔ پروفیسر صاحب کا انگریزی مقالہ جو اب تک غیر مطبوعہ تھا، پروفیسر موصوف نے دوستوں کی گذارش پر دوبارہ ترمیم اور اضافہ کے ساتھ پھر سے ترتیب دینا شروع کیا[۱] جو ۱۹۶۳ء میں بنگال پبلیشرز پرائیویٹ لیمیٹڈ (کلکتہ) کے اہتمام میں طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا اور بہت مقبول اور ہردلعزیز ہوا اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں ہندوستانی زبانوں ــــــ اس کے مسائل اور حل پر سیر حاصل بحث ہے۔ دوسرا حصہ ہندوستانی زبانوں کے آداب پر مفصل تبصرہ ہے۔ پہلے حصے کے جو مضامین ہیں ان میں The Present Linguistic Position The Place of India اور The Question of Script in India بہت اہم ہیں۔

---

[۱] دیباچہ ص۱۱ تا ص۱۳

۴۔ Phonatic in the Study of Classical Language in the East

یہ کتاب ان کے ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے بنگلور یونیورسٹی میں بالترتیب ۸ر اور ۹ر مارچ ۱۹۶۷ء کو بطور نجلنگ گپا توسیعی لکچر دیئے تھے جو اسی سال مئی کے مہینے میں بنگلور یونیورسٹی کے اہتمام میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ گرچہ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن علم صوتیات کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

۵۔ India and Ethopia (from the 7th Century B.C.)

اگست ۱۹۶۸ء میں پروفیسر موصوف نے ریاستہائے متحدہ امریکہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں مستشرقین کی ۲۷ ویں بین الاقوامی کانگریس میں اپنا مقالہ مذکورہ عنوان پر پڑھا تھا۔ یہ مقالہ پوری دنیا میں بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔ کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے اسے شائع کر کے اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔

۶۔ World Literature and Tagore

یہ کتاب بھی ان کے ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے وشوا بھارتی یونیورسٹی میں ۲۷ر اور ۲۸ر اپریل ۱۹۶۸ء کو نری پندرا چندرا بنرجی میموریل لیکچرز کے طور پر دیئے تھے۔ اس کتاب میں دنیا کی چند مشہور کلاسیکس اور نامور ادبی شخصیتوں پر فاضلانہ مضامین ہیں۔ عربی اور فارسی کے کلاسیکس میں The Shahnama اور The Arbian Nights شامل ہیں جو ان کے وسیع مطالعے کے ترجمان ہیں۔ the National Epic of Iran سب سے طویل مقالہ ٹیگور پر ہے جو ٹیگور اور ان کے فن سے قربت کی یاد دلاتی ہے۔

## شخصیت اور اس کے چند اہم پہلو

پروفیسر چٹرجی پوری دنیا میں ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے

لیکن سچ پوچھئے تو وہ ایک ماہر لسانیات سے زیادہ ایک بڑے "ہیومانیسٹ" تھے۔ ان کی نظر میں دنیا کی الگ الگ تہذیب کی کوئی جگہ نہیں تھی بلکہ وہ پوری دنیا کو ایک انسانی تہذیب کے جامہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا کی تمام قوموں، کلچروں اور مذہبوں سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے تھے جس کا مظاہرہ انھوں نے تادم حیات اپنی تقریروں و تحریروں میں کیا۔ وہ جہاں ویدانتا کے قدیم ہندوستانی فلسفے کے سچے پرستار تھے وہاں قدیم یونانی فکر و نظر اور اسلامی تصوف کے بھی بڑے دلدادہ و مدّاح تھے وہ دنیا کی مختلف زبانوں کے جن کلاسیکس کو بہت اہم سمجھتے تھے ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ سنسکرت زبان میں ـــــ رگ وید کے کچھ حصص ـــــ دوسرے وید، مہابھارت رامائن اور کالیداس کا شکنتلا۔

۲۔ یونانی زبان میں ـــــ ہومر کی گیتیں، یونانی المیے وغیرہ۔

۳۔ عبرانی زبان میں ـــــ انجیل مقدس، عبرانی زبان کی دوسری مقدس کتابیں۔

۴۔ فارسی زبان میں ـــــ شاہ نامہ

۵۔ عربی زبان میں ـــــ الف لیلہ

۶۔ انگریزی زبان میں ـــــ شیکسپیر کے ڈرامے، اور نظمیں، ٹالسٹائی کی ناولیں، ڈرامے وغیرہ۔

۷۔ بنگلہ زبان میں ـــــ رابندرا ناتھ ٹیگور کی تمام نثری اور غیر نثری تحریریں۔

وہ ایک کامیاب معلم بھی تھے۔ طلباء کے بارے میں ان کی ہمدردی کا جذبہ غیر معمولی تھا۔ انھوں نے طلباء کی تعلیم سے جس قسم کی دلچسپی لی وہ اس زمانہ میں عنقا ہے۔ انھوں نے کم و بیش تیس سال تک یونیورسٹی میں علم لسانیات اور صوتیات کے علاوہ جن مضامین کی درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے ان میں زمانہ قدیم اور زمانہ وسطیٰ کی انگریزی، یونانی، گوتھک، پہلوی اور عربی کی نصابی کتابیں شامل تھیں۔ لسانیاتی درس میں انھوں

نے سنسکرت، بنگلہ، ہندی، اردو اور اُڑیہ جیسی زبانیں پڑھائیں۔ یونیورسٹی میں وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک لڑکوں کو درس دیتے رہے۔

ان کی گھریلو زندگی بھی عملی زندگی کی طرح کامیاب رہی۔ ایک اچھے انسان کی طرح وہ اپنے گھر سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ شریمتی کملا دیوی جب پچاس سال تک رفیقۂ حیات رہنے کے بعد ۱۹۶۴ء میں چل بسیں تو انھوں نے ایک مثالی شوہر کی طرح اس کی یاد میں کچھ کرنا چاہا۔ مغلیہ تاجدار شاہجہاں کے پاس دولت تھی اس لئے اس نے سنگ مرمر کا تاج بطور یادگار چھوڑا۔ لیکن سونیتی تو کاغذ و قلم کے بادشاہ تھے لہذا وہ ایک "کاغذی تاج محل"[۱] اس کی یاد میں بنا گئے جو ان کی کامیاب خوشگوار گھریلو زندگی کی انمٹ داستان ہے۔

وہ عوامی زندگی میں بھی خواص و عوام میں بڑے مقبول و معزز رہے۔ ان کی مقبولیت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جب ۱۹۵۲ء میں وہ مغربی بنگال لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تو اپنے مقابلے میں دو دو امیدوار ہونے کے باوجود ایک بڑی تعداد ووٹ سے الیکشن جیت گئے اور پھر سبھوں کی متفقہ رائے سے اس کے چیرمین بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء کے الیکشن میں بھی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اسی طرح وہ بار بار منتخب ہوکر تقریباً تیرہ سال تک اس عہدے پر رہے یہاں تک کہ انھیں نیشنل پروفیسر مقرر ہونے کی وجہ سے مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ پورے ہندوستان میں ایسے عہدے پر اتنے دنوں تک رہنا سب سے طویل عرصہ ہے۔

---

[۱] اس کاغذی تاج محل کا نام ہے "In Memoriam: Kamla Devi (1900—1964) A Husband's Offering of Love and Respect" مطبوعہ ۱۹۶۵ء (کلکتہ)

# پروفیسر صاحب اور ٹیگور

پروفیسر چیٹرجی بنگال کے عظیم شاعر و ادیب رابندرا ناتھ ٹیگور سے بڑے ہی قریب تھے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے پیدا ہونے میں ٹیگور کی صحبت کا بہت ہاتھ ہے۔ جہاں وہ ٹیگور سے متاثر تھے وہاں یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں کہ ٹیگور بھی ان کی علمی استعداد اور بالخصوص لسانیاتی معلومات سے بڑے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "بنگا بھاشا پرتیچیہ" کا انتساب پروفیسر صاحب کے نام سے کیا اور انھیں "بھاشا چاریہ" کے نام سے پکارا۔ پروفیسر صاحب اس پر بہت فخر کیا کرتے تھے۔ ٹیگور نے اپنی تحریروں میں بھی بیشتر جگہوں پر اس کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ اپنی کتاب "شیشیر کبیتہ" میں انھوں نے پروفیسر صاحب کو بحیثیت ہیرو پیش کیا۔ پروفیسر صاحب نے ٹیگور کے ساتھ جاوا، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ کا سفر کیا۔ یہاں انھوں نے مختلف جگہوں پر ہندوستانی آرٹ، کلچر اور ٹیگور پر لیکچر دیئے۔ ۱۹۶۲ء میں بھی انھوں نے مارا ٹھواڑا یونیورسٹی (اورنگ آباد) میں ٹیگور اور اس کے فن پر تین لیکچر دیئے، نہ صرف تقریر بلکہ اپنی تحریر سے بھی انھوں نے حق رفاقت ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب WORLD LITERATURE AND TAGORE کا نام قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے ٹیگور کے فن پر اپنے بسیط مطالعہ کا ماحصل پیش کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء میں ایک اور کتاب ٹیگور کے نام پر شائع کی۔ ٹیگور پر ایک اور کتاب بھی وہ مکمل کر چکے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ کتاب[۳] طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔

---

۳؎ AN INTERPETATION OF TAGORE'S JIVAN DEVATA

## پروفیسر صاحب اور اردو

پروفیسر چیٹرجی پورے ہندوستان میں بولی جانے والی تمام ترقی یافتہ زبانوں سے واقف تھے نہ صرف زبان بلکہ ان کی لسانی پیچیدگیوں اور ان کی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے اس سلسلے میں ہندی اور اردو کا ذکر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہندی کی انھوں نے جو خدمت کی اس کو ہندی کی تاریخ میں ہمیشہ جلی حرفوں سے لکھا جائے گا۔ ہندی کی ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "ساہتیہ واچسپتی" جیسے خطاب سے نوازا گیا۔ لیکن یہاں معتوب زبان (اردو) کے ساتھ ان کے تعلقات کا ذکر بہت ضروری ہے۔ اردو کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے انھوں نے اس زبان کی جنم، اس کی ابتدار وارتقار پر جو تحقیقیں کیں وہ بڑی معتبر و مستند سمجھی جاتی ہیں۔ مشہور نقاد و محقق پروفیسر آل احمد سرور نے اردو زبان کی جنم اور اس کی ابتدار وارتقار پر جہاں بحث کی ہے۔ وہاں وہ پروفیسر چیٹرجی کی رائے کو دوسرے محققوں کی رائے پر ترجیح دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

> "اردو زبان ایک آریائی زبان ہے۔ یہ کھڑی بولی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ گریرسن اس کا آغاز ہریانی کے آغاز میں تلاش کرتا ہے۔ شیرانی نے اس کا جنم قدیم پنجابی میں ڈھونڈھا ہے۔ جولیس بلاک اسے اس شورسینی پراکرت کا ثمر سمجھتا ہے جو الہ آباد سے لاہور تک پھیل گئی تھی لیکن اس سلسلے میں سب سے مستند رائے ہندوستان کے مشہور ماہر لسانیات ایس۔ کے چیٹرجی کی ہے جو اسے کھڑی بولی کی

ادبی شاخ کہتا ہے[۱۴]"

ایک دوسری جگہ ان کی رائے سے یوں اتفاق کیا ہے۔

"ہندی اور اردو دو مستقل اور جداگانہ زبانیں نہیں

بقول چٹرجی کے دو ادبی اسلوب ہیں[۱۵]۔"

پروفیسر موصوف نے اپنی مشہور کتاب

Languages and Literatures of Modern India

میں جہاں بھارت کی دوسری زبانوں اور اس کے ادب پر روشنی ڈالی ہے وہاں اردو زبان وادب پر بھی ایک قابل قدر باب لکھکر اردو سے اپنے تعلقات کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب میں ہندوستانی زبانوں کی ادبیات میں "اردو ادب" کا دوسرے باب میں ہونا اردو زبان وادب سے ان کی گہری محبت کا بین ثبوت ہے۔

مغربی بنگال میں جب حکومت نے اردو اکیڈیمی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے چیرمین شپ کے لئے سب سے موزوں آدمی پروفیسر چٹرجی ہی ملے۔ لہٰذا حکومت نے چیرمین کے عہدے پر ان ہی کو نامزد کیا۔ اردو اکیڈیمی تیاری کمیٹی نے ان کی زیر نگرانی اکیڈیمی کا جامع منصوبہ بنایا تھا اور گذشتہ سال اگست کے مہینے میں اپنی مکمل رپورٹ بھی پیش کرچکی تھی لیکن اسے اردو کی بدقسمتی کہیئے یا اردو والوں کی کہ ایک طرف نئی حکومت اردو کے بارے میں الکشنی وعدوں کے برعکس سوتیلی ماں جیسا برتاؤ کر رہی ہے (گرچہ بنگال کی ریاستی حکومت نے اب تک کوئی ایسا بیان نہیں دیا ہے اور نہ اس سے ایسی توقع ہے) دوسری طرف پروفیسر چٹرجی جیسا حامی وجاں نثار اکیڈیمی قائم ہونے سے پہلے! سے

---

[۱۴] ادب اور نظریہ ص ۲۵۹ — ۲۶۰، مطبوعہ ۱۹۵۴ء

[۱۵] ایضاً ص ۲۶۳۔

ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا ع
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

## پروفیسر صاحب اور رامائن

قدرت نے پروفیسر موصوف کی طبیعت میں شروع ہی سے بے انتہا کرید اور تلاش و جستجو ودیعت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علم لسانیات و صوتیات جیسی موضوعات پر کامیابی کے ساتھ تا عمر آخیر کام کرتے رہے یہی تلاش و تجسس انھیں ان کی مقدس مذہبی کتاب "رامائن" سے بھی حقائق کے پردے اٹھانے سے باز نہیں رکھ سکی۔ رامائن کی اصل، اس کے واقعات کی صحت پر انھوں نے عمر کے آخری دور میں جو تحقیقی انکشافات کئے۔ اسے ارباب عقل اور قدامت پرست ہندوؤں کے درمیان بحث و مباحثے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق انھوں نے اپنی تحقیق کی بنا پر یہ رائے دی تھی کہ رامائن کا تصور (Concept) ہومر سے مستعار ہے اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ ہماری Mythology میں دس سر رکھنے والے راکشش کی بات ہماری اپنی نہیں بلکہ یونانی دیومالاؤں سے ماخوذ ہے۔ سب سے زیادہ انھیں جس حقیقت کے انکشاف پر قیل وقال کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ انھوں نے ہندوؤں کے عقیدے کے برعکس رام کو بھگوان کا اوتار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید رامائن ہی پروفیسر چٹرجی جیسے حق گو و حق شناس محقق کی آخری منزل ہوتی لیکن قدرت کو کیا منظور تھا کہ ع
مسافر رک گیا چلتے چلتے

## انعامات، اعترافات اور اعزازات

سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں انھیں دو گرانقدر اسکالرشپ "پریم چند ریسرچ اسٹوڈنٹ شپ"

اور ”کلکتہ یونیورسٹی جوبلی ریسرچ پرائز“ ملے۔ ۱۹۳۶ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کا فیلو منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں ہندی زبان کی ترویج وترقی کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات کے لئے ”ساہتیہ واچسپتی“ کا خطاب ملا، ۱۹۵۵ء میں حکومت ہند نے ان کی تبحر علمی اور خدمات کو سراہتے ہوئے پدم بھوشن اور پھر ۱۹۶۲ء میں پدم وی بھوشن جیسے اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۶۱ء میں روم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ اس یونیورسٹی کے علاوہ اور بھی کئی یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ جس میں دہلی یونیورسٹی، رابندرا ناتھ ٹیگور یونیورسٹی (کلکتہ) وشوا بھارتی (بیر بھوم) عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) اور کلکتہ یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں انھیں چیکوسلاکیہ نے ان کی علمیت پر ”طلائی تمغہ“ دیا۔ ۱۹۶۹ء میں ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) نے ان کی لسانیاتی تحقیقات سے متاثر ہو کر انھیں ”رابندر پلیک“ (RABINDRA PLAQUE) پیش کیا۔

پروفیسر موصوف سینکڑوں ملکی اور غیر ملکی اداروں، مجلسوں، درسگاہوں وغیرہ سے منسلک تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے وہ دوبار صدر منتخب ہوئے۔ پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء میں اور دوسری بار ۱۹۷۰ء میں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے فائن آرٹس اور موسیقی فیکلٹی میں وہ ڈین (DEAN) بھی رہے۔ ۱۹۳۸ء میں وہ سی۔ پی۔ آئی۔ ایل (پیرس) کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ ”سوسائٹی آف آرٹس اینڈ سائنس“ کے بھی منتخب ممبر تھے۔ جن اداروں سے وہ اعزازی طور پر وابستہ تھے ان میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ آف پولینڈ، فرانسیسی اورینٹل سوسائٹی، امریکن اورینٹل سوسائٹی، لنگوِسٹک سوسائٹی آف امریکہ، اٹالین انسٹی ٹیوٹ فور دی نیر اینڈ فار ایسٹ انٹرنیشنل کونسل آف فونیٹیک سائینسز، یونیورسٹی آف سیلون، لنگوسٹک سوسائٹی اور پاکستان فونیٹیک سوسائٹی کے نام بہت اہم ہیں۔

افسوس! صد افسوس!! کہ پروفیسر چیٹرجی جیسا عالم صدیوں کیا قرنوں میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے، ان کی موت ایک عالِم کی نہیں ایک عَالَم کی موت ہے۔ ان کی موت کے بعد جب تصور میں ان کا ہیولا اٹھنے لگتا ہے تو کسی شاعر کا یہ شعر اس پر ہر جگہ کندہ نظر آتا ہے ؎

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انسان ــــــ ایک "مکمل انسان" کی واقعی وہ تعبیر تھے۔ الوداع! اے بنگال کے لائق فرزند الوداع ــــــ بھارت کے علم و ادب کے نامور شہسوار الوداع ع

"ڈھونڈیں گے" اگر ملکوں ملکوں ملنے کا نہیں "نایاب ہے" تو

ڈاکٹر مشیر الحق

# دریابادی کے خط بحریابادی کے نام

(مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی خدمت میں مجھے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ اس وقت نیاز حاصل ہوا جب دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اپنا تعلیمی سلسلہ ختم کرنے کے بعد میں اپنے اساتذہ کرام مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں (مرحوم) ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ رسالہ تعمیر میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ یہ رسالہ چند برسوں تک بڑی آن بان کے ساتھ زندہ رہ کر ختم ہوگیا تو میں مزید علم کی تلاش میں جامعہ ملیہ اسلامیہ چلا آیا۔ پھر یہاں سے ۱۹۶۱ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مانٹریال (کناڈا) چلا گیا۔ ۱۹۶۷ میں واپسی سے قبل ہی میرا تقرر پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبہ مذہبیات میں ریڈر کی حیثیت سے ہوگیا۔ چند ماہ تک وہاں کام کرنے کے بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شملہ میں بحیثیت "فیلو" چلا گیا۔ اس عرصے

---

ڈاکٹر مشیر الحق، پروفیسر و صدر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (مشیر صاحب ایک زمانے میں اپنے نام کے ساتھ بحریابادی لکھا کرتے تھے اب وہ اسے ترک کر چکے ہیں لیکن عنوان میں اسی مناسبت کا خیال رکھا گیا ہے۔)

میں مولانا مرحوم سے صدق جدید کے ذریعہ یکطرفہ ملاقات ہوتی رہی۔ مولانا چونکہ اپنے ایک ایک منٹ کی فکر رکھا کرتے تھے اس لئے اس پوری مدت میں کبھی بھی میں نے انھیں خواہ مخواہ خط لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور وہ میرے بارے میں تقریباً بے خبر رہے۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۷۰ء کے صدق جدید میں مولانا محمد علی مرحوم کے بارے میں ایک نوٹ شائع ہوا جس میں کتابت دطباعت کی غلطیوں کے باعث بعض اہم تاریخیں کچھ گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ دلانے کے لئے میں نے مولانا کی خدمت میں جامعہ نگر سے ایک خط بھیجا جہاں اس وقت میں تعطیلات سرما کے زمانے میں مقیم تھا، اور یوں ہم دونوں میں کچھ دنوں کے لئے خط وکتابت کی راہ پڑ گئی۔

مولانا مرحوم اپنے خطوط خود اپنے قلم سے لکھا کرتے تھے، لیکن جن لوگوں کی نظروں سے ان کے خطوط گذرے ہوں گے انھیں اندازہ ہوگا کہ مولانا کے خطوں کو ٹھیک ٹھیک پڑھ لینا کچھ آسان کام نہ تھا۔ خود مولانا کو بھی غالباً اس کا احساس تھا، کیونکہ میرے پاس ان کے جو خطوط موجود ہیں ان میں سے بعض خط ایسے بھی ہیں جنھیں لکھنے کے بعد انھیں اندازہ ہو گیا کہ وہ خط پڑھا نہ جا سکے گا اس لئے انھوں نے اسی خط پر اپنے کاتب خاص سے خط کا پورا مضمون نقل کرا کے اصل کے ساتھ مجھے بھیجا ہے۔ بعض طویل خطوط کو انھوں نے اپنے اسی کاتب خاص کو املا کرایا ہے اور بھیجنے سے قبل اپنے قلم سے ضروری تصحیحات کر دی ہیں۔ میں نے خطوں کو نقل کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ الفاظ کا املا وہی رہے جو مولانا کے قلم سے نکلا ہے۔

(۱)

بسم اللہ

سدق جدید

مورخہ ۲۱ر مارچ ۱۹۷۰ دریا باد ضلع بارہ بنکی یوپی

عزیزم، وعلیکم السلام

مدت دراز کے بعد آنعزیز کی خیریت ملی، اور ضمناً پتا بھی معلوم ہوگیا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ جامعہ میں کس مضمون کی تعلیم سپرد ہے[۱]۔ محمد علی کی پرسش تو خیر تھوڑی بہت ہر کہیں ہوجاتی ہے۔ یہ شوکت علی اور خلیق الزماں کے پرسانِ حال کون نکل آئے۔ چودھری صاحب کے حالات کہیں سے مل گئے؟ ان دونوں بلکہ تینوں کے حالات پر اگر ایک سرسری نظر میں کرلیتا تو ممکن تھا کہ کچھ مفید مشورے دے نکلتا[۲]۔

---

[۱] چونکہ یہ خط میں نے جامعہ سے لکھا تھا اس لئے مولانا یہ سمجھے کہ میرا تقرر جامعہ میں ہوگیا ہے۔

[۲] ان دنوں میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اسٹڈیز کلکتہ کی طرف سے چار جلدوں میں شائع ہونے والی "ڈکشنری آف نیشنل بیاگرافی" کے لیے ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی کے چند ممتاز مسلم زعما بشمول مولانا محمد علی، شوکت علی اور چودھری خلیق الزماں کے حالات زندگی مرتب کر رہا تھا۔ چودھری صاحب کے بارے میں کچھ معلومات میں نے اپنے خط میں مولانا سے چاہی تھیں، ضمناً علی برادران کا بھی تذکرہ کر دیا تھا۔ مولانا کے حسب حکم میں نے ان تینوں کا مسودہ انھیں بھیج دیا جسے انھوں نے اصلاح اور مشوروں کے بعد مجھے خط نمبر ۲ کے ساتھ واپس کیا جو ان کے کاتب خاص کے قلم سے ہے لیکن جگہ جگہ مولانا نے اپنے قلم سے اصلاحات کی ہیں انگریزی کے الفاظ خود مولانا نے اپنے قلم سے لکھے ہیں۔

جامعہ کے حالات سن سن کر بڑا دل کڑھتا ہے [۳۵]۔

والسلام

دعا گو و دعا خواہ

عبدالماجد

(۲)

(بخط کاتب خاص)

بسمہ اللہ

صدق جدید

مورخہ ۲۰ر اپریل ۱۹۷۰ دریاباد ضلع بارہ بنکی یوپی

عزیز مکرم۔ وعلیکم السلام

محمد علی، شوکت علی، خلیق الزماں۔ تینوں مقالے پڑھ لئے۔ تینوں اچھے ہیں۔ ماشاء اللہ۔ معروضات ذیل پیش نظر رکھیں۔

محمد علی۔ ص۱ شروع۔ محمد علی اپنی نظر بندی کے بعد چھوٹ کر پہلی بار مع اپنی داڑھی کے لکھنؤ آئے، غالباً ۱۹۲۰ء میں، تو ان کے مرشد اور فاضل عصر مولانا عبدالباری ؒ نے مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں باقاعدہ جلسہ کر کے انھیں مدرسہ کی طرف سے اعزازی ڈگری "مولانا" کی عطا کی۔ جب ہی وہ مولانا کہے جانے لگے۔

ص۱۔ عہدوں کا صحیح نام Deputy col یا Deputy mag ہونا چاہیئے۔ Subordinate تو صرف "جج" ہوا کرتے تھے۔ کلکٹر یا مجسٹریٹ

---

[۳۵] صدق جدید کا پابندی سے مطالعہ کرنے والوں کو یاد ہوگا کہ ان دنوں مولانا جامعہ کی "سیکولر زندگی" سے نالاں ہونے کے باعث اپنے رسالہ میں برابر کوئی نہ کوئی نوٹ لکھا کرتے تھے۔

نہیں۔ اس لائن میں صرف ڈپٹی کا لفظ چلا ہوا تھا۔

ص۳ ۔ آنرز کی ڈگری تاریخ میں لے کر، غالباً Modern History میں۔

" یہ ایک بار پھر دیکھ لیجئے گا کہ Opium ہی میں ہوئے تھے۔ مجھے شبہ ایسا ہو رہا ہے کہ Exise میں ہوئے تھے۔ اور کچھ خیال ایسا پڑ رہا ہے کہ مقام نوساری (Nausari) میں "کمشنر" تھے۔

ص۳ ۔ کامریڈ کے بند ہو جانے کے دو بڑے اسباب تھے۔ ایک محمد علی کی مسلسل علالت ' ذیابیطس کے علاوہ بھی۔ دوسرے کسی خاطر خواہ اسسٹنٹ کا میسر نہ آنا (پہلے دور کے اسسٹنٹ غلام حسین اب مرحوم ہو چکے تھے)

ص۴ ۔ ہمدرد اپریل ۱۹۲۹ء میں بند ہوا۔ ایک سبب تو وہی محمد علی کی علالت۔ دوسرا اور بڑا سبب خرچ اور آمدنی کے درمیان عدم توازن۔ محمد علی پبلک جذبات کی نمائندگی بھی ہمیشہ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے مسائل میں تنقید بھی کرتے اور دہارے کے بالکل خلاف تیرنا چاہتے۔

ص۵ وسط۔ court member کے بجائے faculty member رکھیئے[۳]۔

ص۶ ۔ یہ ۱۹۳۰ء والی کانفرنس پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تھی۔

---

[۳] اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جب ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں علی گڑھ گئے تھے اور ناخدایان یونیورسٹی کو گورنمنٹ سے ترک تعلق پر آمادہ کر رہے تھے۔ میں نے لکھا تھا کہ اگرچہ اس میں انھیں پوری کامیابی نہ ہوئی لیکن بعض طلباء اور فیکلٹی کے ممبروں کے دلوں کو جیت لینے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ مولانا کی اصلاح کے بعد میں نے "کورٹ" کا بھی اضافہ کر دیا لیکن جب کتاب شائع ہوئی تو اس میں "کورٹ" کے بجائے "کونسل" چھپ گیا۔

spelling کی جن غلطیوں پر نظر پڑی انھیں ٹھیک کر دیا ہے، جن الفاظ پر شبہ رہا، ان پر سوالیہ نشان ؟ بنا دیا ہے۔

شوکت علی۔ ص۱ شروع۔ پٹھان خاندان۔ ایک بار پھر نظر ثانی کر لیجئے۔[۵]

ص۲۔ شوکت علی 'خادم کعبہ' تھے اور مولانا "خادم الخدام"۔ صدر و سکرٹری کی اصطلاحیں مستعمل نہ تھیں۔۔ انجمن کا مقصد محض حاجیوں کی خدمت نہ تھا بلکہ کعبہ کی حفاظت بھی۔[۶]

ص۳ "خدام کعبہ" مجھے یاد نہیں پڑ رہا ہے۔ "خادم الحرمین" کئی سال بعد فرنگی محل سے نکلا تھا غالباً ۱۹۲۶ء میں۔

ص۴۔ مولانا شوکت علی کا مستقر بمبئی کئی سال قبل سے بن چکا تھا۔ "خلافت عثمانیہ" کے نام سے ہفتہ وار پہلے ۱۹۲۰ء میں نکلنا شروع ہوا۔ وہی آگے چل کر روزنامہ خلافت ہو گیا۔ ایڈیٹر اور لوگ ہوتے تھے۔ شوکت صاحب اس کے صرف نگران اعلیٰ تھے۔

'شوکت' کا تلفظ اردو میں عربی سے مختلف ہے، عربی نام کے لئے تو بلاشبہ Shawkat صحیح ہے، لیکن اردو نام کے لئے وہی Shaukat 'u' کے ساتھ۔

چودھری خلیق الزماں۔ ص۱ وسط۔ چودھری صاحب کی یہ اہلیہ اپنی زندگی بھر ان کی بیوی ہی رہیں، ابھی دو ڈھائی سال ہوئے لاڑکانہ (سندھ) میں انتقال ہوا ہے۔

---

[۵] علی برادران کے خاندان کی طرف اشارہ ہے۔

[۶] ۱۹۱۳ء میں مولانا شوکت علی نے انجمن خدام کعبہ قائم کی تھی۔ اس انجمن کا سکریٹری "خادم" کہلاتا تھا اور صدر "خادم الخدام"۔ پہلے خادم مولانا شوکت علی مقرر ہوئے تھے اور "خادم الخدام" مولانا محمد عبدالباری تھے۔

بیری قریبی بہن تھیں۔ خرچ بھی اخیر تک چودھری صاحب ہی دیتے رہے۔ زاہدہ بیگم[۵]
ساتھ گئی تھیں، لیکن یہ بھی دو ہی ایک سال بعد پاکستان چلی گئی تھیں۔

صدا آخری سطر میں۔ وسیم صاحب[۶] ان کے حقیقی بہنوئی بھی تھے۔

چودھری صاحب کا خاص الخاص کارنامہ یہ ہے کہ مشہور و معروف خلافت کمیٹی کی بنیاد انھیں نے ستمبر ۱۹ء میں رکھی۔ علی برادران اس وقت نظر بند تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کانگریس کے اجلاس ہونے ہی بند ہو گئے تھے (سنہ مجھے یاد نہیں پڑ رہا ہے، ۳۰ء یا ۳۱ء ہوگا) اور ایک ہی شخص بہ طور کانگریس ڈکٹیٹر کے مقرر کر دیا جاتا تھا تو ڈاکٹر انصاری نے اپنا جانشین اپنی گرفتاری کے وقت چودھری صاحب ہی کو بنایا تھا۔ اور یہ کئی مہینے تک اس کے ڈکٹیٹر رہے تھے۔

اس مقالہ کی نقل اگر آپ بھیج سکیں تو میں اسے چودھری صاحب کو بھیج سکتا ہوں۔

والسلام

عبدالماجد

(پوسٹ کارڈ) (۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدق جدید

۱۲ مئی ۷۰ء دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

عزیز مکرم، السلام علیکم

چودھری خلیق الزماں کی ضخیم و تازہ کتاب "شاہراہِ پاکستان" ۱۱۱۲ صفحہ کی ضخامت

---

[۵] چودھری صاحب کی دوسری بیوی۔

[۶] سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کے بڑے بھائی اور پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل۔

کی آپ کی نظر سے گزری ؟ کبھی نہ گزری ہوگی ۔ دستیاب ہونا آسان نہیں ۔ مجھے محض اتفاق سے ہی البتہ ہاتھ لگ گئی ۔ ہے بڑے کام کی کتاب اور معلومات کا خزانہ ہے اس کے پڑھنے میں اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا ۔ ہے دوسرے کی ملکیت اور عنقریب ہی واپس کردینے کی فکر میں ہوں، ورنہ چند روز کے لئے آپ کو بھیج دیتا۔ ؎ ناشر: انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی ۔

قیمت مجلد Rs 25

والسلام

دعاگو

عبدالماجد

عزیزم شیر الحق صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی
شملہ

(پوسٹ کارڈ) (۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدق جدید

۲۵ مئی ۱۹۷۰ء دریاباد ۔ ضلع بارہ بنکی

عزیزم، وعلیکم السلام

دونوں خط مل گئے ۔

شاہراہ پاکستان اس انگریزی کتاب سے کہیں زیادہ مفصل ہے ۔ ملنا اگر ممکن ہو تو ضرور اسے پڑھئے ۔

---

؎ میں چودھری صاحب کی انگریزی خودنوشت سوانح Pathway to Pakistan پڑھ چکا تھا اس لئے میں نے مولانا کو لکھا کہ میں ان کی سوانح پڑھ چکا ہوں ۔ دوسرے خط میں مولانا نے اس کا جواب دیا ۔

انڈکس کی تیاری پر آمادگی کے لئے، جزاک اللہ۔ اور بھی دو ایک خط آئے تھے۔ اگر ضرورت ہوئی تو ان شاء اللہ ضرور تکلیف دونگا[1]۔

والسلام
عبدالماجد

مشیرالحق صاحب
شملہ[2]

(۵)

بسم اللہ

صدق جدید

مورخہ ۱۳ جون ۱۹۷۰ء　　　　دریاباد ضلع بارہ بنکی یوپی

عزیزم۔ وعلیکم السلام

جی ہاں یہ وہی کچلو[1] ہیں ـــــ مگر انتقال سے کئی سال قبل کانگریسی نہیں رہے تھے، بلکہ کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اور کانگریسیوں میں بدنام۔ بالکل آخر میں تو گمنام محض تھے۔ کسی شمار قطار میں نہیں۔

۱۹۲۱ء والے مشہور مقدمہ کراچی میں علی برادران کے ساتھ سزایابی کے بعد سے

---

[1] صدق جدید میں اپنی زیر طبع تفسیر کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے مولانا نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ کوئی صاحب اس کے مضامین کا اشاریہ (انڈکس) تیار کرنے کی ذمہ داری لے لیں، مجھے چونکہ اس کام کا کچھ تجربہ تھا اس لئے میں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

[1] ڈکشنری آف نیشنل بیاگرافی کے لئے سیف الدین کچلو کے حالات بھی میں نے لکھے تھے، اس سلسلے میں کچھ معلومات میں نے مولانا سے حاصل کی تھیں۔

تحریک خلافت کے بھی لیڈر ہو گئے، اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

۲۵ء سے تحریک تنظیم چلائی۔ یہی اس کا نام تھا۔ ایک روزنامہ بھی تنظیم کے نام سے نکالا اس کے ایڈیٹر عبدالمجید قرشی اپنے وقت کے زبردست پروپگنڈسٹ تھے۔ تحریک کا زور دو ڈھائی سال رہا۔

غلام بھیک صاحب نیرنگ انبالہ والے (سابق گورنمنٹ ایڈوکیٹ) شروع میں کچلو کے دست راست رہے۔ مقصد مسلمانوں کا تعمیری کام۔

بعد کو نیرنگ صاحب نے اپنی الگ تحریک تبلیغ کے نام سے کئی سال تک چلائی۔ بڑے مخلص مسلمان، اور بڑے شیریں زبان مقرر، شاعر و ادیب تھے۔

تبلیغ شدھی کے جواب میں شروع ہوئی تھی۔ شدھی کے لیڈر سوامی شردھانند تھے۔

سنگھٹن کے لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی تھے۔ تنظیم اس کے جواب میں تھی۔

ستیہ پال آخر میں پورے کانگریسی تو نہیں رہے تھے، لیکن شدھی میں بھی شریک نہ تھے۔[۱۲]

والسلام

دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

ڈاکٹر مشیرالحق ایم اے، پی ایچ ڈی

شملہ

---

۱۲ پورا خط لکھ لینے کے بعد غالباً مولانا کو احساس ہوا کہ وہ پڑھا نہ جا سکے گا۔ اس لئے انھوں نے اسی کاغذ پر اپنے کاتب خاص سے اس خط کو نقل کرا کے میرے پاس بھیجا تھا۔

(پوسٹ کارڈ)

(۶)

بسم اللہ

صدق

۱۴ر جون ۱۹۷۱ء

دریاباد ضلع بارہ بنکی

عزیزم سلمہ اللہ، وعلیکم السلام

۱۔ مسرت نامہ نے دل کو مسرور کیا۔ اتنے مسلمانوں کا نام تو میرے اندازہ میں بھی نہ تھا۔ یہ شاید آپ ہی کی برکت ہے[۱۳]

۲۔ آپ کے غازی پوری ہونے کا مجھے علم تھا۔ اعظمگڈھی محض سہواً لکھ گیا۔ بحری آباد سے بھی واقف ہوں اور قمر احمد مرحوم تو میرے مخلصین میں تھے۔ نیشنلسٹ ہونے کے باوجود بڑے مسلمان۔ برسوں تعلقات رہے[۱۴]۔ البتہ ان کے ایک کمال کا علم، ایک معتبر راوی

---

[۱۳] ڈکشنری آف نیشنل بیاگرافی کے بارے میں مولانا نے صدق جدید (۱۱ر جون ۷۱) میں ایک نوٹ شائع کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس طرح کی انجمنوں میں جگہ اقلیت والے غریبوں کو ذرا مشکل ہی سے ملتی ہے، لیکن یہ ایک خالص علمی کام ہے۔ تعصب وتنگ نظری سے اس میں کام نہ لیا جائے گا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ۸۰، ۸۲ فیلو ہیں ان میں ۳ مسلمان ہیں اور سیرتیں جو لکھوائی گئی ہیں ان میں معلوم ہوا ہے کہ سرسید احمد خاں اور مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابو الکلام آزاد اور چودھری خلیق الزماں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شخصیتیں ہیں اور مضمون نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت ڈاکٹر مشیر الحق (اعظم گڑھ) کی ہے۔" اس نوٹ کو پڑھ کر میں نے مولانا کو ڈکشنری میں جگہ پانے والے ۱۲۱ مسلمانوں کے نام لکھ کر بھیجے تھے۔

[۱۴] میں نے مذکورہ بالا خط میں مولانا کی توجہ اس طرف دلائی تھی کہ میں اعظم گڈھ کا نہیں بلکہ اصلاً بحری آباد (ضلع غازی پور) کا رہنے والا ہوں۔ اسی سلسلے میں اپنے ایک مرحوم چچا قمر احمد صاحب (بی اے، ایل ایل بی وکیل) کا بھی ذکر کیا تھا جن کا تحریک خلافت کے زمانے میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی زبانی ابھی پچھلے سال ہوا۔ یعنی ان کے کلام کا ایک حصہ ہزل اور فحش کے رنگ کا ہے۔ ان کی عام متانت، ثقاہت کو دیکھ کر کبھی اس کا گمان بھی نہ ہوا ورنہ ضرور کچھ ان سے پڑھوا کر سنتا۔[۲۴]

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علی برادران سے گہرا تعلق رہا تھا۔ تحریک کے سلسلے میں وہ اپنی اچھی خاصی چلتی ہوئی وکالت کو چھوڑ کر جیل گئے، پھر کچھ دنوں تک خلافت کے ایڈیٹر بھی رہے۔ آخر عمر میں دوبارہ وکالت کی طرف توجہ کی لیکن کامیابی نہ ہوسکی اس لئے گھر آکر بیٹھ رہے۔ مولانا کا بھی چونکہ علی برادران سے گہرا تعلق رہا تھا اس لئے ازراہ تعارف میں نے اپنے خط میں قمر چچا کا ذکر کیا تھا۔

[۲۵] "معتبر راوی" میرے نزدیک کچھ غیر معتبر سا تھا اس لئے میں نے مولانا کو لکھا کہ "قمر چچا کی شاعری کے بارے میں جن صاحب نے آپ تک روایت پہونچائی ہے وہ غالباً ہزل، فحش اور خاکہ اڑانے (caricature) کے نازک فرق سے اچھی طرح واقف نہیں معلوم ہوتے۔ یا پھر انھوں نے بھی سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کیا ہے۔ اب تو چچا کا کلام بھی کہیں نہیں ملتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا زیادہ حصہ واقعاتی ہوتا تھا۔ مختلف خاندانی تقریبات کے مواقع پر جو سنجیدہ اور غیر سنجیدہ واقعات پیش آتے تھے انھیں وہ اس انداز سے نظم کرتے تھے کہ ان واقعات میں ملوث لوگ بھی خود اپنے اوپر ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ اس قسم کی طویل نظمیں اور مثنویاں چند گھنٹوں میں مکمل کر دیتے تھے اور پھر خاندان کا کوئی لڑکا یا لڑکی اسے منہ زبانی یاد کر کے ان سے لے لیتا تھا اس طرح وقتی طور پر تو وہ نظم بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتی تھی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے انتقال کے بعد وہ سب چیزیں ضائع ہوگئیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اگر انھیں کسی ایسے شخص کا خاکہ اڑانا مقصود ہوتا جو ان سے رشتے اور عمر میں بہت چھوٹا ہوتا تو پھر وہ اپنے کسی چھوٹے کے نام سے نظم لکھتے، اگرچہ ہر شخص جانتا کہ اصل شاعر کون ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ انھیں اعلیٰ درجات عطا کرے، بڑی خوبیوں کے شخص تھے۔"

اچھا [کیا] کہ عبدالسلام قدوائی کی خیریت لکھ دی[17]۔ وہ بھی میرے پرانے مخلصوں میں ہیں۔ موجودہ جامعہ میں بسر کرنا ان کے ایمان کے لئے امتحان بلکہ مجاہدہ کا حکم رکھتا ہے۔

آپ کے انگریزی مضمون کا پہنچنا* کچھ یاد تو پڑتا ہے۔ مگر خوب واضح طور پر یاد نہیں[17]۔

اپنی انگریزی کتاب ضرور بھیجئے۔ نظریاتی اختلاف کس کا کس سے نہیں ہوتا۔ اس سے تو چارہ ہی نہیں[18]۔

والسلام
دعاگو و دعاخواہ
عبدالماجد

* بلکہ کچھ اس کا پسند کرنا[19]

ڈاکٹر مشیرالحق سلمہ
شملہ

---

[17] استاد محترم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی صحت ان دنوں ٹھیک نہ تھی۔ ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ گرمیاں گذارنے کے لئے میرے پاس شملہ میں مقیم تھے۔

[17] اب مجھے خود بھی یاد نہیں کہ کس مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

[18] انہی دنوں میری کتاب "مسلم پالٹکس ان ماڈرن انڈیا" شائع ہوئی تھی جس میں مولانا آزاد اور دوسرے نیشنلسٹ علماء کی "مذہبی سیاست" کا میں نے تجزیہ کیا تھا۔ مولانا کے پاس کتاب بھیجنے سے قبل میں نے اجازت اس لئے لی تھی کہ اسی زمانے میں ان کا ایک نوٹ صدق جدید میں شائع ہوا تھا کہ لوگ ان کے پاس اپنی ہر قسم کی کتابیں بھیج دیتے ہیں جن میں سے اکثر کو پڑھ کر "تکلیف" پہونچتی ہے۔ مجھے کتاب کے بھیجنے میں پس و پیش دو وجہوں سے تھا ایک تو اس میں علماء پر تنقید تھی دوسرے وہ کتاب استاد محترم پروفیسر محمد مجیب کے نام معنون تھی اور میرے خیال میں یہ دونوں باتیں مولانا کو پسند نہ آتیں لیکن کتاب کے نہ بھیجنے میں خطرہ یہ تھا کہ اگر انھیں کسی دوسرے ذریعہ سے پتہ چل جاتا تو پھر میرے لئے کتاب نہ بھیجنے کا کوئی معقول عذر نہ رہتا۔

[19] کارڈ پر یہ عبارت اسی طرح الگ سے لکھی ہوئی ہے۔

(پوسٹ کارڈ) (۷)

بسم اللہ

صدق

۱۲ جولائی ۱۹۷۱ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

عزیزم، وعلیکم السلام

انگریزی کتاب پہنچ گئی تھی، اسے باوجود آشوبِ چشم کے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی ڈالا۔ اتفاق سے نظر پہلے ہی "ڈیڈیکیشن" پر پڑ گئی اور دل بیٹھ گیا۔

لیکن کتاب کی الٹ پلٹ سے معلوم ہوا کہ کتاب پر اس شاگردی کا زیادہ اثر نہیں، اور کتاب بڑی حد تک سلجھی ہوئی ہے۔

مجیب میرے دور کے عزیز ہوتے ہیں، ان کے والد محترم[۲۰] (ہر معنیٰ میں محترم) کو ہم لوگ ماموں کہتے تھے، اور میری والدہ مرحومہ ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں، لیکن اب کیا لکھوں کہ ان حضرت نے بہ حیثیت شیخ الجامعہ دل کو کیسے کیسے صدمے دینی حیثیت سے پہنچائے ہیں، خصوصاً غالب کی مورتی نصب کر کے[۲۱]

دوسرا بڑا مراسلہ (انٹرویو سے متعلق) میں نے رکھ لیا ہے، صدق میں کچھ حصہ دینے کے لئے۔ میں خود بھی شائع شدہ رپورٹ کو ناقص

---

۲۰ جناب محمد نسیم صاحب مرحوم۔ لکھنؤ کے اپنے زمانے کے مشہور ترین وکلا میں سے ایک۔

۲۱ غالب صدی کے دوران جہاں اور بہت طریقوں سے غالب کی پرسش احوال ہوئی وہاں یہ بھی ہوا کہ جامعہ کالج کیمپس میں جامعہ کے ایک استاد مجسمہ سازی کا بنایا ہوا قد آدم سے بھی قدرے بڑا غالب کا مجسمہ نصب ہوا، جس کا فوٹو رسالہ جامعہ غالب نمبر (فروری مارچ ۱۹۶۹ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

سمجھ رہا تھا۔[۲۲]

والسلام

دعاگو و دعا خواہ

عبدالماجد

---

[۲۲] اپریل یا مئی کی کسی تاریخ میں نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی کے ایک سیمینار میں مجھے شرکت کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں ہندی کے ایک مشہور ہفتہ وار دِنمان کی ایک خاتون رپورٹر نے مجھ سے اور چار دوسرے شرکاء سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل پر ایک انٹرویو لیا تھا جسے بعد میں انھوں نے ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر کے شائع کیا، اس انٹرویو کی جو رپورٹنگ روزنامہ دعوت دہلی نے اپنے ایک شمارے میں کی اسے پڑھ کر مولانا نے صدق جدید (۲۵ رجون) میں لکھا کہ "ہم عصر دعوت نے ایک ہندی ہفتہ وار کے حوالہ سے پانچ دانشوروں کے انٹرویو بھارتی مسلمانوں کے مستقبل پر شائع کئے ہیں۔ ان پانچ میں علی گڑھ کے ایک نیک نام لائبریرین بھی ہیں جو مدت ہوئی الحمدللہ وہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان تک جو اسلام پہونچا ہے وہ مسخ شدہ اسلام ہے اور پانچ وقت کی نمازیں اور ۳۰ دن کے روزے جدیدیت سے میل نہیں کھاتے۔ اور دوسرے دانشور کوئی ڈاکٹر بمل پرشاد ہیں۔ تیسرا نام جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے ایک مسلمان کارکن ڈاکٹر رشید الدین کا ہے جن کا خیال ہے کہ عوامی و سرکاری تقریبات میں بھومی پوجا، ناریل کا توڑنا اور منتر جاپ جاری رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ ہماری تہذیب کے جزو بن چکے ہیں۔ چوتھا نام شملہ کے ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر مشیر الحق کا اور پانچواں نام معلوم و معروف سیکولر دوست ڈاکٹر اے بی شاہ کا ہے ——— بدنصیب اقلیت کی قسمت میں کیسے کیسے صبر آزما امتحانوں سے گزرنا لکھا ہے۔"

انٹرویو میں جن خیالات کا میں نے اظہار کیا تھا وہ ان چاروں سے بالکل مختلف تھا لیکن مولانا کا نوٹ جس انداز کا تھا اس نے مجھے بھی پانچوں سواروں میں کھڑا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(پوسٹ کارڈ)

(۸)

بسم اللہ

صدق

۲؍اگست ۱۹۷۱ء  دریاباد ضلع بارہ بنکی

عزیزم وعلیکم السلام

یہ حدیث تو میرے لئے بھی نرالی نکلی اب سوا اس کے کوئی شکل نہیں کہ اسے ۱۵؍اگست کے پرچہ میں درج کرکے دوسروں سے روشنی حاصل کروں۔

البتہ محدث مرحوم کے فتوی کے اس جزو سے یہی کہونگا کہ سر منڈانا بھی سنت رسول ہے۔ مجھ بے علم کے علم میں تو بجز ایک منسک حج کے اور کسی موقع پر یہ عمل رسول صلعم نہیں رہا ہے۔[۳۴]

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے مولانا کو خط لکھا اور اپنا پورا انٹرویو اردو میں نقل کرکے انھیں بھیج دیا کہ وہ اس میں قابل اعتراض باتوں کی نشاندہی کر دیں۔ مولانا نے اسے پسند کیا اور پورے کا پورا "ایک اخباری انٹرویو" کے عنوان سے صدق جدید (۱۳؍اگست ۱۹۷۱) میں شائع کر دیا۔ چونکہ انٹرویو خاصا طویل ہے اس لئے یہاں اسے نقل نہیں کر رہا ہوں۔

[۳۴] فتاویٰ نذیریہ (مولانا نذیر حسین محدث دہلوی) میں ایک حدیث سر منڈانے کے سلسلے میں نظر سے گذری جس میں مذکور تھا کہ حضرت جعفر کی شہادت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اہل و عیال کو تین دنوں تک غم منانے کی اجازت دی۔ اس کے بعد ان کے بچوں کے سروں کو آپؐ نے منڈوا دیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد میں نے مولانا سے پوچھا تھا کہ "ہندوؤں کے یہاں ایسے مواقع پر میت کے قریبی اعزا کریا کرم کے بعد اپنے سروں کو منڈواتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے ہاں تو اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے سروں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چودھری خلیق الزماں کی اردو کتاب "شاہراہ پاکستان" ضرور کسی ذریعہ سے پاکستان سے حاصل کرکے پڑھئے۔ ان کی انگریزی کتاب سے کہیں زیادہ مفصل و پر معلومات ہے۔

والسلام۔ دعاگو

عبدالماجد

(پوسٹ کارڈ)* (۹)

بسم اللہ

صدق

دریاباد ضلع بارہ بنکی ۱۱ر اگست [ا] ۱۹۷

عزیز مکرم، وعلیکم السلام

خوب کیا جو احتیاطاً دوسرا خط لکھدیا۔[۴۴] احتیاط کام آگئی، پہلا خط آج تک نہ ملا۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو کیوں منڈوایا تھا۔" مولانا نے اس خط کو "سر منڈانا عہد رسالت میں" کے عنوان سے ۱۳ر اگست کے شمارے میں شائع کیا اور ناظرین صدق میں حدیث و سیرت پر گہری نظر رکھنے والوں کو اس کا مالہ وماعلیہ تحریر فرمانے کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں مولانا نے اپنی طرف سے یہ اضافہ بھی کیا کہ "سر منڈوانے کی رسم خصوصاً ماتم وغم کے موقع پر ہندوؤں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا میں کثرت سے قوموں میں رہی ہے۔ اور خود توریت میں اس کا ذکر متعدد مقام پر موجود ہے، چنانچہ کتاب احبار میں اور کتاب گنتی میں۔ ہو سکتا ہے کہ قدیم عرب میں یہ رسم عام ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔"

* نصف پوسٹ کارڈ پر پورا خط مولانا مرحوم کے قلم سے ہے۔ بقیہ نصف پر خط کی نقل ان کے کاتب خاص کے قلم سے ہے۔

۴۴ سر منڈانے کے سلسلے میں پہلا خط مولانا کو لکھنے کے بعد مجھے ایک دوسرا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اب یہ کوئی نئی بات رہی ہی نہیں۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فتویٰ مولانا محدث کے مجموعے میں نظر آیا، جس میں اس حدیث کی ایک قابل قبول تشریح موجود تھی۔ میں نے مولانا کو اس کی اطلاع کی۔ اس دوران ان کا خط نمبر ۲ ملا کہ وہ میرے خط کو صدق میں شائع کر رہے ہیں میں نے احتیاطاً اپنے پہلے خط کے مفہوم کو دوبارہ ان کے پاس لکھ کر بھیجا کہ "فتاویٰ نذیریہ کا مطالعہ کرتے کرتے ایک دوسرا فتویٰ بھی نظر سے گزرا جو سر کے بالوں کو منڈوانے سے متعلق ہے۔ یہ استفتاء بنگال سے آیا تھا۔ وہاں کے کسانوں کو برسات کے دنوں میں کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا اور اس میں ان کے لمبے لمبے بال حارج ہوتے تھے، اس تکلیف سے بچنے کے لئے کچھ لوگوں نے اپنے بالوں کو منڈوا دیا۔ وہاں کے بعض علماء نے اس فعل کو سنت کے خلاف سمجھ کر اس سے منع کیا اور بقول مستفتی: 'جو شخص بال منڈواتا ہے یا کترواتا ہے تو اس کو جماعت سے خارج کرتے ہیں۔ یعنی سلام کلام و دیگر معاملات سے اس کو روکتے ہیں اور کفارہ لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کفارہ لینا کیسا ہے اور کفارہ لینے والا کیسا ہے؟' اس استفتا کا جواب مولانا محدث کے مجموعے میں یہ دیا گیا ہے کہ "سوائے حج کے بالوں کا منڈوانا یا کتروانا ضرورت کے وقت جائز ہے بلکہ جیسے عدم ضرورت و معذرت کے وقت بالوں کا رکھنا سنت ہے اسی طرح وقت ضرورت کے منڈوانا یا کتروانا سنت ہے۔ پس صورت مسئولہ میں بالوں کا منڈوانا یا کتروانا بلاشبہ جائز و درست ہے بلکہ سنت ہے۔" اس فتویٰ کے کاتب کوئی عین الدین مٹیا برجی تھے لیکن اس پر "سید محمد نذیر حسین" کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ دوران بحث میں بنی جعفر والی حدیث بھی نقل کی گئی ہے اور اس کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جعفر کے بال کو منڈوایا ہے اس وجہ سے کہ ان کے سروں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔" آخری ٹکڑے سے حدیث کا اشکال ختم ہو گیا تھا۔ جب مولانا کو میرا یہ دوسرا خط ملا تو اسے انھوں نے صدق جدید (۳۰ راگست ۱۹۷۱) میں شائع کر دیا۔

یہ دوسرا خط کوشش کی جائے گی کہ قریب ترین اشاعت میں نکل جائے، پورا ایک ہفتہ قبل پرچہ مرتب کر کے، مسودہ دفتر کو بھیج دیتا ہوں۔

ہندوستانی ہائی کمشنر (کراچی) سے، یا پاکستانی ہائی کمشنر (دہلی) سے اگر ربط قائم ہو سکے تو شاید اس جوئے شیر کے لئے کوئی فرہاد "تیشہ بدست" پیدا ہو جائے اور کتاب کراچی سے دہلی پہنچ جائے۔[۲۴۳]

والسلام
دعاگو
عبدالماجد

ڈاکٹر مشیر الحق صاحب ایم اے پی ایچ ڈی
جامعہ ملیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

---

[۲۴۳] وہی چودھری صاحب کی کتاب۔ مولانا کے ۲ ر اگست کے خط کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ کتاب پڑھنے کا شوق تو ہے لیکن پاکستان سے کتاب کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے۔

میرے نام مولانا کا یہ آخری خط تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال قبل جس طرح بے سان و گمان خط و کتابت شروع ہوئی تھی اسی طرح چپ چاپ ختم بھی ہو گئی۔ بعد میں بعض مسائل پر میں نے انھیں چند خطوط لکھے جسے انھوں نے صدق جدید میں شائع کیا، لیکن چونکہ ان میں کوئی نجی بات نہ تھی اس لئے الگ سے انھوں نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

سید زاہد علی

# سترھویں صدی کا طرزِ معاشرت
## چند پہلو
## (۲)

شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں جادوگر اور تماشہ گر بے حد مقبول تھے جو گلی کوچوں میں گھوم کر اپنے کرتب دکھاتے تھے، سڑکوں پر جیوتشی بھی بیٹھا کرتے تھے۔ برنیئر نے لکھا ہے کہ یہ عقلمند ڈاکٹر (جیوتشی) دھوپ میں سڑکوں کے کنارے بیٹھا کرتے تھے، ایک گرد آلود دری ہوتی تھی، کچھ پرانے حساب کتاب کا سامان جن پر ستاروں اور سیاروں کے نام لکھے ہوتے اور نقشہ بھی بنا ہوتا تھا۔ یہ لوگ غریبوں سے ایک پیسہ کے عوض اُن کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ بے وقوف عورتیں سفید چادروں میں لپٹی لپٹائی جیوتشیوں کے پاس کثرت سے آتی تھیں اور شوہروں کے پوشیدہ راز بھی اُن کے کانوں میں کہہ دیتی تھیں۔ جاہل عوام کا خیال تھا کہ ان جیوتشیوں کے ذریعہ اُن کی قسمت بدل سکتی ہے[۲۳]۔ آج بھی اگر ہم دہلی کے کستوربا (وکٹوریہ) ہسپتال کے باہر سڑک پر پیدل چلیں تو جیوتشی بیٹھے ہوئے دکھائی دیں گے، وہی ایک پرانی سی چادر، اُس پر کتابیں اور پانسہ، ان کو دیکھ کر شاہ جہاں کے دور کی دلی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا

---

۲۳۔ سفرنامۂ برنیئر۔ صفحہ ۲۴۴۔

ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج بھی ہندوستانی عوام توہمات کے شکار ہیں یا بہتر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم تہذیب کی عوامی روایت انھیں ورثہ میں ملی ہے۔

رقص وسرود کی پیشہ ور عورتوں کی ایک علیحدہ جماعت ہوتی تھی جو تہواروں کے مواقع پر بلائی جاتی تھیں۔ دلی اور آگرہ جیسے بڑے اور اہم شہروں میں یہ عورتیں معقول اُجرت پر مل سکتی تھیں[۲۴]۔ شاہ جہاں کے دور میں یہ عورتیں (کنچن) محل میں آتی تھیں لیکن اورنگ زیب نے ان عورتوں کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا تھا۔ اورنگ زیب کے علاوہ تمام مغل شہنشاہ موسیقی کے دلدادہ تھے۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں موسیقی اور مصوری اپنی بلندی کے انتہائی درجہ پر پہنچ چکی تھی۔

مشاعرے، قصہ گوئی، باغبانی، مختلف قسم کے میلے اور عرس وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ گلستانِ سعدی، بوستان سعدی اور ایران کے مشہور شعراء کے دواوین بیحد مقبول تھے[۲۵]۔ اسلامی تہواروں کے علاوہ ایرانی تہوار بھی بڑی شان وشوکت کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ برنیر نے محلات کے مینا بازار کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ان محلوں میں جن میں سوزن کاری اور گل کاری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے تھے، امراء کی خوبصورت عورتیں خاص طور پر حصہ لیتی تھیں۔ یہ حسین عورتیں دکاندار ہوتی تھیں اور بادشاہ، بیگمات اور شہزادیاں خریدار ہوتی تھیں۔ اگر کسی امیر کے پاس کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی تھی تو اس کی دلی خواہش ہوتی کہ کسی طرح وہ بادشاہ کی منظورِ نظر ہوجائے۔ کبھی کبھی بادشاہ مول تول میں ایک ایک پیسے پر حجت کرتا تھا۔ شاہ جہاں اس قسم کے میلوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس قسم کے بازار تقریباً ہر تہوار پر لگائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کنچن عورتیں ہر بدھ کے

---

۲۴۔ سفرنامۂ منوچی۔ دوم۔ صفحہ ۹

۲۵۔ ایضاً صفحہ ۲۷۲

روز دیوان عام میں لگان جمع کرانے آتی تھیں اور تمام رات وہاں قیام کرتیں اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں۔[26]

بادشاہ کی پیدائش کا دن بھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ یہ تقریب تمام دن جاری رہتی۔ بادشاہ امراء کے ساتھ اپنی والدہ کی قبر پر جاتا اور نیکی کا طالب ہوتا لیکن شاہ جہاں کے دور میں خالص ہندوستانی رسومات کو ترک کر دیا گیا تھا۔[27] عبدالحمید لاہوری کا کہنا ہے کہ وہ تمام چیزیں جن سے بادشاہ کا وزن کیا جاتا تھا، غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ بادشاہ کا وزن سونے سے کیا جاتا تھا۔[28] ان مواقع پر امراء شہنشاہ کو تحائف دیا کرتے تھے اور بادشاہ امراء کے منصب میں ترقی کرتا تھا، جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ امراء کے گھر کی مستورات بھی ملکہ کو تحائف پیش کرتی تھیں۔ ایرانی تہواروں میں نوروز کے علاوہ آب پاشان (گل پاشان) کا تہوار بھی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ یہ تہوار بارش کی یاد میں ایرانی ماہ 'یتر' کی ۱۳ تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کے موقع پر موسم بہار کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ عبدالحمید لاہوری کے بقول شاہ جہاں اس تہوار کو ...... عیدِ گلابی کہتا تھا جس میں امراء اور شہزادے اور بادشاہ ایک دوسرے پر عرقِ گلاب چھڑکتے تھے۔ اکبر کے دور میں ہولی، دیوالی اور دسہرہ بھی منایا جاتا تھا۔ مسلمان محرم، عید میلاد، شبِ برات، عیدالفطر اور عیدالضحیٰ مناتے تھے۔ ان تہواروں پر محلات میں خاص طور پر روشنی کی جاتی تھی۔ دیوان عام میں آتش بازی بھی چھوڑی

---

۲۶۔ سفرنامۂ برنیر۔ صفحہ ۲۷۴۔۲۷۳۔

۲۷۔ سفرنامۂ فیرک۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۲۰۴۔ ۲۰۰

۲۸۔ عبدالحمید لاہوری۔ بادشاہ نامہ۔ حصہ اول۔ صفحہ ۲۴۳۔ ۲۴۴

جاتی تھی[۲۹]۔ ہندو عوام پریاگ اور ہردوار تیرتھ کے لئے جاتے تھے اور مسلمان اجمیر، پانی پت، حضرت نظام الدین اولیاء اور سرہند میں عرس کی تقریبات میں عقیدت مندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے (منیرک) ہندو مسلم امراء کی عورتیں سختی کے ساتھ پردہ کرتی تھیں اور باہر بہت کم جاتی تھیں وہ عام طور پر صبح کو پالکی میں غلاموں کے ساتھ باہر جاتی تھیں۔ یہ پالکی مکان کے اندرونی حصوں تک آجاتی تھی جہاں پر غیر مردوں کا گذر نہ ہوتا تھا، اگرچہ تمام عورتیں پردہ نہ کرتی تھیں۔

لڑکیوں کی پیدائش کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ محلّات میں لڑکے کی پیدائش پر خصوصی جشن منائے جاتے تھے اور لڑکی کی پیدائش پر صرف شاہی محلات میں عورتیں ہی خوشی مناتی تھیں اور تمام دربار اس خوشی میں شریک نہ ہوتا تھا[۳۰]۔ کم عمری میں شادی کا رواج تھا، شادی سے پہلے دلہن کو دیکھنا سخت برا سمجھا جاتا تھا۔ کچھ طبقوں میں دولہا کے گھر کے افراد دلہن کے عزیزوں کو روپیہ دیا کرتے تھے[۳۱]۔

مجموعی طور پر عورتوں کا مقام بلند نہ تھا بلکہ وہ اپنے شوہروں کے ماتحت رہا کرتی تھیں۔ عورتیں اپنے شوہر کے بغیر کھانا نہ کھاتی تھیں۔ پردے کے باوجود عورتیں علم و ادب کے میدان میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ دولت مند خاندانوں کی لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور خاص طور پر شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتی تھیں۔

ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ادارے قائم تھے۔ ہندو تعلیمی اداروں میں سنسکرت اور چاروں وید نصاب میں شامل تھے، فلسفہ، سنسکرت گرائمر (قواعد) اور

---

۲۹۔ عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ۔ حصہ دوم صفحہ ۱۶۸۔ ۱۶۷

۳۰۔ سفرنامہ منوچی حصہ دوم صفحہ ۲۴۳

۳۱۔ ایضاً حصہ سوم صفحہ ۵۵۔

پُران وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی[۳۲]۔ دلی، آگرہ، لاہور، گجرات اور کشمیر میں اعلیٰ تعلیمی مراکز قائم تھے، خاص طور پر دلی میں کئی ادارے قائم تھے[۳۳]۔ لیکن ہندو مسلم تعلیمی ادارے مذہبی اثرات سے خالی نہ تھے۔ ماہا منگا نے ایک مدرسہ خیر المنزل کے نام سے قائم کرایا جو پرانے قلعے کے مغربی دروازے کے مخالف سمت میں قائم تھا[۳۴]۔ ہمایوں کے مقبرہ میں بھی ایک مدرسہ قائم تھا۔ شاہ جہاں نے بھی ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا جس کا نام دارالبقا تھا جو جامع مسجد کے جنوب کی طرف واقع تھا[۳۵]۔ مختلف مدارس میں مختلف نصاب ہوتے تھے۔ عام طور پر تعلیم بارہ سال میں مکمل ہوتی تھی۔ اس دور کے کتب خانوں سے بھی لوگوں کی ذاتی قابلیت اور علمی ذوق وشوق کا پتہ چلتا ہے۔ برنیئر نے دلی اور آگرہ کے کتب خانوں کا حال اور وہاں کی علم پروری کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے جس سے مغل بادشاہوں کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے[۳۶]۔

(ختم)

---

۳۲۔ سفرنامۂ برنیئر۔ صفحہ ۳۳۵

۳۳۔ ہندوستان میں قدیم اسلامی درسگاہیں۔ صفحہ ۲۳

۳۴۔ ایضاً۔ ابوالحسن علی ندوی۔ صفحہ ۲۲۔ ۲۴

۳۵۔ آثار الصنادید۔ سرسید احمد خاں۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۱۲

۳۶۔ سفرنامۂ برنیئر۔ صفحہ ۳۳۵

# تعارف وتبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

## ابن الفارض ـــــ عربی صوفیانہ شاعری کی ایک منفرد شخصیت

مصنفہ : غلام مصطفیٰ

سائز ۲۰x۲۶/۸، حجم ۲۴۴ صفحات، خوبصورت ٹائپ میں، غیر مجلد، قیمت درج نہیں۔

اشاعت اول : ۱۹۷۳ء۔ناشر : ادارۂ علوم اسلامیہ۔ مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ 202001

عربی شعروادب پر اردو میں کوئی جامع اور مبسوط ادبی، تاریخی یا تنقیدی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ شبلی نے شعرالعجم کی طرح شعرالعرب لکھنے کا ارادہ کیا تھا، مگر ایک مضمون سے آگے نہ لکھ سکے۔ بہت بعد میں عربی ادب کی تاریخ پر ایک دو کتابیں لکھی گئیں جواب قریب قریب ناپید ہیں، لیکن اردو میں عربی کی صوفیانہ شاعری پر اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، زیرتبصرہ کتاب کی اشاعت سے یہ کمی بڑی حد تک پوری ہوگئی ہے۔

ابن الفارض (۱۱۸۰ ـ ۱۲۳۴ء) جن کا پورا نام شیخ ابوحفص شرف الدین عمر بن الفارض ہے، مشہور صوفی گذرے ہیں اور ان کا شمار بقول فاضل مصنفہ : "اسلام کے ممتاز صوفیہ میں ہوتا ہے اور وہ عربی صوفیانہ شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری کے نصف آخر میں یہ آفتاب طلوع ہوا اور ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں نصف النہار پر پہنچ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی تصوف مدارج ارتقا کو طے کرتا ہوا نقطۂ عروج کو پہنچ رہا تھا۔ ایک طرف شیخ اکبر محی الدین بن عربی کے صوفیانہ افکار کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا اور دوسری

طرف ابن الفارض [یہی ابن الفارض جن پر یہ زیر تبصرہ کتاب لکھی گئی ہے۔] کی شاعری کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے، گویا عربی تصوف کے آفتاب اور ماہتاب دونوں ساتھ ساتھ اپنی اپنی چمک دمک سے دنیا کو منور کر رہے تھے" (تعارف)

یہ کتاب پیش لفظ اور تعارف کے علاوہ چھ ابواب پر مشتمل ہے: پہلا باب: سوانح حیات، دوسرا باب: اخلاق وعادات، تیسرا باب: آثار وباقیات، چوتھا باب: شعری خصوصیات و کمالات، پانچواں باب: بنیادی موضوعات وخیالات اور چھٹا باب: صوفیانہ افکار ونظریات۔ اس آخری باب سے کچھ صوفیانہ اشعار کے ترجمے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) جو بارِ غم مجھ پر ہے، اگر وہ پہاڑوں پر ہوتا اور ان کے درمیان طور سینا بھی ہوتا تو بھی وہ سب کے سب تجلی سے قبل ہی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔

(۲) جو غم مجھ پر نازل ہوا ہے وہ میرے نزدیک ایک عطیہ ہے۔ میرے عہدِ محبت کی گرہ اتنی مضبوط ہے کہ وہ کسی طرح کھل نہیں سکتی۔

(۳) یقیناً تو ہی میرے دل کی تمنا، میری طلب کی غایت، میری مراد کی انتہا، میرا انتخاب اور میری پسند ہے۔

(۴) بے شک تجھے محبت ہے لیکن اپنے نفس سے، اس بارے میں میری ایک دلیل یہ ہے کہ تو اپنے [بعض] انفرادی وصف کو اب تک باقی رکھے ہوئے ہے۔

(۵) میں صحو [ہوش] کو اپنی پستی اور سُکر [مدہوشی] کو بلندی خیال کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اپنی ہستی کو محو کر دینا ہی میرا منتہائے مقصود ہے۔

(۶) اور جو حالت صحو میں حقیقت کو کھو دیتا ہے اور صرف حالت سُکر ہی میں اس کو پاتا ہے وہ اپنے تلون حال کی وجہ سے قرب الٰہی کی تمکین کا اہل نہیں۔

(۷) تو میرا عاشق نہیں ہو سکتا تا آنکہ تو میرے اندر فنا نہ ہو جائے اور تو فنا نہیں

ہو سکتا تا آنکہ تیرے اندر میری صورت جلوہ گر نہ ہو جائے۔

(۸) میں ہمیشہ سے "وہ" ہوں اور وہ ہمیشہ سے "میں" ہے اور کوئی فرق نہیں ہے بلکہ میری ذات نے میری ہی ذات سے محبت کی ہے۔

(وما زلت ایاها و ایای لم تزل ولا فرق بل ذاتی لذاتی احبت)

اس کتاب کے فاضل مصنف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب مسلم یونیورسٹی کے ان اساتذہ میں سے ہیں، جن سے میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے اور واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ عربی شاعری اور ادب پر ان کی وسیع اور گہری نظر ہے۔ اگر ادارۂ علوم اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی) جس نے زیر تبصرہ کتاب شائع کی ہے، موصوف سے عربی شاعری اور ادب پر کوئی مبسوط کتاب لکھوا کر شائع کر سکے تو یہ اردو زبان وادب کی مفید خدمت ہوگی اور اس کے خزانے میں قیمتی اضافہ ہوگا۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر کتب خانے کی زینت بنے اور عربی زبان وادب کے طلبا واساتذہ خاص طور پر اس کا مطالعہ کریں۔ افسوس کہ اس کتاب پر اس کی قیمت درج نہیں ہے اور سنہ اشاعت ۱۹۷۳ء درج ہے جبکہ امسال ۱۹۷۷ء کے نصف سال گذرنے کے بعد تبصرے کے لئے موصول ہوئی ہے، اس سے یونیورسٹیوں کے حسن انتظام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

## مسلمان اور وقت کے تقاضے

از مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$، حجم ۱۳۶ صفحات، مجلد، تاریخ اشاعت: دسمبر ۱۹۷۶ء۔ قیمت: آٹھ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

زیر تبصرہ کتاب گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) مسلمانوں کے لیے راہِ عمل (۲) وقت کا تقاضا (۳) اسلام کا پیام امن واتحاد (۴) دین ودنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود (۵) عبادت کا مفہوم (۶) روح قرآن (۷) راہ ہدایت

(۸) حدیث نبوی کے اولین صحیفے (۹) استقامت (۱۰) بے نفسی کی حیرت انگیز مثال (۱۱) ایمان کی تاثیر۔

مولانا عبدالسلام صاحب جہاں ندوی ہیں وہاں جامعی بھی، وہ مذہبی مسائل کو بھی سمجھتے ہیں اور زمانے کے تقاضوں سے بھی واقف ہیں، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی اور اب یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں تصنیف و تالیف کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ساتھ ہی ندوہ کے معتمد تعلیم بھی ہیں، غرض قدیم و جدید کے صحیح معنی میں سنگم ہیں اور انھیں پورا حق ہے کہ مسلمانوں کو وقت کے تقاضوں سے آگاہ کریں۔ اس لیے مجھے قوی امید ہے کہ زیر تبصرہ کتاب مسلمانوں میں خاص طور پر مقبول ہوگی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ اس کتاب کے مضامین سے استفادہ کریں گے۔

## مراٹھی ادب کا مطالعہ　　　از یونس اگاسکر

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۱۵۱ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: دس روپے، اشاعت اول: نومبر ۱۹۷۶ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ پرنسس بلڈنگ۔ جے جے اسپتال۔ ڈاکٹر اقبال چوک۔ بمبئی۔ 400003

اردو ادب میں جو خامیاں اور کمیاں ہیں، ان میں سے ایک اہم کمی یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کے بارے میں مفصل اور مبسوط کتابیں نہیں ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کی اشاعت سے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوگئی ہے۔ اس کتاب کے نوجوان مصنف، یونس اگاسکر ریاست مہاراشٹر کے ایک مشہور شہر بھیونڈی کے رہنے والے ہیں اور بمبئی کے ایک کالج کے شعبۂ اردو میں لکچرر اور ماہنامہ "نقش کوکن" (بمبئی) کے اڈیٹر اور ماہنامہ "شاعر" (بمبئی) کے مدیر معاون ہیں۔ اردو کے علاوہ مراٹھی ادب سے شروع ہی سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ پیش نظر کتاب ان کی اولین تصنیف

ہے۔ تعارف اور مقدمہ وغیرہ کے علاوہ کتاب کے اہم عنوانات حسب ذیل ہیں :

(۱) مہاراشٹری تہذیب کے چند پہلو (۲) قدیم مراٹھی شاعری (۳) قدیم مراٹھی نثر کی آبرو: بکھر [تاریخ نویسی] (۴) جدید مراٹھی نثر کا مقدمۃ الجیش (۵) مراٹھی فکشن کا آغاز: دورِ جدید و ترجمہ (۶) مراٹھی کے ابتدائی ناولوں پر ایک نظر (۷) مراٹھی اسٹیج اور ڈراما: آغاز و ارتقا (۸) مراٹھی لوک ناٹک: وَشا وُ تَار۔

مراٹھی کے مشہور نقاد اور انشائیہ نگار، پروفیسر را، بھی جوشی کے الفاظ میں: "اس مختصر سی کتاب میں جناب یونس اگاسکر نے مراٹھی شاعری اور ادب کا ایک واضح خاکہ اردو میں پیش کیا ہے اور جس جس صنفِ ادب کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیا ہے اس کے تقریباً تمام گوشوں کو روشن کر دیا ہے۔ اس کتاب کی مدد سے اردو داں قارئین نہ صرف مراٹھی ادب کی مختلف اصناف اور اس کے ادوار سے واقف ہو سکیں گے بلکہ اس کا اندازہ بھی لگا سکیں گے کہ فارسی اور اردو سے مراٹھی کا رشتہ کیا اور کیسا رہا ہے۔" (صفحہ ۱۵) فاضل مراٹھی نقاد نے اس کتاب کی ایک کمی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، وہ یہ کہ: مراٹھی کی "موجودہ کہانی اور نئی شاعری کا جائزہ اس میں شامل نہیں ہے۔" چونکہ اس کتاب سے ملک کی ایک اہم زبان کے ادب سے ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس لیے توقع ہے کہ اردو میں مقبولیت حاصل کرے گی۔

## محراب از عزیز وارثی

سائز ۱۸x۲۲/۸ ، حجم ۱۶۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: دس روپے۔ سنہ اشاعت: ۱۹۷۶ء

## جسارت از عزیز وارثی

سائز ۱۸x۲۲/۸ ، حجم ۱۲۸ صفحات، غیر مجلد، قیمت: دس روپے۔ سنہ اشاعت: ۱۹۷۶ء

دونوں مجموعۂ کلام کے ملنے کا پتہ: مکتبہ ندائے اتحاد، ۱۶۳۹۔ لال کنواں۔ دہلی۔ 110006

جناب عزیز وارثی اردو کے خوشگو شاعر، دلی کے سماجی کارکن اور ایک پندرہ روزہ اخبار "ندائے اتحاد" (دہلی) کے اڈیٹر ہیں جو ۱۹۵۵ء سے جاری ہے۔ ابھی پچھلے سال ۲۲ راگست ۱۹۷۶ء

کو موصوف کی تیس سالہ ادبی وسماجی خدمات کے اعتراف میں دلّی میں بڑی شان کے ساتھ جشن منایا گیا، جس میں نوجوانوں کے علاوہ بزرگوں اور مرکزی وزیروں نے بھی شرکت کی۔ اسی موقع پر مذکورہ بالا دونوں مجموعے شائع کئے گئے ہیں۔

پہلے مجموعے، "محراب" میں زیادہ تر غزلیں ہیں اور تھوڑی سی نظمیں۔ اور "جسارت" میں نعتیں، منقبتیں، خمسے، نظمیں اور قطعات ہیں۔ اس کے بارے میں خود شاعر نے لکھا ہے کہ: "اس مجموعے کا نصف حصہ ہی نہیں بلکہ میری نصف شاعری تصوف کی مرہونِ منت ہے۔ چونکہ تصوف سے مجھے قدرتی دلچسپی ہے، میں براہ راست وارثیہ سلسلے کے عظیم روشن ضمیر فقیر بزرگ حاجی حضرت اوگھٹ شاہ صاحب وارثی کا کمترین غلام ہوں جو عالم نواز وارثِ پاک بے مثل محبوب اور مقرب خاص تھے۔ مجھے اوائل عمر ہی سے اپنے مرشد و رہبر کی خاص سرپرستی و رہنمائی کا فخر حاصل ہے، اسی لیے روحانیت میری زندگی کا ایک حصہ ہے، غالباً میری روحانیت کے برابر کا اور "جسارت" کی بیشتر نظمیں اسی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری نظمیں قوم پرستی وسیکولرازم کی آئینہ دار ہیں۔" (صفحہ ۵) کچھ نظمیں مشہور اور مقتدر شخصیتوں کے بارے میں ہیں، مثلاً باباگرونانک، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، حکیم اجمل خاں، خواجہ حسن نظامی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، جواہر لال نہرو۔ کچھ نظمیں تہواروں پر بھی ہیں، مثلاً دوالی، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ وغیرہ۔ غرض یہ دونوں مجموعے بڑے دلچسپ، مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ امید ہے کہ جناب عزیز وارثی کے پہلے مجموعہ "سفینہ وساحل" کی طرح یہ مجموعے بھی مقبول ہوں گے۔

(عبداللطیف اعظمی)

# جامعہ





جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ

جلد ۷۴ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۷ء | شمارہ ۹

## فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبد اللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

---

طابع ناشر: عبد اللطیف اعظمی ● مطبوعہ: جمال پریس دہلی ● ٹائٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

۳ راگست کو سائپرس (قبرص) کے آرک بشپ۔ صدر مکیری اُس (Makarios) کا انتقال ہو گیا اور بحیرۂ روم کے علاقے کی سیاست کی ایک اہم اور دلچسپ شخصیت اپنی جگہ خالی کر گئی۔ سائپرس کے یونانی انھیں اپنا ہیرو سمجھتے تھے، سائپرس کے ترک انھیں بازنطینی عیاری، فریب اور شرانگیزی کا ایک معجون مرکب تصور کرتے تھے۔ مکیری اُس اس میں تو کامیاب رہے کہ انھیں کی قیادت میں سائپرس کو برطانوی سامراج سے آزادی ملی، لیکن وہ اس میں افسوسناک حد تک ناکام رہے کہ وہ اس خوبصورت جزیرے کو متحد رکھ سکیں، اپنے آخری دنوں میں وہ آہ بھر کر کہتے تھے کہ میں اپنی زندگی میں سائپرس کو متحد نہ دیکھ سکوں گا۔

---

مکیری اُس ایتھنز اور بوسٹن سے جب اپنی عیسائی دینیات کی تعلیم ختم کر کے واپس ہوئے تو انھیں ۱۹۴۸ء میں گریک آرتھوڈوکس چرچ میں بشپ کے عہدے پر فائز کیا گیا اور پھر ۱۹۵۰ء میں انھیں آرک بشپ بنا دیا گیا، ساتھ ہی ساتھ وہ سائپرس کے یونانیوں کے نسلی و قومی لیڈر بھی تسلیم کر لئے گئے۔ جلد ہی وہ سائپرس کی آزادی اور یونان سے اس جزیرے کے اتحاد کی تحریکات (enosis) میں شامل ہو گئے۔ لیکن درحقیقت اِنوسِس کی حمایت ان کی ایک چال تھی، اس لئے کہ وہ آزادی کی لڑائی کے لئے یونانی گوریلاؤں کے محتاج تھے، ۱۹۶۰ء میں جب یہ جزیرہ آزاد ہوا اور مکیری اُس اس کی آزاد ریپبلک کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے اپنی آزاد مملکت کی بہر قیمت حفاظت کا ارادہ کیا اور اس کے لئے ایک جنچے تلے لائحہ عمل کے مطابق بین الاقوامی تائید بھی حاصل کر لی۔ یونان کے انتہا پسندوں نے اُن کی اس سیاست کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھیں اور جزیرے میں دہشت اور قتل و غارت گری کی فضا قائم رہی۔ اس سلسلے میں یونان کے ایک متعصب

فوجی کونل جارج گری واس کا نام ہمارے قارئین کے ذہن میں محفوظ ہوگا اور EOKA اور EOKA-B کی باہم خونیں اور آتشیں آویزشیں بھی یہ ہوں گی۔

---

جن لوگوں کو ترکی کی تاریخ اور تاریخ یوروپ کے "مسئلۂ شرقیہ" سے دلچسپی رہی ہے انھیں یاد ہوگا کہ سائپرس ایک ترک جزیرہ تھا اور یہاں ترکوں کی اکثریت تھی۔ ۱۸۸۰ کی برلن کانگرس کے موقع پر جو روسی ترکی جنگ (۱۸۷۸-۱۸۷۶) کے بعد منعقد ہوئی تھی، سلطان ترکی نے اسے برطانیہ کو لیز پر دے دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے اسے بطور تاوان جنگ ہڑپ کرلیا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد ہی سے انگریز انتظامیہ کی ہمت افزائی کی وجہ سے یونان سے یونانی باشندے بڑی تعداد میں یہاں آنے اور بسنے لگے تھے۔ یونان سے کلرکوں اور نوجوانوں کی مانگ تھی کیونکہ ان میں تعلیم بھی تھی اور وہ عیسائی بھی تھے۔ نتیجہ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد صورت یہ نکلی کہ سائپرس میں یونانیوں کی اکثریت تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہاں بھی فلسطین جیسی صورت حال پیدا ہوگئی، یعنی یونانیوں نے سائپرس سے قدیم ترک آبادیوں کو نکال باہر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۶۰ء میں سائپرس کے آزاد ہونے کے بعد ہی ترکوں پر حملے شروع ہو گئے تھے، ترکوں نے اس کا جواب بھی دیا تھا، لیکن ۱۹۶۳ء میں گریوس کی سازش سے یونانی انتہا پسندوں (EOKA-B) نے اپنے لیڈر سیمپسن کی قیادت میں ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ترکی چاہتا تھا کہ وہ فوجی مداخلت کرے لیکن امریکہ اور برطانیہ نے اسے ایسا نہ کرنے پر راضی کرلیا کیونکہ ان کے خیال میں اس وقت سائپرس کی خود مختاری کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ سائپرس کی آزادی کے موقع پر ایک صلحنامۂ گارنٹی بھی مرتب اور منظور ہوا تھا جس کی رو سے اس جزیرہ کی ساورنٹی کے تحفظ کے لئے ضرورت ہو تو برطانیہ، یونان یا ترکی اپنی فوجی طاقت کا استعمال کرسکتا ہے۔ بہرحال جزیرہ کے ترکوں پر جب حملوں کے واقعات زیادہ ہونے لگے تو ترک ہوائیہ نے یونانی دیہاتوں کو اپنا نشانہ بنانا شروع کیا۔ آخر کار ترک اقلیت کی حفاظت کے لئے اقوام متحدہ کی فوجیں آگئیں۔

---

اِدھر یہ ہوا کہ ۱۹۶۳ء کے بعد سے مکیگری اُس نے ترکوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ترکوں کی آبادی تو پورے جزیرے میں ۲۰ فیصدی کے قریب ہے لیکن چونکہ وہ زیادہ ترکسان ہیں اس لئے جزیرے کی زمین کا کوئی ۳۵ فیصدی حصہ ان کے پاس ہے۔ مکیگری اُس کی یہ سخت ترین سیاسی غلطی تھی، لیکن ان پر نسلی تعصب اتنا غالب تھا کہ آرک بشپ ہوتے ہوئے بھی وہ انصاف نہیں کر پاتے تھے اور ترک مسلمانوں کے لئے امن و سلامتی کا کوئی تصور ان کے پاس نہ تھا۔ ایتھنز میں فوجی حکومت کے قیام کے بعد ۱۹۶۷ء میں سائپرس کے ترکوں کے خلاف پھر دہشت انگیزی اور غارت گری کی مہم چلی اور جولائی ۱۹۷۴ء میں تو یونان کے پانچ سو فوجی افسروں کی مدد سے EOKA – B نے آرک بشپ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود انھیں بھاگ کر لندن میں پناہ لینی پڑی۔

---

اس بار ترکی نے فوجی مداخلت کی اور چند روز کے اندر مسٹر سیمپسن جن کی پیاس ترکوں کے خون سے بجھتی ہی نہیں تھی اور جنھوں نے EOKA – B کے سہارے اپنی حکومت قائم کر لی تھی، گرفتار ہو گئے، ایتھنز میں فوجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ترکوں کے قبضہ میں سائپرس کا کوئی ۴۰ فیصدی علاقہ آ گیا، بڑے پیمانہ پر انتقال آبادی ہوا، اور ترکوں اور یونانیوں دونوں کو سخت مصائب اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال کوئی دس برس کے سیاسی اور سماجی بائیکاٹ کے بعد ترک اقلیت کو اپنا الگ ایڈمنسٹریشن قائم کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ آج قبرص (ترکوں نے اپنے علاقے کا بھی پرانا نام رکھا ہے) ہر لحاظ سے ایک علاحدہ قوم اور مملکت ہے، اس کی اپنی کرنسی ہے، پوسٹیج اسٹامپ ہیں اور ترکی کا جھنڈا ہے۔

---

۱۹۷۴ء میں سائپرس میں ترکی کی فوجی مداخلت پر دنیا کا ردعمل عام طور پر ترکوں کے حق میں تھا، صرف امریکہ ایسا ملک تھا جس نے اپنی طاقتور یونانی لابی کے دباؤ کی وجہ سے اس پر ناگواری کا اظہار کیا تھا اور ترکی کو اسلحے کی سپلائی روک دی تھی۔ جزوی طور پر آج تک یہ پابندی نافذ ہے۔ اس کی وجہ سے ترکی اور امریکہ کے تعلقات پر بھی ایک حد تک اثر پڑا ہے۔ امریکہ نے اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح سائپرس کے مسئلے کا

کوئی آئینی حل نکل آئے۔ ایک حل یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ جزیرے کی تقسیم کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کسی وفاقی نظام حکومت پر فریقین متفق ہو جائیں، لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ وہ امور جو خاص طور پر زیر بحث آتے ہیں اور طے نہیں ہو پاتے، یہ ہیں:

۱۔ آخری خط تقسیم کیا اور کہاں ہو۔

۲۔ تقسیم کے وقت ترکوں اور یونانیوں نے جو جائدادیں اور اثاثے اپنے پہلے کے علاقوں میں چھوڑے ہیں ان کے معاوضہ کی شرح کیا ہو۔

۳۔ دونوں قوموں کو جزیرے میں کہیں بھی آجا سکنے کی آزادی ہو لیکن اس سلسلے میں دونوں کے کیا حقوق متفقہ اور مشترکہ طور پر ہوں اور طے شدہ ہوں اور

۴۔ دونوں ریاستوں اور مجوزہ فیڈریشن کے مابین اختیارات کی تقسیم کیسے ہو۔

---

مکیری اُس زندہ ہوتے تو مسئلے کا جو حل بھی وہ قبول کرتے اُسے سائپرس کے یونانیوں سے منوا لیتے کیونکہ وہ ان میں بے حد مقبول تھے، موجودہ حکومت کے لئے غالباً یہ بھی ایک مشکل ہوگی کہ اس کے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے۔ سلطنت عثمانیہ اور اور یونانیوں کے تعلقات کی پوری تاریخ کے پس منظر میں دیکھئے اور ماضی قریب میں خود اس جزیرے میں جو کچھ ہوا ہے اسے سامنے رکھئے تو مسئلے کا حل تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تقسیم کو قانونی طور پر دنیا تسلیم کرلے۔ آج یورپ کے ملکوں میں باہم جو نہایت خوشگوار تعلقات ہیں اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ہٹلر سارے یوروپ کو متحد کرنے میں ناکام رہا۔ اس لئے امریکہ کا یہ اصرار کچھ زیادہ معقول نظر نہیں آتا کہ جزیرۂ سائپرس کا اتحاد، ترکوں اور یونانیوں میں باہم ناگفتہ بہ تلخیوں اور بے پناہ نفرتوں کے باوجود، بحال کیا جائے۔

سید اطہر رضا بلگرامی

# آبادی اور ترقی

سماجی علوم کے ماہرین کے سامنے آبادی اور معاشی ترقی کا باہمی رشتہ ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے۔ بحث کا نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ کسی ملک کی شرح آبادی کس حد تک اس کی معاشی و سماجی ترقی یا پستی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک تین اہم نظریات سامنے آئے ہیں۔ ایک کلاسیکی نظریہ ہے جس کے بانی مالتھس تھے دوسرا سوشلسٹ نظریہ ہے جس کے بانی مارکس تھے، تیسرا جدید نظریہ ہے جس میں معقولیت پسندی اور توازن معلوم ہوتا ہے۔ اس مقالہ میں ان تمام نظریات کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مالتھس کے نظرئے کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

آبادی اور ترقی کے باہمی رشتہ پر مالتھس کا پہلا جامع مقالہ ESSY ON THE PRINCIPLE OF POPULATION (1798) ہے جو آج بھی سماجی علوم کے ماہرین کے لئے فکر اور فہم و ادراک کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے مطالعوں اور مشاہدوں سے مندرجہ ذیل نتائج نکالتا ہے:

"ا": انسانوں میں افزائش نسل کی قوت زمین کی قوت نمو سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

"ب": اگر آبادی بغیر کسی مزاحمت کے بڑھتی رہے تو اس کی افزائش کا انداز

---

جناب اطہر رضا بلگرامی۔ لکچرر شعبہ معاشیات جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

سلسلۂ ہندسیہ (GEOMETRICAL PROGRESSION) کی طرح ۶۴، ۳۲، ۱۶، ۸، ۴، ۲ و ۱ کے نہج پر ہوگا جو اس کو ۲۵ برسوں میں دُوگنا کر دیتا ہے۔ لیکن زمین سے اجناس کی پیداوار کی رفتار، جو انسانوں کی بقا کی بنیاد ہے، سلسلۂ حسابیہ (ARITHMETRICAL PROGRESSION) کی طرح ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳ و ۲ و ۱ کی مانند رہتی ہے۔

"ج": اس طرح آبادی اور اجناس دونوں کے بڑھنے کی رفتار میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ آبادی کی تیز روی اور اجناس کی سست روی سے رونما ہونے والی یہی خلیج دونوں کے درمیان ایک غیر متوازن نسبت کو جنم دیتی ہے اور غربت، افلاس اور پس ماندگی کا بنیادی سبب بنتی ہے۔

"د" چونکہ زمین پیداوار کا ایک طے شدہ اور محدود ذریعہ ہے، اس لیے جیسے جیسے آبادی بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے رہائشی اور دیگر ضروریات نیز زرعی پیداوار کے نقطۂ نظر سے چھوٹی ہوتی جاتی ہے۔ مزید براں، چونکہ زمین زرعی پیداوار کے سلسلے میں متواتر استعمال ہوتی رہتی ہے اس لیے ایک مدت کے بعد اس کی قوت نمو بھی تدریجاً کم ہونے لگتی ہے۔ یعنی زمین کی ایک دی ہوئی اکائی پر اگر محنت و سرمایہ کی اکائیاں بڑھائی جاتی رہیں تو اس سے پیدا ہونے والی پیدائش گھٹتی ہوئی شرح سے بڑھے گی۔ اس طرح زمین رقبہ اور قوتِ نمو دونوں اعتبار سے آبادی کے بڑھنے کا ساتھ نہیں دیتی۔ نتیجتاً انسان اور زمین کے درمیان ایک غیر متوازی، غیر صحت مند اور غیر مثبتی نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ یہ نسبت اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ کس طرح آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی بقاء کا سب سے اہم عنصر زمین کمیاب سے کمیاب تر بنتا جاتا ہے۔ اب یہ غیر متوازی نسبت جتنی شدید ہوگی عوام میں افلاس، غربت اور پس ماندگی بھی اسی قدر شدید ہوگی۔

"نما" چونکہ زمین طے شدہ اور محدود ہے اس لیے اس غیر متوازن نسبت کو درست کرنے کا واحد حل آبادی کو کنٹرول کرنے میں ہی مضمر ہے۔ اس سلسلے میں مالتھس دو طریقے بتاتا ہے۔ اول امتناعی (PRIVENTIVE METHOD) ہے جس میں انسان خود ارادی طور پر افزائشِ نسل کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرے۔ ان طریقوں میں ادویات کا استعمال، آپریشن، اسقاطِ حمل اور اخلاقی انضباط (MORAL RESTRAINS) خصوصی ہیں۔ ان میں بھی مالتھس سب سے زیادہ اہمیت اخلاقی انضباط جیسے شادی میں تاخیر، ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ بچوں کی پیدائش، ضبطِ نفس وغیرہ کو دیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں یہی سب سے زیادہ پائیدار اور موثر ذریعہ ہے۔ اگر انسان آبادی کو کنٹرول کرنے کے سلسلے میں کوتاہی برتے یا ناکام ثابت ہو تو پھر اس کا یہ یقین ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو قانونِ قدرت جنگوں، وبائی بیماریوں، قحط سالی، سیلابوں کے ذریعہ کم کر دے گا اور اس طرح انسان اور اس کے "ذرائع بقا" کے درمیان فطری طور پر توازنی نسبت قائم ہو جائے گی۔ نظامِ قدرت کے ذریعہ آبادی کے کنٹرول اور اس کی بقار کا یہ تحفظ مالتھس کی نگاہ میں مثبتی یا فطری کنٹرول (POSTIVE CHECK) ہے۔

مالتھس کے ان نظریات کا کلیہ یہ ہے کہ آبادی اور ترقی کا مسئلہ درحقیقت انسان اور اس کی بقار کے محدود وسائل کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا مسئلہ ہے۔ چوں کہ آبادی پیداوار کے محدود وسائل کے بالمقابل زیادہ تیزی سے بڑھتے رہنے کا رجحان رکھتی ہے اس لیے آبادی کے فروغ کے ساتھ ساتھ عوام کی غربت، افلاس اور پس ماندگی بھی بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے چھٹکارا اسی وقت ممکن ہے جب انسان خود ارادی طور پر اپنی شرحِ افزائش کو بقار کے وسائل کی شرحِ افزائش کے متوازی رکھنے کی کوشش کرے۔ اور اگر وہ اس میں ناکام ثابت ہوتا ہے

تو پھر نظام قدرت انسانی اضافوں کو تباہ کر کے اس کی بقاء کے محدود وسائل کے درمیان توازن قائم کرتی رہے گی۔

واضح رہے کہ مالتھس کے یہ نظریات قنوطیت (PESSIMISM) اور یقینیت قطعیت یا جبریت (DETERMINISM) کی طرف شدت سے مائل ہیں۔ یہاں آبادی کی تیز رفتاری کو ترقی کے منفی اور غیر صحت مند عنصر کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے، اسے انسانی فلاح و بہبود کے لئے خطرہ قرار دیا گیا ہے۔ محض اس لئے کہ آبادی کی تیز رفتاری کے مقابلہ میں اس کی بنیادی ضرورتوں کو، جن پر اس کی خوش و خرم اور پرسکون زندگی کا انحصار ہے، پورا کرنے والے وسائل اس قدر نہیں بڑھائے جا سکتے۔ اس طرح مالتھس کی نگاہ میں غربت، افلاس اور پس ماندگی محض اس لئے فروغ پاتی ہے کہ زندگی کے محدود وسائل پر انسانوں کا دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔

مارکس نے مالتھس کی طرح آبادی کا کوئی جامع نظریہ پیش نہیں کیا ہے لیکن وہ مالتھس کے اس نظریہ کو غیر یقینی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آبادی کے سلسلے میں کسی ایسے باعمل اور عام فہم قانون کا بنا لینا جو ہر دور اور ہر مقام پر یکساں موزوں ہو غیر یقینی سا ہے۔ وہ آبادی اور ترقی کے مسئلے کو سماج کی مختلف ساختوں، ڈھانچوں اور تنظیموں کی تشکیل میں پنپتا دیکھتا ہے اور انھیں کے تغیرات سے حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مارکس کے یہاں عمل آبادی (POPULATION PROCESS) سماجی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے فروغ کا تعلق متعدد عوامل جیسے پیداآور طاقتوں کی سطح، پیداوار کے رشتے، عوام کا اخلاقی معیار اور اس کے متعلق قوانین، مذہب، سیاسی نظریات اور جغرافیائی ماحول سے ہے۔ آبادی کے سائز کو طے کرنے میں جو عناصر سب سے اہم رول ادا کرتے ہیں وہ پیداوار کے رشتے ہیں اور انھیں رشتوں کی نوعیت کے بموجب جس طرح کے سماج کی تشکیل ہوتی ہے نظریہ آبادی اسی کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ اس طرح آبادی کی زیادتی

یا کمی کا تصور دراصل اس سماجی تنظیم کا نتیجہ ہے جو کسی مخصوص نوعیت کے پیداوار کے رشتوں سے وجود میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ سماج کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سرمایہ کو مرکزیت کا رجحان ملتا ہے۔ سرمایہ کے اس رجحان کے ساتھ پیداوار کے دیگر وسائل کا ایک جگہ مرکوز ہونا لازمی امر ہے اور یہ سب محض اس لئے ہوتا ہے کہ سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ منافع پر قابض رہنا چاہتا ہے۔ اب ایک سماجی تنظیم جہاں پیداوار کے رشتوں میں پھیلنے اور منتشر ہونے کے بجائے چند سرمایہ داروں کی گرفت میں مرکوز ہو جانے کا رجحان پیدا کر دیا جائے، آگے چل کر مزدور سماج کے استحصال کا سبب بنتی ہے۔ مزدور مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو ہجرت کرے۔ نتیجتاً جس مقام کو مزدوروں نے چھوڑا ہے وہاں آبادی کی کمی اور جس مقام پر وہ ہجرت کر کے پہنچے ہیں وہاں آبادی کی زیادتی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی تصور کے ساتھ روزگار، آمدنی اور معیار زندگی کے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ مسائل آبادی کی کمی والے علاقے میں اس لیے پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہاں انسانوں کی کمی نے پیداوار اور صرف کی سطح کو گرا دیا جس کے نتیجہ میں وسائل کی بے روزگاری پھیلی، پیداوار گری، آمدنی گھٹی، صرف اور مجموعی طلب گری۔ دوسری طرف وہ علاقے جہاں آبادی نے زیادتی اختیار کر لی ہے وہاں زائد انسان زائد مانگ کا ثبوت ہیں۔ یہ اضافی انسانوں کا وجود فی الحال غیر پیداواری ہے جن کے لیے فوری طور پر اگر پیداوار میں اسی قدر اضافہ نہ کیا گیا تو یہ افراد موجودہ پیداوار میں ہی شریک ہو جائیں گے اور نتیجتاً اپنے ساتھ سبھی کے معیار صرف اور معیار زندگی کو گرا دیں گے۔ مزید بے روزگاری پھیلائیں گے اور آمدنی کو گھٹا کر معیار زندگی کو پست کر دیں گے۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں زائد آبادی اور اس سے پیدا شدہ مسائل خود کار نوعیت کے ہوئے جہاں بے روزگاری، غربت، افلاس جیسے مسائل کی ذمہ دار آبادی نہ

ہو کر وہ سماجی تنظیم ہوئی جس کی بدولت اس طرح کے مسائل رونما ہوتے رہیں۔ یہاں انسانوں کی پس ماندگی کا تعلق آبادی کے بڑھتے ہوئے سائز سے نہیں بلکہ مخصوص سماجی تنظیم کے ذریعہ روزگار کے مواقع پر پڑنے والے غیر صحت مند دباؤ سے ہے۔ اس لئے مسئلے کا بھی حل آبادی کو کم کرنے میں نہیں، بلکہ پیداواری رشتوں کی تبدیلیوں کے ذریعہ سماجی تنظیم میں رونما ہونے والی تبدیلی میں مضمر ہے۔

جدید مالتھوزین نظریہ کا خیال یہ ہے کہ آبادی کی موجودہ تیز رفتاری قدرتی وسائل پر دباؤ بڑھاتی جارہی ہے اور نتیجہ میں قدرتی وسائل سے ملنے والا افادہ گھٹتی ہوئی در سے حاصل ہورہا ہے۔ اس لیے معاشی ترقی کی ایک مقررہ شرح کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ سرمایہ کو دائمی اضافہ کے ساتھ لگائے جانے کے اصول کو اپنالیا جائے۔ لیکن آگے چل کر یہ بھی بے اثر ہوجائے گا۔ بڑھتی ہوئی آبادی ابتدا میں بے روزگار نوجوانوں کے دباؤ کو بڑھاتی جائے گی۔ نتیجہ میں برسر روزگار طبقہ کی بچت کم ہوگی اور پھر بچت کی یہی مسلسل تخفیف بڑھتے ہوئے سرمایہ کو لگانے کے مطالبے کو کمزور سے کمزور بناتی جائے گی۔ اسی طرح معاشی ترقی اور سماجی فروغ دونوں بڑھتی ہوئی آبادی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ یہاں آبادی اور سرمایہ کو لگاتے رہنے کی دوڑ میں آبادی مستقبل میں سرمایہ کو غیر افادہ بخش اور ترقیاتی پروگراموں کو بے اثر اور ناکارہ بنا دے گی۔ یہ ملک کی مستقبل کی ترقی کے لیے عظیم خطرہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آبادی کا وہ کونسا مناسب و بہتر سائز ہے جو معیشت کو ان خطرات سے محفوظ رکھے۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ آبادی کو ملک کے وسائل کے تناسب میں رہنا چاہیے تاکہ مثبت معاشی نتائج حاصل کیے جاتے رہیں۔ یہاں آبادی کا OPTIMUM نظریہ جنم لیتا ہے جو جدید مالتھوزین نظریہ کی ہی پیداوار ہے۔ یہ آبادی کے ایک ایسے سائز کا تصور کرتا ہے جو موجودہ وسائل و تکنیکی سطح کے مطابق ایک بہتر اور بلند معیار زندگی گزار رہا

ہے۔ یہی آبادی کا سب سے موزوں، معقول اور مناسب سائز ہے۔ اس سائز پر پہنچ کر "فی شخص اصل آمدنی" (REAL PER CAPITA INCOME) سب سے بلند سطح پر ہوگی۔ اب اگر آبادی اس سطح سے آگے بڑھ جاتی ہے تو فی شخص اصل آمدنی کی شرح گھٹ جائے گی اور اس طرح زائد حصہ اضافی آبادی کہلائے گا۔ اس کے برخلاف اگر آبادی اس معقول سطح سے نیچے رہتی ہے تو پیداوار کے تمام وسائل کا بھرپور استعمال نہیں ہو پائے گا اور فی شخص اصل آمدنی جو آبادی کے بڑھنے پر مزید بڑھ سکتی ہے نہیں بڑھ پائے گی۔ اس طرح آبادی کا معقول سائز اس کے عروج کا وہ نقطہ ہے جہاں پہنچ کر کمیونٹی کا ہر فرد اشیاء و خدمات کی وسیع مقدار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس معقول سائز سے آبادی کتنی زیادہ یا کم ہے، اس کو پہچاننے کا ایک اصول بتایا گیا ہے جو اس طرح ہے:

$$م = \frac{ا - و}{و}$$

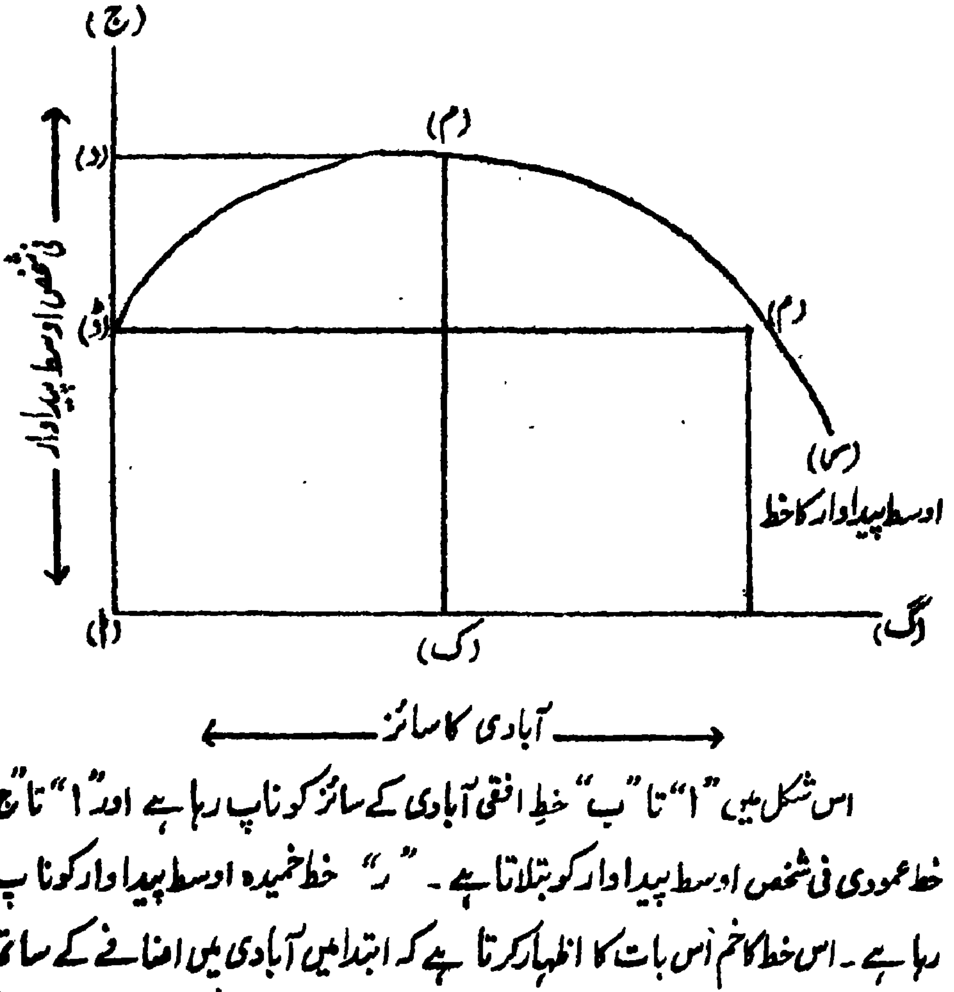
م = عدم مطابقت

ا = موجودہ آبادی

و = معقول آبادی

یہاں "م" عدم مطابقت کی سطح کو بتلاتا ہے۔ "ا" موجودہ آبادی کے سائز کو اور "و" معقول آبادی کے سائز کو ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر آبادی کا معقول سائز وہی ہے جو درحقیقت آبادی کا موجودہ سائز ہے تو پھر عدم مطابقت کی ڈگری جس سے آبادی کے زائد یا کم ہونے کا اندازہ لگایا جاتا ہے، صفر ہوگی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ موجودہ آبادی کا سائز اسی ۸۰ کروڑ ہے جب کہ معقول سائز پچاس ۵۰ کروڑ خیال کیا جاتا ہے تو اس اصول کے تحت عدم مطابقت کی ڈگری ۰٫۶ ہوئی یعنی آبادی معقولیت کی سطح سے ۶۰ فی صد زائد ہے۔ اسی طرح آبادی کی کمی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس اصول کی وضاحت ایک نقشہ کی مدد سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اس نقشے کی مدد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معقول سائز کیا ہے اور اگر اس سائز سے

آبادی آگے بڑھتی ہے تو فی شخص اصل آمدنی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔




اس شکل میں "ا" تا "ب" خطِ افقی آبادی کے سائز کو ناپ رہا ہے اور "ا" تا "ج" خط عمودی فی شخص اوسط پیداوار کو بتلاتا ہے۔ "ر" خط خمیدہ اوسط پیداوار کو ناپ رہا ہے۔ اس خط کا خم اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ ابتدا میں آبادی میں اضافے کے ساتھ فی شخص پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ فی شخص پیداوار میں یہ اضافہ اپنے ایک انتہائی بلند مقام (م) تک جائے گا۔ اس مقام کے بعد اگر آبادی میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو وہ فی شخص پیداوار میں گراوٹ کا باعث بن جائے گی۔ اس طرح "ا" تا "ک" آبادی کا معقول سائز ہوا کیوں کہ یہ وہ سائز ہے جہاں فی شخص پیداوار کا خط "ک" تا "م" اوسط پیداوار کے خط میں سب سے بلند مقام پر ہے۔ اب اگر آبادی "ا" تا "ک" سائز سے آگے بڑھتی ہے تو پھر فی شخص پیداوار و آمدنی پہلے کی بہ نسبت گر جائے گی۔ اس معقول سائز سے آبادی جتنی زیادہ آگے بڑھے گی اسی قدر فی شخص آمدنی و پیداوار میں تخفیف ہوگی۔ اس

تخفیف کو شکل میں آسانی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مان لیا کہ آبادی مقام "ک" سے آگے بڑھ کر "گ" تک پہنچ جاتی ہے تو نتیجہ میں فی شخص آمدنی بھی مقام "د" سے گر کر "ڈ" تک پہنچ جاتی ہے۔ فی شخص پیداوار میں یہ گراوٹ محض اس وجہ سے ہوئی کہ آبادی اپنے معقول سائز سے تجاوز کر گئی۔

(۲)

آبادی اور ترقی کے ان تمام نظریات میں مالتھس کا نظریہ سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنا۔ لیکن شدید اعتراضات کے باوجود مالتھس کے نظریہ کی اس حقیقت سے آج تک کوئی انکار نہ کر سکا کہ آبادی میں اپنی بقار کے وسائل کے بالمقابل زیادہ بڑھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس لیے آبادی اور ترقی کا مسئلہ درحقیقت انسان اور اس کی بقار کے محدود وسائل کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا مسئلہ ہے۔ یہ کلیہ، جدید اور آبادی کے معقول نظریہ کا بھی ہے۔ آج ایشیا کے تمام ترقی پذیر ممالک، بالخصوص ہندوستان، اس نظریہ کے امتحان کا سب سے بہتر میدان بنے ہوئے ہیں۔ یہ نظریہ کس حد تک صحیح ثابت ہوا ہے، اس کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان تمام اہم اعتراضات کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو مالتھس کے خیالات پر کیے گئے ہیں۔

مالتھس پر سب سے اہم اعتراض اس یقینیت پسندی پر کیا گیا۔ مالتھس کا یہ یقین کہ آبادی ہمیشہ سلسلۂ ہندسیہ میں بڑھتی ہے مشکوک ہے۔ دنیا کے ڈیموگرافک ریکارڈ بتاتے ہیں کہ آبادی کے بڑھنے کا انداز ضروری نہیں ہے کہ سلسلۂ ہندسیہ جیسا ہی پایا جائے۔ مزید براں مالتھس کا یہ یقین کہ اگر آبادی بغیر کسی مزاحمت کے بڑھتی رہے تو ہر پچیس ۲۵ برس بعد دوگنی ہو جائے گی، تاریخ کے پس منظر میں غلط ہے۔ وہ کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل آبادی کے پچیس ۲۵ برسوں میں دوگنا ہو جانے کے پس پشت جو شرط رکھی گئی ہے وہ آبادی کے بغیر کسی مزاحمت کے (Unchecked) بڑھتے رہنے کی ہے یعنی ایک ایسی آبادی کا تصور کیا

جارہا ہے جہاں جنگیں نہ ہوں، کسی وبائی بیماری، سیلاب، قحط سالی، زلزلہ وغیرہ سے تباہیاں نہ آئی ہوں، آبادی کو محدود رکھنے کے مصنوعی طریقے نہ اپنائے جارہے ہوں، شادی کے درمیان کسی قسم کی معاشی دشواریاں حائل نہ ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی ایسی آبادی کا وجود ہے جو اس طرح کی تمام مزاحمتوں سے بری ہے تو وہ ہر پچیس ۲۵ برس بعد دوگنی ہو جائے گی۔ لیکن تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ آبادی ہمیشہ ان تمام مزاحمتوں میں سے کسی ایک یا زیادہ سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ اس لیے آبادی کے دوگنا ہو جانے کے لیے بغیر کسی مزاحمت کے بڑھتے رہنے کا مفروضہ تاریخ کی روشنی میں قطعی غلط نظر آتا ہے۔

مالتھس پر دوسرا اہم اعتراض پیداوار کے محدود وسائل کے رخ سے کیا گیا۔ مالتھس کی نگاہ میں زمین جو پیداوار کا بنیادی وسیلہ ہے، آبادی کے فروغ کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ وہ کوتاہ سے کوتاہ تر ہوتی جاتی ہے اور اس طرح زراعتی استعمال کے لئے آبادی کا رقبہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔ دوسری طرف زراعتی استعمال میں زمین اپنی قوت نمو بھی بتدریج کھوتی جاتی ہے۔ اب اگر زمین کے ایک ٹکڑے پر محنت و سرمایے کی اکائیاں بڑھائی جاتی رہیں تو بھی اضافی اکائی پر پیداوار گھٹتی ہوئی درسے بڑھتی ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آبادی اور اجناس دونوں کے بڑھنے کی رفتار میں فرق پیدا ہو جاتا ہے جو غربت، افلاس اور پس ماندگی کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہاں مالتھس انسان کی ان پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کو نظر انداز کرتا نظر آتا ہے، جن کو بروئے کار لاکر اس نے پیدائش کی قلت کو افراط میں بدل دیا ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک کی زرعی پیداوار کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں انسانی دماغوں نے بہتر کھاد، صحت مند بیج، آب پاشی کے مناسب انتظامات، بہتر کارکردگی کے اوزار اور مشینوں اور زراعت کے سائنسی طریق کار کو ایجاد کر کے پیداوار کو، باوجود زمین کے مسلسل استعمال کے، اپنی ضرورت سے بھی زیادہ پیدا کر لینے پر قدرت حاصل کر لی ہے۔ اس مقام پر مالتھس قنوطیت کی طرف شدت سے مائل نظر آتا ہے۔ وہ

انسانی جدوجہد، سائنسی ایجادات، تبدیلی اور اس طرح کے تمام ان عناصر کا منکر نظر آتا ہے جن کے ذریعہ انسان اپنی بقاء اور اپنی مادی خوش حالی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

مالتھس پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ تجارت کے فوائد سے قطعی بے تعلق سا نظر آتا ہے۔ ہر ملک ہر شئے پیدا کرنے میں یکتا نہیں ہوتا۔ وہ وہی شے پیدا کرتا ہے جس میں اس کو دوسرے ملک کے بالمقابل زیادہ فائدہ نظر آتا ہے یعنی جس میں اس کی تقابلی لاگت کم ہو۔ تجارت میں درآمدات اور برآمدات کے اصول اسی تقابلی لاگت پر مبنی ہیں۔ اب اگر کوئی ملک اجناس کی پیداوار میں پیچھے ہے یا کسی مخصوص پیداوار کو معاشی استحکام کے لیے موزوں نہیں سمجھتا تو وہ اس شے کو درآمد کرسکتا ہے اور اس کے بدلے اس شئے کو برآمد کرسکتا ہے جس کی پیداوار اس کے لئے کافی اور وافر ہے۔ درآمدات اور برآمدات کا یہ اصول تمام ممالک کی ایک دوسرے کی ضرورتوں کی تکمیل کا ایک دائمی و موثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ بین الاقوامی تجارت دراصل پیداوار کی زیادتی اور کمی کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے اور مالتھس نے اس اہم گوشے کو نظرانداز کردیا ہے۔

ایک اہم سوال یہ بھی اٹھایا گیا کہ کیا وسائل اور آبادی کے درمیان تعلق قائم کرنے میں وسائل کا تخمینہ لگایا جاسکتا ہے؟ وسائل صرف قلیل مدت کی رو سے طے شدہ تسلیم کیے جاسکتے ہیں ورنہ کسی طویل مدت کے لیے وسائل کا اندازہ لگالینا مشکل امر ہے۔ وسائل ہمیشہ سماجی ترقی اور تعلیمی معلومات کے ساتھ فروغ پاتے ہیں۔ اس طرح وسائل کے فروغ کا مسئلہ بھی نسبتی ہے۔ یہ ہمارا سماجی ڈھانچہ ہے جو مختلف وسائل کے استعمال اور اہمیت کو طے کرتا ہے، مقدار کا تعین کرتا ہے اور ان کی تقسیم کے اصول کو مرتب کرتا ہے۔ مالتھس وسائل کے اس نسبتی پہلو کو نظرانداز کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنے نظریہ میں یہ پہلے ہی سے طے کرلیا ہے کہ وسائل آبادی کے بالمقابل محدود رہتے ہیں۔ لیکن انسانی تاریخ کے ارتقاء نے یہ ثابت کردیا کہ یہ انسان ہی کا کام ہے جو سماجی ترقی کے ساتھ قدرت

کے لامحدود خزانوں کو تلاش کرتا رہا ہے، کمتر وسائل کو تغیر و تبدل کے ذریعہ کار آمد سے کار آمد تر بناتا رہا ہے، محدود کو لامحدود بناتا رہا ہے، کمزور کو لازوال طاقت بخشتا رہا ہے۔ یورینیم اور پلاٹنیم دھاتیں جو انتہائی قلیل مقدار میں تلاش ہوئی ہیں، انسان کی انھیں کاوشوں کا عملی ثبوت ہیں۔ اور اس طرح وہ مقدار کے مسئلہ کو معیار کی بلندی تلاش کر کے حل کرتا رہا ہے۔

(۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مالتھس کے نظریہ آبادی و ترقی پر چھائے ہوئے یقینیت و قطعیت کے عنصر نے بہت حد تک دور اندیشانہ ترقیاتی قیاس آرائیوں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور انھیں قنوطیت کا رجحان دیا ہے لیکن اس کے باوجود اس مسلّمہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آبادی و ترقی کے درمیان جس رشتے کی وضاحت مالتھس نے کی ہے وہ ایک ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ آبادی کا مسئلہ دراصل آبادی کی رفتار اور انسانی بقار کے بنیادی عنصر، اشیائے خورد و نوش (اجناس) کی شرح پیداوار کے درمیان غیر توازنی نسبت کا مسئلہ ہے۔ اب اگر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ انسان نے اپنی جستجو، کاوش اور سائنس ٹکنالوجی کا سہارا لے کر آبادی کی تیز رفتاری کے بالمقابل دن بدن کم محسوس ہوتے ہوئے وسائل پر قابو پالیا ہے اور اس طرح آبادی اور بقار کے وسائل کے درمیان ایک موافق، توازنی اور مثبت رشتہ قائم کرلیا ہے تو یہ خیالِ خام ہے۔ ان کی نگاہ میں مغربی ممالک کی مثالیں ہیں۔ وہی ان کے نظریہ کے مضبوط دلائل ہیں۔ اور ایشیائی ممالک جہاں آبادی ایک سنگین مسئلہ ہے، جہاں مالتھس کے نظریہ کی صداقت جھلکتی ہے ان کی نگاہ میں یوں تنقید کا شکار ہیں کہ ان ممالک نے پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں سائنس، ریسرچ اور ٹکنالوجی کی وہ سطح عبور نہیں کی ہے جو مغربی ممالک عبور کر چکے ہیں۔ اسی لیے ان ممالک میں آبادی اور وسائل کا ایک غیر توازنی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ ایسے تمام نظریات مالتھس کی بیان کردہ

ٹھوس حقیقت کو بدل نہیں سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اگرچہ آبادی اور وسائل کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے نئے نئے وسائل تلاش کرے گا، محدود وسائل کو لامحدود بنانے کی کوشش کرے گا، لیکن عارضی طور پر توازن قائم کرنے کی کوشش ہوگی کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن وسائل کی طرف وہ بڑھے گا انھیں وسائل کی طلب کو وہ بڑھائے گا اور جیسے جیسے طلب بڑھے گی ان وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوگا۔ طویل مدت میں مسلسل بڑھتی رہنے والی طلب کے سامنے یہ وسائل تنگ اور محدود معلوم ہونے لگیں گے اور اس طرح ایک بار پھر مالتھس کے نظریہ کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ سائنس، ٹکنالوجی اور انسانی کاوشیں مالتھس کی یقینیت پسندی پر ایک عارضی ضرب تو ضرور لگا سکتی ہیں لیکن دائمی نہیں۔ جس وسیلہ کی طلب بڑھے گی وہی طویل مدت میں قلیل بن کر معاشی استحکام و سماجی بہبود کے راستے کی رکاوٹ بن جائے گی۔

اب اگر یہ دلیل پیش کی جائے کہ سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ بقار کے بنیادی عناصر بھی بدلتے رہیں گے تو بھی مالتھس کے مرکزی خیالات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک سماجی سطح پر انسانی زندگی کی بقار کے عناصر اناج، زمین، پانی وغیرہ ہیں اور کسی دوسری سطح پر ترکاریاں، پھل، گوشت، شراب اور دیگر مشروبات اور فضا بن گئے ہیں تو بھی مسئلہ اپنے مقام پر رہے گا۔ یہاں بھی جو شئے انسانی بقار کے لئے ضروری ٹھہرائی گئی ہے اس کی طلب کو انسانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے منسلک کر دینا پڑے گا اور اس طرح طلب کے مقابلے میں رسد کی کمی لازمی طور پر انسان اور وسائل کے درمیان غیر توازنی نسبت کو قائم رکھے گی۔ اس لیے توجہ طلب امر یہ نہیں ہے کہ مالتھس نے بقار کے لیے صرف اشیائے خورد و نوش (زرعی پیداوار) کو ہی کیوں ضروری سمجھا۔ یہ جزو تو انسانی تہذیب و تمدن میں تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا جائے گا اور نئے نئے عناصر آتے اور جاتے رہیں گے بلکہ جو توجہ دینے والی بات ہے وہ یہ کہ انسانی تہذیب اپنی بقار کے لئے جو بھی چاہے وسائل ٹھہرا لے،

دیکھنا یہ ہے کہ انسانوں کی طلب سے ان کی نسبت توازنی رہتی ہے یا غیر توازنی۔ اس ضمن میں مغربی ممالک کی مثالیں سامنے رکھی جاتی ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ وہاں کے انسانوں نے سائنس و ٹکنالوجی اور تمدنی تبدیلیوں سے مالتھس کے نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے، یہ بات درست نہیں ہے۔ دراصل جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ مالتھس کے ہی نظریہ کی تائید کرتے ہیں اور اپنی ہی دلیلوں سے ٹھوس ثبوت پیش کرتے ہیں۔ آج مغربی ممالک میں ایشیائی ممالک کے بالمقابل، انسانوں اور ان کی بقا کے وسائل کے درمیان زیادہ بہتر اور صحت مند نسبت جو نظر آتی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ آبادی کی رفتار کی طرف سے منہ موڑ کر، ساری توجہ پیداوار کو بڑھانے، سماجی ڈھانچوں کو تبدیل کرنے، سماجی نظریات کو بدلنے اور زیادہ سے زیادہ سائنس و ٹکنالوجی کا سہارا لے کر آبادی کی بے لگام رفتار کو مات دینے پر لگا دی گئی ہو۔ بلکہ یہ نسبت توازنی کیفیت میں اس لیے نظر آتی ہے کہ وہاں کے عوام نے اپنے وسائل کے مقابلہ میں آبادی کو ہمیشہ احساس ذمہ داری کے ساتھ بڑھنے کی اجازت دی اور چوں کہ یہ احساس وہاں موجود ہے، اس لئے یہی احساس مالتھس کے نظریہ کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔

اسی طرح آبادی اور ترقی کے درمیان جس نسبت کی وضاحت مالتھس نے اپنے نظریہ آبادی میں کی ہے وہ کسی مخصوص معاشی و سماجی ڈھانچہ کو سامنے رکھ کر نہیں کی ہے اور نہ کسی قلیل مدت کے لیے کی ہے، بلکہ اس نے تو ایک ایسی ٹھوس بنیاد قائم کر دی ہے جس کو ہر بدلتے ہوئے معاشی و سماجی ڈھانچہ میں موزوں سمجھا جا سکتا ہے۔ آبادی اور انسانی برادری کے افلاس، غربت اور بے روزگاری کا مسئلہ ایک غیر توازنی نسبت کا مسئلہ ہے جس کا حل آبادی کی رفتار کو نظر انداز کرتے ہوئے محض پیداوار کو بڑھا کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک وقتی حل ہوگا، دائمی حل نہیں۔ ایشیائی ممالک کی غربت، افلاس اور بے روزگاری کی سنگین صورتِ حال، اسی غیر توازنی نسبت کو پیش کرتی ہے۔ ان ممالک کے سامنے جو مثبت حل ہے

وہ پیداوار کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں رکھنا ہے۔ آبادی کو قابو میں رکھنا افراد کے مجموعی احساس ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک نجی فیصلہ ہے جس کا مجموعی نتیجہ مناسب حد کی آبادی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اسی لیے مالتھس ہمیشہ رضاکارانہ امتناعی طریقے (Preventive Method) بالخصوص اخلاقی انضباط (Moral Restrains) پر زور دیتا ہے۔ لیکن اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر انسان نے ایسا نہ کیا تو پھر قدرتی نظام اپنے اقدامات سے خود غیر توازنی نسبت کو توازنی نسبت میں بدل دے گا۔ حکومت اس سلسلے میں عوام میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ، احساس ذمہ داری کو ابھار سکتی ہے لیکن ان حدود سے نکل کر اگر کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے، جس میں رضاکارانہ "جذبہ" فوت ہو جائے تو وہ یقیناً غیر صحت مند اور غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا۔

محمد نعیم صدیقی

# اکبر الہ آبادی اور سید سلیمان ندوی

میر اکبر حسین اکبر الہ آبادی ہماری زبان کے ان زندہ دل شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی دکان سخن میں متاع طنز و ظرافت راس المال کی حیثیت رکھتی ہے۔ لطف زبان، حسن بیان، ظرافت، خوش مذاقی اور صفائی و برجستگی ان کے ایوان شاعری کے ستون ہیں۔ ان کی ذہانت، حاضر جوابی اور طائر تخیل کی بلند پروازی نے بڑے حسین اور دلچسپ شعری پیکر تراشے ہیں۔ اکبر کی شاعری درحقیقت اس عہد کی تمدنی تاریخ کا ایک نگار خانہ ہے، جب ہندوستان میں مغربی تہذیب کی چمک دمک سے ہر نگاہ خیرہ ہو رہی تھی۔ اور عصری تعلیم کے بعض مضر اثرات سے نئی نسل دوچار تھی۔ اکبر نے اپنے خصوصی رنگ اور مزاحیہ اسلوب میں ان خطرات سے خبردار کرنے کی امکانی جد و جہد کی۔ یہ بلاشبہ درست ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم کے سیلاب بلاخیز کے سامنے اکبر سد سکندری قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انھوں نے آنے والی نسلوں کو اس سیلاب کی مضرتوں سے باخبر اور ہوشیار ضرور کر دیا اور بقول آل احمد سرور "اسی کی وجہ سے مغربیت کے خلاف رد عمل شروع ہوا[1]"

---

محمد نعیم صدیقی ندوی۔ ایم اے (عربی۔ اردو) [illegible] محلہ بدرقہ اعظم گڈھ

[1] تنقیدی اشارے ص ۹۲

اپنے اسی امتیاز اور مغربیت مخالف رجحان کے باعث اکبر کے ہم عصر مشاہیر اہل علم اور اکابر رجال ان سے دوستانہ مراسم قائم کرنا اپنے لیے مایۂ افتخار تصور کرتے تھے۔ اس عہد کے تقریباً تمام ہی قابل ذکر علما اور ممتاز اہل قلم سے اکبر کی بے تکلفانہ مراسلت تھی۔ چنانچہ علامہ شبلی سے ان کے تعلقات علی گڑھ کے ابتدائی زمانے ہی سے تھے اور دونوں میں بے حد اخلاص اور گہری مودت تھی، اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ شبلی کے انتقال کے بعد اکبر علامہ سید سلیمان ندوی کو جو خطوط لکھتے۔ ان میں شبلی کو "ہمارے پیارے دوست قدر افزا مکرم مرحوم" لکھا کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہماری شاعری کا مزا تو آپ کے استاذ مرحوم کے ساتھ اٹھ گیا۔"[1]

اکبر کے آرٹ میں قافیوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایسے ایسے قافیے ڈھونڈ کر لاتے تھے جو دوسرے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ ایک بار الہ آباد کے قیام کے دوران میں علامہ شبلی نے اکبر سے کہا: "میر صاحب میں آپ کی تلاش قافیہ کا جب قائل ہوں جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں" اکبر نے ہنس کر جواب دیا: "دیکھیے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں۔" بات ہنسی میں ختم ہو گئی۔ ایک دو روز کے بعد میر صاحب نے ۲۳ر نومبر ۱۹۰۷ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ علامہ مرحوم کے پاس بھیجا۔ جس میں لکھا تھا:

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی    دعوت ہے بھائی تمہاری شبلی
مل جائے یاں جو دال دلیا    سمجھنا تم اسے پلاؤ قلیا

علامہ شبلی نے اس کے جواب میں لکھا:

آج دعوت میں نہ آنے کا ہے مجھ کو بھی ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

---

[1] رقعات اکبر ص ۲۳

آپ کے لطف وکرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں[1]

مذکورہ بالا واقعہ سے جہاں دونوں مرحومین کے درمیان گہرے اخلاص اور تعلق کی عکاسی ہوتی ہے، وہیں اکبر کی قادر الکلامی، برجستہ گوئی اور جدت قوافی کا بھی پتہ چلتا ہے وہ غالباً اردو کے اولین شاعر ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ نئے قافیے اور نئی ردیفیں استعمال کی ہیں۔

اکبر علامہ شبلی سے اسی فرط عقیدت و مودت کے باعث ان کی علمی یادگار بلکہ خوابوں کی حسین تعبیر دار المصنفین کے بھی بڑے قدرداں اور علامہ مرحوم کے تلامذہ خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم سے خصوصی تعلق رکھتے تھے جس پر وہ خطوط شاہد ہیں جو اکبر نے سید صاحب کو کثیر تعداد میں لکھے ہیں۔ خطوطِ اکبر کا یہ انمول خزانہ کتب خانہ دار المصنفین کے نوادر میں شمار ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض خطوط رسالہ "معارف" ۱۹۶۴ء میں آثار ادبیہ کے تحت شائع ہو چکے ہیں اور کچھ رقعات اکبر مرتبہ محمد نصیر ہمایوں میں بھی شامل ہیں، لیکن اب بھی اس نادر ذخیرہ کے متعدد خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ سید صاحب سے اپنے تعلق کے بارے میں ۱۲ر فروری ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"آپ سے مجھ کو کیوں نہ دلی تعلق ہو۔ اولاً آپ میرے

---

[1] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۷۴

قدر افزا دوست مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد ہیں دوسرے
خود ایسے قابل اور سنجیدہ ہیں کہ آپ سے قطع نظر
مشکل ہے۔"

علامہ سید صاحب بھی اپنے استاد کے دوست کی حیثیت سے اکبر کا بڑا احترام کرتے تھے۔ جب بھی کسی تقریب سے الہ آباد جانا ہوتا تو ان کی زیارت ضرور کرتے تھے۔ سید صاحب جب وفد خلافت میں لندن گئے تھے تو اکبر نے ان کی شان میں یہ قطعہ کہا تھا:

سلیمان کی بات کیسی بنی ۔۔۔ کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے ۔۔۔ مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں ۔۔۔ خدا غیر سے ان کو کر دے غنی

وفد خلافت کے بعد جب لندن سے پیرس جانے کی خبر آئی تو یہ شعر کہا تھا:

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پر
مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر[1]

حضرت سید صاحب اکبر الہ آبادی کی مقصدی شاعری سے بھی بہت متاثر تھے اور باصرار فرمائش کر کے اکبر سے ان کا منتخب کلام طلب کرتے اور "معارف" میں بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ جب کلیات اکبر پہلی بار طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئی اور سید صاحب کے ملاحظہ سے گذری تو انہوں نے دلی تقاضے سے مجبور ہو کر اگست ۱۶ء کے "معارف" میں "اکبر کا ظریفانہ کلام" کے عنوان سے اس پر ایک طویل ریویو لکھا، جو سید صاحب کے حسن ادب و انشا اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا شاہکار ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب نے نہایت ژرف بینی اور دقت نظر کے ساتھ اکبر کی ظریفانہ شاعری کا کامیاب

---

[1] شاہ معین الدین احمد ندوی: حیات سلیمان ص ۴۶۵

تجزیہ کرتے ہوئے اس میں رعایت لفظی، جدت قافیہ، دعوائے مخاطب کی تشریح، ایہام، جدت تشبیہ واستعارہ، جدید محاورات وغیرہ کی نشاندہی کی ہے اور حسن انتخاب کے ساتھ اصل کلام سے اس کو مدلل و مزین کیا ہے۔

سید صاحب کے اسی مذکورۃ الصدر مضمون کے درج ذیل اقتباسات خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں۔ سید صاحب نے ایجاز و جامعیت کے کیسے کیسے نگینے جڑے ہیں اور الفاظ و معانی کی کیسی کیسی مینا کاری کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"میر اکبر حسین کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شاعری کا موضوع عام پر معنی اور سنجیدہ ظرافت ہے۔ ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست، قومیات، جس موضوع پر بھی جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس کا مغز سخن چاہے جو کچھ بھی ہو، لیکن اس کا قشر بالائی صرف سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے۔"

"اکبر کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند، موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مضامین اور اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے۔ سید انشا کے زمانے کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی۔ وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے۔ اب انگریزی سرکاری زبان ہے۔ میر صاحب اسی بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں۔"

"میر صاحب اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں جن کو یوں پینا اس جدید دور لطافت و تنو پسندی میں ناممکن تھا۔ میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام، امرار، حکام، مدعیان رہبری عام اور نوجوان تعلیم یافتوں کا مذاق اڑاتے ہیں

اور ان کے چھینٹوں پر میل تک نہیں آتا۔"

"میر اکبر کا اصل رنگ یہ ہے کہ جدید طرز معاشرت یورپین اخلاق وعادات، تعلیم جدید کے نقائص، مغربی تقلید کے معائب کو ظرافت کے پردے میں اس طرح نمایاں اور واضح کریں کہ مخاطب جھینپ کر خاموش ہو جائے اور اپنے فعل پر تھوڑی دیر کے لئے اس کے چہرے پر ندامت سے پسینہ آجائے۔"[1]

جب یہ ریویو اکبر کی نظر سے گذرا تو انھوں نے ایک خط میں اس پر اظہار سپاس کرتے ہوئے سید صاحب کو لکھا کہ :

"آپ کے طرز سخن سے جو آگاہ ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ نے میرے ناچیز کلام کی نسبت جو بعض ریمارک .... کئے تھے وہ میرے لئے باعث فخر ہیں .... میری خرافات نے مجلس علماء وفقہاء سے داد پائی۔ اس کو اپنی خرافات کا ارتقاء سمجھتا ہوں۔"

خطوط اکبر بنام سید سلیمان ندوی کا جو نادر سرمایہ کتب خانہ دارالمصنفین میں محفوظ ہے اس کا مطالعہ کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان میں وہ چاشنی کم تر ملتی ہے جس کی وجہ سے اکبر کا سارا کلام زعفران زار ہے۔ بیشتر خطوط میں اپنی گوناگوں پریشانیوں، آلام پیری، اور بیزاری حیات کا ذکر ہے لیکن بایں ہمہ اکبر کی دلچسپ شخصیت اور اس کی رنگا رنگی ہر خط کی آڑ سے صاف جھانکتی نظر آتی ہے۔ ان خطوط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر صرف ایک قادر الکلام سخن گو ہی نہ تھے بلکہ نثر نگاری کے نوک پلک سے بھی واقف تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی نثر میں وہ شگفتگی اور سلاست نسبتہً بہت کم ہے جو ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے لیکن جب غالب کے روایتی انداز اور خصوصی طرز کے بے تکلف اور برجستہ جملے ان کے قلم سے تراوش

---

[1] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۱۷۹۔

کرتے ہیں تو حسن انشاء کی چاندنی سی بکھر جاتی ہے، ان خطوط سے اکبر کی سخن سنجی اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

دستیاب ذخیرۂ مکاتیب میں سید صاحب کے نام اکبر کا قدیم ترین خط ۵ار فروری ۱۹۱۵ء کا ملتا ہے۔ یقیناً مراسلت کا سلسلہ اس سے پہلے قائم ہو چکا ہوگا لیکن وہ خطوط دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اکبر الہ آبادی علامہ سید صاحب سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ جب سید سلیمان ندوی کے آفتاب حیات کی عین دوپہر تھی اکبر کی شب زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ مسلسل عوارض جسمانی اور پیہم مصائب کی وجہ سے ان کی طبیعت میں بیحد افسردگی اور مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ تقریباً ہر خط میں نشاط زندگی کے فقدان اور آلام حیات کا شکوہ اور اپنے چراغ سحری ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ ۲۶ر اپریل ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ کو بہت افسوس ہے کہ تعمیل ارشاد میں قاصر رہا، بات یہ ہے کہ بہ سبب امراض و آلام و انقلابات حالات کے طبیعت بے حد افسردہ رہتی ہے کہ لکھنے پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

اسی طرح ۲۵ر جون ۱۹۱۵ء کے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:

"آپ ابھی کم عمر ہیں۔ بہت ڈیوٹی باقی ہے۔ دولت ناشدہ ختم است و من آخر شدہ ام۔ اس خیال سے کسی قدر تسکین ہوتی ہے کہ آپ ایسے ارباب بصیرت ابھی حلقۂ مکتب میں موجود ہیں۔"

۱۳ر جون ۱۹۱۷ء کے خط میں:

"آپ تو ابھی کم عمر ہیں۔ دنیا میں بہت کچھ کرنا باقی ہے اور کام کرنے کی قابلیت بھی ہے۔ بے مثل قابلیت۔"

اکبر اپنے خطوط میں سید صاحب کو مختلف القاب مثلاً کبھی عزیز مکرم، کبھی جناب من، کبھی حبیبی و مکرمی، کبھی ڈیر فرینڈ، کبھی میرے مکرم اور کبھی قدر افزائے اکبر سے خطاب کرتے

تھے۔ اور پھر ان سب کے ساتھ "سلمہ اللہ تعالیٰ" ایک لازمی اور مشترک جز وکی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح خاتمہ خط پر نیاز مند، خاکسار اور "دعائے خیر کا امیدوار اکبر" کے الفاظ لکھتے تھے۔ عمر کے بیچ تفاوت کے باوجود ان القاب سے جہاں اکبر کی فطری شرافت نفس مثالی انکسار و تواضع، بلندی کردار و اخلاق اور عالی ظرفی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہیں علامہ سید صاحب کی علمی بلندی اور شہرت عام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جبکہ دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان طویل مراسلت کے باوجود ملاقات کی نوبت ۱۹۲۱ء کے اواخر میں اس وقت آسکی جب اکبر نے سید صاحب کو ۱۸ مئی ۱۹۲۱ء کے خط میں لکھا:

"میں نے ایک نیاز نامے میں عرض کیا ہے کہ آپ سے ملنے
کا نہایت مشتاق ہوں، لیکن خدا جانے یہ آرزو کب
پوری ہو۔ میری حالت یہ ہے کہ زندہ ہوں لیکن نشاطِ
زندگی باقی نہیں۔"

اور پھر اس کے نتیجہ میں غالباً جولائی یا اگست میں دونوں ایک دوسرے کے دیدار سے دلشاد ہوئے۔ اکبر کو سید صاحب سے مل کر جو مسرت حاصل ہوئی اس کا اندازہ ایک خط کی درج ذیل سطور سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ مجھ سے ملنے تشریف لائے۔
مجھکو تو اس تشریف آوری کی یادگار قائم کرنا تھی لیکن
تواضع و تکریم بھی کما حقہٗ نہیں کر سکا۔ وقت نہ تھا یہ مسرت
ہوئی کہ بعض امور میں آپ میرے ہم خیال ہیں۔"

اہل نظر واقف ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی جس طرح بحر علم و تحقیق کے کامیاب شناور اور جامع و متنوع کمالات شخصیت کے حامل تھے۔ اسی طرح ان کا ذوق شعر و سخن بھی نہایت

معیاری تھا، گو انھوں نے کبھی اس کو نہ تو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا اور نہ کبھی نام و نمود کا ذریعہ ہی بنایا، بلکہ محض واردات قلبی شعری پیکر میں ڈھل جاتے تھے۔" ان کی شاعری ہم کو سیاست سے بھی ہمکنار نظر آتی ہے اور تاریخ کا گہوارہ بھی، اصلاحِ قوم کا ذریعہ بھی نظر آتی ہے اور خدا و رسول سے محبت و عقیدت مندی کی آئینہ دار بھی۔[1]" یقیناً سید صاحب کے گوناگوں علمی و تصنیفی کارناموں نے ان کی اس حیثیت پر دبیز پردے ڈال دیئے، لیکن جہاں تک ان کی شاعرانہ صلاحیت اور اس میں پختگی و فکر کی بلندی کا سوال ہے، اکبر الہ آبادی شروع ہی سے اس کے معترف تھے۔ چنانچہ اپنے متعدد خطوط میں انھوں نے نہایت کشادہ قلبی اور فیاضی طبع کے ساتھ سید صاحب کو اپنے پسندیدہ اشعار کی داد دی ہے۔ ۷ر اپریل ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں آپ کی مدح میں مبالغہ نہ کروں گا کہ آپ کو تصنیفِ شعر کی زحمت ہو۔ (آپ کا شعر خوب ہے) یہی کہوں گا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ اسی سبب سے آپ کا مشتاق رہا کرتا ہوں کہ کچھ سیکھوں

زخود بہترے جوئے و فرصت شمار
کہ باچوں خودے گم کنی روزگار

کبھی کبھی دو چار شعر کہہ لیا کیجئے۔ آپ کو نظم سخن میں سلیقہ خاص ہے کبھی ملئے تو مفصل سنئے گا۔"

جب اپریل ۱۹۱۷ء میں سید صاحب کی رفیقۂ حیات نے داغِ مفارقت دیا تو مرحومہ کی یاد میں سید صاحب نے اپنے محسوسات قلبی ایک غزل میں ظاہر کیے۔ اس کی اشاعت پر اکبر اپنے ۲۲ر مئی ۱۹۱۷ء کے مکتوب میں رقمطراز ہیں:

"آپ کے اشعار نے میرے داغ دل ہرے کر دیئے۔ ہرے تو رہتے ہی

---

[1] عبدالقوی دسنوی: سات تحریریں ص ۷۵

ہیں۔ یہ کھڑے لہو لہان کر دیئے۔ جوش غم نے آپ سے ایسے مصرعے کہلا دیئے

ط شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا
ط وہ گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

ورنہ صرف علمی قابلیت اور قوت قافیہ پیمائی کافی نہیں۔"

اسی طرح سید صاحب کی ایک اور غزل کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کے اشعار نے جن کے معنی بحر حقیقت میں ڈوبے ہوئے ہیں، مجھ کو آپ کا زیادہ مشتاق کر دیا۔"

۱۱؍ مئی ۱۹۱۸ء کا مکتوب ملاحظہ فرمائیں:

"آپ کی غزل کے ایک شعر نے مجھکو اپنے دو شعر یاد دلائے جن کو میں نے فریاد مجنونانہ اور جذبات غم کی انتہا کے ذیل میں لکھ لیا تھا۔

جس سے مری زندگی تھی مر گیا کیوں مر سکا
چرخ نے مجھ پر ستم یارب کیا کیوں کر سکا
واقعات جانگزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع
کیوں نہ مری آہ سے قانون فطرت ڈر سکا"

سید صاحب نے اپنے محبوب استاذ علامہ شبلی کے حادثۂ وفات پر جو دلدوز نوحہ لکھا تھا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکبر اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں:

"نظم پہونچی۔ نہ صرف آپ کی قابلیت کی شاہد ہے بلکہ آپ کا دلی جوش ظاہر ہوتا اور دل پر اثر پڑتا ہے۔

مرکزِ امید تھا جب وہی جاتا رہا الخ
اب پرِ پرواز معنی کون بخشے گا مجھے الخ
کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن الخ
کون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوئے قلم الخ

کیا لاجواب شعر ہیں، معنی اور الفاظ دونوں لحاظ سے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سکونِ خاطر عطا فرمائے۔"

۷ر جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں اس طرح داد دیتے ہیں:

"حضرت ماجد کی شادی کی آپ نے لاجواب تاریخیں کہی ہیں۔ داد دیتا ہوں۔ اگرچہ آپ اس سے مستغنی ہیں۔"

اسی طرح ۴ر اگست ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ میں شاعرانہ جوہر اس سے زیادہ معلوم ہوتا ہے جس کی جھلک آپ کے چند اشعار میں دیکھی۔ یہ زمانہ ہماری شاعری کے لئے مساعد نہیں۔"

اس کے علاوہ خطوطِ اکبر بنام سید سلیمان ندوی کے مطالعہ سے تصوف کے بعض مسائل کے بارے میں اکبر کے مخصوص نظریات و میلانات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ معلوم ہے کہ اکبر صوفی مشرب بلکہ پکے صوفی تھے۔ چنانچہ جو بھی تصوف کی مخالفت کرتا، اکبر اس سے ضرور نبرد آزما ہوتے۔ وہ علامہ اقبال کے فلسفۂ اسرارِ خودی اور بے خودی سے بھی سخت ناراض تھے۔ ایک زمانے میں اسی باعث دونوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ کیونکہ اقبال مروجہ تصوف کے مخالف تھے، گو بعد میں دونوں کے درمیان کسی طرح غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا تھا۔

آزادیٔ نسواں اور عورتوں کی تعلیم و ترقی کے بارے میں اکبر الہ آبادی اور علامہ سید صاحب حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے کے ہم خیال اور ہم آہنگ تھے۔ ایک زمانہ میں حضرت

سید صاحب نے رسالہ "معارف" کے شذرات میں آزادی نسواں کے متعلق مسلسل اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جب یہ تحریریں اکبر کے ملاحظہ سے گذریں تو انھوں نے اپنے ۱۰ ار اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط میں سید صاحب کو لکھا:

"آپ کی تحریروں کو پڑھکر یہ اشعار کہے تھے:

ادھر جوانوں کو ہے یہ سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں
ادھر خواتین خلوت آرا ہنوز مست اپنی موج میں ہیں
مگر یہ قید حرم کہاں تک، حجاب کے دن نقاب کب تک
کہ گبرو ترسا کی لیڈیاں اب شریک واعظ کی فوج میں ہیں"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں رقمطراز ہیں:

"اخبار تہذیب نسواں لاہور نے میری پردے کی چند نظموں کو لے کر شکایت چھاپی ہے کہ میں متعصب اور سخت ہوں۔ ترقی نسواں کا مخالف ہوں یہ مضمون ایک بیگم صاحبہ کا ہے یا ان کے نام سے ہے۔

اب تو آپ کو میرے اس شعر کا زیادہ لطف ملے گا اور آپ مجھ کو اس کی زیادہ داد دیں گے جو شاید دو مہینے پیشتر میری زبان سے نکلا اور آپ نے نوٹ کر لیا تھا۔

غریب اکبر نے بحث پردہ کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہکر کہ کر ہی لے گا مرا موا کیا

تہذیب نسواں تو بظاہر پردے کا ہنوز مخالف نہیں، پھر معلوم نہیں وہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے تو لکھدیا ہے کہ برادرم شاعرانہ قافیہ بندیاں تو چلی ہی جائیں گی۔ لیکن دنیا کا انتظام زمانہ کی حالت کے ساتھ ہیں۔ میرے اشعار انقلاب روکنے کے لئے نہیں بلکہ یادگار انقلاب ہیں ۔۔۔۔ تعلیم کا مخالف

میں کیوں ہونے لگا ؎

نظمِ اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب

یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

میرا ایک قطعہ "مشرق" نے نہایت پسند کیا تھا جس کا آخری شعر یہ ہے:

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم

قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

لوگ بھی غضب کرتے ہیں۔ شعر کی شوخی اور لطافت کی داد دینا چاہیئے نہ کہ لکچر سمجھ کر بحث کو اٹھ کھڑا ہونا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اب عورتوں کی طرف سے نوٹس ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ، ہم خود اٹھتے ہیں۔"

راقم سطور نے گذشتہ صفحات میں سید صاحب کے نام اکبر کے خطوط کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں، وہ سب کتب خانہ دار المصنفین کے ذخیرہ نوادر میں محفوظ اور مکمل مکاتیب سے ماخوذ ہیں۔ ان میں سے بعض اہم خط تاہنوز غیر مطبوعہ ہیں اس لئے پیش نظر مضمون میں ان کی پہلی بار اشاعت کی اہمیت مسلّم ہے۔ میرا خیال ہے کہ خطوط اکبر کے مذکورہ بالا اقتباسات یہ اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی اور اکبر الہ آبادی میں کس غایت درجہ کا مخلصانہ اور عمیق تعلق قلبی تھا۔ نیز ان مکاتیب سے اکبر کے سوانح نگار کو بہت قیمتی مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عبد الرحیم دہلوی نے ان ہی خطوط کی بنیاد پر "اکبر کے شب و روز" کے نام سے ایک سوانحی ڈائری مرتب کر دی ہے جو حیات اکبر کے مستند ترین مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ اکبر کے نام علامہ سید صاحب کے مکاتیب محفوظ نہیں ہیں، ورنہ علم و ادب کے ان دو مایۂ آبدار سے مرحومین کے تعلق اور ان کی حیات کے مزید گوشے منور ہو سکتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کے حادثۂ انتقال پر سید صاحب نے معارف ستمبر ۲۱ء کے شذرات میں "غمِ اکبر" کے عنوان سے جو مجلس ماتم برپا کی تھی، ذیل میں ہم اس کو نقل کر کے اپنا یہ مضمون ختم کرتے ہیں:

"محرم ۱۳۴۰ھ میں ہماری زبان کا زندہ دل شاعر اس دنیا سے چل بسا۔ اس گلستان نا خزاں آباد کی بہتّر بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھیں۔ وہ اس وقت عالم وجود میں آیا تھا جب ہندوستان انقلاب کی کروٹیں لے رہا تھا، اس لئے لامحالہ اس کی زبان سے وہی نالے بلند ہوئے جو قوموں کے انقلاب اور ملکوں کے تغیرات کی خبر دیتے ہیں۔ اس کے ضخیم دیوان کے اوراق ہماری سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، تخیلی اور تعلیمی انقلابات کی تاریخ ہے۔ آئندہ نسلیں اس کے اوراق کو پڑھیں گی اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی۔ اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ گذرا جس کو اپنے کاشانہ خیال میں اس نے جگہ نہ دی۔ زبان خلق نے اس کو لسان العصر کا خطاب دیا اور اس سے بہتر لقب اس کے لئے دوسرا ہو نہیں سکتا تھا۔ اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں۔ وہ فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی اور زندہ دل شاعر تھا۔ اس کا نمک ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز چرکا لگاتا ہو۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں مرہم تھا۔ سرسید کے زمانے سے لے کر اب تک تمام ہندوستانی تمدن جدید کے حسن منظر پر والہ و شیدا تھا۔ لیکن صرف ایک اکبر کی زبان تھی جو برملا اس کے عیوب و نقائص واشگاف کرتی رہتی تھی۔

وہ مکروہات عالم سے آزردہ اور حیات دنیا سے بے زار تھا۔ اشعار کے علاوہ اس کا شاید ہی کوئی خط اس بیان سے خالی ہو۔ وہ اکثر اپنے خطوط میں مجھے لکھا کرتے تھے

اولت نا شدہ ختم است و من آخر شدہ ام

آخر اس شکوہ سنج حیات کی حیات بھی آخر ہوگئی۔

مرحوم کو سب سے پہلے میں نے شاید ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں استاذ[1] مرحوم کے پاس دیکھا تھا۔ دبلا پتلا بدن، چہرہ پر جھریاں، گال سکڑے ہوئے، چشم گریاں مگر دل خنداں، اس کے بعد لکھنؤ اور الہ آباد میں بار بار ملاقاتیں ہوئیں۔ جیسے جیسے ملتا گیا، ہنسوڑ شاعر کے بجائے دانائے فطرت حکیم کے رنگ میں وہ مجھ پر ظاہر ہوتا گیا۔ ایک دفعہ ایک خط میں مجھے لکھا تھا۔

اپنے غم خانہ کا دروازہ کرو بند اکبر
اب نہیں کوئی سوا موت کا آنے والا

اب اس کے غم خانہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اور وہ موت جس کے آنے کی وہ راہ دیکھا کرتا تھا آگئی۔

بوڑھے اکبر! مبارک ہو کہ تیرے دل کی مراد پوری ہوئی اور تجھے مسرت جاوید نصیب ہوئی —"

یہ اثر انگیز نوحہ اور منثور مرثیہ اپنے گوناگوں ظاہری و معنوی محاسن اور سوانحی و تنقیدی اہمیت کی بجائے خود ایک جیتی جاگتی بلکہ بولتی تصویر ہے۔ اس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

---

[1] علامہ شبلی نعمانی

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی

# ہندوستان کے عربی مدارس کا نظام تعلیم

## (ایک جائزہ)

ابتدائے اسلام میں تعلیم کے لئے علٰحدہ مدرسے نہیں تھے، عموماً مسجدوں ہی میں ضروری باتیں بتادی جاتی تھیں، عرب میں اس زمانہ میں زیادہ لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس جانب توجہ دلائی اور خاص طور پر لکھنے کی ترغیب دی۔ آپ کی توجہ سے صحابہ نے بقدر ضرورت لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ پڑھنے کے لئے نہ بہت سے علوم تھے نہ کتابیں بس قرآن مجید ہی توجہ کا مرکز تھا، جتنا قرآن مجید نازل ہوتا آپ صحابہ کو سناتے اور ذہن نشین کراتے اور جو لوگ لکھ سکتے تھے ان کو لکھا بھی دیتے تھے۔ جو لوگ پہلے اسلام لاچکے تھے وہ بعد کو مسلمان ہونے والوں کو پچھلی آیتیں یاد کراتے اور سمجھاتے۔ قرآن مجید کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسب ضرورت اخلاق و آداب کی تعلیم دیتے، عبادات کے طریقے بتاتے اور معاملات کے قاعدے سکھاتے۔ آپ کی مجلس میں لوگ شریک ہوتے اور وہیں ضروری مسائل سیکھ لیتے، بس تعلیم کا یہی سیدھا سادا طریقہ تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس تعلیمی نظام میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور سنت نبوی کی تعلیم کے لئے زیادہ بڑے پیمانہ پر انتظام کیا گیا۔ بیت المال

---

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ریڈر شعبۂ اسلامک، عرب ایرانین اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ نئی دہلی۔ ۲۵

سے معلموں کو وظائف دیئے جاتے تھے تاکہ وہ بے فکر ہو کر لڑکوں اور بڑوں کو تعلیم دیں خلفائے راشدین ہی کے زمانہ میں صحابہ کرام مدینہ سے نکل کر دور دراز کے شہروں میں پھیل گئے تھے اور ہر جگہ ان کے تعلیمی مرکز بن گئے تھے بنی امیہ کے عہد میں قرآن وحدیث اور مسائل فقہ کے علاوہ ادب، تاریخ اور انساب کی تعلیم کا بھی انتظام ہوا۔ عربی زبان کے قواعد بھی مرتب ہونے لگے تاکہ ان کے ذریعہ غیر عرب عربی زبان صحت کے ساتھ پڑھ لکھ سکیں۔ شعر وشاعری نے جس کا رواج اسلام کے ابتدائی دور میں کم ہو گیا تھا اس عہد میں خاصی ترقی کی۔ خطابت موسیقی اور اس قسم کے دوسرے فنون کا بھی رواج ہوا۔ اس وقت تک فلسفہ اور دوسرے عقلی علوم بہت باقاعدہ تو نہیں بن پائے تھے مگر ان کی بھی ابتدا ہو گئی تھی اور دین کی سادگی پر عقل کا سایہ پڑنے لگا تھا۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو ان کے ساتھ دینی اور عقلی علوم کے ماہرین بھی آئے اور قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ، منطق، طب، ریاضی اور شعر وادب کی تعلیم درسگاہوں میں ہونے لگی۔ اس وقت دینی ودنیوی تعلیم کی دو قسمیں نہ تھیں اور نظام تعلیم ثنویت سے ناآشنا تھا۔ درسگاہوں میں حالات اور ضروریات کے مطابق سبھی علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ پھر حالات وضروریات، مشاغل اور پیشوں کے تقاضوں کے مطابق ہر شخص کسی علم وفن میں خصوصی مہارت حاصل کرتا تھا اور واعظین، دینیات کے ماہرین، قضاۃ، وزراء، امراء، حکام اور فوجوں کے سربراہ سب ایک ہی قسم کا جامع نصاب پڑھتے تھے اور پھر جس مشغلہ کو اختیار کرتے اس کی خصوصی تربیت حاصل کر لیتے تھے۔ غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، پٹھانوں۔ اور مغلوں سب کے زمانہ میں یہی حال رہا۔ نصابی کتابوں میں وقتاً فوقتاً کچھ ردوبدل ہو جاتا تھا مگر ان کا امتزاج تقریباً اسی طرح رہتا تھا۔ اس زمانے میں عام طور پر مدرسوں میں جن علوم کی تعلیم ہوتی تھی ان کی تفصیل یہ ہے: صرف ونحو، فقہ واصول، تفسیر وحدیث، ادب وبلاغت، منطق و فلسفہ، ریاضی وہندسہ اور مناظرہ وکلام، فضیلت کا معیار زمانے کے اعتبار سے بدلتا رہتا تھا۔ کسی زمانے میں تفسیر وحدیث کی مہارت ضروری سمجھی گئی، کسی زمانے میں فقہ کی اور کسی زمانے

میں منطق اور کلام کی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس دور میں جس علم کی اہمیت رہی ہے علمائے کرام نے عام طور سے اسی میں زیادہ کام کیا، مثلاً ایک دور میں فقہ کی زیادہ اہمیت تھی اس لیے علماء نے اس زمانے میں اس کی طرف زیادہ توجہ کی اور بہت سے فقہی مباحث زیر بحث لائے۔ ایک دور میں منطق، فلسفہ اور حکمت کا زور تھا، اس زمانے میں یہ علوم درسیات کا اہم حصہ تھے۔ پھر حدیث اور اصول حدیث کو فروغ ہوا تو اس موضوع پر بہت کام کیا گیا۔

ایک زمانے تک اس قسم کا نصاب تعلیم رائج رہا، پھر لوگوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اس تعلیمی ڈھانچے میں کچھ ایسی تبدیلی کی جائے کہ قدیم اور بعض غیر ضروری علوم کی جگہ نئے اور ضروری علوم شامل درس کیے جا سکیں، اور مطالعہ محض کتابی نہ ہو بلکہ اس سے فکر و نظر اور صلاحیت و استعداد میں بھی اضافہ ہو۔ اس سلسلے میں ملا نظام الدین سہالوی کی ذات ناقابل فراموش ہے، مدارس و نصاب تعلیم کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے زمانے کے حالات کا جائزہ لیا اور ایک ایسا جامع نصاب بنایا جس سے اس زمانے کی تمام ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ ان کا بنایا ہوا نصاب بہت مقبول ہوا اور آج تک درس نظامی کے نام سے بیشتر مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے درس نظامی ایک زمانے میں ملکی اور مذہبی تمام ضرورتیں پوری کرتا تھا، لیکن جب انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی اور جدید علوم و فنون نے افکار و خیالات میں تلاطم پیدا کر دیا، ایجادات و اختراعات اور سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا اور نئے فلسفہ و حکمت نے پرانے افکار و خیالات کی بنیادیں ہلا دیں، تہذیب و تمدن کا معیار بدل گیا، معیشت و معاشرت نے نیا رنگ اختیار کیا۔ ان حالات میں قدیم علوم و فنون بیکار نظر آنے لگے اور قدم قدم پر ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اب نصاب اور نظام تعلیم میں غیر معمولی رد و بدل ضروری ہے۔ چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینی تھی اس لیے عام طور پر مسلمانوں کو ان سے ہی نہیں بلکہ ان کے لائے ہوئے

علوم وفنون اور ان کی زبان وتہذیب سے بھی نفرت تھی۔ اس شدید نفرت کی وجہ سے عہد قول کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ انھیں اس نئے ماحول کی جانب توجہ دلائے، لیکن چونکہ دنیا کے حالات بدل چکے تھے، زمانہ غیر معمولی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ نئے نئے علوم وفنون مغربی ممالک میں پھیل رہے تھے۔ اس وقت دنیا میں ترقی کرنے، زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے، وقت کی ضرورتوں کا اندازہ کرنے اور زندگی کے میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بڑی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں دین و دنیا کے کسی شعبے میں قدیم نظام تعلیم کارآمد نہ رہا اور نئے علوم وفنون کو اختیار کئے بغیر قوم کی حالت روز بروز پست ہوتی جارہی، اس قومی زبوں حالی کو دیکھ کر سرسید اور ان کے رفقا نے ہر قسم کی لعنت وملامت اور سب وشتم گوارا کرکے جدید تعلیم کے رواج کی کوشش کی۔

سرسید ۱۸۵۷ء کے غدر کے خونچکاں حالات سے خود دوچار ہوئے تھے، انھوں نے اس سے پہلے مسلمانوں کی علمی اور سماجی برتری دیکھی تھی، اس کے بعد ان کی زبوں حالی کا بھی مشاہدہ کیا۔ سرسید کی نظر مسلمانوں کے حال ہی پر نہیں، ان کے مستقبل پر بھی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان سنجیدگی اور دیانتداری کے ساتھ موجودہ حالات کی روشنی میں اپنی علمی، مذہبی اور سماجی زندگی کا جائزہ لیں اور پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ عمل اختیار کریں۔ سرسید ایک حقیقت پسند انسان تھے، وہ غدر کی ناکامی دیکھ چکے تھے، وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انگریزوں کے قدم اب ہندستان میں جم چکے ہیں اور دوسری قومیں ان کا قرب حاصل کرکے اور ان کے علوم وفنون سیکھ کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ زمانے کا تقاضا تھا کہ مسلمان بھی اس تغیر اور اس کے دوررس نتائج کو سمجھیں، اپنے حالات کا جائزہ لیں اور اپنے اعلیٰ مذہبی عقائد واعمال اور بلند اخلاق وکردار کے تحفظ کے ساتھ زندگی کے میدان میں قدم رکھیں، جاہ وعزت اور قدر ومنزلت کے حصول کے لئے انگریزوں کے قریب آئیں، ان کی تہذیب ومعاشرت سے واقفیت حاصل کریں، ان کے علوم وفنون کو سیکھیں اور جو چیزیں ان کے کام کی ہوں ان سے فائدہ اٹھائیں۔

بالآخر سرسید اور ان کے ہمنواؤں کی کوششوں سے حقائق لوگوں کے سامنے آئے اور مغربی علوم وفنون کی تعلیم رائج ہوگئی۔ مغربی علوم وفنون کے رواج کے ساتھ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے فکر کے سانچے بدلے اور پرانے طرز کے عالموں اور واعظوں سے ان کی تشفی نہ ہوسکی۔ اختلاف کی خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہونے لگی تو روشن ضمیر اور معاملہ فہم علماء کو خیال پیدا ہوا کہ درس نظامی میں زمانے کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی مونگیری، مولانا لطف اللہ علی گڈھی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی اور ان کے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا علمی اور مذہبی حلقوں میں بڑا اثر تھا، ان لوگوں نے حالات کی رفتار کو محسوس کر کے لوگوں کو اسلامی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم میں تبدیلی کی دعوت دی، مدارس کے سربراہوں کو اس ضرورت کا احساس دلایا اور کوشش کی کہ سارے نصاب پر نظر ثانی کی جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ قدیم فلسفہ ومنطق کے بجائے کتاب وسنت کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے، لیکن آگے چل کر یہ خیال ہوا کہ مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم کی اصلاح کی ان کوششوں کو مجتمع کیا جائے، چنانچہ مولانا محمد علی مونگیری کی سرکردگی میں ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی بنیاد پڑی۔ یہ انجمن رفتہ رفتہ جدید وقدیم کے تمام مکاتب فکر کا مرکز بن گئی۔ مولانا شبلی نعمانی جن کو سرسید کے ساتھ علی گڈھ میں برسوں کام کا موقع ملا تھا اور قدیم علوم میں مہارت کے ساتھ جدید زمانے کے حالات اور مغربی افکار کا بھی اندازہ تھا، وہ بھی اس انجمن میں پوری دلچسپی کے ساتھ شریک ہوئے اور اپنی ان تھک کوشش سے مشکلات وموانع کے باوجود انھوں نے ندوہ کو جدید وقدیم علوم کا سنگم دیا۔

لیکن زمانہ جتنی تیزی سے آگے بڑھا اتنی تیزی سے ندوہ کی تحریک آگے نہ بڑھ سکی، اس تحریک میں شروع سے مختلف مکاتب فکر اور مختلف مسلک کے لوگ شریک تھے، ملی انتشار میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے یہ طرز عمل مفید تھا، اس سے مختلف نقطہ ہائے خیال رکھنے والے اشخاص کے لئے مل بیٹھنے اور آپس میں تبادلۂ خیال کا موقع ضرور ملا، ایک دوسرے کے

قریب آنے کی وجہ سے باہمی اختلافات بھی کم ہوئے اور غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کچھ نہ کچھ ہوا، مگر مختلف الخیال اشخاص اور جماعتوں کو ملا کر ایک ساتھ لے چلنے میں رواداری اور ایثار سے کام لینا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے یکسو ہو کر تیزی سے اصلاح حال کی جدوجہد نہیں کی جا سکتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ندوہ کی تحریک حالات اور ضروریات کے مطابق تیز قدم نہ اٹھا سکی اور زمانے کے تقاضوں کو کما حقہ پورا نہ کر سکی۔ اس کے دار العلوم نے عربی اور دینیات کے پرانے نصاب میں کافی تبدیلیاں کیں، انگریزی زبان اور جدید علوم بھی ایک حد تک شامل کئے، لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، افکار و خیالات، علوم وفنون، تہذیب و تمدن اور معیشت و معاشرت میں بہت تبدیلی آچکی ہے، ان حالات میں ندوہ کی اصلاحی تحریک کو جہاں تک آگے بڑھنا چاہیئے تھا وہاں تک ابھی نہیں پہونچ سکی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا، ملک کی ترقی کے منصوبے بنے اور فکر و خیال کے نئے پہلو سامنے آئے تو عربی مدارس کے نصاب میں مزید تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھنؤ میں علماء کا ایک اجتماع کیا اور انھیں اس جانب توجہ دلائی، لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا، مگر رفتہ رفتہ معاشی دباؤ نے طلباء کو سرکاری امتحانات کا خیال دلایا اور منتظمین مدارس کو سرکاری امداد حاصل کرنے کی غرض سے نئے سرکاری نصاب کو اختیار کرنا پڑا۔ اس طرح قدیم مدرسوں میں جدید آوازیں پہونچنے لگیں مگر چونکہ یہ تغیر ذہن کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مصلحت کی بنا پر ہے اس لئے اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ زمانہ بڑا تیز رفتار ہے، اس کا ساتھ دینے کے لئے جزوی تبدیلیاں کافی نہیں ہیں بلکہ بڑے انقلابی اقدام کی ضرورت ہے، اب صرف چند کتابوں کی الٹ پھیر یا جدید علوم کے مبادیات کے شامل درس کرنے اور انگریزی ہندی کو کسی حد تک نصاب میں جگہ دینے سے کام نہیں چلے گا، ملک میں انقلاب بڑی تیزی سے آرہا ہے، اس وقت کسی ایک گوشے میں ردوبدل نہیں ہو رہا ہے بلکہ زندگی کے تمام پہلو اس سے متاثر

ہو رہے ہیں، انقلاب کی تیز رفتاری کا احساس تو کچھ نہ کچھ سب کو ہے مگر مذہبی اقدار کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا خیال ابھی بہت تھوڑے لوگوں کے دلوں میں آرہا ہے، اقبال نے کہا تھا ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہی منزل اب ہم سب کے سامنے آگئی ہے، زمانے کی گاڑی تیز رفتاری سے چل رہی ہے اور ہم سب کو اپنے ساتھ گھسیٹ رہی ہے۔ ہم نہ اس گاڑی کو روک سکتے ہیں نہ اس سے اپنے کو الگ کر سکتے ہیں، اس وقت اپنے کو سفر کے لائق بنائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ جو لوگ اب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں یا گریز کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں اب ان کے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔ حالات ہمارا انتظار زیادہ نہیں کر سکتے، کسی زمانہ میں عربی مدارس اسلام کے قلعے سمجھے جاتے تھے، غدر کے بعد اس قلعہ بندی نے مدافعت ملی میں بڑی مدد دی، مگر ہوائی جہازوں کے دور میں یہ قلعے زیادہ سود مند نہیں ہو سکتے، اب عصر حاضر کے حالات کے مطابق ان مدارس کو جدید ساز و سامان سے مسلح ہونا پڑے گا، اس کے بغیر ملت کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ جب بھی عربی مدارس میں جدید تعلیم کا ذکر آتا ہے اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم۔ مختلف مواقع پر علماء پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ انگریزی نہیں جانتے اس لئے علوم جدیدہ سے ناواقف ہیں، حالانکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ بات درست نہیں ہے، علوم جدیدہ الگ ہیں اور انگریزی الگ، ضروری نہیں ہے کہ علوم جدیدہ صرف انگریزی ہی کے ذریعہ سے سیکھے جائیں، اس کے لئے دوسری زبانوں کا بھی استعمال ہو سکتا ہے، بہر حال یہ الگ بحث ہے، میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ علماء پر یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے۔ جب بھی تجدد اصلاح کا نعرہ لگا ہے علماء کی ایک بڑی تعداد

نے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی تائید کی ہے اور کبھی کبھی یہ اصلاحی نعرے علماء ہی کی طرف سے شروع بھی ہوئے۔ اس وقت بھی جہاں تک میرا خیال ہے علماء کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ اپنے کو حالات کے مطابق ڈھال لیں، مگر ان کی ایک مشکل ہے جس کی طرف پچھلے دنوں جامعہ میں ہونے والے سیمینار "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ" میں ایک فاضل مندوب نے اشارہ بھی کیا تھا کہ ان کو دو عدالتوں میں جواب دینا ہوتا ہے، ایک تو دنیا میں عوام کے سامنے اور دوسرے خدا کی عدالت میں، اس لئے ان کی پوزیشن ذرا نازک ہے اور خاص طور سے جب معاملہ تجدد کا ہو تو وہ ذرا زیادہ ہی محتاط ہو جاتے ہیں اور یہی احتیاط رفتار کو سست کر دیتی ہے۔

عربی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ دینی اور فنی علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تمام دنیاوی امور کی تعلیم وہاں رائج نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ ان کے اپنے نصابی مضامین اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ یہ بات ممکن نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی ایک جدید فن کو پڑھانے کے لئے یونیورسٹی میں کتنے وسائل ہوتے ہیں۔ عربی مدارس عام طور سے مالی دشواریوں سے دوچار ہوتے ہیں اور کسی طرح بھی ان میں یہ سکت نہیں ہوتی کہ وہ ان وسائل کو تو کجا یونیورسٹی کے مالی معیار پر ایک استاد بھی رکھ سکیں، ہم لوگ ان پر الزامات تو آسانی سے لگا دیتے ہیں لیکن ان کے واقعی مسائل اور مشکلات کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عربی مدارس اس بات کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں کہ ان کے طلباء علوم حاضرہ سے واقف ہوں مگر وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کی یہ کوشش محض کوشش ہی رہتی ہے۔

عربی مدارس سے اس بات کی توقع کرنا کہ وہ تمام جدید علوم پڑھائیں اور ان کے فارغ التحصیل طلباء عربی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے بھی ماہر ہوں کچھ نامناسب سی بات ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے متداول علوم کے ساتھ ساتھ کسی ایک جدید علم کو بھی سیکھ لیں۔ مگر اس کے

لئے پھر وہی مسئلہ ہے کہ اس فن کو پڑھانے کے لئے ان کو اشخاص کہاں سے ملیں گے؟ اس لئے کہ وہاں کی تنخواہیں یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہیں اور اس زمانے میں ان تنخواہوں پر مشکل ہی سے جدید علوم کے اساتذہ مل سکیں گے۔ البتہ اس کا ایک حل نکل سکتا ہے، ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی[1] اسلامی کردار اور اسلامی فکر کی یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے، یہ یونیورسٹی ایسا کرسکتی ہے کہ اپنے اساتذہ میں سے الگ الگ مضامین کے کچھ اساتذہ کو عربی مدارس میں ڈیپوٹیشن پر بھیجنے کی پیشکش کرے۔ اس کے ساتھ اس کا بھی انتظام کرے کہ ایسے اساتذہ کی تنخواہ اپنے میزانیہ سے ادا کرے۔ تجربہ کے طور پر سوشل سائنسز کے کچھ مضامین کو لیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو تو پھر دوسرے مضامین کو لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عربی اور مذہبی علوم کی تعلیم کے لئے وہاں کے اساتذہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ عربی مدارس کے طلباء کو جدید علوم سے واقفیت ہوگی اور دوسری طرف یونیورسٹی اور مدارس عربیہ کے درمیان جو بدظنی کی تصوراتی خلیج حائل ہے وہ آپس کے میل جول سے دور ہوجائے گی، دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب آئیں گے اور ملک وملت کے لئے زیادہ بہتر طور پر کام کرسکیں گے اور شاید اسی بہانے سے سرسید کے اس خواب کی تعبیر مل جائے جو انھوں نے اس یونیورسٹی کو قائم کرتے وقت مذہب اور جدید علوم میں باہم ربط پیدا کرنے کے لئے دیکھا تھا۔

---

[1] یہ مضمون مسلم یونیورسٹی ہی میں پڑھا گیا تھا اور فاضل مضمون نگار اس وقت مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں لکچرر تھے۔ (ادارہ)

کالیداس گپتا رضا

# مثنوی مولوی معنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ

جناب عماد الحسن آزاد فاروقی جامعہ (بابت ماہ مئی ۱۹۷۷ء ص ۲۶۴) میں مثنوی معنوی کے قدیم ترین؟ نسخے[1] کے پہلے ۲۲ اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں محمود المطابع کانپور کا چھپا ہوا مثنوی مولانا روم کا نسخہ مستند ترین اور مقبول عام نسخوں میں سمجھا جاتا ہے۔
(نسخہ سلطان ولد سے) مقابلہ کے لئے ہم نے پہلے بائیس اشعار اسی نسخہ سے نقل کئے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے نسخہ محمود المطابع کانپور اور نسخہ سلطان ولد کا مقابلہ کیا ہے جس سے نہ صرف

---

جناب کالیداس گپتا رضا، خوش فکر شاعر ہیں اور بمبئی میں مقیم ہیں، آپ کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی نثر نگار بھی ہیں۔

[1] یہ نسخہ قونیا ترکی میں مولانا روم کے مزار کے متصل میوزیم میں محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "مولانا روم کے بڑے صاحبزادے سلطان ولد کے ہاتھ کا ۱۳۲۳ء کا رقم کردہ" ہے۔ اس لئے ترکی کے علماء اور میوزیم کے منتظمین کی رائے میں یہ مثنوی مولانا روم کا سب سے قدیم اور مستند ترین نسخہ ہے"۔ نسخہ شیشے کی الماری میں کھلا رکھا ہے جس سے مثنوی کے صرف پہلے ۲۲ اشعار پڑھے جا سکتے ہیں۔ جناب فاروقی صاحب انھیں ۲۲ اشعار کو زیر بحث لائے ہیں۔

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسخہ محمود المطابع اور نسخہ سلطان ولد کے پانچ اشعار کے متن میں اختلاف ہے بلکہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شروع کے بائیس اشعار میں سے چار (۱۴ تا ۱۷) اشعار ایسے ہیں جو نسخہ سلطان ولد میں نہیں ہیں۔ تفصیل یہ ہے (یہاں نسخہ سلطان ولد کو س اور نسخہ محمود المطابع کو م کہا جائے گا۔)

شعر پہلا م بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

س بشنو این نے چوں شکایت می کند
از جدائیہا حکایت می کند

---

شعر دوسرا م کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

س کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
در نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

---

شعر پانچواں م من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوش حالاں و بد حالاں شدم

س من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت بد حالاں و خوش حالاں شدم

---

شعر چھٹا م ہر کسے از ظن خود شد یارِ من
وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

س ہر کسے از ظن خود شد یار من
از درون من نہ جست اسرار من

---

شعر اٹھارہواں م محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مر زباں را مشتری چوں گوش نیست

س محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مر زباں را مشتری جز گوش نیست

---

جو چار اشعار نسخہ سلطان ولد میں موجود نہیں[1] مگر نسخہ محمود المطابع میں موجود ہیں وہ یہ ہیں :-

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے | یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما | ہائے ہوئے در فگندہ در سما
لیک داند ہر کہ اورا منظر است | کایں فغانِ ایں سرے ہم زاں سرست
دمدمہ ایں نائے از دمہائے اوست | ہائے وہوئے روح از ہیہائے اوست

مگر میرے کتب خانے میں مثنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے جس کا متن نسخہ سلطان ولد کے نسخے کے متن سے بہت قریب ہے۔ یہ نسخہ مطبع نامی کانپور میں چھپا تھا۔ سالِ طباعت درج نہیں مگر اسے چھپے شاید سو سال سے بھی کم ہی ہوئے ہوں گے۔

---

[1] جناب فاروقی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ نسخہ سلطان ولد میں ان چار محذوف اشعار کی جگہ کن اشعار نے لی۔ غالبًا یہ ہوگا کہ نسخہ محمود المطابع کے پہلے چھبیس اشعار (چار شعر حذف کر کے) نسخہ سلطان ولد کے پہلے بائیس اشعار ہوں گے۔

کتاب بڑے سائز پر اس قدر خوبصورت چھپی ہے کہ بے اختیار کاتب اور منتظمین مطبع کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کل صفحات ۴۵۴ ہیں۔ حواشی میں مثنوی کی شرح بھی بزبان فارسی درج ہے۔ اب نسخہ مطبع نامی (ن) سے مذکورہ بالا اشعار کا مقابلہ نسخہ سلطان ولد (س) سے کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ پہلے شعر کے "این" اور دو لفظوں "حکایت" اور "شکایت" کے الٹ پھیر کے سوا "ن" کا تمام متن تقریباً وہی ہے جو "س" ایسے "قدیم ترین نسخے" کا ہے۔

پہلا شعر ن بشنو از نے چوں حکایت می کند

از جدائیہا شکایت می کند

س بشنو این چوں شکایت می کند

از جدائیہا حکایت می کند

---

دوسرا شعر ن کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند

از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

س کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند

در نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

---

پانچواں شعر ن من بہر جمعیتے نالاں شدم

جفت بدحالاں و خوش حالاں شدم

س من بہر جمعیتے نالاں شدم

جفت بدحالاں و خوش حالاں شدم

چھٹا شعر ن ہر کسے از ظنِ خود شد یار من

از درون من بجست اسرار من

س   ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من

از درون من نجست اسرارِ من

---

اٹھارہواں شعر ن   محرم ایں ہوش جُز بے ہوش نیست

مر زبان را مشتری جز گوش نیست

س   محرم ایں ہوش جُز بے ہوش نیست

مر زبان را مشتری جز گوش نیست

---

اس کے علاوہ وہ چاروں شعر (محمود المطابع اشعار ۱۴ تا ۱۷) بھی مطبع نامی کانپور والے نسخے میں نسخہ سلطان ولد کی طرح شامل نہیں۔

اس نسخے (ن) کے آخر میں بعنوان "اعلان" تصحیح کتاب میں مؤلف کی سعی کے بارے میں لکھا ہے:

"...... متنش را بمتعدد نسخہ ہائے مقابل فرمودند کہ ہر یکے را بجائے صد کتاب تواں گفت نہ نہ کہ صد گوہر از مختلف کانہا برآوردہ بیک سلک سفتند۔ چرا کہ بعضے از مثنوی مولانا جامی علیہ الرحمتہ منقول است و دیگرے در کتب خانہ ہائے شاہی بگنجینۂ بے بہا موصول۔ حقا کہ بعضے تقریباً بصد نسخہ تصحیح کردہ شد و دیگرے بدست ہزار علمائے ظاہری و باطنی دستمال ماندہ ......"

گذشتہ اقتباس کے بعد فاروقی صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوستانی نسخوں میں محمود المطابع کانپور کا چھپا ہوا مثنوی معنوی کا نسخہ "مستند ترین" ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔ اگر نسخہ سلطان ولد قدیم ترین اور اس وجہ سے دنیا بھر میں مستند ترین نسخہ ہے تو عین ممکن ہے کہ مطبع نامی کانپور کا مطبوعہ نسخہ بھی نہایت مستند نسخوں میں سے ایک ثابت ہو۔

---

## بقیہ تعارف وتبصرہ

نے بچوں کے ادب اور شاعری کی طرف بھی توجہ کی تھی۔ مرحوم لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور وہیں ۱۵ مئی ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے، مگر عمر کا بڑا حصہ مدراس میں گذارا اور آخری حصہ بھوپال میں بسر کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

مدراس کے زمانۂ قیام میں ۱۹۴۷ء میں بچوں کی نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو نہ جانے کیوں ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا تھا، اسی کو ان کے صاحبزادے برادرم منیر المحوی صدیقی نے مرحوم کی دوسری برسی کی ابتدا میں شائع کیا ہے۔ نظموں کے علاوہ مرتب کے قلم سے "ابتدائیہ" کے عنوان سے ایک تعارفی مضمون ہے، اس کے بعد جناب عبدالقوی دسنوی (صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال) کی ایک تحریر شامل ہے جس میں مرحوم کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد "مصنف کی گذارش" کے عنوان سے مرحوم کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اپنی شاعری کے دور آغاز وشباب میں بچوں کے ادب وشاعری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، صرف ابتدا میں ۱۹۱۰ء میں بچوں کے لئے ایک دو نظمیں لکھی تھیں، اس کے بعد غالباً ۱۹۱۹ء میں لاہور سے بچوں کا ہفتہ وار رسالہ "نونہال" نکلا تو اس کے مدیر کی فرمائش اور اصرار پر، پہلے اسلامی اور تاریخی کہانیاں لکھیں جو بعد میں مکتبہ جامعہ سے دو حصوں میں شائع ہوئیں اور بہت مقبول ہوئیں، اس کے بعد مدیر "نونہال" ہی کی فرمائش پر بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔

نظموں کا یہ مجموعہ بچوں کے ادب میں اچھا اور مفید اضافہ ہے، امید کہ قبول عام حاصل کرے گا۔

عبداللطیف اعظمی

# تعارف وتبصرہ

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

## ڈاکٹر ذاکر حسین ـــ ایک سوانح

مصنف: پروفیسر محمد مجیب
مترجم: محمد طیب جامی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۲۷۶ صفحات، غیر مجلد، قیمت: دس روپئے، سنہ طباعت: ۱۹۷۶ء

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ 110025

ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال ـــ ۳ر مئی ۱۹۶۹ء کے فوراً بعد ان کی سوانح حیات لکھنے کا کام حکومت ہند نے ان کے دوست اور مدت العمر کے ساتھی پروفیسر محمد مجیب صاحب کو سپرد کیا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اس سے بہتر کوئی اور انتخاب ہو ہی نہیں سکتا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اسے انگریزی میں لکھنا تھا، مجیب صاحب گوناں گوں اور انتہائی مصروفیات کے باوجود لکھنے میں ہمیشہ تیز قلم رہے ہیں اور انگریزی ہو یا اردو میں، ان کا ایک مخصوص اسلوب نگارش ہے جو اپنی جگہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں مجیب صاحب کی متعدد کتابیں ہیں، مگر سوانح حیات پر یہ پہلی کتاب ہے ـــ اور آخری بھی۔ اس سے قبل انھوں نے چند روسی تخلیق کاروں کے بارے میں لکھا تھا، مثلاً پشکن، دستہ ئف سکی، ٹالسٹائی اور چیخوف وغیرہ پر جو ان کی کتاب "روسی ادب" میں شامل ہے یا ہندوستان کے چند رہناؤں اور ادیبوں کے بارے میں سوانحی خاکے یا تاثراتی مضامین لکھے تھے، مثلاً مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جو ماہنامہ "جامعہ" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں، مگر کوئی مکمل سوانح حیات اب تک

نہیں لکھی تھی، یہ پہلا موقع ہے جب انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کی ذمہ داری قبول کی۔ کسی دوست یا ساتھی پر لکھنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے، وہ بھی ایسا دوست اور ساتھی جس سے گہری عقیدت اور محبت بھی ہو، مگر جن لوگوں نے یہ کتاب پڑھی ہے ان کا کہنا ہے کہ مجیب صاحب نے اس نازک کام کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اور اس کو لکھ کر موصوف نے سوانح نگاروں کی صف میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔

یہ کتاب انگریزی میں ستمبر ۱۹۷۱ء میں مکمل ہو گئی تھی، مگر دوسرے سال ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی اور ذاکر صاحب کی تیسری برسی کے موقع پر ۳ر مئی کو اس کی رسم اجرا ادا ہوئی، جس کی تفصیل ماہنامہ جامعہ بابت ماہ جون (۱۹۷۲ء) کے کوائف میں چھپ چکی ہے۔ اور اب اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اگرچہ کتاب پر سنہ طباعت ۱۹۷۶ء درج ہے، مگر ابھی حال میں ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر مجیب ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو انگریزی یا اردو پر یکساں عبور حاصل ہے اور اپنی تحریروں کو انگریزی سے اردو یا اردو سے انگریزی میں بڑی بے تکلفی اور انتہائی تیزی کے ساتھ املا کرا دیتے ہیں، اس لیے میری خواہش تھی کہ وہی اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر دیں اور اگر ترجمہ کرنے کے لئے فرصت نہ ہو تو املا کرا دیں، کیونکہ میرے خیال میں مجیب صاحب کے ترجمہ کرنے اور املا کرانے میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے، مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ان کے مشورے پر ان کے ایک شاگرد اور جامعہ کے قدیم طالب علم جناب محمد طیب صاحب کو ترجمے کا کام سونپا گیا۔ طیب صاحب نے اگرچہ اکاؤنٹنسی میں ٹریننگ لی ہے اور زندگی بھر اسی مضمون اور کام سے تعلق رہا ہے۔ مگر چونکہ اپنے دور کے طالب علموں میں ممتاز حیثیت اور اچھا علمی ذوق رکھتے تھے، اس لئے ان کے ترجمے میں قریب قریب وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو عام طور پر جامعہ کے ترجموں میں ہوتی ہیں۔ طبع زاد کتابوں میں بھی تبصرہ نگار کی ذاتی پسند اور ذوق کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، مگر ترجموں میں اختلاف کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے، مگر فی الجملہ میری نظر میں

ترجمہ اچھا ہے اور وہ خرابیاں نہیں ہیں جو آجکل نئے ترجمہ کرنے والوں کے یہاں نظر آتا ہیں۔ امید ہے کہ انگریزی کتاب کی طرح یہ ترجمہ بھی مقبول ہوگا۔

## مفتی صدر الدین آزردہ ـــ حیات، شخصیت، علمی اور ادبی کارنامے

از عبدالرحمان پرواز اصلاحی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۲۴ صفحات، مجلد، قیمت: بارہ روپے۔ تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۷۷ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025۔

مفتی صدر الدین آزردہ (۱۷۸۹ـ۱۸۶۸ء) کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کے حالات زندگی اور علمی و ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، پرواز اصلاحی صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ ضرورت پوری کردی اور بہ احسن پوری کی۔ اس میں پروفیسر مسعود حسین صاحب کا ایک مختصر پیش لفظ شامل ہے جس میں موصوف نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ: "یہ تصنیف محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے اور موضوع زیر بحث کا حق مخلصانہ مگر غیر جانبدارانہ انداز میں ادا کیا گیا ہے، اس میں آزردہ کی علمی و ادبی خدمات کے تمام پہلوؤں پر جس تفصیل سے بحث و گفتگو کی گئی ہے وہ دوسری جگہ ملنا ممکن نہیں، ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ جس طرح کیا گیا ہے، وہ بھی لائق ستائش ہے۔ ان کی شعر فہمی اور نکتہ سنجی، ادبی چھیڑ چھاڑ، علم و وقار اور غالب کے "دوست غم گسار، یار وفا شعار اور علامۂ روزگار" کی جو تصویر اس تصنیف میں ملتی ہے وہ یقیناً اردو ادب میں ایک اضافہ کا حکم رکھتی ہے۔"

مطالعہ کے وقت جہاں فاضل مولف کی تحقیق و جستجو کی داد دینی پڑتی وہاں تنقید و تبصرے کے توازن اور اعتدال کی اور استنتاج میں صلابت رائے کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے، سوائے ایک جگہ کے جہاں راقم الحروف کے نزدیک رائے قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے میں موصوف سے غلطی ہوئی

ہے۔ نواب رام پور سید محمد کلب علی خاں کے نام غالب کے ایک خط کی بنا پر، جو "مکاتیب غالب" (مرتبہ: مولانا امتیاز علی خاں عرشی) کے پہلے ایڈیشن، ۱۹۳۷ء میں نہیں ہے، غالباً بعد میں دریافت ہوا ہے، فاضل مولف نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ: "غالب کی ضرورت اپنی جگہ پر لیکن یہ ان کے لئے کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اپنے مخلص دوست [یعنی آزردہ] کی بیوہ کی امداد میں رکاوٹ ڈالیں۔" اس کی تفصیل یوں ہے کہ آزردہ کی وفات پر ان کی تجہیز وتکفین کے لیے نواب کلب علی خاں نے مبلغ پانچ سو روپے بطور امداد کے عطا فرمائے۔ آزردہ کے انتقال کے گیارہویں دن غالب نے نواب صاحب کو خط لکھا جس کے شروع میں لکھا ہے کہ: "آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین کی زوجہ کو پانچ سو روپے مفتی جی کی تجہیز وتکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور وکفن نہ رہے گا۔" (صفحہ ۹۹) اس کے بعد ڈیڑھ سطر میں مفتی صاحب کی بیوہ کے بارے میں لکھا ہے اور پھر اپنی مالی حالت کے بارے میں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خط کی بنیاد پر غالب کے کیرکٹر پر جو حملہ کیا گیا ہے اور خواجہ احمد فاروقی صاحب کی اس رائے سے کہ: "ان کا (غالب) جو معاملہ بعض معاصرین اور خاص طور پر آزردہ کے ساتھ رہا ہے وہ صریحاً اتنا قابل اعتراض ہے کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز ڈھونڈنا مشکل ہے۔" جو حمایت حاصل کی گئی ہے، اس کے لیے گنجائش کہاں سے نکل آئی ؟! نواب صاحب امداد دے چکے، اس کے روکنے کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، غالب کا اگر کوئی قصور ہے تو صرف اس قدر کہ انھوں نے نواب صاحب کی اس فیاضی اور ہمدردی سے جو مفتی صاحب کی بیگم کے ساتھ ظاہر کی ہے، فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی توجہ اپنے حال کی طرف مبذول کی ہے۔

اس حصے کو پڑھ کر ایک دو سوالات اور پیدا ہوئے، جو تحقیق کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ فاضل مولف نے لکھا ہے کہ: "اس مالی اعانت کی خبر دہلی کے مشہور ہفتہ وار اخبار "اکمل الاخبار" میں بھی شائع ہوئی۔" موصوف نے حاشیہ میں جس شمارے کا حوالہ دیا ہے

وہ ۳۰ ستمبر ۱۸۶۸ء کا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا انتقال ۱۶ جولائی کو ہوتا ہے، ظاہر ہے ان کی تجہیز و تکفین کے لیے جو امداد دی گئی ہے وہ فوراً دی گئی ہوگی۔ غالب کے خط مورخہ ۲۷ جولائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امداد کی شہرت اس وقت تک شہر میں ہو چکی تھی اور "شہر" سے مراد یقیناً دلّی ہی ہوگی، پھر کوئی دو ماہ بعد ۳۰ ستمبر کے اخبار میں یہ خبر کیوں شائع ہوئی ؟ !
دوسرا سوال : مفتی صاحب کا انتقال ۱۶ کو یوم پنجشنبہ کو ہوا، اس کے دس روز کے بعد گیارہویں دن ۲۷ کو غالب نے خط لکھا اور اس پر دن "روز شنبہ" درج ہے، حالانکہ حساب سے اسے دوشنبہ ہونا چاہیئے، شنبہ کو ۲۵ تاریخ ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ماہرین غالب اس کی کیا توجیہہ کریں گے۔

اس بحث سے قطع نظر جو "مقطع" میں آپڑی، زیر تبصرہ کتاب مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ اصلاحی صاحب کی ایک کتاب "مخدوم علی مہائمی" کا تعارف ماہ مئی ۱۹۷۷ء کے جامعہ میں کرایا جا چکا ہے، یہ ان کی دوسری تالیف ہے۔ امید ہے کہ ان کے علمی و تحقیقی کام کا یہ مفید سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

## بالک باغ ـــــ بچوں اور بچیوں کے لیے اچھی اچھی اور مزیدار نظمیں

مصنف : علامہ محوی صدیقی لکھنوی، مرتب : منیر المحوی صدیقی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۴۴ صفحات، مجلد، قیمت : چھ روپے، تاریخ اشاعت ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء

ملنے کا پتہ، معیار ادب بکڈپو۔ گلی بیسا ہزاری۔ گوجر پورہ۔ بھوپال۔ 462001

مولانا محوی اردو کے بزرگ ادیب و شاعر تھے، تقریباً دو سال ہوئے ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو ۹۴ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس طویل عمر میں درس و تدریس اور تحریر و شاعری کے ذریعہ اردو کی قابل قدر خدمت کی۔ مرحوم اردو کے ان اولین خدمت گذاروں میں سے ہیں جنھوں نے

(باقی صفحہ ۴۹۹ پر)

# جامعہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ


| جلد ۷۴ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء | شمارہ ۱۰ |
|---|---|---|


## فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

مدیر معاون

عبداللطیف اعظمی

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

---

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی • ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

ہندوستان کی تاریخ کئی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، خاص طور سے نو آبادیاتی، قومی، فرقہ واری سماجی اور مارکسی نقطۂ نظر سے اور سب سے زیادہ اختلاف رائے زاویۂ نگاہ اور تشریحات و تعبیرات میں اس دور کی تاریخ سے متعلق رہا ہے جو اس ملک میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے اور خاص طور سے اس وقت تک باقی رہتا ہے جب مسلمانوں کی حکومت انحطاط و زوال کی زد میں آگئی۔ آزادی سے پہلے بھی جب ہماری قومی تحریک کا عروج تھا اور آزادی کے بعد بھی جب ہماری قومی حکومت قائم ہوئی، ہمارا یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا کہ انگریز تاریخ نگاروں اور ان کے اثر سے ہندوستانی مورخوں نے ہماری تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا اور اس نقطۂ نظر سے واقعات کو قلمبند کیا اور ان کی تشریحات کیں جس سے ملک کی مختلف قومیتوں، ذات برادریوں اور مذہبی و لسانی گروہوں میں تفاہم کے بجائے تصادم کا جذبہ اُبھرا۔ اس احساس کی وجہ سے ہمارے بعض مورخین نے واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے اور فوجی لڑائیوں اور سیاسی حالات کی سطح کے نیچے تہذیبی تمدنی اور روحانی سطح پر مختلف گروہوں کے میل ملاپ، لین دین اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کے رجحانات و واقعات کو اُبھارنے کی کوشش کی، یہ قومی نقطۂ نظر تھا لیکن سیاسی نشیب و فراز کی وجہ سے فرقہ واری نقطۂ نظر سے بھی تاریخیں لکھی جاتی رہیں اور بدقسمتی سے اکثر یہی نقطۂ نظر غالب رہا۔ ملک میں اتحاد و یکجہتی کے جذبے کو اس سے شدید نقصان پہونچا اور ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کے خونیں نتائج بھی دیکھے۔ اِدھر پندرہ بیس سال سے سماجی اور مارکسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کی کوششیں کی گئی ہیں اور اس سلسلے میں واقعات کی تعبیرات میں اگرچہ کہیں کہیں یک رُخاپن اور مارکسی عصبیت نمایاں ہوگئی ہے، پھر بھی دیانت داری کے ساتھ تاریخ ہند سے متعلق نئی تحقیقات سے پورا پورا استفادہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ٹھیٹ قومی اور فرقہ واری نقطۂ نظر یا نو آبادیاتی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تاریخوں اور اس انداز کی تاریخوں میں بین فرق ہوگا اور ازمنۂ وسطی کی شخصیتوں اور واقعات سے متعلق کتنے فرسودہ خیالات پر اس سے کاری ضرب

گئی ہو گی۔

---

ابھی حال میں یہ اختلافی مسئلہ ابھارا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل چار کتابیں جن میں اول الذکر دو کتابیں اسکولوں کے نصاب میں کئی برس سے داخل ہیں اور جن کے ترجمے بھی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں، ہندوستان کی تاریخ نگاری کی دنیا کا بہت بڑا حادثہ ہے۔ یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ان کتابوں میں اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں ملک کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ ہماری روایتی، تہذیبی اور علمی اقدار سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. Medieval India
2. Modern India
3. Freedom Struggle
4. Communalism and the Writing of Indian History

یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی کے واقعات سے متعلق ہماری معلومات ناقص ہی رہیں گی اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ مذہبی اور وطنی جانبداری کی وجہ سے ان واقعات کی تصویر مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، آزادی کے بعد اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کو تعصب اور جانبداری کے اثر سے پاک کیا جائے اور نئی تحقیقات کی روشنی میں جہاں تک ممکن ہو واقعات و اشخاص کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔ مثلاً، میڈیول انڈیا کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ عام طور پر اس کتاب میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی شخصیت اور کارناموں کے روشن پہلو ہی پیش کیے گئے ہیں، کہنے والوں کو اس پر اعتراض ہے کہ جبکہ اب تک دکن کی مسلم حکومتوں پر اورنگ زیب کے حملے کا خاص سبب تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ شیعہ حکومتیں تھیں اور اورنگ زیب اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر انھیں ختم کرنا چاہتا تھا، یہ کتاب یہ نظریہ پیش کرتی ہے کہ اورنگ زیب نے ان مسلم سلطنتوں کو اس لئے فتح کیا تاکہ مرہٹے ان پر قابض نہ ہو جائیں ——— یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ تاریخی شواہد کچھ اور کہتے ہیں۔ مغلوں کی تاریخ کے ماہرین میں اب شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس نظریے کا حامی ہو اور حقیقت

یہ نظریہ اس غیر علمی اور فرقہ وارانہ مفروضہ پر مبنی ہے کہ ترک اور مغل حکمرانوں کی ہر سیاسی سرگرمی کے پیچھے کوئی نہ کوئی مذہبی مقصد ضرور ہوتا تھا۔ اب جو ارباب نظر ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں انھیں اس نظریے کی کمزوری کا پورا یقین ہے۔

---

اسی طرح موڈرن انڈیا کے بارے میں ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس ہی صرف ایسی جماعت نہیں تھی جس نے ملک میں قوم پرستی کے شعور کو بیدار کیا اور وطنی جذبات کی آبیاری کی۔ یہ بات واقعی ناقابل فہم ہے کہ اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ ملک میں اور بھی تنظیمیں، جماعتیں اور شخصیتیں تھیں جنھوں نے قوم پرستی کے شعور کو بیدار کرنے میں حصہ لیا، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا حصہ اتنا بڑا نہ ہوگا جتنا کہ کانگرس کا، لیکن اس بنا پر ان کے اپنے دائرہ کار میں ان کے رول کی اہمیت سے انکار کرنا، یا اس کا ذکر نہ کرنا، تاریخی شعور کی کم مائیگی کے مترادف سمجھا جائے گا۔

---

آزادی کے بعد یہ بحث اٹھائی گئی کہ تاج محل اصل میں راجپوتوں کا محل تھا۔ اسی طرح کی بات چند اور عمارتوں کے بارے میں کہی گئی اور اس امر کی کوشش کی گئی کہ نئی نسل کو اس بات کا یقین دلا دیا جائے۔ مسٹر مدھوک تو آج بھی یہ کہتے ہیں کہ تاج محل کی تعمیر سے متعلق مورخوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاکہ سچائی کھل کر سامنے آجائے لیکن اب تو اس قدر مستند مواد اس سلسلے میں سامنے آگیا ہے کہ کسی کے لئے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ایشیا پبلشنگ ہاؤس نے ۱۹۷۷ء میں میڈیول انڈیا کے عنوان سے مقالات کے مجموعے کی چوتھی جلد شائع کی ہے۔ اس میں مسٹر آر۔ ناتھ کا مقالہ "تاج محل کی تعمیر سے متعلق شاہی فرمان" اتنا واضح اور روشن ہے کہ اس میدان کے ٹھیٹ متعصبین کی نظروں سے بھی تاریکی کے پردے چھٹ سکتے ہیں۔

---

۲۵ ستمبر کے اسٹیٹسمین میں اس کے اسٹاف رپورٹر کی طرف سے دی گئی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۲۴ ستمبر کو دہلی اسکول آف اکونومکس کے زیر اہتمام منعقدہ ایک سیمینار میں تاریخ نگاری سے متعلق دو "انتہا پسندانہ" نقطۂ نظر اس طرح پیش کئے گئے کہ مناظرہ کی

سی صورت پیدا ہوگئی ۔ ایک نقطہ نظر مارکسی تھا اور دوسرا فرقہ واری ۔ مارکسی نقطۂ نظریہ تھا کہ نو آبادیاتی اور قوم پرستانہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں صحیح مارکسی نقطۂ نظر ہی ہے ۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ مغل سلطنت کو جس کی عمر ۱۵۰ برس تھی ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جبکہ وجیہ نگرم کی سلطنت کی اہمیت جو رقبہ میں تقریباً برابر ہی ہوگی، نظر انداز کی جاتی رہی ہے ۔ اس نظریہ کے ترجمان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کی تاریخ تہذیبی، نسلی اور سماجی اعتبار سے "ہندو تاریخ" ہے ۔ ان کا مطالبہ تھا کہ "ہندو لبرل کلچرل فریم ورک" کے آئینہ میں ہندوستان کی تاریخ کی تمام کتابوں کو جانچا جائے ۔ انھوں نے حکومت کو توجہ دلائی کہ وہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کرے تاکہ صورت حال میں ضروری اصلاح کی جاسکے ۔

ہمارے خیال میں حقیقت دونوں نقطۂ نظر یعنی مارکسی اور قومی نقطۂ نظر کے بیچ میں کہیں ہے اور ہمیں اسی کی تلاش ہونی چاہیئے ۔ واقعات کو صحیح تاریخی عوامل کے پس منظر میں معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنا اور تجزیہ کرکے کسی ایسے نتیجہ پر پہونچنا چاہیئے جس پر جانبداری اور تعصب کا سایہ نہ پڑا ہو، یہ کام مشکل ضرور ہے اور اس سلسلے میں تاریخ نگار کے لئے اپنے آپ کو اپنے ذاتی افکار و عقائد کی پرچھائیں سے بچائے رکھنا تقریباً ناممکن سا ہے ۔ پھر بھی تاریخ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں اس طرف سے ہر وقت چوکنا رہے ۔ یہ کوشش جس حد تک کامیاب رہے گی، ہم کہہ سکیں گے کہ اس حد تک اس کی نگارشات معروضی اور مبنی بر عدل ہیں ۔

---

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر فرقہ وارانہ رنگ کی تاریخ نگاری سے متعلق ہندی کے مشہور و معروف دانشور اور ادیب شری چندر گپت ودیالنکار کی بات بیان کر دی جائے ۔ انھوں نے کچھ اس طرح کہا ہے کہ فرقہ وارانہ رنگ میں تاریخ کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ اصل میں جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے ۔ صداقت کی تلوار اور رواداری کی ڈھال لے کر اگر ہم اپنی تاریخ کے ناہموار راستے میں اتریں تو اس کے اندھیرے میں ہم کو کہیں بھی نفرت اور دشمنی کے بھوت دکھائی نہیں دیں گے اور اس راستہ میں ہمیں جو سچائیاں ملیں ہمیں چاہیئے کہ ان کے نور سے درسی کتابوں کے ذریعے ہم اپنے بچوں کے ذہنوں کے لئے روشنی کا انتظام کریں ۔

سید شہاب الدین دسنوی

# اسکول کے ذریعے یک جہتی

ہندوستان میں وقتاً فوقتاً ہندو مسلم ایکتا، قومی یک جہتی، قومی آہنگی، جذباتی ہم آہنگی اور اسی نوعیت کے نعرے لگائے جاتے رہے ہیں۔ ان نعروں کی ضرورت عام طور پر اس وقت محسوس کی جاتی ہے جب ملک کے کسی حصہ میں فرقہ وارانہ منافرت، لسانی یا علاقائی تعصب کے تحت کوئی فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ اُن موقعوں پر اخباروں میں اس کا بڑا چرچا ہوتا ہے، ریڈیو پر اسی موضوع پر فیچر اور ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں؛ سرکاری اور نیم سرکاری کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں، مذاکرے اور سیمینار منعقد ہوتے ہیں؛ اسکولوں کے نصاب پر نظرثانی اور تاریخ ازسرنو لکھے جانے کی بات بھی چلتی ہے، کہیں کہیں عید، دیوالی اور ہولی کے مشترکہ اجتماع ہوتے ہیں (جن میں خلوص کم، سیاست یا دکھاوا زیادہ ہوتا ہے)۔ پھر کچھ دنوں بعد آہستہ آہستہ یہ چرچے کم ہونے لگتے ہیں، لوگ ان باتوں کو بھولتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کا تذکرہ آئندہ وقوع پذیر واردات تک کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک نیتی کے باوجود اس مسئلے کا کوئی پائیدار حل ہمیں ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔

مختلف وجوہ کے تحت برطانیہ میں، دولتِ مشترکہ کے مختلف ملکوں سے جب مہاجرین

---

جناب سید شہاب الدین دسنوی، سابق پرنسپل صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ بمبئی، حال مقیم پٹنہ۔ ۸۰۰۰۱ (زمین منزل۔ ٹی، این، بنرجی روڈ)

آکر بسنے لگے تو ان کی آباد کاری کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ انھیں برطانوی معاشرے میں سمونے کا پیدا ہوا۔ اور قدرتی طور پر ان کا تعلق تعلیم سے قائم کیا گیا۔ چنانچہ اس موضوع پر نفسیاتی، عمرانی نقطۂ نظر سے بحثیں ہوئیں۔ سماجیات کے اصولوں، اقوام متحدہ کی قراردادوں کے پیش نظر اور ساتھ ساتھ زمانے کی نبض پہچانتے اور سلجھے ہوئے برطانوی مدبّروں، مفکروں اور ماہرین تعلیم نے رنگ اور نسل کے امتیاز سے پیدا ہونے والے اختلافات، تعصب یا فرق کے متوقع نتیجوں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ مشاہدوں اور مطالعوں سے کام لیا گیا؛ لوگوں سے براہ راست رابطہ قائم کر کے ان کے ردّ عمل معلوم کیے گئے۔ اس طرح کام کرنے کے بعد کئی رپورٹیں، کئی مضامین اور کتابیں شائع ہوئیں۔ پارلیمان کے ممبروں نے اسے اسکولوں کا ایک معمولی سا، اقلیتوں کا ناقابل اعتنا مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس پر بحث کی۔

۱۹۷۴ء میں برطانوی حکومت نے مہاجرین کے تعلیمی تقاضوں اور ان کی زبوں حالی کے پیش نظر ایک قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) شائع کیا جس میں کہا گیا:

> "حکومت اس ملک کی گوناگوں تہذیب اور ثقافت کے حامل مختلف النسل باشندوں کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے کی خواہشمند ہے اور چاہتی ہے کہ اس ہم آہنگی کی بنیاد ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کی عزت و توقیر پر رکھی جائے۔ تعلیمی اداروں میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام بچوں اور طلباء کو ان کے آبائی وطن کی ثقافتی روایات کے ساتھ اس ملک کی خصوصی روایات کا انھیں زیادہ سے زیادہ علم دے کر اُن سے اس طرح اُنس پیدا کیا جائے کہ رنگ و نسل کے معاملات میں وہ ہوشمندانہ رویّہ اختیار کرنے لگیں۔"

اس سلسلے میں برطانیہ کے شہر برمنگھم میں ماؤنٹ پلیزنٹ اسکول کی صدر معلمہ مس بی۔ سی۔ ہینکس (B.C.HANKS) نے لندن کے ایک تعلیمی جریدہ "ٹرینڈس اِن ایجوکیشن" کے شمارہ ستمبر ۱۹۷۵ء میں

اپنے تجربے شائع کئے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہمارے لیے یوں دلچسپ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں بھی اسکولوں میں زبان، مذہب اور علاقے کے اختلاف کی بنیاد پر طلبا منقسم ہوتے ہیں۔ برمنگھم میں مس ہینکس کے اسکول میں ویسٹ انڈیز اور مشرقی افریقا کے ہندو۔ کے علاوہ پاکستان کے مسلمان اور پنجاب کے سکھ بچے اور بچیوں کی اچھی خاصی تعداد پڑھتی ہے۔ ان میں مسلمان اور سکھ لڑکیاں شلوار پہنتی ہیں، ہندو لڑکیاں اسکرٹ، سکھ بچے پگڑی کے ساتھ اسکول کے یونی فارم میں دکھائی دیتے ہیں، باقی برطانوی بچوں کی طرح ملبوس ہوتے ہیں۔ ان میں کس درجہ ہم آہنگی، رواداری اور یک جہتی پیدا ہوئی ہے؟ اور کس حد تک انھیں لازماً ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے؟ برطانیہ کے اسکولوں میں صرف مختلف النسل طلبا کی موجودگی یا صرف سفید اور گندمی یا سیاہ فام طلبا کے درمیان ہی کشمکش یا تناؤ نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ ایک ہی ملت یا قوم کے دو فرقوں کے مابین بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے مسلمان یا بنگلادیش کے مسلمان؛ آئرلینڈ کے دو مختلف فرقوں کے سفید فام بچوں کے درمیان؛ برومی (Brummies) اور گلیسوے جئن (Glaswegian) یا بار بے ڈین (Barbadian) اور جمیکن (Jamaican) کے درمیان۔ پھر ان سبھوں کے آپس کی کشمکش اور کشیدگی سے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کے پیش نظر رواداری کی ضرورت اور افہام و تفہیم کی بنیادی قدروں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان قدروں کو حاصل کرنے کا جو طریقہ عمل میں لایا گیا ہے اس میں ہر ایک کو انفرادی حیثیت دے کر اسے سمجھنے کی کوشش کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

مس ہینکس نے اپنے اسکول کو کئی برادری کے گروہ میں تقسیم کر دیا ہے جنھیں وہ "ہاؤس" (House) کہتی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں طلبا کو مختلف ہاؤس میں تقسیم کر دینا کوئی انوکھا طریقہ نہیں ہے۔ مگر برمنگھم کے اس اسکول کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہاں کے ہاؤس اور طلبا کے گھروں کے درمیان ایسا گہرا رشتہ قائم کر دیا جاتا ہے جس کی بدولت

ہر طالب علم اسکول کی تعلیم کی پوری مدت میں بحیثیت فرد اسی ہاؤس کی مناسبت سے جانا پہچانا جاتا ہے ۔ پہلے سال ہاؤس کا جو ٹیوٹر مقرر ہوتا ہے وہ کئی برس ہاؤس کے ممبروں کے ساتھ ساتھ آگے آگے بڑھتا جاتا ہے ۔ چوتھے سال سے مضامین کے انتخاب کی آزادی اور ان کا تنوع ایسا ہوتا ہے کہ طلبار کو اس کا کوئی خطرہ نہیں رہتا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ امتیازی سلوک رنگ یا نسل کی وجہ سے برتا جائے گا اور انھیں کسی خاص سمت میں ڈھکیلا جائے گا ۔

اسکول کے نصاب میں سرگرمیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے ؛ اس کی تنظیم یا تو گروپ کی بنیاد پر کی جاتی ہے یا عمر کے اعتبار سے ۔ ہر بدھ کی سہ پہر کو سرگرمیوں کے اوقات مقرر ہوتے ہیں جن میں طرح طرح کے کھیل کود، صنعت و حرفت ، مشغلے ، ڈرامے دیکھنا ، میوزیم اور نمائشوں میں جانا شامل ہوتا ہے ۔ دلچسپیوں کے لحاظ سے تقسیم کئے ہوئے گروپ کی ذمہ دار جو ٹیچر ہو ، ضروری نہیں کہ اس کا میلانِ طبع بھی اسی طرف ہو مگر طلبا کی رہنمائی یا مدد کرنا اس کا فرض ہوتا ہے ۔ سرگرمیوں کے انتظام کرنے میں طلبا کے معاشرتی اختلاف کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے ۔ کھانے پینے کی تقریبوں میں ان کے عادات اور پسندیدگی پیش نظر ہوتی ہے ۔ ایک بار ایک ٹیچر اپنے گروپ کو لے کر کرسمس پارٹی کے لئے ایک سفید فام اور اور ایک سیاہ فام بچے کو لے کر خریداری کرنے چلی تو ان دونوں بچوں نے خود تجویز کیا کہ وہ اپنے ایک پاکستانی ساتھی طالب علم کو بھی لے لیں تو اچھا ہوگا ۔ تجویز منظور ہوئی ۔ اس کے بعد اس ٹیچر کا مشاہدہ تھا کہ تینوں بچوں نے خورد و نوش کے سامان کی خریداری کے وقت اپنی جماعت کے مختلف مذاق کے ساتھیوں کا بار بار ذکر کیا اور ان کے ذوق کو ملحوظ رکھ کر خریداری کی ۔

تعلیم کے نصاب میں طلبا کے اجتماع کے ذریعے مذہبی تعلیم دینے کا رواج ہے مگر جس اسکول میں کئی مذہب کے ماننے والے طلبا ہوں وہاں یہ مسئلہ بڑا نازک بن جاتا ہے ۔

لیکن چونکہ مختلف ادیان بنیادی طور پر ایک ہی منزل یعنی خدا تک پہنچانے کے الگ الگ راستے ہوتے ہیں اور انسان کو نیک بننے کی تلقین کرتے ہیں، اس لئے برمنگھم کے اسکول میں مذہبوں کو ایک ہی ہیرے کے جدا جدا پہلو کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اسکول کے چوتھے یا پانچویں سال تک پہنچتے پہنچتے ہر طالب علم چاروں مذہب یعنی عیسائیت، اسلام، ہندومت اور سکھ دھرم کی معلومات کا کورس مکمل کر لیتا ہے۔ کلاس میں آدھے سے زیادہ ایسے طلبا ہوتے ہیں جو اس کے علاوہ دو تعلیمی منصوبے جن میں ایک خود اس کے مذہب سے متعلق اور دوسرا کسی اور مذہب کے بارے میں ہوتا ہے، مکمل کر لیتے ہیں۔ خاص خاص موقعوں پر مذہبی موسیقی، رقص اور اس قسم کے دوسرے پروگرام طلبا کی جانب سے پیش کئے جاتے ہیں جن میں اسمائے حسنہ، صفات الٰہی اور ادائیگی شکر سے متعلق عنوانات ہوتے ہیں۔ ان میں طلبا بلا امتیاز فرقہ حصہ لیتے ہیں۔ برمنگھم کے ماؤنٹ پلیزنٹ اسکول میں مس ہینکس کے مطابق طلبا کی بعض دینی ضروریات کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے مثلاً رمضان میں لنچ کے اوقات میں مسلمان طلبا کے لئے وضو کا انتظام اور ایک ایسا مخصوص کمرہ جس میں وہ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔

ہاؤس کی تقسیم کے بعد طلبا اپنے اپنے رہنما ٹیچر سے وابستہ ہو جاتے ہیں، اُن کے والدین بھی ان ٹیچروں سے ربط قائم رکھتے ہیں اور دونوں مل کر اسکول کے تعلیمی مقاصد کے حاصل کرنے میں کوشاں ہوتے ہیں۔ یوں تو یہ طریقہ اسکولوں میں عام طور پر رائج ہے اور اس میں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی ہے مگر مس ہینکس کے اسکول میں اس طرح کے ربط اور ملاقاتوں کے سلسلے سے طلبا کی شکایت ـــــ کام نہ کرنے یا شرارت کی شکایت، مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ سفید فام والدین کو بالخصوص اسکولوں میں مدعو کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے بچوں کی زندگی میں ہم آہنگی اور یک جہتی کے تماشے دیکھیں۔ اسکول ہی میں نوجوانوں اور محلہ والوں کا مرکز بھی ہے جس میں شام کے وقت موسیقی، کھیل کود اور دوسرے مشاغل کی تربیت کے کلاسوں میں مختلف نسل کے نوجوان ٹولیوں

میں اکٹھے ہوتے ہیں، یہ بھی ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد ثابت ہوتے ہیں۔

سب سے بڑا مسئلہ مختلف النسل بچوں کو برطانوی شہریت کے قابل بنانے کی خاطر ان میں یک جہتی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ اسکولوں میں ویسٹ انڈینز کے طلبا کھیل کود میں نمایاں پارٹ ادا کرتے ہیں۔ انگریز (سفید نسل کے) بچے اسکول کی خدمت گذاری میں دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، ایشیائی بچے پڑھنے لکھنے پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ یہ کلیہ تو نہیں مگر عام مشاہدہ ہے۔

اقلیتی گروہ کے بچوں کی تربیت صحیح ڈھنگ سے اسی حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ ان کے سامنے اقلیتوں کے رہن سہن اور اکثریت سے میل جول اور باہمی تعلقات کے اچھے نمونے سامنے موجود ہوں ورنہ صرف پند و نصیحت یا وعظ سے زندگی میں وہ قدریں نہیں پیدا ہوتی ہیں جو ہم لانا چاہتے ہیں۔ اسی خیال کے تحت اسکول کے ہر سطح کے اسٹاف کی تقرری میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مختلف نسل، مذہب اور ملک کے گروہوں کی نمائندگی ہوتی رہے تاکہ مجموعی طور پر بڑی عمر کے لوگوں کو ایک ساتھ کام کرتے، اور ہنستے بولتے دیکھ کر طلبا سمجھنے لگیں کہ عملی طور پر ہم آہنگی کیا ہوتی ہے۔

اپنے اسکول کے تجربے کے سلسلے میں مس ہینکس کہتی ہیں: "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تجربے نے ہمارے اسکول کے طلبا میں ایک دوسرے کو قبول کر لینے میں کس حد تک مدد کی؟ یہاں پر یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ جو بات ہمارے راستے میں سب سے زیادہ حائل ہوتی ہے وہ انگریزی زبان کی اجنبیت ہے، جیسے جیسے اس میں مہارت بڑھتی جاتی ہے باہمی تعلقات زیادہ گہرے ہوتے جاتے ہیں، ایک چیز جو بہت مددگار ثابت ہوتی ہے وہ ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ہوتا ہے، خواہ وہ کلاس کا کام ہو یا کلاس کے باہر کی سرگرمیاں۔ پہلے دو تین سال تک طلبا کا رجحان اپنی نسل اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا ہوتا ہے مگر بتدریج جب وہ دوسروں کے گھر بھی آنے جانے لگتے ہیں تو پھر احباب کے انتخاب

میں مشترکہ دلچسپی اور ہم مذاقی کو زیادہ دخل ہونے لگتا ہے۔

"اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ کا سماج اب مختلف تہذیبوں کے امتزاج کا نتیجہ بنتا جارہا ہے، خصوصاً بڑے شہروں میں۔ اس لئے ہمارے اسکول کا نصب العین جہاں طلبا کو اس نئے برطانوی سماج کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے وہیں انھیں ان کی موروثی ثقافت سے بھی آگاہ رکھنا ہوتا ہے۔"

برطانوی اسکول کا یہ تجربہ ہم ہندوستانیوں کے لئے بڑا اسبق رکھتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں زیادہ تر ایسے مقاصد سرکاری احکام، تقریروں اور وقتی جوش سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح طلبا کے ذہن اور دماغ کو بدل کر ان میں صحت مند اقدار پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن برسوں کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسی کوششیں ضائع گئی ہیں۔

ابوبکر موری موتو
ترجمہ: شہاب الدین انصاری

# کوریا میں اسلام کی اشاعت

ایک اندازے کے مطابق کوریا اسلام سے "سن را" خاندان کے دورِ حکومت (۹۳۵ء۔ ۶۶۸ء) میں چند عرب تاجروں کی آمد پر متعارف ہوا۔ اگرچہ اس خیال کے ثبوت میں اب تک کوئی دستاویزی ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ تاریخی اسناد کے مطابق ایک سو عرب تاجروں پر مشتمل ایک قافلہ "گو۔ رایو" خاندان کے دورِ حکومت (۱۳۹۲ء ۔ ۹۱۸ء) میں شاہ "ہایون۔ جونگ" کے سولہویں سنہ جلوس مطابق ۱۶ر ستمبر کو کوریا آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کوریا میں ۱۰۲۶ عیسوی میں آیا۔ شروع کے دور میں آنے والے عرب اپنے ساتھ ایک ترقی یافتہ عربی علم طب و تہذیب کے ساتھ ساتھ جنوبی مشرقی ایشیا سے گھریلو دستکاری بھی لائے اور اس وجہ سے بادشاہ اور ان کے درباریوں نے انھیں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔

عربوں نے پرتگالیوں کے دنیا کے بری نقشہ پر اُبھرنے تک کوریا اور دوسرے ایشیائی ممالک کے درمیان بحری راستوں سے تجارت کو فروغ دیا اس کے علاوہ چین کی تجارتی شاہراہ کے راستے انھوں نے کوریا اور مغربی ایشیا کے ممالک کے درمیان برّی تجارت کی داغ بیل

---

جناب شہاب الدین انصاری، لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری۔ جامعہ ملیہ۔ دہلی

بھی ڈالی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے عرب تاجر کوریا میں بس گئے اور ان کی نسلیں ملک کے "پائینگ۔ ٹائیک" علاقے میں ایک ہزار برس تک آباد رہیں۔ اس طرح اسلام کا رابطہ کوریا سے ایک ہزار سال سے قائم ہے لیکن اس پورے دور میں اسلام کی ترویج کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی ہے۔ ہاں کوریا کی تاریخ میں ابتدائی دور میں آنے والے عربوں کا ایک نشان اب بھی باقی ہے اور وہ ہے اس ملک کا نام کوریا۔ عرب تاجروں نے اپنے غلط تلفظ سے اس زمانے کے حکمران خاندان گو۔ رایو (Go - Ryeo) کو کوریا کر دیا تھا۔

کوریا میں مذہب اسلام کی اشاعت موجودہ صدی کے پانچویں دہے میں ترک افواج کی آمد پر شروع ہوئی۔ یہ فوجیں کوریا کی جنگ میں شرکت کے لئے ادارہ اقوام متحدہ کی تولیت میں آئی تھیں۔ کوریا میں سب سے پہلی مسجد بھی ترکوں نے ہی بنائی اگرچہ اس کی نوعیت بالکل عارضی تھی۔ ترکوں کی اسلامی طرز زندگی سے کوریا کے باشندے بہت متاثر ہوئے اور ان کے بہت قریب آئے۔ جلدی ہی ان لوگوں نے حلقہ بگوش اسلام ہوکر کوریا میں اسلام کی اشاعت کی تحریک میں کلیدی حیثیت اختیار کرلی۔ ترک سپاہ کے مذہبی جذبہ سے اس دلچسپ حقیقت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ ہر چند کہ ایک ملک سیاسی عقیدہ کی رو سے سیکولرازم کا حامی ہو جائے اسلام کا جذبہ سرد نہیں پڑتا۔ ترکوں کے ذریعہ کوریا میں اسلام کی ترویج سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ روایتی انداز کی تبلیغ کے مقابلے میں مسلمان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کا نمونہ اشاعت اسلام کے لئے زیادہ موثر ہے۔

کوریا میں اسلام کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی اس کی مختلف سمتوں سے آبیاری کی گئی اور سید محمد جمیل صاحب اور ان کے جیسے دوسرے باہر کے ملکوں سے آنے والے مذہبی رہنماؤں کی پر خلوص کوششوں سے دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوتا گیا۔ حوصلہ افزائی کرنے والوں میں داؤد حاجی نوح (ملیشیا) ڈاکٹر

محمد توفیق اویدا (مصر) داتو سید ابراہیم بن عمر السا گوف (سنگاپور) وغیرہم جیسے مسلم اکابر، رابطہ اسلامی مکہ، قرآن پاک سوسائٹی پاکستان، صدائے اسلام سوسائٹی لیبیا، کل ملیشیا تنظیم برائے بہبود مسلمانان اور اعلیٰ تنظیم برائے امور اسلامی قاہرہ جیسے ادارے نیز اسلامی ملکوں کی حکومتیں شامل تھیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ملک میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے اور ان میں سے اکثریت دانشوروں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کی ہے۔

کوریائی مسلمانوں کی اپنی تین مختلف تنظیمیں ہیں۔ کوریا مسلم فیڈریشن جس کے سربراہ حاجی صابری شوہ ہیں۔ فیڈریشن کا قیام ۱۹۶۳ میں عمل میں آیا لیکن ۱۹۶۶ میں اس کی تشکیل جدید ہوئی۔

دوسری انجمن کوریا اسلامک فاونڈیشن ہے جو ایک مذہبی سوسائٹی کی حیثیت سے ۱۹۶۷ میں رجسٹرڈ کرائی گئی۔ تیسری انجمن کا نام مسلم اسٹوڈینٹس اسوسی ایشن ہے۔ مذہبی امور پر عمل کرنے کے سلسلے میں تینوں انجمنیں باہمی تعاون سے کام کرتی ہیں۔ عام مذہبی اور سماجی تقریبات کے انتظام کے ساتھ ساتھ یہ انجمنیں نوعمر مسلمانوں کی تعلیم میں کافی دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ اس مقصد کے تحت اسلامی تعلیمات اور اسلامی طرز معاشرت کا مطالعہ کرنے کی غرض سے یہ انجمنیں اب تک ۵۳ کوریائی نوجوانوں کو مختلف اسلامی ملکوں کو بھیج چکی ہیں ان میں انڈونیشیا، پاکستان، سعودی عرب، لیبیا، مراکش اور ملیشیا کے ملک قابل ذکر ہیں۔

ادارہ اقوام متحدہ کی فوج میں شریک ترکوں کی آمد کے وقت سے کوریا کے مسلمان نماز کی ادائیگی کے لئے عارضی بندوبست کرتے رہے ہیں اور انھیں ایک مسجد کی تعمیر کا احساس شدت سے ہوتا رہا ہے۔ عمارت اور جگہ کے لئے وہ برابر کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں حکومت سے گفت و شنید ۱۹۶۱ میں ملیشیائی خیر سگالی مشن کی آمد کے موقع پر شروع کی گئی۔ لمبے عرصے کی گفت و شنید کے بعد ۱۹۶۹ میں حکومت کوریا مسلم فیڈریشن کو جگہ دینے کے لئے

تیار ہوئی۔ کوریا کے صدر "پارک چنگ ہی" نے ۵۰۰۰ مربع میٹر کا علاقہ مسجد اور اسلامک سینٹر کی تعمیر کے لئے عطیہ کے طور پر دیا۔

مسجد اور اسلامی مرکز کی تعمیر کوریائی مسلمانوں کی سچی لگن کے ذریعہ صدر پارک کی عطا کی ہوئی زمین پر ابوظہبی، کویت، لیبیا، مراکش، قطر، سعودی عرب وغیرہ اسلامی ممالک اور شاہزادہ نواف بن عبدالعزیز اور عدنان کشوگی جیسے مخیر زعما کی مالی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ تعمیر کی منصوبہ بندی اکتوبر ۱۹۷۲ء میں شروع ہوئی اور تعمیر کا کام اکتوبر ۱۹۷۴ء میں شروع ہوا۔ اسلامی مرکز کی عمارت فروری ۱۹۷۵ء میں مکمل ہوئی اور مسجد کی تعمیر مئی ۱۹۷۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔

مسجد سیول شہر میں ۲۱-۷۳۲ "ہنام۔ڈونگ، یونگ سان۔گو" کے علاقے میں واقع ہے اس کا رقبہ ۱۵۶۴٫۹۲ مربع میٹر ہے اور اس میں نماز کی جگہ کے علاوہ دو کمرے دفاتر کے لئے ہیں۔ مسجد کی تعمیر پر ۲,۴۴۵,۳۹۸ امریکی ڈالر کا صرفہ ہوا ہے۔ اسلامی مرکز کی عمارت ۱۲۳۴٫۸۸ مربع میٹر پر محیط ہے اور اس میں ۱۰ کمرے ہیں۔ اس میں عربی زبان کی تعلیم کے لئے ایک ادارہ، مبلغین کے لئے کمرے اور کوریا اسلامک فاؤنڈیشن کے دفاتر شامل ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر پر ۱۵۸۰۰۵٫۳۳ امریکن ڈالر خرچ ہوئے۔

کوریا مسلم فیڈریشن نے اشاعت اسلام کے دو بنیادی پلان ترتیب دیئے ہیں۔ پہلے پلان کی مدت ۱۹۷۴ سے ۱۹۷۶ تک تھی۔ اس دوران اسلام کی تبلیغ کے لئے اخبارات و رسائل و دیگر مطبوعات، مسلم طلباء کی سرگرمیوں، عربی زبان کی ترویج، وظائف کی مدد سے طلباء کا اسلامی ممالک سے تبادلہ، قرآن مجید کا کوریائی زبان میں ترجمہ اور ایک اسلامی ادارہ کے قیام پر زور دیا گیا۔ دوسرے پلان کی مدت ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۰ تک کی ہے۔ اس پلان میں مسلم علاقوں میں مسجدوں کی تعمیر، کالج، لائبریری اور یتیم خانہ کا قیام، طبی سہولیات اور

مسلم بستی کے قیام کی اسکیمیں ہیں۔

کوریائی مسلمانوں نے مرکزی مسجد اور اسلامی مرکز کے قیام کے لئے پوری لگن اور شیفتگی سے کام کیا ہے اور انھیں اس بات پر پورا یقین ہے کہ مسجد کی تکمیل سے ان کے عقیدہ میں مزید پختگی حاصل ہو گی اور مسجد کوریا میں اسلام کی اشاعت میں سنگ میل کا کام دے گی۔

رشید الدین

# مولوی غلام ربّانی مرحوم

گذشتہ ماہ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ء کو مولوی غلام ربانی کے انتقال کو ایک سال مکمل ہو گیا۔ ان کی پہلی برسی کے موقعہ پر "جامعہ" کے لئے ان کے بارے میں مضمون لکھنے بیٹھا ہوں تو ان کی شکل و صورت، بات چیت اور عادات و اطوار آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔ انتقال کے وقت وہ ۹۰ کے پیٹے میں تھے لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ صرف ۸۴ سال کی عمر میں ان کے سامنے عینک لگائے بیٹھے مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ انتقال کے وقت بھی بیمار نہیں تھے بلکہ اچانک سرِ شام انتقال ہو گیا۔ اپنے پوتے کے ساتھ آنگن میں تخت پر بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ اتنے میں پیشاب کی حاجت ہوئی۔ پیشاب سے ہو کر واپس آئے اور تخت پر بیٹھے ہی تھے کہ پیچھے کی طرف لڑھک گئے اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی جب کہ نام و نمود اور شہرت و عزت کے حصول کی خواہش انسانوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور زبان و ادب اور علم و ہنر کے ذریعہ ہر معمولی آدمی اپنے آپ کو مشہور و مقبول فنکار ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے،

---

جناب رشید الدین، ایم۔ اے (عثمانیہ) مددگار مترجم (اردو) نظامتِ ترجمہ حکومت آندھرا پردیش، حمایت نگر، حیدر آباد۔ ۲۹

مولوی غلام ربانی کو میں نے بے حد خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف دیکھا ہے۔ وہ اردو کے ایک خاموش خدمت گزار تھے۔ یہ وہی ربانی صاحب تھے جو برسوں داغ کے جانشین حضرت بیخود دہلوی کی صحبت میں رہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ کام کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ۲۵ سال تک رفیق رہے اور غلام یزدانی (ماہر آثار قدیمہ) کے ساتھ کم و بیش ۲۵ سال کام کیا۔ یہ وہی ربانی صاحب تھے جنھوں نے پانچ ڈکشنریوں کی تیاری میں ہاتھ بٹایا تھا۔ یہ وہی ربانی صاحب تھے جن کی کئی کتابیں شائع ہو چکیں اور مختلف رسائل و اخبارات میں پچھلے ساٹھ سال کے عرصہ میں جن کے بے شمار مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وہی ربانی صاحب تھے جن کے ریڈیو ڈراموں اور نشری تقاریر دو سو سے بھی زیادہ ہیں۔

لیکن اس کے باوجود انتقال کے وقت انھیں ہندوستان اور پاکستان تو کجا خود شہر حیدرآباد میں بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اس کی وجہ محض یہی تھی کہ ان کی طبیعت میں انکسار اور خودداری اس درجہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ کبھی انھوں نے واقعی اپنی حیثیت کو منوانے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی یہ چاہا کہ کسی اخبار یا رسالے میں ان کے نام اور کام کی تشہیر ہو۔ ورنہ اردو زبان میں ان کی خدمات ایسی تھیں کہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی زندگی ہی میں علامہ دہر قرار پاتا، لیکن اس کے برخلاف ان کا یہ عالم تھا کہ ان کی زندگی میں جب میں نے ان پر ایک مضمون لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو صاف ٹال گئے اور برسوں ٹالتے رہے۔ لیکن میرا اصرار جاری رہا تو بہ دقت تمام ایک روز وقت نکال کر انھوں نے میرے سوالوں کا جواب دیا لیکن یہ شرط بھی لگادی کہ پہلے وہ مسودہ کا ایک ایک لفظ دیکھیں گے اور اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دیں گے۔ چنانچہ میں نے مضمون مکمل کیا اور مسودہ لے جا کر ان کے حوالے کیا۔ کئی دن تک مسودہ اپنے پاس رکھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ پتہ نہیں کیسا کیا تبدیلیاں کریں گے، زبان و بیان کی کیا کیا غلطیاں نکالیں گے اور کن کن واقعات کے بارے

میں اعتراض کریں گے۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میرا مسودہ مجھے ویسا ہی واپس مل گیا جیسا میں نے دیا تھا۔ مسودہ واپس کرتے ہوئے کہا: "بھئی تم نے بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔" میری جان میں جان آئی۔ ویسے مجھے ان کی طبیعت کا بخوبی احساس تھا اس لیے میں نے پہلے ہی مضمون بہت محتاط طریقہ پر لکھا تھا۔ وہ مضمون پہلے روزنامہ "سیاست" اور پھر ماہنامہ "آندھرا پردیش" (حیدرآباد) میں شائع ہوا اور کافی پسند کیا گیا۔

ویسے ربانی صاحب کو زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے لیکن جو جانتے تھے خوب جانتے تھے اور ان کی قابلیت وصلاحیت سے خوب واقف تھے۔ میرے اور ان کے خاندانی مراسم تھے اور بہت قدیم تھے۔ جب وہ اورنگ آباد کالج میں اردو پڑھاتے تھے (یہ کوئی ۱۹۳۰ء کی بات ہے) تو میرے ماموں مولوی عبدالعزیز صاحب ان کے شاگرد تھے[1]

---

[1] موصوف حکومت ہند کے وظیفہ یاب عہدہ دار ہیں۔ انھوں نے کوئی ۳۷ سال تک محکمہ آثار قدیمہ میں ملازمت کی۔ تقسیم ہند سے قبل وہ برسوں تک ریاستِ حیدرآباد میں غارہائے ایلورہ واجنتا میں مہتمم رہے۔ وائسرائے ہند لارڈ للینتھگو کو آپ ہی نے ان غاروں کا معائنہ کروایا تھا۔ ہندوستان میں ان غاروں کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھنے والے چند لوگوں میں مولوی عبدالعزیز صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔ سابق صدر جمہوریہ ہند راجندر پرشاد آنجہانی نے بھی آپ ہی کی معیت میں ان غاروں کا معائنہ کیا تھا۔ ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد (۱۹۴۸ء) ان کا تبادلہ اورنگ آباد سے حیدرآباد ہوگیا اور وہ مددگار ناظم آثار قدیمہ کے طور پر صدر دفتر میں کام کرنے لگے۔ ریاستی تنظیم جدید (۱۹۵۷ء) کے بعد ان کی خدمات مرکزی محکمہ آثار قدیمہ نے حاصل کرلیں اور وہیں سے انھوں نے وظیفہ حاصل کیا۔ مولوی عبدالعزیز صاحب تاریخ، تمدن اور آثار قدیمہ کے علاوہ زبان وادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ ویسے تو آپ کا وطن اجنتا (مہاراشٹر) ہے لیکن آپ نے حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ (رشید)

بعد میں ربانی صاحب محکمہ تعلیمات سے محکمہ آثار قدیمہ میں منتقل ہوئے تو یہ دونوں شریک کار بھی بن گئے۔ اس طرح یہ مراسم اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ اس لئے مجھے زندگی میں انھیں بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ وہ بھی مجھے چاہتے تھے اور میری انشا پردازی کی صلاحیتوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

مولوی غلام ربانی مرحوم دلی سے جانب شمال تیس میل دور واقع ایک قصبہ پلول میں (جس کا ضلع گڑگاؤں ہے اور جو ان دنوں ریاست ہریانہ میں شامل ہے) ۱۸۸۸ میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پلول ہی میں حاصل کرنے کے لئے وہ دلی چلے گئے اور گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد مشن کالج دلی میں انٹر میں داخلہ لیا۔ یہ وہی کالج تھا جہاں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے شاگردانِ رشید مرزا فرحت اللہ بیگ اور مولوی غلام یزدانی نے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ دونوں حضرات ان سے کالج میں سینیر تھے، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ربانی صاحب اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور دلی کے اکاونٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ یہ دفتر اس زمانے میں لال قلعہ کے اندر تھا اس طرح وہ روز لال قلعہ کی زیارت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ہم محلہ ہونے کی وجہ سے مشہور اردو شاعر علامہ بیخود دہلوی سے ان کے مراسم پیدا ہو گئے تھے اور وہ روزانہ پابندی کے ساتھ ان سے ملا کرتے تھے۔ ربانی صاحب کہا کرتے تھے کہ بیخود مرحوم کی صحبت میں انھوں نے زبان کے بہت سے رموز جانے اور بول چال اور تحریر میں اس کا صحیح استعمال سیکھا۔ علامہ مرحوم ان سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے ورنہ بیخود کی سخت مزاجی اردو ادب میں مشہور ہے۔

تین سال تک اے۔جی۔ آفس میں حساب کتاب کا کام کرنے کے بعد ربانی صاحب نے یہ ملازمت چھوڑ دی کیونکہ وہ کسی طرح ان کے ذوق کے مطابق نہیں تھی۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر نے کلکتہ سے انگریزی کا مشہور ہفتہ وار "کامریڈ" نکالا۔ ربانی صاحب بحیثیت خازن وہاں کام کرنے لگے۔ اس زمانے میں بلقان کی جنگ چل رہی تھی اور مولانا

محمد علی جوہر کے مضامین کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی کی تائید میں زبردست جوش وخروش پایا جاتا تھا اور بلقان فنڈ میں دھڑا دھڑ روپیہ جمع ہو رہا تھا جو "کامریڈ" کے توسط سے ترکی بھیجا جا رہا تھا۔ بعد میں مولانا جوہر نے کامریڈ (انگریزی) کے ساتھ ایک اردو روزنامہ "ہمدرد" بھی جاری کیا۔ اس زمانے میں "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے ادارہ سے قاضی عبدالغفار، میر محفوظ علی بدایونی (عبدالحق کے خاص ساتھی) ضیاء الدین برنی، سید ہاشمی فرید آبادی، جالب دہلوی اور راجا غلام حسین جیسے لوگ وابستہ تھے۔

ربانی صاحب نے جہاں بھی کام کیا پوری فرض شناسی اور ذمہ داری سے کیا۔ "ہمدرد" کا دفتر اور مولانا جوہر کی رہائش گاہ ایک ہی عمارت میں تھی۔ ایک دن اندر سے ان کی نوکرانی نے آکر کہا کہ "بیگم صاحبہ صاحب کے سگار کے لئے ۲۵ روپیہ منگا رہی ہیں" ربانی صاحب نے جواب دیا کہ "صاحب کی چٹھی لاؤ۔" نوکرانی اندر گئی اور پھر آکر اس نے کہا کہ "بیگم صاحبہ بہت خفا ہو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ بغیر چٹھی کے پیسے دے دو۔" ربانی صاحب نے انکار کر دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پیچھے سے اپنے کندھوں پر کسی کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا انھوں نے مڑ کر دیکھا تو مولانا جوہر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ جوں ہی دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں مولانا نے کہا "ارے بھئی تم نے بہت اچھا کیا۔ مجھے قوم کے پیسے کی حفاظت کے لئے ایسے ہی خازن کی ضرورت تھی۔"

جب بھی ربانی صاحب یہ واقعہ سناتے تھے ان کی آنکھوں میں ایک چمک آ جاتی تھی۔

علی برادران (محمد علی شوکت علی) کی گرفتاری کی وجہ سے "کامریڈ" اور "ہمدرد" دونوں اخبار بند ہو گئے اور ربانی صاحب پھر بے کار ہو کر کلکتہ سے اپنے وطن چلے گئے۔ دو سال بعد "کامریڈ" کے ممتاز صحافی راجا غلام حسین نے جب لکھنؤ سے اپنا ذاتی انگریزی ہفتہ وار "نیو ایرا" جاری کیا تو انھوں نے ربانی صاحب کو منیجر کی حیثیت سے لکھنؤ بلا لیا۔ یہ اخبار کافی اچھا تھا

اور اس زمانے میں "کامریڈ" کا جانشین سمجھا جاتا تھا مگر ٹریفک کے ایک حادثہ میں راجا صاحب کی اچانک اور بے وقت موت کی وجہ سے "نیوایرا" بھی بند ہو گیا۔

ربانی صاحب مولوی عبدالحق کے والد شیخ حسین علی صاحب کے ملنے والوں میں سے تھے۔ مولوی صاحب کے بڑے بھائی ضیاء الحق اور چھوٹے بھائی احمد حسین صاحب سے بھی ان کی ملاقات تھی۔ خصوصاً احمد حسین صاحب سے ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ جب احمد حسین صاحب انجینیر بن کر بھوپال چلے گئے تو ایک بار ربانی صاحب بھی ان سے ملنے وہاں گئے۔ اتفاق سے مولوی عبدالحق صاحب بھی پانی پت سے مولانا الطاف حسین حالی کے آخری مراسم میں شرکت کے بعد اورنگ آباد واپس ہوتے ہوئے (جہاں اُن دنوں انجمن ترقی اردو کا دفتر واقع تھا) ایک دو دن بھوپال میں اپنے بھائی کے پاس ٹھیر گئے تھے۔ یہیں ربانی صاحب اور عبدالحق صاحب کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا[1] اور بعد میں ۲۵ سال تک یہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے رہے۔ چونکہ ربانی صاحب ان دنوں بے کار تھے اس لئے مولوی صاحب نے انھیں انجمن ترقی اردو (جس کے وہ اعزازی معتمد تھے) کے دفتر میں کام کرنے کے لئے بلالیا اور اس طرح ربانی صاحب انجمن کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ مولوی صاحب ان دنوں اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات تھے اور اعزازی طور پر انجمن کا کام بھی کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ربانی صاحب کو تعلیمات میں ملازم بھی رکھوا دیا تھا اور وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں جو ان دنوں کالج سے ملحق تھا) اردو پڑھانے لگے تھے۔ یہیں میرے ماموں مولوی عبدالعزیز صاحب (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) ان کے شاگرد ہوئے تھے۔ ربانی صاحب کے اس زمانے کے قابل ذکر شاگردوں میں میرے ماموں کے علاوہ اردو کے مشہور شاعر سکندر علی وجد اور محامد علی عباسی (سابق معتمد فینانس حکومت آندھراپردیش) شامل

---

[1] مولانا حالی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا [illegible]

میں تہ جد صاحب اپنا ابتدائی کلام ان ہی کو دکھایا کرتے تھے اور ربانی صاحب ان کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

دلی میں نوکری کرتے ہوئے ربانی صاحب رات میں دیر گئے تک مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھکر انجمن کا کام کیا کرتے تھے۔ وہاں ان کے ذمہ انجمن کی مطبوعات اور سہ ماہی رسالہ "اردو" میں اشاعت کی غرض سے آنے والے مسودات کو دیکھنا شامل تھا۔ "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" کی تیاری میں بھی ربانی صاحب نے مولوی صاحب کا ہاتھ بٹایا تھا جس کے دیباچہ میں مولوی صاحب نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ مولوی صاحب کی شہرہ آفاق "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" میں بھی (جو اصل میں کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کا اردو ترجمہ ہے) انھوں نے کام کیا تھا۔ اس زمانے میں پنڈت ونشی دھر ودیا النکار، وہاج الدین اور محوی صدیقی اس کام میں ان کے ساتھ تھے۔ مولوی صاحب ان تمام حضرات کو ساتھ لے کر تراجم کو قطعی صورت دیتے تھے۔ عام طور پر یہ نشست شام کے کھانے کے بعد شروع ہوتی اور رات دیر گئے تک جاری رہتی تھی مولوی صاحب رات کا کھانا مغرب کے فوری بعد کھا لیتے تھے کیونکہ وہ دوپہر میں کھانا نہیں کھاتے تھے۔

اس زمانے میں انجمن کی جانب سے "اردو لغت" کی تیاری کا کام بھی جاری تھا۔ مولوی صاحب اردو کی پرانی کتابوں سے الفاظ نکال کر یہ لغت مرتب کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ربانی صاحب نے بیسوں پرانی کتابیں پڑھ کر سینکڑوں الفاظ تلاش کر کے جمع کئے۔ افسوس کہ یہ کام انجمن کے دلی دفتر میں ۱۹۴۷ء کے فسادات میں تلف ہوگیا۔ اسی زمانے میں ربانی صاحب نے عبدالحق صاحب کی فرمائش پر انجمن ترقی اردو کی سلور جوبلی کے موقعہ پر "انجمن کی کہانی" نامی مختصر سی کتاب لکھی تھی جس میں انجمن کی پوری تاریخ موجود ہے۔ جو بھی انجمن کے ماضی کے بارے میں کچھ پوچھتا تو مولوی صاحب اسے اس کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔

اپنے قیام اورنگ آباد کے زمانے میں ہی ربانی صاحب کی ملاقات مولوی غلام یزدانی صاحب[1] سے ہوئی تھی۔ وہ ان کے قدیم فن تعمیر کے ذوق، پرانے سکوں کے شغف اور تاریخ سے دلچسپی کی بنا پر ان سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ربانی صاحب کو تعلیمات سے آثار قدیمہ میں منتقل ہونے کی دعوت دی تھی۔ اُس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب بھی اورنگ آباد سے جا چکے تھے اور ربانی صاحب بھی اورنگ آباد چھوڑنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے یزدانی صاحب کی اس دعوت کو قبول کر لیا اور حیدرآباد آکر نظامت حیدرآباد میں بحیثیت منتظم دفتر کام کرنے لگے۔ کچھ دن وہ بیدر (موجودہ کرناٹک) میں بحیثیت مہتمم آثار قدیمہ بھی کارگزار رہے لیکن پھر منتقلی پر حیدرآباد آگئے اور ۱۹۵۰ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوکر مستقل طور پر حیدرآباد ہی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ حیدرآباد سے انھیں کچھ ایسی انسیت ہو گئی تھی کہ اگرچہ ان کے سارے رشتہ دار پاکستان میں ہیں پھر بھی وہ پاکستان منتقل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے رشتہ داروں سے ملنے پاکستان جاتے بھی تھے تو کچھ دن رہ کر لوٹ آتے تھے اور تب ہی اطمینان کی سانس لیتے تھے۔ حتّٰی کہ ایک دن اسی خاک میں آسودہ خواب ہو گئے۔

---

[1] غلام یزدانی مرحوم کا شمار ہندوستان کے ممتاز ماہرین آثار قدیمہ میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ پر اردو اور انگریزی میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد میں برسوں تک ناظم آثار قدیمہ رہے اور غارہائے اجنتا کی بازیافت کے بعد اس کی صفائی اور تشہیر میں انھوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ ان کا وطن دلّی تھا لیکن ساری زندگی حیدرآباد میں گزاری اور یہیں آسودہ خاک ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ان کے بچپن کے دوست تھے اور "نذیر احمد کی کہانی" نامی کتاب میں بیگ صاحب نے جگہ جگہ یزدانی صاحب کا ذکر کیا ہے کیونکہ وہ دونوں نذیر احمد سے عربی پڑھتے تھے۔ (رشید)

ربانی صاحب کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار تھی۔ انھوں نے اپنی شادی کی ۶۰ ویں سالگرہ بھی منائی تھی۔ مسز ربانی ایک بے حد خوش اخلاق خاتون ہیں جو مجھ سے اور میرے بچوں سے بے حد شفقت سے پیش آتی ہیں۔ پہلے میں ہر اتوار کو پابندی سے ان کے گھر جاتا تھا لیکن جب سے ربانی صاحب کا انتقال ہوا ہے جانا بہت کم کر دیا ہے۔ در اصل ربانی صاحب کے بغیر ان کا گھر مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ربانی صاحب کے بڑے فرزند غلام یزدانی صاحب ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور اے۔ جی۔ آفس حیدرآباد میں اکاونٹس آفیسر ہیں۔ دوسرے فرزند غلام جیلانی ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم ایس سی ہیں اور اسی یونیورسٹی میں طبیعات کے ریڈر ہیں۔ یہ دونوں حضرات بھی افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے ہیں اور آل انڈیا حیدرآباد سے اکثر ان کی چیزیں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ربانی صاحب کی دو لڑکیاں تسلیم ربانی اور نسیم ربانی ہیں یہ دونوں بھی عثمانیہ یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہیں اور پاکستان میں بیاہی گئی ہیں۔

غلام ربانی مرحوم نے اب تک مختلف موضوعات پر سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔ پہلے ان کے مضامین انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اردو" میں پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ آخری چند سال میں ان کے مضامین زیادہ تر "جامعہ" میں شائع ہوئے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کے بچوں کے رسالے "پیام تعلیم" میں بھی بچوں کے لئے ان کے اکثر بے حد دلچسپ مضامین شائع ہوئے تھے۔ اخباروں میں ان کے مضامین زیادہ تر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ مضامین ماہنامہ "آندھرا پردیش" (حیدرآباد) میں بھی شائع ہوئے تھے۔ بعض دیگر اخبارات و رسائل میں بھی چیدہ چیدہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ در اصل ربانی صاحب کبھی بھی کسی رسالے یا اخبار کو خود سے کوئی مضمون نہیں بھجواتے تھے جب تک کہ ایڈیٹر کی طرف سے فرمائش یا تقاضہ نہ ہوتا۔ انتقال سے چند ماہ پہلے ایک مضمون لکھ کر "[illegible]" (بمبئی) کو بھجوایا تھا جسے [illegible] صاحب نے بے حد پسند کر کے شائع کیا تھا

اور مزید مضامین بھجوانے کو مجھے لکھا تھا لیکن اس کی نوبت نہ آسکی۔

ربانی صاحب کے خاص موضوعات زبان و ادب کے مسائل، تاریخ، آثار قدیمہ، قدیم سکے، طرز تعمیر، مجسمہ سازی علم فلکیات اور موسیقی و مصوری وغیرہ تھے۔ ان کا اپنا ایک منفرد طرز تھا جو بے حد سلیس، دلکش اور موثر تھا۔ نثر میں ان کا تعلق عبدالحق اسکول سے تھا وہ دوسروں کو بھی ایسی ہی زبان لکھنے کی تلقین کرتے تھے اور ادق اور بوجھل زبان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ لوگ پیچیدہ طرز تحریر اور مشکل زبان اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ جس موضوع پر وہ لکھتے ہیں اسے سمجھانے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اس طرح مشکل طرز و زبان کا لبادہ اس پر چڑھا دیتے ہیں۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"مولوی عبدالحق صاحب ضلع بیڑ کے دورہ پر تھے۔ ترل راو صاحب مہتم تعلیمات تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ڈاک بنگلہ میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ ترل راو صاحب کو پاس کے کسی گاؤں میں کچھ کام تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے چلے گئے۔ مولوی صاحب نے ایک پلنگ پر کچھ کپڑے اور بستر رکھ کر اس پر چادر ڈال دی۔ اور ایک تکیہ پر کوئلہ سے آدمی کا چہرہ بنا کر سرہانے رکھ دیا۔ دور سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی آدمی کروٹ لئے سو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ترل راؤ صاحب آئے۔ مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "ارے بھائی! تمہارے کوئی دوست تم سے ملنے آئے ہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ پلنگ پر لیٹتے ہی سو گئے۔ ترل راؤ صاحب نے دروازے میں سے دیکھا تو واقعی کوئی شخص پلنگ پر لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو ترل راؤ صاحب اٹھ کر اندر گئے۔ چادر اٹھائی تو مطلع صاف تھا۔"

("کچھ بلبائے اردو کے بارے میں")

(مطبوعہ تنقیدات مبینہ)

بے شمار مطبوعہ مضامین کے علاوہ ربانی صاحب کی تصنیفات میں "انجمن کی کہانی" کے علاوہ "تاریخ ہند" (یہ تقسیم سے قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں شامل تھی) "ہندو اخلاقیات" (یہ ایک ترجمہ ہے) اور رہنمائے اردو (یہ غیر اردو داں افراد کو اردو سکھانے والی کتاب ہے) شامل ہیں۔ انتقال کے وقت ان کے پاس بے شمار مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین تھے جنھیں مرتب کیا جائے تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ انتقال سے قبل میں نے انھیں مولوی عبدالحق صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے لئے راضی کر لیا تھا لیکن افسوس کہ اس کام کو پورا نہ ہونا تھا۔ کچھ ان کا تساہل اور ہر چیز کو ایک خاص معیار کے مطابق انجام دینے کی عادت نے اس کام کے آغاز ہی میں اتنی دیر کر دی کہ بالآخر موت کے فرشتہ نے صدا دے دی۔ اب یہ ان کے فرزندوں کا کام ہے کہ وہ ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا انتخاب کر کے انھیں کتابی صورت میں شائع کریں۔ مکتبہ جامعہ پر بھی ان کے مضامین کی اشاعت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ان کے آخری دور کے بیشتر مضامین "جامعہ" ہی میں شائع ہوئے ہیں۔

غلام ربانی مرحوم بے حد منکسر المزاج، سنجیدہ، وضعدار، ہمدرد اور شائستہ انسان تھے۔ وہ ایک خاموش اور کم آمیز انسان تھے لیکن جس کے سامنے کھلتے تھے خوب کھلتے تھے اور معلومات کے خزانے بکھیر دیتے تھے۔ مجھ سے اکثر ادھر ادھر کی اور نئی پرانی باتیں کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں تم سے یہ باتیں اس لئے کرتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ تم انھیں اپنی تحریر میں استعمال کرو گے۔ ان سے ملنے کے بعد مجھے اکثر بڑا سکون اور جذباتی چین میسر آتا تھا۔ اور جب بھی ان کے گھر سے لوٹتا تھا بے تحاشہ حالی کا یہ شعر یاد آجاتا تھا ؎

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر<br>
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

افسوس کہ دنیا اب ایسے لوگوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر مہدی بیگم مطلب

# احسن الدین خاں بیاؔن

اورنگ زیب کی وفات سے بہادر شاہ کی معزولی تک اس ڈیڑھ صدی کا زمانہ سلطنت مغلیہ کا نہایت پر آشوب زمانہ تھا جس میں مغل شہنشاہوں کی حالت شطرنج کے بادشاہ کی سی تھی۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی لگاتار جدوجہد نے مغل حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔

اس پر آشوب زمانے میں احسن الدین خاں بیاؔن نے دہلی[1] میں جنم لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میؔر، سوؔدا، دؔرد کے نغمے فضاؤں میں گونج رہے تھے اور اردو شاعری اپنے ارتقاء کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ دؔرد، میؔر، سوؔدا کے مقلدین میں کئی شاعر ایسے تھے جنھوں نے اپنے فن کی دھاک بٹھا دی تھی۔ ان میں بعض تو ایسے تھے جنھیں شہرت ملی اور اردو ادب کی تاریخ میں بلند مقام ملا لیکن بعض ایسی بھی ہستیاں ہیں جو ان گہر ہائے تاب دار کی مانند

---

ڈاکٹر مہدی بیگم مطلب، جامعہ عثمانیہ کیمپس۔ حیدر آباد (آندھرا پردیش)

[1] تاریخ ادب اردو کے فاضل مولف نے لکھا ہے کہ: خواجہ احسن الد، کشمیری النسل تھے اور دلّی میں پیدا ہوئے۔" مگر اس کتاب کے حاشیہ نگار مرتضیٰ حسین فاضل نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "ولادت سب کے نزدیک آگرہ میں ہوئی۔" اسی حاشیہ میں سال وفات ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء لکھا ہے۔ (صفحہ ۲۶۶) صفحہ ۹۰۴ پر فاضل مولف نے لکھا ہے کہ: خواجہ احسن الد بیاؔن شاگرد مظہر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد پہنچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی۔"
۱۱۰۱ء ۱۰۹۱ء

سمندر کی تہہ میں پوشیدہ رہیں اور حسن کی آب و تاب ان جوہریوں کی نظروں سے پنہاں رہی ان ہی غیر معروف لیکن فنکار ہستیوں میں احسن الدین خاں بیانؔ بھی تھے جن کے حالات زندگی پردہ اخفا میں رہے۔ تذکرہ نگاروں کو نہ تو ان کے صحیح نام کا علم ہو سکا نہ ان کی شاعری کی اہمیت کا۔

بیانؔ کے نام کے بارے میں اردو کے تذکروں میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعضوں نے ان کا نام احسن اللہ خاں، احسن الدین خاں، احسان اللہ خاں یا پھر احسن اللہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح کوئی تذکرہ نگار نام کے ساتھ "میر" یا کسی نے "خواجہ" لکھا ہے۔ ذیل میں ان اختلافات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے :

خواجہ احسن اللہ

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | تذکرہ ریختہ گویاں ۱۱۶۶ھ | سید فتح علی حسنی گردیزی |
| ۲۔ | چمنستان شعراء ۱۱۷۵ھ | لچھمی نرائن شفیقؔ |
| ۳۔ | مخزن نکات ۱۱۶۸ھ | قیام الدین قائمؔ |
| ۴۔ | تذکرہ شعرائے اردو ۱۱۸۸ھ تا ۱۱۹۲ھ | میر حسن دہلوی |
| ۵۔ | فص الکلمات ۱۱۹۷ھ | شاہ محمد حمزہ |
| ۶۔ | گلشن بے خار ۱۲۵۰ھ | مصطفیٰ خاں شیفتہؔ |
| ۷۔ | سخن شعراء ۱۲۸۱ھ | عبدالغفور نساخؔ |
| ۸۔ | گلستان بے خزاں ۱۲۹۱ھ | حکیم میر قطب الدین |
| ۹۔ | گل رعنا ۱۳۴۰ھ | عبدالحیٔ |
| ۱۰۔ | انتخاب عظیم ۱۳۶۸ھ | سید عظیم الدین |
| ۱۱۔ | انتخاب شورش | شورش |
| ۱۲۔ | محبوب الزمن | عبدالجبار ملکاپوری |
| ۱۳۔ | خمخانہ جاوید | لالہ سری رام |

| | |
|---|---|
| ۱۴۔ بزم سخن | حسن علی خاں |
| ۱۵۔ جواہر سخن | محمد مبین چڑیا کوٹی |
| ۱۶۔ تاریخ ادب اردو[۲] | رام بابو سکسینہ |

**احسان اللہ**

| | |
|---|---|
| ۱۔ تذکرہ گلزار ابراہیم ۱۱۹۷ھ تا ۱۱۹۸ھ | علی ابراہیم خلیل |
| ۲۔ یادگار ضیغم | عبداللہ خاں ضیغم |
| ۳۔ اردو غزل | ڈاکٹر یوسف حسین خاں |

**احسن اللہ خاں**

| | |
|---|---|
| ۱۔ گلشن ہند ۱۲۱۵ھ | حیدر بخش حیدری |
| ۲۔ گلشن ہند ۱۲۲۵ھ | مرزا علی لطف |

**احسن اللہ**

| | |
|---|---|
| ۱۔ گلشن سخن | مردان علی خاں مبتلا |

**احسن الدین خاں**

| | |
|---|---|
| ۱۔ مجموعہ فصاحت ۱۲۱۶ھ | شاہ تجلی |
| ۲۔ قصائد و قطعات وغیرہ در شاہ ارسطو جاہ وزیر دکن ۱۲۱۶ھ | بدیع |
| ۳۔ اعظم الامرا ارسطو جاہ | عبدالمجید صدیقی |

**خواجہ احسن الدین خاں**

| | |
|---|---|
| ۱۔ مقالات الشعرا ۱۱۷۴ھ | قیام الدین حیرت |

---

[۲] میرے سامنے اس کتاب کا علمی پرنٹنگ پریس لاہور کا ایڈیشن ہے۔ صفحہ ۱۳۵ اور صفحہ ۴۰۹ پر یقیناً خواجہ احسن اللہ ہی لکھا ہے مگر صفحہ ۱۳۵ پر خواجہ احسن اللہ خاں بھی چھپا ہے۔ (لطیف اعظمی)

۲۔ تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء — غلام ہمدانی مصحفی

۳۔ دستور الفصاحت ۱۲۱۳ھ — احمد علی یکتا

۴۔ عمدۂ منتخبہ ۱۲۱۵ھ — میر محمد خاں سرور

۵۔ مجمع الانتخاب ۱۲۱۹ھ — شاہ کمال

۶۔ تذکرہ شعراء ۱۲۵۱ء

۷۔ توزک آصفیہ — شاہ تجلی

۸۔ عیار الشعراء — خوب چند ذکاء

۹۔ تکملۃ الشعراء — شوق رامپوری

۱۰۔ طبقات سخن — غلام محی الدین عشق

۱۱۔ شعر الہند — عبدالسلام ندوی

بیاؔن کے نام کے بارے میں تذکرہ نگاروں کی رائے میں اختلاف کا بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید نام کا پہلا جزو اور تخلص زیادہ مشہور تھا چنانچہ وہ تو سب نے صحیح لکھ دیا لیکن جزو ثانی کو صرف ایسے تذکرہ نگاروں نے صحیح لکھا جن کی بیاؔن سے واقفیت اور ذاتی تعلقات تھے یا پھر ایسے جو نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ ایک ہی استاد کے شاگرد اور ایک ہی مرشد کے مرید تھے۔ جن تذکرہ نگاروں نے احسن الدین خاں کے بجائے احسن اللہ لکھا مردان علی خاں مبتلا ہیں[۳]۔ جنھوں نے گلشن سخن جب مرتب کیا اس وقت بیاؔن بقید حیات تھے اس لئے ضرور یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نام صحیح لکھا ہو۔ لیکن جو شواہد یکے بعد دیگرے ملتے گئے ان سے ثابت ہو چکا ہے کہ بیاؔن کا احسن اللہ نام صحیح نہیں ہے۔

---

[۳] گلشن سخن مبتلا ۱۱۹۴ھ صفحہ ۶۸

اب ایسے تذکرہ نگار جو ان کا نام خواجہ احسن اللہ بتاتے ہیں۔ گردیزی، شفیق، قائم، میرحسن، شاہ محمد حمزہ، شیفتہ، نساخ، قطب الدین، عبدالحئی، محمد عظیم الدین، شور تپش، عبدالجبار خاں ملکاپوری، لالہ سری رام، حسن علی خاں، محمد مبین چڑیا کوٹی اور رام بابو سکسینہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے تذکرہ نگار بیآن کے ہم عصر رہ چکے ہیں بلکہ شفیق کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے چمنستان شعرار کو (جن شعرار کے حالات معلوم نہ ہوسکے) بذات خود مل کر مکمل کیا لیکن یہاں بھی ہم کو مایوسی ہوتی ہے کہ کن وجوہات کی بنار پر انھوں نے لکھنے میں غلطی کی ہے بعد کے تذکرہ نگاروں کی غلطی کا سبب شاید یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی معلومات کا ماخذ اول الذکر تذکرہ نگاروں کے تذکرے رہے ہوں چنانچہ خواجہ احسن الدین بیآن نام ہماری تحقیق میں غلط ثابت ہوا ہے۔

اب صرف ایسے تذکرہ نگار باقی رہ جاتے ہیں جنھوں نے احسان اللہ لکھا ہے ان میں خلیل[۴] اور ضیغم[۵] قابل ذکر ہیں لیکن بیآن کا احسان اللہ نام بھی صحیح نہیں ہے۔

حیدر بخش حیدری[۶] اور علی لطف[۷] نے گلشن ہند بیآن کے انتقال کے دو سال بعد یعنی ۱۲۱۵ھ میں لکھا صرف احسن اللہ خاں لکھتے ہیں خواجہ کا لفظ ان دونوں کے پاس نہیں ملتا کہا نہیں جاسکتا کہ ان دونوں کے پیش نظر مبتلا کا تذکرہ تھا یا نہیں لیکن انھوں نے احسن اللہ کے ساتھ "خاں" کا ضرور اضافہ کیا ہے لیکن ہمارے خیال میں احسن اللہ خاں بھی غلط ہے۔

ہمارے خیال میں بیآن کا صحیح نام احسن الدین خاں ہے۔ اس بیان کی تائید مندرجہ ذیل شواہد سے ہوتی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے جوان کا پورا نام جانتے تھے جن کا قول

---

۴ۓ تذکرہ گلزار ابراہیم صفحہ ۶۵ ۔ ۵ۓ یادگار ضیغم صفحہ ۱۲۵

۶ۓ گلشن ہند صفحہ ۶۵ ۔ ۷ۓ ایضاً صفحہ ۶۵

لکھدیا ہے لیکن بعض ایسے جنھوں نے نام کے پہلے جز یعنی "خواجہ" کو زیادہ اہمیت نہ دی ہو یا پھر نظرانداز کردیا حالانکہ کسی شاعر کے نام کا ہر جز بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

۱۔ بدیعی[۸] جس نے ارسطوجاہ پر لکھے گئے سارے قصائد کو ایک مجموعہ کی شکل دی ہے جس میں بیاںؔ کا بھی ایک قصیدہ جو ارسطوجاہ کی مدح میں لکھا گیا تھا اس میں قصیدے کے آخر میں وہ بیاںؔ کا نام احسن الدین خاں لکھتے ہیں۔

۲۔ اس طرح عبدالمجید صدیقی[۹] نے اپنی کتاب "اعظم الامراء ارسطوجاہ" میں ان کا نام احسن الدین خاں ہی بتایا ہے۔

۳۔ ان کے علاوہ بیاںؔ کے شاگرد رائے گلاب چند ہمدمؔ جنھوں نے اپنا دیوان اپنے استاذ بیاںؔ کی زندگی میں مرتب کیا تھا۔ اس کے دیباچے میں اور استاد کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے میں ان کا نام احسن الدین خاں بتایا ہے۔ قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

کون یعنی احسن الدین خاں بہادر کی جناب
ہے بیاںؔ جس کا تخلص فخر دے جو شعر کو[۱۰]

ان سب سے قطع نظر کتب خانہ سالار جنگ میں ایک اور قلمی بیاض ہے جس میں ارسطوجاہ کے دربار سے متوسل ڈیڑھ سو شاعروں کے قصائد میں شاہ تجلی علی جو بیاںؔ کے ہم عصر رہ چکے تھے ان قصیدوں کو مرتب کیا ہے[۱۱]۔ اس بیاض کے باب الباء کے نیچے بیاںؔ

---

[۸] مجموعہ قصائد و قطعات وغیرہ در شاہ ارسطوجاہ وزیر دکن ۱۲۱۶ھ صفحہ ۱۷۶۔

[۹] اعظم الامراء ارسطوجاہ صفحہ ۴۸

[۱۰] دیباچہ دیوان ہمدم۔ گلاب چند ہمدمؔ .... دریں روزگار رفیض آثار ذات بابرکات افزائے بزم سخنوری و زیب بخشای انجمن ہنرپروری سرآمد سخن آرایاں جہاں استاد زماں احسن الدین خاں خان بہادر بیاںؔ

[۱۱] مجموعہ فصاحت شاہ تجلی صفحہ ۲۱۲۔

کے قصیدے سے پہلے ان کا نام احسن الدین خاں ہی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ قصیدے کے ساتھ اس بیاض میں یہ چار مصرعے بھی درج ہیں :

الیسی قدرت سے لایا ہے اے عالی جناب
بعد مدت کے ہوا ہے آرزو کا فتح یاب
دوست دشمن نیک و بد سب آکے حاضر ہو چکے
احسن الدین خاں نہیں خدمت میں ابتک باریاب

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیان نے خود شعر میں اپنا نام لکھدیا ہے اس شعر کے پڑھنے کے بعد مزید کسی شبہ کی گنجائش نہیں لیکن ہماری تحقیق میں اس سے بھی اہم چیز جو دستیاب ہوئی ہے وہ اسٹیٹ آرکائیز کی وہ اہم دستاویز ہے جس میں ان کو دیے گئے خطاب کے ساتھ ان کا پورا نام درج ہے یعنی احسن الدین خاں بہادر۔ اس کے علاوہ مصحفی نے تذکرہ ہندی، قاسم نے مجموعہ نغز، سرور نے عمدہ منتخبہ، شاہ کمال نے مجمع الانتخاب اور تجلی نے توزک آصفیہ میں خواجہ احسن الدین خاں ہی لکھا ہے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آخر اس تسامح اور اختلاف کا کیا سبب ہو سکتا ہے اس کا صرف ایک ہی سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں کی معلومات کا ماخذ پہلے کے چند تذکرے تھے جنھوں نے ان تذکروں میں جو بھی پڑھا اسی کو یکے بعد دیگرے لکھتے چلے گئے۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں کیا خامیاں رہ گئی ہیں اور ان کو کس حد تک درست کیا جاسکتا ہے۔ ان کوتاہیوں کے باوصف قدیم شاعروں کے حالات، تہذیب و تربیت کا ان تذکروں سے بہتر ماخذ ہماری دسترس سے باہر ہے اس لئے ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ ان تذکرہ نگاروں میں سب سے زیادہ اہم قاسم، مصحفی، شاہ کمال اور شاہ تجلی اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ یہ لوگ نہ صرف ان کے ہم عصر رہ چکے ہیں بلکہ ان کا تعلق بیان

سے بہت قریبی رہا ہے۔ ان کی تحریر کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ اس کی تصدیق آرکائیز کی اس دستاویز سے ہوتی ہے جس میں بیآن کا پورا نام معہ خطاب کے درج ہے۔

دکن میں بیآن کی قدر و منزلت ہوئی اور خطاب سے نوازا گیا۔ کسی تذکرہ نگار نے بیآن کے خطاب کا ذکر نہیں کیا خطاب کی وجہ سے ان کی زندگی کے دو اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ ان کے ہم عصر شعراء میں ان کے مقام کا تعین کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت ان کو دربار میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔

۲۔ ذریعہ معاش پر بھی روشنی پڑتی ہے کیونکہ عام طور پر خطاب کے ساتھ جاگیر یا منصب بھی عطا کیا جاتا تھا۔

ان کے شاگرد رائے گلاب چند ہمدم نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اور استاد کی مدح میں لکھے گئے قصیدے میں نام کے ساتھ ان کا خطاب یعنی "خاں بہادر" لکھا ہے[۱۱]۔ اس کے علاوہ کتب خانہ آصفیہ میں بیآن کا جو دیوان ہے اس کے پہلے صفحہ پر بیآن کے نام کے ساتھ خاں بہادر لکھا ہوا ہے لیکن واضح الفاظ میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ خاں بہادر ان کا خطاب ہے۔

بیآن کے خطاب کا ریکارڈ (اسٹیٹ آرکائیز) میں موجود ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

| نام | منصب | اضافہ | خطاب | |
|---|---|---|---|---|
| خواجہ احسن الدین بیآن تخلص | اصل ۲۶ رمضان ۲۶ سنہ شاہ عالم یکہزاری و خطاب خانی و خطاب بہادر العلم | ۱۶ جمادی الاول ۲۷ سنہ شاہ عالم یکہزاری ذات | دو ہزاری ذات العلم | خانی و بہادری |

---

[۱۱] دیباچہ دیوان ہمدم... بزم سخن وری و زیب بخشای انجمن ہنرپروری سرآمد سخن آرایان جہان اعنی استاد و زمان احسن الدین خاں بہادر بیآن ...

خواجہ احسن الدین بیآن ۲۶ ر رمضان جلوس سنہ ۲۶ لغایتہ ۱۱۹۹ھ کو یکہزاری ذات وخطاب خانی عطا ہوا۔

اور پھر دوسرے سال یعنی جلوس ۱۹ ر جمادی الاول ۲۷ سنہ لغایتہ ۱۲۰۱ھ کو پھر یکہزاری یعنی دوہزاری ذات الاعلم اور خطاب خانی وبہادری عطا کیا گیا۔

اصل ۲۷ ر رمضان ۲۶ سنہ شاہ عالم یکہزاری ذات وخطاب خانی } دوہزاری ذات الاعلم
اضافہ ۱۹ ر جمادی الاول ۲۷ سنہ شاہ عالم یکہزاری ذات } خانی وبہادر وخطاب بہادر الاعلم

---

خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دلّی میں پیدا ہوئے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی۔ ۱۲۱۳ھ [۹۸-۱۷۹۸ء] میں وفات پائی اور حیدر آباد ہی میں مدفون ہوئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے: "اُستاد از جہاں رفت"۔ میر حسن اپنے تذکرے میں ان کے بڑے معترف ہیں، لکھتے ہیں: "شاعر عذب البیان اور خوش گویان زمان... زیج نامہ از مشہورست بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد"۔ نمونہ کلام یہ ہے:

کوئی کسی کا بیآن آشنا نہیں دیکھا سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا
مصلحت ترک عشق ہے ناصح لیک ہم سے یہ ہو نہیں سکتا
سمجھتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہنچ کانوں تلک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ
بیآن کون ہے، اب تلک پوچھتے ہو تغافل کے قرباں، تجاہل کے صدقے

(تاریخ ادب اردو)

استدراک

# مثنوی مولوی معنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ

جامعہ کے ستمبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں مثنوی مولوی معنوی (دفتر اول) کے قدیم ترین نسخہ (نسخہ قونیا۔ ترکی) اور نسخہ مطبع نامی کانپور کے پہلے ۲۲ اشعار کا موازنہ پیش کیا گیا تھا۔ اب یہاں مثنوی (دفتر اول) کے چند دوسرے نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنھیں مستند اور معتبر مانا گیا ہے۔[1]

## (۱) نسخہ برٹش میوزیم لندن

یہ باریک خط نستعلیق میں علی بن محمدؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل نسخہ ہے۔ تاریخ کتابت ۷۱۸ھ ہے یعنی مصنف کی وفات ۶۷۲ھ سے صرف ۴۶ سال بعد۔

## (۲) نسخہ کتب خانہ ٹیوبنج (جرمنی)

یہ نسخہ مصنف کی وفات سے ۷۲ سال بعد لکھا گیا۔ کاتب کا نام محمد بن الحاج دولت شاہ بن یوسف الشیرازی ہے اور سالِ کتابت ۷۴۴ھ ہے۔ صحتِ کتابت اور خوشخطی میں ممتاز ہے۔

---

[1] یہ تفصیلات مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے ایک پرانے مضمون مطبوعہ 'مرقع' لکھنؤ (جنوری ۱۹۲۶ء ص ۱۷) سے اخذ کی گئی ہیں۔

## (۳) نسخہ نکلسن

یہ نسخہ پروفیسر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) کی ملکیت تھا۔ سالِ کتابت ۸۴۳ھ۔ گویا مصنف کی وفات کے ۱۷۱ سال بعد لکھا گیا۔ کاتب کا نام درج نہیں۔

## (۴) نسخہ برٹش میوزیم (دیگر)

یہ صرف دفترِ اول کا نسخہ ہے۔ سالِ کتابت درج نہیں۔ کتابت خطِ نسخ میں ہے۔ اعراب اکثر غائب ہیں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم ہے۔

## (۵) نسخہ "ناسخہ مثنویات سقیمہ"

یہ شیخ عبداللطیف عباسی گجراتی کا مشہور نسخہ ہے جس کے متعلق مؤلف کا دعوے ہے کہ یہ اسّی مختلف نسخوں سے مقابلہ کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ شیخ عبداللطیف کا سالِ وفات ۱۰۴۸ھ کہا جاتا ہے۔ مولانا عبدالماجد مرحوم نے اس کا ایک نسخہ مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔

(۶) صحتِ متن اور حواشی کے لحاظ سے پروفیسر نکلسن کا انگریزی نسخہ بہترین ہے۔ یہ لیڈن (ہالینڈ) کے مشہور مشرقی مطبع بریل کمپنی کے زیرِ اہتمام طبع ہوا تھا اور اس کی اشاعت لندن کی مشہور فرم لیوزک اینڈ کو نے کی تھی۔

کالیداس گپتا رضا

# تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

## نوائے آوارہ از غلام ربانی تاباںؔ

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

'نوائے آوارہ' اردو کے ممتاز و معتبر ترقی پسند شاعر جناب غلام ربانی تاباںؔ کی غزلوں کا غالباً تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے "حدیث دل" اور "ذوق سفر" کی اشاعت کی پذیرائی اردو کے حلقوں کی طرف سے کی جا چکی ہے۔ یوں تو تاباںؔ صاحب نے ماضی میں نظمیں بھی لکھی ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور اس کے برتنے کے سارے رموز و اسرار سے واقف ہیں۔ غزل گوئی ہمارے بیشتر شعراء کے لئے عادت کا درجہ رکھتی ہے مگر تاباںؔ صاحب کے لئے یہ آگہی ہے اور مکمل اور معمور آگہی ہے۔

وہ غزل کے غنائی ادراک و اظہار کے وسیلوں پر قدرت رکھتے ہیں اور یہ بات جانتے ہیں کہ حریم غزل میں

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست

اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ غالبؔ کی زبان میں بے خودی میں بھی "انداز گفتار" کا خیال رکھنا ضروری ہے ورنہ رند پر شراب حرام ہو جاتی ہے۔ اِن "محرماتِ فن" کے احساس کے تحت کی جانے والی غزل گوئی میں احتجاجی لب و لہجے کا شور و شر نہ ہوگا اور جو کچھ بھی شاعر دیکھے گا

اس میں "شائستگیٔ دیدہ تر" ہوگی اور وہ جو کچھ کہے گا اس میں نوائے زیرلبی کی سکوت آلود حلاوت ہوگی۔ تاباں صاحب کی غزل میں لب و لہجے کی شائستگی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے اور اسے میں ان کے شعری محاورے کا بنیادی وصف سمجھتا ہوں۔ آج ہماری غزل ہی کیا جملہ اصناف ادب میں استحکام یافتہ تہذیب کے بخشے ہوئے لب و لہجے کے خلاف ایک شدید لہر رواں ہے اور تہذیب کے عدم استحکام کے احساس کے تحت ایک غیر مستحکم آہنگ کو حقیقی تہذیبی صورت حال کے اظہار کے لئے مناسب و موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ اس لہر کی زد میں ہماری غزل بھی آچکی ہے۔ چنانچہ آزاد غزل کے تجربے بھی کئے جا رہے ہیں۔ غزل کی روایتی اشاریت سے گریز کرکے نئے پیکروں اور استعاروں کی تخلیق کا عمل جاری ہے۔ سب سے اہم رجحان غزل کو اس کی روایتی تعمیم سے محروم کرکے تجربے کی تخصیص عطا کرنے کا رجحان ہے۔ بلاشبہ ان میں سے بعض رجحانات نے ہماری غزل کو معنی خیز طور پر بدل کر رکھ دیا ہے اور اسے تجربے اور اس کے اظہار کے نئے آفاق سے آشنا کیا ہے۔ فن کو غیر فن کے ذریعہ مسخر کرکے ازسرنو فن میں تبدیل کرنے کا عمل عالمی سطح پر جاری ہے۔ غزل کا فن غیر فن کے چیلنج کا مقابلہ کس طرح کرے گا اور اپنا کیا کچھ برقرار رکھ سکے گا، اس کے بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ لیکن فیضؔ اور تاباںؔ جیسے شعراء کے کلام سے کچھ امید بندھتی ہے کہ غزل، بہت کچھ بدل جانے کے باوجود، بنیادی طور پر غزل رہے گی۔ تاباں صاحب نے اس سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے:

> "زبان و بیان کے معاملے میں میرا خیال ہے کہ کھردری زبان اور اکھڑے اکھڑے اندازِ بیان کی غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی کی نظر میں یہ جرم ہے تو میں اپنے جرم کا اقبال کرتا ہوں لیکن عصری حسیت کے نام پر غزل کے لہجے کی نرمی کو مجروح کرنے اور اس سے حسن و لطافت چھین لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" نوائے آوارہ ص ۱۰۳

کلاسیکی دروبست کے ساتھ لکھی جانے والی غزل کی میرے خیال میں ایک اہم دفاعی لائن فیض، جذبی اور تاباں کی غزل ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے ہماری نسل کو پسپا ہوتی ہوئی تہذیب کی آخری چوکی قرار دیا تھا۔ اس "آخری چوکی" کو میں کلاسیکی اور نو کلاسیکی غزل کا استعارہ سمجھتا ہوں۔ اس کی مدافعت میں المیہ شکوہ کی موجودگی ایک مخصوص حسن رکھتی ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے۔

تاباں کی غزل کو ہمیں نئی غزل کے معیاروں سے نہیں بلکہ ترقی پسند غزل کے معیاروں سے پرکھنا چاہیئے۔ یہی حقیقی تنقیدی نقطہ نگاہ ہے۔ اس لیئے کہ تنقید کے معیار بہرحال تخلیق سے اخذ کیئے جاتے ہیں یا اخذ کیئے جانے چاہیئیں۔ ترقی پسند غزل نے اپنے انداز سے غزل کی دنیا کو وسعت بخشی تھی، اس میں اپنے نظریۂ حیات کی آباد کاری کی تھی۔ اس نے نئی علامتوں کی تخلیق سے زیادہ پرانے علائم میں نئے تلازموں کے اضافے کا کام کیا تھا۔ یہ تبدیلی کوئی بڑی تبدیلی تھی یا نہیں، اس پر تو بحث کی جا سکتی ہے مگر اس تبدیلی کے انقلابی کردار سے انکار نا انصافی ہے۔ جدید غزل زیادہ بڑے اور وسیع کردار کی خبر دیتی ہے مگر اس خبر کی پذیرائی کے جوش میں ہمیں ترقی پسند غزل کے حسن سے منکر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مغرب میں جدیدیت کی جتنی بھی تحریکیں تھیں ان میں ابتدا ً ترقی پسند انقلابی عنصر موجود رہا ہے اس عنصر کی موجودگی جدیدیت اور ترقی پسندی کے فاصلے کو جو ہمارے یہاں اردو میں موجود ہے کم کر سکتا ہے یا کم از کم جدیدیت کو ترقی پسند فن میں حقیقی فنی عناصر کی موجودگی کے احساس و اعتراف کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

تاباں صاحب کی غزل میں عصری حسیت کی کمی کی طرف ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے ایک مقالے میں اشارہ کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں عصری حسیت کا کیا تصور ہے۔ عصری حسیت کا ایک وہ تصور ہے جسے جدیدیت نے عام کیا ہے جو تہذیب کے زوال انسان کی گناہ آلودگی اور عدم تکمیل کے احساس پر مبنی ہے اور اس دور کی سائنسی ترقی کو عذاب سمجھتا ہے اور ٹکنالوجی کے دور سے قبل کی تہذیب کو ORGANIC LIFE

کی علامت تصور کرتا ہے اور اسی طرح کے قیام کو اپنے وژن کا ایک اہم جزو قرار دیتا ہے۔ یقیناً اس وژن کا اظہار مغرب کے جملہ فنون لطیفہ کے ذریعہ انتہائی موثر طریقہ پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ لیکن عصری حسیّت کا ایک پہلو اور بھی ہے جو تہذیب کے زوال کا احساس رکھتا ہے مگر انسان کی اس صلاحیت کا بھی معترف ہے کہ وہ موجودہ تہذیبی بحران پر قابو پا سکتا ہے، اور تمام تر سائنسی ترقیات کی تردید کے بغیر ایک ایسا نظام قائم کر سکتا ہے جو انسان کو علاحدگی کے عذاب سے نکال کر ایک معنی خیز نظام سے مربوط کر سکے۔ مغربی یورپ میں یہ ترقی پسند حسیّت در اصل ایک اقلیتی حسیّت ہے مگر اس حسیّت کا وجود ضرور ہے۔ مشرقی یورپ اور ایشیا میں یہ صورت نہیں ہے، ہم اس حسیت کے حقیقی اور پرخلوص ہونے سے انکار کر سکتے ہیں، یہ جس نظام کے ذریعہ فرد اور تہذیب کی شیرازہ بندی کرنا چاہتی ہے، اس کے تخلیقی امکانات سے انکار کر سکتے ہیں مگر یہ بات کہ یہ عصری حسیت کی ایک صورت ہے جس کا اظہار ادب کا ترقی پسند نظریہ مختلف ممالک کے ادبیات میں کرتا ہے، اس سے انکار علمی دیانت سے محرومی ہے۔ ہم کو ترقی پسند WORLD VIEW سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ہم اس کے وجود سے منکر ہو جائیں، یا اس کے تاریخی کردار سے انکار کریں، کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

تاباں صاحب کی غزل عصری حسیّت کے ترقی پسند پہلو کا اظہار کرتی ہے اور "نوائے آوارہ" میں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ روایتی ترقی پسند حسیّت کے FRAME WORK سے کچھ آگے بھی دیکھنے لگے ہیں اور ہم نے جن اقدار کو روایتی طور پر ترقی پسندی کی پہچان بنا لیا تھا، اُن سے گریز نہیں تو کم از کم، اُن سے ماوراء اُن حقیقتوں کے ادراک کی جرأت کی گئی ہے جو جدید حسیت کے مقبول مظاہر سے مخصوص ہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر تاباں صاحب کا کلاسیکی دروبست اب بھی قائم ہے، پھر بھی اس کی فضا میں تھوڑی سی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں جو ان کے شعری محاورے اور حسیّت میں تبدیلی کی

طرف اشارہ کرتے ہیں:

رہگذر ہو یا مسافر نیند جس کو آئے ہے
گرد کی میلی سی چادر اوڑھ کر سو جائے ہے

---

یہ اور بات ہے ٹوٹے نہ بے حسی کا طلسم
صدا لگاتے رہو، پتھروں کے صحرا میں

---

نہ جانے گردِ سفر ہے کہ آندھیوں کا غبار
جدھر نگاہ اٹھاؤں، دھواں دھواں سا لگے

---

کسے پڑی تھی کہ دشتِ سراب میں آتا
مجھے تو شہر کے پیاسوں کا کارواں سا لگے

---

کیا خبر تھی ٹوٹے گا جب طلسم سمتوں کا
میری طرح آوارہ ہو گی میری منزل بھی

---

ہر طرف بکھرا ہوا ہے دور تلک پیاس کا رنگ
کون کہتا ہے کوئی حسن سرابوں میں نہیں

یہ اور اس طرح اور بہت سے اشعار حسّیت اور محاورے کی ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ تاباں صاحب اپنی شعری پہچان کے حدود میں رہتے ہوئے بھی غزل کے نئے مزاج سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں اور نئی ترقی پسند حسّیت کو

وسعت دے رہے ہیں وہ نئی ترقی حسیت جس کے خطوط مشہور ترقی پسند مارکوزے نے اپنی کتاب AN ESSAY ON LIBRATION میں نمایاں کیے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے یہاں کے ترقی پسند اپنی محدود بصیرت کی وجہ سے مارکوزے کے افکار کی پذیرائی نہ کریں اور اُسے مرتد قرار دیں۔

تاباںؔ صاحب ہموار لب ولہجے کے شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں اپنے حُسن کی ہمواری کا ایک انداز رکھتی ہیں۔ ان کی شعری دنیا اپنی مخصوص کشش کی وجہ سے ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ ان کے شعری تجربے ہمیں استعجاب کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی استقامت کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں۔ تاباںؔ صاحب ہماری ترقی پسند غزل کی موقر اور معتبر آواز ہیں۔

(انور صدیقی)

## یادیں از رحم علی الہاشمی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۱۲۰ صفحات، غیر مجلد، قیمت: آٹھ روپے، تاریخ اشاعت: اکتوبر ۱۹۷۶ء۔ مصنف سے ۴۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱ کے پتے پر کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف جناب رحم علی الہاشمی صاحب اردو کے قدیم ترین صحافت نگاروں میں سے ہیں۔ موصوف نے اپنی صحافت نگاری کا آغاز انگریزی کے مشہور اخبار "انڈی پنڈنٹ" (الہ آباد) سے کیا، اس کے بعد روزنامہ "ہمدم" (لکھنؤ)، انگریزی ہفتہ وار "اسٹار" (پٹنہ)، روزنامہ "تریاق" (لاہور) اور انگریزی ہفتہ وار "میسج" (دہلی) وغیرہ میں کام کیا۔ اس کے علاوہ موصوف نے چند کتابیں بھی لکھی ہیں، مثلاً: "فن صحافت" (اخبار نویسی کے اصول اور طریقے) اور "مردم شماری" (۱۹۴۱ء کی مردم شماری و تبصرہ) اور چند انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں، مثلاً "اسلام دوراہے پر" اور "ہندوستان کے تمدن پر اسلام کا اثر"۔ زیر تبصرہ۔ "یادیں" موصوف

کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو چند سال پیشتر انگریزی میں شائع ہوئی تھی اور اب کچھ اضافوں کے ساتھ اردو میں شائع ہوئی ہے۔ ایک لحاظ سے کتاب کے دو حصے ہیں، صفحہ ۵ سے صفحہ ۷۵ تک میں فاضل مصنف کے حالات و واقعات ہیں اور صفحہ ۷۶ سے صفحہ ۱۲۰ تک ان شخصیات کے متعلق مختصر نوٹ ہیں جن سے انھیں اپنی زندگی میں واسطہ پڑا یا کسی نہ کسی قسم کا تعلق تھا، ان میں بعض مشہور شخصیتیں آگئی ہیں، مثلاً اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱)، پنڈت موتی لال نہرو (۱۸۶۱-۱۹۳۱)، مسیح الملک حکیم اجمل خاں (۱۸۶۳-۱۹۲۷)، مولانا محمد علی (۱۸۷۸-۱۹۳۱)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰-۱۹۳۶)، مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸)، حسرت موہانی (۱۸۸۱-۱۹۵۱)، سید جالب دہلوی (۱۸۷۴-۱۹۳۰)، ڈاکٹر تارا چند (۱۸۸۸-۱۹۷۳) وغیرہ۔

کتاب اتنی ہی دلچسپ ہے جتنی عام طور پر خود نوشت سوانح عمریاں ہوا کرتی ہیں، کہیں کہیں بڑے ہی دلچسپ واقعات آگئے ہیں۔ مولانا آزاد سے متعلق بہت سے لوگوں نے ایسے واقعات لکھے ہیں، جن سے ان کی عظمت اور فراخدلی پر روشنی پڑتی ہے، ایک واقعہ اس کتاب میں بھی بیان ہوا ہے جو بڑا دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں کہ: "وہ ایک مرتبہ دلی کے آگرہ ہوٹل دریا گنج میں مقیم تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور اسی وقت ایک آدمی نے آکر انھیں ایک خط دیا جسے کھول کر انھوں نے پڑھا۔ اسی خط میں ایک سو روپیہ کا نوٹ تھا جسے مولانا نے خط کے ساتھ لفافے میں رکھ کر میز پر رکھ دیا اور کسی کام سے غسل خانے چلے گئے۔ واپسی میں انھوں نے دروازے پر سے دیکھا کہ ان صاحب نے نوٹ لفافے سے نکال کر جیب میں رکھ لیا، لیکن مولانا نے ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے۔ جو لوگ پاس بیٹھے تھے انھوں نے کہا کہ مولانا آپ نے تو ان صاحب کو نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھتے دیکھ لیا تھا پھر ان سے کیوں نہیں لیا۔ مولانا نے فرمایا: "میرے بھائی انھیں ضرورت ہوگی، مجھے اللہ اور دے گا۔" بعد کو معلوم ہوا کہ مولانا نے ہوٹل کا

حساب کرنے کے لئے یہ سو روپے حاجی محمد صالح سے قرض منگائے تھے۔ (ص ۷۰) ایک بات شوکت تھانوی (۱۹۰۴-۱۹۶۳) کے متعلق لکھی ہے جو شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جب انھوں نے "ہمدم" کی اڈیٹری کا کام سنبھالا تو اس وقت اس کے دفتری عملے میں شوکت تھانوی اشتہارات کے کلرک تھے۔ "میں نے سارے عملے سے اجتماعی اور انفرادی طور پر گفتگو کی اور ان کی تحریروں کے نمونے دیکھے اور سب سے پہلے شوکت تھانوی کو دفتری عملہ سے اڈیٹوریل عملے میں منتقل کیا اور انھیں اخبار کے مزاحیہ مضامین "دو دو باتیں" کے عنوان سے لکھنے پر مامور کیا۔ چنانچہ ان کی "سودیشی ریل" پہلے "دو دو باتیں" ہی کے ذیل میں شائع ہوئی جس پر میری کافی اصلاحیں تھیں، بعد کو شوکت صاحب نے اسے بڑھا کر کتاب کی شکل میں شائع کیا۔" (صفحہ ۴۴)

میری نظر میں کتاب کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں تاریخیں قریب قریب بالکل نہیں ہیں۔ اس کے بارے میں محترم مصنف نے پیش لفظ میں یہ عذر کیا ہے کہ "چونکہ تاریخوں کے متعلق میری یادداشت کمزور ہے، اس لئے میں نے تاریخیں حذف کر دی ہیں، تاکہ تاریخوں اور واقعات میں خلط مبحث نہ ہو جائے۔" جب یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی تھی تو میں نے موصوف سے گذارش کی تھی کہ اسے اردو میں ضرور شائع کیجئے اور اردو میں لکھتے وقت یا ترجمہ کرتے وقت تحقیق کر کے اور مختلف اخبارات اور کتابوں کی مدد سے تاریخوں کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کی افادیت اور معنویت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ موصوف نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں اپنی موجودہ صحت اور عمر (اس وقت موصوف کی عمر ماشاء اللہ ۷۹ ویں سال میں ہے) کے پیش نظر یہ کام نہیں کر سکتا، اگر تم کر دو، خاص طور پر مرحوم اشخاص کے سنہ ولادت و وفات کا تو بہت اچھا ہو، ان کی یہ فرمائش پوری کرنا چاہتا تھا، مگر اس زمانے میں ایک کتاب کی تالیف میں بہت زیادہ مصروف تھا، اس لیے فوری طور پر وقت نہ نکال سکا اور اردو ترجمے کا مسودہ پریس کے حوالہ کر دیا گیا۔ اس کی

کے باوجود کتاب بہت ہی مفید ہے اور اس کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ
ر ایک صحافت نگار اور ادیب کی راہ میں کیا کیا مشکلات اور رکاوٹیں آسکتی ہیں، خصوصاً اگر
وہ آسودہ حال نہ ہو، لیکن اگر وہ جذبۂ صادق اور عزم و حوصلے سے کام لے تو راہ کی مشکلات
ائی کی طرح چھٹ جاتی ہیں اور بالآخر اسے کامیابی وکامرانی نصیب ہوتی ہے۔

## جدید عربی شاعری از نسیمہ فاروقی (ایم اے)

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۲۰۷ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت: آٹھ روپے۔ تاریخ اشاعت:
اگست ۱۹۷۷ء۔ ملنے کا پتہ: ڈی ۔ ۵۰/۲۱۶ قاضی پورہ کلاں۔ وارانسی ۔ ۲۲۱۰۰۱

زیر تبصرہ کتاب بہت ہی مختصر ہے، مگر چونکہ جدید عربی شاعری اور شعرا پر اردو میں بہت
لکھا گیا ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہے، اس لئے اپنے
ختصار کے باوجود مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ اس میں مولفہ صاحبہ کے الفاظ میں: "جدید
ربی شاعری کے تمام رجحانات وتحریکات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ البتہ شعرا کے سلسلے میں
تخاب کے اصولوں پر عمل کیا گیا ہے اور صرف وہی شعرا اس بزم کی رونق ہیں جنھوں نے
دو پیش کو متاثر کیا ہے یا کسی خاص رجحان کی نمایندگی کی ہے۔" (صفحہ ۱۵)

کتاب سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک کی مدت پر مشتمل ہے اور فہرست مضامین کے لحاظ سے
ن ابواب میں منقسم ہے: (۱) تاریخی پس منظر (۲) عربی شاعری کا ارتقا (۳) جدید عربی شاعر
ن آخری باب کے تحت منتخب شعراء کے مختصر حالات درج کئے گئے ہیں اور ان کی شاعری
تبصرہ کیا گیا ہے۔ غالباً مصنفہ کی یہ پہلی کوشش ہے، اس لیے اس میں وہ خوبیاں تو نہیں
ہ جو ایک منجھے ہوئے اور تجربہ کار ادیب کی کتابوں میں ہوا کرتی ہیں اور سب سے بڑی کمی
ہ یہ نظر آئی کہ عربی اشعار کے ترجمے نہیں دئے گئے ہیں، جس کی وجہ سے ایک ایسا شخص جو
بان سے واقف نہیں ہے وہ اس کتاب سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا ہے مگر

پھر بھی اپنے مواد اور مباحث کے لحاظ سے کتاب مفید ہے اور اس لائق ہے کہ ہر کتب خانے میں موجود ہو۔

## ماہنامہ کتاب نما ــــ مرزا دبیر نمبر مرتبہ : عبدالقوی دسنوی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۰۰ صفحات، غیر مجلد، عام شمارے کی قیمت : ۵۰ پیسے، سالانہ چندہ ۵ روپے، اس خاص شمارے کی قیمت : ساڑھے سات روپے۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ 110025

اردو کے دو چوٹی کے مرثیہ گو شعرا مرزا سلامت علی دبیر (۱۸۰۳ - ۱۸۷۵) اور میر ببر علی انیس (۱۸۰۳ - ۱۸۷۴) نہ صرف یہ کہ معاصر تھے بلکہ ایک دوسرے کے گہرے دوست اور مخلص قدر دان تھے، مگر دونوں کا میدان فن یا میدان شاعری ایک ہی تھا، اس لئے اگرچہ ان دونوں بزرگوں میں معاصرانہ چشمک نہیں تھی مگر ان کے مداحوں اور شاگردوں میں ان کی افضلیت اور فوقیت کے بارے میں شدید اختلاف تھا اور اس اختلاف کی بنیاد اتنی گہری اور مضبوط پڑی کہ باوجودیکہ ان کی وفات پر سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے مگر اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کے ادبی و شعری کمالات اس وقت تک نکھر کر سامنے نہیں آسکتے جب تک ان کا باہمی مقابلہ نہ کیا جائے۔

۱۹۷۵ء میں جب ہندوستان میں انیس کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں تو دبیر کے حامیوں کو خیال آیا کہ ان کی یاد بھی منائی چاہیئے، گویا یہاں بھی مقابلے کا وہی جذبہ کارفرما ہے۔ "کتاب نما" کے دبیر نمبر کے فاضل مرتب عبدالقوی دسنوی صاحب نے لکھا ہے کہ "اسے اردو ادب کا بہت بڑا سانحہ کہئے کہ مرزا سلامت علی دبیر بحیثیت انسان اور بحیثیت مرثیہ نگار جس مرتبے کے مستحق تھے ہم اردو والے نہ صرف انھیں وہ مرتبہ دلانے میں ناکام رہے ہیں بلکہ انھیں متعارف کرانے سے بھی گریز کرتے رہے ہیں۔۔۔۔ عرصے سے دلی خواہش تھی کہ جہاں دوسرے شعرا کے "یادگار نمبروں"

کے شائع ہونے کا اردو میں سلسلہ جاری ہے، مرزا دبیر پر بھی نمبر شائع کئے جائیں۔ امید تھی کہ کوئی نہ کوئی رسالہ اس طرف متوجہ ہوگا یا کوئی ادارہ اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرے گا لیکن جب ہر طرف خاموشی دیکھی تو میں نے اپنے دوست اور کرم فرما شاہد علی خاں صاحب [جنرل منیجر مکتبہ جامعہ] سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے نہایت مسرت ہوئی کہ وہ خوشی کے ساتھ مرزا سلامت علی دبیر نمبر شائع کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔" لیکن آگے چل کر کیا ہوا؟ خود فاضل مرتب کی زبانی سنئے: "لیکن جب مضامین حاصل کرنے کی کوشش شروع کی تو پرانا سبق یاد آگیا، یعنی "کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل"۔ کئی بار ہمت چھوٹ گئی۔ لوگ حسب عادت وعدہ کرتے رہے اور شرمندہ ہوتے رہے۔" اور آخر میں موصوف نے لکھا ہے کہ: "یہ ایک حقیقت ہے کہ "مرزا سلامت علی دبیر نمبر" پیش کرکے کوئی کارنامہ نہیں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ آیندہ اس عظیم فنکار کی طرف اردو والوں کو متوجہ کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔" گویا ایک صدی کے بعد لوگوں کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ مرزا دبیر نام کے مرثیہ گو شاعر گذرے تھے جن کی شخصیت اور شاعری پر کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔

بہرحال اس نمبر کے آخر میں جو کتابیات درج ہے، اس سے معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ پاکستان میں ماہنامہ "ماہ نو" (کراچی) کا "دبیر نمبر" ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں اور ہندوستان میں ہفتہ وار "سرفراز" (لکھنؤ) کا "دبیر نمبر"، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا ہے۔ چلئے کچھ تو ہوا ہے، بالکل سناٹا نہیں رہا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دبیر پر ایک بھرپور کتاب لکھنے کی ضرورت ہے، جس میں اس کی ضرورت نہیں کہ انیس سے لامحالہ مقابلہ ہی کیا جائے یا شبلی اور محمد حسین آزاد کو برا بھلا کہا جائے، اس کے بغیر بھی دبیر کے کمالات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ "حیات دبیر" کمیاب بلکہ نایاب ہے، اگر دبیر کے سوانح حیات پر اس سے بہتر فی الحال کوئی کتاب لکھی نہ جا سکے تو اسی کو از سر نو مرتب کرکے شائع کر دینا چاہئے۔ مکتبہ جامعہ بہرحال مبارکباد کا مستحق ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ دبیر کی ادبی وشعری خدمات کے اعتراف میں دوسروں نے بخل سے کام لیا تھا، اس نے "کتاب نما" کا دبیر نمبر شائع کرکے ایک مفید

خدمت انجام دی ہے۔

## پیام تعلیم — نیّر نمبر    اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

سالانہ چندہ: سات روپے۔ نیّر نمبر کی قیمت: تین روپے۔ ضمیمے کی قیمت: ایک روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شفیع الدین نیّر صاحب اردو کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ ۴۲، ۴۴ سال تک موصوف نے تعلیم کی خدمت کی ہے اور کم و بیش ۵۰ سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ شروع سے بچوں کے جن رسالوں میں آپ کی نظمیں اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں "پیام تعلیم" بھی شامل ہے اور مکتبہ جامعہ سے بھی آپ کا گہرا تعلق ہے، اس لیے "پیام تعلیم" اور مکتبہ جامعہ پر آپ کا حق تھا کہ ان کی ان طویل اور مخلصانہ خدمات کے اعتراف میں کوئی نمبر نکالے، خوشی کی بات ہے کہ مکتبہ کے منیجر شاہد علی خاں صاحب نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور "پیام تعلیم" کا "نیّر نمبر" نکال کر ایک مفید کام انجام دیا۔

"پیام تعلیم" کے دو شمارے، ستمبر اور اکتوبر کے نیّر صاحب کے لیے مخصوص تھے، ان میں نیّر صاحب کی سیرت و شخصیت اور ان کی شاعری اور کہانیوں پر، ان کے دوستوں، قدردانوں اور عزیزوں کے مفید مضامین ہیں اور خود نیّر صاحب کا بھی اپنی زندگی کے بارے میں ایک طویل مضمون شامل ہے۔ اس طرح مستقبل میں نیّر صاحب پر کام کرنے والوں کے لئے بہت اچھا مواد جمع ہوگیا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ "پیام تعلیم" کے یہ دونوں شمارے مقبول ہوں گے اور اہل نظر قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

(عبداللطیف اعظمی)

# کوائف جامعہ

## علماء اور مسلم دانش وروں کی ذمہ داریاں

شعبۂ اسلامک وعرب ایرانین اسٹڈیز کے اسٹڈی سرکل کا نئے تعلیمی سال کا پہلا جلسہ ۲۰ر اگست کو جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، ورپیش نظر عنوان پر عبداللطیف اعظمی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس وقت برصغیر ہند وپاک کا مسلم معاشرہ جن جدید مسائل سے دوچار ہے اور جن کا فوری حل کسی نہ کسی صورت میں ضروری ہے، ان کی تعداد مقالہ نگار کے نزدیک سات ہے: (۱) تعدد ازدواج (۲) طلاق (۳) مطلقہ عورت کا نان نفقہ (۴) خلع کی مشکلات (۵) محجوب الارث (۶) تجارتی سود اور بنک کا سود (۷) جان ومال اور آگ کا انشورنس۔ مقالے میں کہا گیا ہے کہ: "ان مسائل میں سے کوئی بھی ایسا پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے جن کی باریکیوں اور حقیقتوں کو سمجھنے میں علما اور مسلم دانشوروں کو کوئی خاص دقت پیش آئے اور ان مسائل پر اب تک علما اور مسلم دانشوروں نے جو کچھ لکھا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ان مسائل کو سمجھتے ہیں اور ان کے ماله وماعلیہ سے بخوبی واقف ہیں۔ مگر ان کے خاطر خواہ حل نہ ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ علمائے کرام اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار ہیں، اگر وہ خلوص اور ہمت وجرأت کے ساتھ ان کو حل کرنے کی کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر سب کے سب نہیں تو ان میں سے بیشتر حل نہ ہو جائیں۔" اس مقالے پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں اور حاضرین جلسہ نے جن میں طلبا اور اساتذہ سبھی شریک تھے، متعدد

سوالات کئے جن کے مقالہ نگار نے جوابات دیئے آخر میں صدر جلسہ کی تقریر پر بحث و گفتگو ختم ہوئی۔

جلسے کے آغاز میں صدر شعبہ پروفیسر مشیر الحق نے مختصر الفاظ میں زیر بحث مضمون پر روشنی ڈالی اور جلسے کے آخر میں اسٹڈی سرکل کے کنوینر ڈاکٹر محمد سالم قدوائی نے صدر جلسہ، جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، مقالہ نگار اور شرکاء جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

## ن۔م راشد کی شعری حیثیت

پیش نظر عنوان پر، شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر محمد ذاکر صاحب نے بزم جامعہ میں ۸ ستمبر کو انگریزی میں ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ موصوف نے فرمایا کہ: راشد نے جس زمانے میں شاعری شروع کی اردو میں نئی روایتیں جنم لے چکی تھیں اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ سماجی حقیقت سے آگاہی کا اظہار کسی نہ کسی حد تک ضروری ہے۔ مخصوص معاشرتی حالات میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر یہ رجحان مقبول تر اور قوی تر ہوتا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے مابعد اثرات اور قومی و بیرونی سیاسی و سماجی حالات نے حقیقت پسندانہ تشبیہوں اور استعاروں کو تابناکی اور توانائی بخشی۔ راشد کی شاعری میں ان تمام باتوں کے اثرات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ شاعر کے محرکات مستعار نہیں ہونے چاہئیں اور نہ وہ روایتی مضامین پیش کرنے کے حق میں تھے جن میں عشق کی محرومیوں کا ذکر نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ راشد استعماریت کے دشمن تھے، وہ ترقی پسند تھے مگر کسی مخصوص ازم کے دلدادہ نہیں تھے، سماجی حقیقت پسندی نے انھیں جمالیاتی انفرادیت پسندی کی آخری منزل تک جانے نہیں دیا۔ اپنی بعد کی نظموں میں انھوں نے ایک ایسے شہر اور معاشرے کا خواب دیکھا ہے جو آزادانہ میل جول اور خیالات کے آزادانہ لین دین سے پیدا ہوتا ہے۔

شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مقالہ نگار ڈاکٹر محمد ذاکر صاحب کو، راشد کی شاعری کے بارے میں بھرپور اور جامع مقالے پر مبارکباد دی اور فرمایا کہ ۱۹۴۱-۴۲ میں جب

میں آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن پر کام کرتا تھا تو اس وقت راشد بھی وہیں کام کرتے تھے۔ میری اور ان کی میز پاس پاس تھی۔ میرے شعبے کا تعلق براہ راست انھیں سے تھا۔ میں اپنی میز سے انھیں بہت غور سے دیکھا کرتا اور تعجب کرتا تھا کہ ان کی شخصیت میں شاعری کی کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ سرکاری اور دفتری قسم کے انسان معلوم ہوتے، گفتگو اور ملنے جلنے کا انداز بھی غیر شاعرانہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ذرا بے تکلفی پیدا ہوئی تو ان کی شاعرانہ شخصیت کی تہیں کھلیں۔ ایک روز میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "ماورا" کیوں رکھا ہے۔ یہ سوال میں نے اس لئے کیا تھا کہ اس مجموعے میں کوئی ایسی نظم نہیں جس کا "ماورائیت" سے دور کا بھی تعلق ہو۔ راشد اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی شاعری میں انفرادیت بھی تھی اور فکری گہرائی بھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک نئے انداز سخن کے بانی تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کی نظمیں معرٰی ہوتیں، ان میں بلا کی موسیقیت اور ترنم اور التزام قوافی رہتا۔ رہا یہ مسئلہ کہ انھیں وہ شہرت اور مقبولیت کیوں حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ اور ان کی شاعری مستحق تھی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں کسی سیاسی پرچے یا پرچم کی حمایت حاصل نہ تھی اور نہ وہ کسی ادبی تحریک سے وابستہ تھے، لیکن جہاں تک ان کے شاعرانہ کمالات اور ان کی شخصیت کی عظمت کا سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں سے آگے تھے۔ اب ان کے اور اردو تنقید کے درمیان فاصلہ زمانی پیدا ہو چکا ہے اس لئے ان کی شاعری کا زیادہ معروضی انداز میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے شاعرانہ مرتبہ کو از سر نو متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کے معاصرین اور اردو شاعری کی تاریخ دونوں میں۔

بالکل شروع میں صدر شعبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مقالہ نگار کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ: "ڈاکٹر محمد ذاکر صاحب کے مزاج میں جس قسم کی سلیقہ مندی ہے اس کا انعکاس ان کی تحریروں میں بھی ہوتا ہے۔ زبان کے رموز و نکات پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے، نیز وہ ادبی روایت اور ادب پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں۔ جلسے کے آخر میں شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب نے صدر جلسہ، شیخ الجامعہ، مقالہ نگار اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

## اسلام اور انفرادی ملکیت

مذکورہ بالا عنوان کے تحت جناب الوالعلیٰ خاں تنوز، لکچرر شعبۂ انگریزی جامعہ نے اسٹڈی سرکل شعبۂ اسلامک وعرب ایرانین اسٹڈیز میں، ۲۷ستمبر کو ایک مقالہ پڑھا، اس طویل مقالے کا خود مقالہ نگار کے الفاظ میں لب لباب یہ ہے کہ: "میرے نزدیک اسلام میں انفرادی ملکیت کی اجازت ہے۔ قرآن وحدیث کی کسی نص صریح سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ انفرادی ملکیت حرام یا ممنوع ہے۔ انفرادی ملکیت آنحضرتؐ کے دور میں پائی جاتی تھی، اور خلافت راشدہ نیز اس کے بعد کے ادوار میں بھی موجود تھی... لیکن اس کا مطلب یہ سمجھنا کہ قرآن کی رو سے انفرادی ملکیت کا اصول کسی دائمی تقدس کا حامل ہے، سراسر غلط ہے۔ انفرادی ملکیت کی اجازت اتنی مقدس نہیں ہے کہ اس پر حالات اور زمانے کے تقاضے کبھی اثر انداز ہی نہ ہوسکیں... آج جب کہ بعض حالات وظروف میں صریحاً یہ محسوس ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کے خاتمے کے بغیر سماج کے معاشی اور اخلاقی مسائل حل نہیں ہوسکتے یہ کہنا کہ اسلام اب بھی انفرادی ملکیت کا علمبردار ہے بڑی زیادتی کی بات ہے" مقالے کے آخر میں موصوف نے فرمایا کہ: "مذکورہ بالا استدلال کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب انفرادی ملکیت حرام مطلق ہوگئی ہے۔ اب بھی اگر کوئی ایسی شکل سمجھ میں آسکے جس میں انفرادی ملکیت کے باوجود استحصال کا کلیتاً خاتمہ ہوجائے اور معاشرے کو بغیر کسی طویل تربیت کے فوری طور پر معاشی جرائم سے اسی طرح پاک کیا جاسکے جس طرح اجتماعی ملکیت کے نظام میں کیا جاسکتا ہے تو انفرادی ملکیت کے باقی رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" اس مقالے پر کافی دیر تک بحث وگفتگو رہی۔ آخر میں صدر جلسہ ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے زیر بحث موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مقالے سے پہلے صدر شعبہ پروفیسر مشیر الحق صاحب نے "اسلام اور انفرادی ملکیت" کی وضاحت کی اور جلسے کے آخر میں ڈاکٹر محمد سالم قدوائی صاحب نے صدر جلسہ، مقالہ نگار اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

# جامعہ

74 (11)

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ

| شمارہ ۱۱ | بابت ماہ نومبر ۱۹۷۷ء | جلد ۷۴ |
| --- | --- | --- |

## فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبوعہ: جمال پریس دہلی • ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

# شذرات

۲۹ر اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نیو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مقدس ہاتھوں نے رکھی تھی۔ اس لئے ہم اہل جامعہ ہر سال اس تاریخ کو خاص طور سے یاد رکھتے ہیں، ان عزائم سے اپنے دلوں کو گرماتے ہیں جو اس کے بانیوں کے دل میں تھے، اپنے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں کہ جامعہ کے مقاصد کیا تھے، اب کیا ہیں اور ہمارے فکر وعمل کہاں تک ان سے ہم آہنگ ہیں۔ مرحوم روش صدیقی نے جامعہ کے جشن زریں کے موقع پر "شعلۂ ایماں" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی۔ انھوں نے اس نظم میں ایک تمنا کا اظہار کیا تھا، آج بھی ہماری یہی تمنا ہے۔ روش نے کہا تھا۔

جامعہ، معجزۂ خونِ جگر کی تخلیق
جیسے ظلمت میں ہو اک بامِ چراغاں پیدا

آج اس شمعِ دل افروز کے پروانوں میں
کچھ لگن بھی ہے، رکاوٹ بھی ہے، کچھ لاگ بھی ہے
دل میں پیوست ہے اک نشترِ خودداری بھی
وقت گاتا ہے جسے لب پہ وہی راگ بھی ہے
سوزِ پنہاں بھی ہے اور سازِ سکوت افشاں بھی
جس سے افکار پگھل جاتے ہیں وہ آگ بھی ہے

کاش اس آگ سے ہو شعلۂ ایماں پیدا

---

۲۹ر اکتوبر کو ہم یہ بھی شمار کرتے ہیں کہ جامعہ کو قائم ہوئے کتنے برس بیت گئے۔ امسال ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ کی عمر ۵۷ برس کی ہو چکی۔ ۵۷ برس کی اس کی تاریخ رنگارنگ نقوش

سے معمور ہے اگرچہ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ کی یہ مدت محض ایک لمحہ ہے ــــ ایک ایسا لمحہ جو اپنے اندر تعمیر و حسرتِ تعمیر، امیدوں اور نا امیدیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ کیسے کیسے پاک سیرت و پاک نظر انساں تھے۔ جنھوں نے رنج و غم اور امید و بیم کی سخت گھڑیوں میں اسے زندہ رکھا۔ پھر قومی تعلیم کے کام کا ایک نقشہ بنایا اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ انجذاب تو جہد نظر کی یہ کیفیت ایسی تھی جیسے بوریہ نشین درویشوں کی طرف شاہوں اور منعموں کی احترام کی نظر اٹھتی ہے یا جیسے رات کے سناٹے میں کہیں دور سے جرس کی آواز آرہی ہو، اس آواز میں اتنی تاثیر ہو کہ لوگ دیر تک اسے سنتے رہیں اور محسوس کریں کہ یہ تو ان کے دل گم گشتہ ہی کی پکار ہے اور انھیں عزمِ سفر کی دعوت دے رہی ہے۔ کامل پچیس سال تک جامعہ ملک کے سیاسی ہنگاموں سے الگ رہ کر ویرانے میں چمن بندی کا کام کرتی رہی۔ اس کا یہ کام چھوٹا تھا یا بڑا، یہ محض دیوانگی تھی یا اس دیوانگی میں فرزانگی کا بھی شائبہ تھا، اربابِ نظر ہی اسے جانچ سکتے ہیں، پرکھ سکتے ہیں۔

---

جامعہ والے باغبانیِ صحرا کا قانون رقم کرتے رہے، یا یوں کہیے کہ جنوں کی حکایاتِ خونچکاں لکھتے رہے اور اس قبیلے کی آنکھ کا تارا وہ مردِ حق آگاہ تھا جس نے اپنی زندگی کے بہترین مہ و سال اس چمن کی آبیاری میں صرف کر دیئے۔ ہماری مراد ذاکر صاحب مرحوم سے ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذاکر صاحب نہ ہوتے تو شاید جامعہ کا قیام عمل میں نہ آتا اور اس کے قائم ہونے کے بعد مرحوم نے اگر اپنی تمام ذہنی و روحانی صلاحیتوں کو اس کے لئے وقف نہ کر دیا ہوتا تو غالباً آج یہ باقی نہ ہوتی۔ رحمتِ خداوندی کے سرچشمے سے ذاکر صاحب کو بہت کچھ ملا تھا۔ انھوں نے وہ سب کچھ جامعہ کی نذر کر دیا اور آج اسی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ نگر کی تعلیمی بستی دنیائے علم و ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے اور گو ذاکر صاحب نہیں ہیں لیکن ان کی نیکیاں باقی، ان کے کارنامے اور ان کے افکار زندہ ہیں۔

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

---

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک تعلیمی خطبہ میں ایک بڑی فکر انگیز بات کہی تھی۔ ہم میں جو غور و فکر کی صلاحیت اور جامعہ کے مخصوص تعلیمی و تہذیبی منصب کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں، ہر سال ۲۹ر اکتوبر کو وہ بات یاد کرتے اور اپنے سینے کے داغوں کو تازہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا :

کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم ہندی مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ . . . ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دلیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کرسکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما"

---

۲۹ر اکتوبر کو ہم ذاکر صاحب کے اُن ساتھیوں کی خدمات کا بھی اعتراف کرتے ہیں جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے اور تعلیم و تعلم اور علم و ادب کے میدان میں نئے تجربے اور نئی کاوشیں کرنے کی دُھن میں اپنے آرام و راحت کا خیال نہیں کیا جن کے بیوی بچے اچھے کپڑے اور اچھی غذا کو ترستے رہے لیکن وہ خود قوم کے بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں لگے رہے۔ ہماری قوم میں اجتماعی طور پر تعلیمی کام کے لئے ایثار و قربانی، مسلسل اور برسوں

مشکلوں، تکلیفوں اور آزمائشوں کو جھیلنے کی مثالیں کم ملتی ہیں اور کیسی کہ پیشانی پر بل نہیں، ہر وقت ایک پُر کیف سرمستی و سرشاری کی کیفیت جو اچھے کام میں لگے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کے ان ساتھیوں میں ہر درجہ، ہر حیثیت اور ہر طرح کی صلاحیت کے لوگ تھے اور ہر شخص کا کام اپنی جگہ اہم اور ضروری تھا۔ ذاکر صاحب جماعت کے سردار کی حیثیت سے سب کے دلوں میں امید اور یقین کی شمع روشن رکھتے اور جب سب یہ دیکھتے کہ وہ خود جو ایثار و قربانی، اخلاقی فضائل، ذہنی صلاحیت اور خاندانی شرافت میں کسی سے کم نہیں ہیں، چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں تو ان کا یقین جامعہ کے بلند نصب العین پر اور بھی زیادہ پختہ اور ان کا عزم اس کے حصول کے لئے اور زیادہ مستحکم ہو جاتا۔ ایسے تمام لوگوں کا ہم پر ہی نہیں بلکہ پوری قوم پر احسان ہے۔ مخلص خدمتگزاروں کا یہ قافلہ نہ ہوتا تو آج وہ نقش پا بھی نہ ہوتا جس کے خد و خال پہچاننے میں ہم سے کبھی کبھی کچھ بھول بھی ہو جاتی ہے —— ۲۹ اکتوبر کو ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہم بدلے ہوئے حالات میں "ساقی" کے "جام آتشیں" کے کیف کی کمیت و کیفیت کا صحیح صحیح ادراک کر سکیں اور دل و دماغ کا وہ نور باقی رکھیں جو خود غرضیوں، تنگ نظر سیاست بازیوں اور حالات کی دسیسہ کاریوں کی ظلمتوں میں ہدایت و سلامت روی کی ڈگر سے ہمیں ہٹنے نہ دے۔ یہ نور ایمان و ایقان کا نور ہے۔ یہی وہ نور ہے جو سچی مذہبیت کی پہچان اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی جان ہے۔ اسی سے انسانیت کی آن بان ہے۔ اسی سے ملک و قوم کی شان ہے۔ یہی نور ہم اہل جامعہ کا سرمایۂ حیات ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اس نور کی تابانی سے جامعہ کا مستقبل درخشاں و تابندہ رہے۔

ڈاکٹر شعیب اعظمی

# حافظ شیرازی و امیر تیمور گورگانی

حافظ شیرازی اور امیر تیمور گورگانی دو متضاد شخصیتیں ہیں۔ ایک نے دنیائے شعر و سخنوری میں دائمی شہرت پائی اور دوسرے نے تاریخ میں جنگجو اور عظیم فاتح کا مرتبہ حاصل کیا۔ خواجہ حافظ کے اشعار نے ان کے عہد میں بھی عالم اسلام میں بسنے والوں کے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ سیہ چشمان کشمیری اور ترکان سمرقندی اُن کی غزلیں پڑھ کر رقص کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ان کی قند پارسی سارے طوطیان ہند کو شکر شکنی پر مجبور کرتی ہے۔ یہ انھیں کی فارسی غزلیں تھیں جو پیران پارسا کو طویل عمریں بخش سکتی تھیں۔ ان سے قبل کسی شاعر نے زلف عروس سخن کو اتنا آراستہ نہیں کیا تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ قبول خاطر و لطف سخن خدا داد چیز ہے اور بقول شہریار جب تک دنیا میں ادب اور شاعری زندہ ہے شعر حافظ ہمہ جا وردِ زباں خواہد بود۔

تیمور جدھر گیا آتش زنی اور قتل و غارت گری نے بستیاں اجاڑ کر رکھ دیں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دئے۔ فتح کے جھنڈے ہی نہیں گاڑ دئے بلکہ یادگاری مینار بنوائے مگر اس کا سارا ساز و سامان انسانی جسم کی بہترین متاع دماغ تھے۔ ہزار اور لاکھ سے کم کی گنتی ہی نہ تھی۔ تیمور کے جہانگیری عہد کو نظام الدین شامی اور شرف الدین علی یزدی

---

ڈاکٹر شعیب اعظمی، ریڈر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین جامعہ ملیہ دہلی

نے کتابوں میں محفوظ کر دیا جن کی بنیاد پر مستشرقین نے الماریوں کتابوں لکھ ڈالیں۔ حافظ کے دیوان نے اُن کے عہد سے لیکر دورِ جدید تک دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہونے کی سعادت حاصل کی۔ آج دونوں ہی زندہ ہیں۔ دونوں کے مختلف میدان تھے۔ زمین و آسمان کا فرق رکھتے تھے مگر تھوڑے سے فصل کے باوجود ہمعصر تھے شمشیر و قلم کی جولانیاں اپنا اثر پائندہ کر گئی ہیں۔ حافظ اور تیمور دونوں ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر تیمور حافظ شیرازی کا نام ان کی غزلوں کی بدولت سن چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اشعار بھی یاد رکھتا تھا۔ چنانچہ اپنی جوانی کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے:

یک یورت چشم بیک دختر جوان اُفتاد کہ بتماشای ما ایستادہ بود دعبور سواران را مینگریست و من ہمینکہ آن دختر جوان را دیدم حالم بطوری شگرف تغیر کرد و دل من کہ ہرگز از وحشت نطپیدہ بود بہ طپش در آمد و بی اختیار بیاد شعر شمس الدین محمد شیرازی افتادہ کہ می گوید:

مرا عشق سیہ چشمان زدل بیرون نخواہد شد
قضای آسمان است این و دیگر گون نخواہد شد

"میری نگاہ ایک خیمہ میں کھڑی ہوئی جوان لڑکی پر پڑی جو مجھے دیکھنے کے لئے کھڑی تھی اور سپاہیوں کے دستوں کو گذرتا دیکھ رہی تھی اور جیسے ہی کہ میں نے اس جوان لڑکی کو دیکھا میرا حال عجیب طریقے سے اس طرح خراب ہوا اور میرا دل جو کبھی گھبراہٹ سے پریشان نہیں ہوا تھا، بے طرح گھبرایا اور بے اختیار شمس الدین محمد شیرازی کا شعر زبان پہ لایا جو کہتا ہے:

سیہ چشموں کا عشق میرے دل سے نہیں نکلے گا
یہ آسمانی بلا ہے جو ٹل نہیں سکے گی۔"

تیمور نے جہاں کہیں حافظ کا ذکر کیا ہے وہاں شمس الدین شیرازی لکھا ہے کیونکہ

خود اُس کے بقول وہ حافظِ قرآن تھا اور حافظ کو اپنے سے برتر نہیں مانتا تھا اور یہ بھی کہ وہ شمس الدین شیرازی کو مسلمان نہیں بلکہ مُرتد مانتا تھا چنانچہ اپنی یادداشت میں ایک جگہ اُس زمانہ کا ذکر کرتا ہے جب کہ حافظ کی شہرت خراسان اور ماوراء النہر کے حدود سے باہر نکل چکی تھی :

"من نمی توانم با دست راست قلم بدست بگیرم و بنویسم ولی میتوانم با ہمان دست قبضہ شمشیر بگیرم و شمشیر بزنم۔ من در ظرف چہل و ہشت سال کہ از تاریخ دیدن آن خواب میگذرد در جنگہا یکصد و ہفتاد و دو زخم خوردم و ہرگز ننالیدم و من طبق توصیہ ای کہ در خواب بمن کردند ہموارہ علما و صنعتگران و شعراء را نگاہ داشتم و لو میدانستم کہ مسلمان نیستند و لو مثل شمس الدین محمد شیرازی مرتد بشمار می آیند۔"

"میں داہنے ہاتھ سے قلم نہیں پکڑ سکتا تھا اور نہ لکھ سکتا ہوں لیکن اُسی ہاتھ سے تلوار کا قبضہ پکڑ سکتا ہوں۔ میں نے ۴۸ سال کی مدت میں جو کہ اس خواب کو دیکھے ہوئے گذر چکی ہے، جنگ میں ۱۷۲ زخم کھائے اور کبھی اُف نہ کی اور میں نے اس نصیحت کے مطابق جو مجھے لوگوں نے خواب میں کی ہمیشہ عالموں، ہنرمندوں اور شاعروں کی خبرگیری کی ہے اگرچہ میں جانتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اور شمس الدین محمد شیرازی کے مانند مُرتد جانے جاتے ہیں۔"

تیمور اور حافظ کی ملاقات کی دو داستانیں زیادہ مشہور ہیں جن میں مستند داستان حافظ کے مشہور شعر :

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

سے متعلق ہے جب تیمور کے پہلے حملہ ۷۸۹ھ/۱۳۸۶ء کے بعد شیراز میں عمال اور محصلین نے حافظ کے مال و متاع کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور جس کے نتیجہ میں حافظ مفلس و قلاش ہو گئے تھے اور جب وہ اپنی عسرت کی زندگی کا شکوہ امیر تیمور کے حضور میں لے کر گئے تو اس نے پوچھا تم وہی ہو نا جس نے محبوب کے رخسار کے ایک تل کے عوض میری ولایات سمرقند و بخارا کو قربان کر دیا تھا؟ ایسا شخص مفلس نہیں ہو سکتا ہے۔ حافظ نے عرض کیا انہیں عطایا کی بدولت تو مفلس ہوا ہوں۔ تیمور اس برجستہ جواب سے اتنا خوش ہوا کہ حافظ کو مصیبت سے رہائی ملی۔

یہ بات یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ بقول رکن الدین ہمایوں فرخ صاحب کتاب حافظ خراباتی، حافظ نے امیر تیمور کی شان میں بھی ایک قطعہ کہا ہے جو دیوان حافظ کے ایک قدیم مخطوطہ مورخہ ۸۱۰ - ۸۳۰/ ۱۴۰۷/ ۱۴۲۶ میں پایا جاتا ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

پادشاہا لشکر توفیق ہمراہ تو اند
اے پادشاہ کامرانی کی فوج تیرے ساتھ ہے
خیز اگر بر عزم تسخیر جہاں رہ می کنی
اٹھ اگر تو دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے

باچنیں جاہ و جلال از پیشگاہ مکرمت
اس جاہ و جلال کے ساتھ اپنی بزرگی کی بنا پر
آگہی و خدمت دل ہای آگہ می کنی
تو باخبر ہے اور باخبر دلوں کی خدمت بھی کرتا ہے

با فریب رنگ این نیلی خم زنگار فام
اس نیلے آسمان کے فریب اور نیرنگی کے باوجود
کار بر وفق مراد صبغۃ اللہ می کنی
تو تمام کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انجام دیتا ہے

آنکہ دہ با ہفت و نیم آورد بس سودی نکرد
جس نے کہ دس کو ساڑھے سات کیا کچھ فائدہ نہ ہوا
فرصتت بادا کہ ہفت و نیم بادہ می کنی
تجھے موقع میسر ہو کہ تو ساڑھے سات کو دس کرتا ہے

دہ با ہفت و نیم کی اصطلاح یوں ہے کہ شاہ منصور کے عہد سلطنت میں مستوفی یعنی اڈیٹر جنرل نے خزانہ کا خرچ کم کرنے اور آمدنی میں اضافہ کے لئے بہت سے

اقدامات کے ساتھ اہل علم کو دی جانے والی وظیفہ کی رقم بھی تخفیف کی۔ جب وظیفہ پانے والوں بشمول حافظ نے شاہ منصور سے اس کا شکوہ کیا تو شاہ نے مستوفی کو سرزنش کی کہ جو کچھ میرے اسلاف نے اہل علم کی خدمت کے لئے مقرر کیا تھا اسے بغیر کم و بیش دیا جائے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مستوفی نے دی جانے والی رقم ۲۵ فیصد کم کر دی تھی یعنی دس روپیہ کی رقم کو ساڑھے سات کر دیا تھا۔ جب شاہ منصور کے حکم سے پورا وظیفہ بحال ہوا تو حافظ نے یہ قطعہ کہا تھا جسے امیر تیمور گورگانی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس کا سلسلہ یوں ہے کہ جنگ کا خراج یا ٹیکس وصول کرنے کی رسم شیراز میں بھی رائج تھی جس کی وصولیابی میں محلہ اور علاقے کے بزرگ ہمیشہ فاتحوں اور حکمرانوں کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ حافظ چونکہ محلہ کا زرون کے اشراف و اکابر میں شمار ہوتے تھے اس لئے خراج کی وصولی اُن کے ذمہ بھی عاید ہوئی اور انھوں نے یہ قطعہ تیمور کے حضور میں گزارا۔ ڈاکٹر رکن الدین ہمایوں فرخ کا خیال ہے کہ چونکہ حافظ کی ایک غزل کے مطلع میں تیمور کے پایہ تخت سمرقند کا ذکر آگیا اور لوگوں نے خال رخ محبوب کے بدلہ میں سمرقند و بخارا کو بخش دینے اور حافظ کو تیمور کے حضور میں فی البدیہہ جواب دے کر چھٹکارا پا جانے کی مفروضہ داستان لکھ ڈالی۔

ہمایوں فرخ کا یہی خیال ہے کہ ۷۸۹ھ/۱۳۸۶ء میں جب تیمور شیراز پر حملہ آور ہوا ہے تو وہ شیراز کے صدر دروازہ پر اپنا پڑاؤ ڈالے رہا اور حدود شہر میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ توقتمش خاں نے ماوراء النہر پر حملہ کر دیا تھا اور تیمور کو اپنی افواج دو حصوں میں تقسیم کر دینی پڑی تھی اور خود ماوراء النہر روانہ ہو گیا تھا اور بالفرض اگر ملاقات ہوئی ہے تو اس قطعہ کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خواجہ حافظ نے امیر تیمور کی قدر و منزلت ہی کی ہے۔ پھر خواجہ حافظ ایسے گئے گذرے نہ تھے کہ تیموران کے علم و فضل کا اندازہ نہ لگا پایا اور انھیں "مرتد" کے کلمہ سے یاد کیا ہے۔

بہرصورت امیر تیمور کے شیراز پر حملہ آور ہونے کے دو سبب بتائے گئے ہیں اور دونوں میں اختلاف ہے۔ "منم تیمور جہاں کشا" مارشل براؤن کی تصنیف ہے اور تیمور کے اولین محرر نظام الدین شامی کے تیمور نامہ پر منحصر ہے اور جس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ ہاں ظفر نامہ کے مشہور مورخ شرف الدین علی یزدی نے نہ صرف نظام الدین شامی کے وجود کا اعتراف کیا ہے بلکہ ظفر نامہ شامی مورخہ ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء سے استفادہ کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ دونوں کے بیانات مختلف ہیں۔ مارشل براؤن کے بیان کی صداقت مشکوک قرار دی گئی ہے مگر مختصر طور پر اس کا ذکر بیجا نہ ہوگا کیونکہ تیمور اور حافظ کی ملاقات کی صحبت کا دلچسپ ذکر ملتا ہے۔ "منم تیمور جہانکشا" کے صفحات راوی ہیں کہ تیمور کے شیراز پر حملہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے کوئی مرض لاحق تھا اور اطبا نے اسے آب لیمو کے مسلسل استعمال کی صلاح دی۔ تیمور نے اپنا ایلچی شاہ منصور مظفری کے دربار میں بھیجکر آب لیمو کی فرمائش کی اور وہاں سے انکار پر اپنی فوج شیراز میں اتار دی۔ نہ صرف شاہ منصور کو تہ تیغ کر دیا بلکہ شہزادوں کو اندھا کر کے قتل کر دیا اور ان کی املاک تباہ کر دی۔

شرف الدین علی یزدی نے واقعہ دوسری طرح بیان کیا ہے کہ شاہ شجاع نے مرتے وقت زین العابدین معتصم کو امیر تیمور کی تولیت میں دیا اور جب زین العابدین تخت پر بیٹھا تو امیر تیمور کا نمایندہ اسے سمرقند لے جانے کے لئے آیا۔ سلطان خوف سے نہ گیا اور ایلچی کو ٹال مٹول کر کے بہلائے رکھا۔ امیر تیمور نے بڑی فوج لے کر پہلے اصفہان کے گرد محاصرہ کیا اور چونکہ کچھ لوگوں نے اس کی فوج پر شبخون مار کر اسے برافروختہ کر دیا تھا۔ اس لیے وہ شہر پر ٹوٹ پڑا اور ستر ہزار اصفہانی تہ تیغ کئے، جن کی کھوپڑیوں سے فتح کے مینار بنائے گئے۔ زین العابدین معتصم بھاگ کر شوستر گیا اور شاہ منصور سے پناہ مانگی مگر اس نے معتصم کو قید کر کے اندھا کر دیا۔ امیر تیمور ابھی شیراز کے دروازہ تعلم پر کہ توقتمش خاں کے ماوراء النہر پر حملہ کی خبر سنی۔ وہاں روانہ ہونے سے شاہ یحیی کو فارس اور اصفہان

کی سلطنت بخشی اور دوبارہ ۷۹۰ھ/۱۳۸۷ء میں سلطان معتصم کو رہائی دلانے کے لئے شیراز اور اصفہان پر حملہ کر دیا۔ شاہ منصور بے جگری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور تیمور معتصم کو آزاد کرا کر لے گیا۔ اس طرح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تیمور کا حملہ شیراز آبلیمو کے لئے نہیں تھا بلکہ جہانگیری کی مہم یا سلطنت کے نزاع کی وجہ سے تھا۔

شیراز پر حملے کے اسباب جو کچھ بھی ہوں ان سے دو باتیں یقینی طور پر واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تیمور حافظ سے واقف تھا اور شیراز میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور یہ بھی کہ تیمور نے ہمیشہ علمار اور شعرار کا احترام کیا۔ "منز تیمور جہانکشا" کے مطابق امیر تیمور کا بیان ہے کہ "شیراز کے نظم ونسق کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے چاہا کہ علمائے شیراز سے ملوں اور حکم دیا کہ شیراز کے علمار عمرو بن لیث صفاری کی مسجد میں جمع ہو جائیں۔ میرے خدام نے شیرازی علمار کی شہرت سے تواضع کی پھر میں نے شیخ بہار الدین اُردستانی سے، جنھیں شیراز کے برگزیدہ علمار میں شمار کیا جاتا تھا، پوچھا کیا وضو کرتے وقت پیروں پر مسح کرنا چاہیئے؟ شیخ نے کہا پیر دُھلنے چاہئیں۔ میں نے پوچھا کس لئے؟ جواب دیا کہ حکم خداوندی ہے۔ میں نے کہا خدا نے یہ حکم کیوں دیا ہے؟ کہا کہ پاکی کے لئے۔ میں نے کہا قرآن کی کس آیت میں یہ حکم تجویز کیا گیا ہے؟ شیخ جواب نہ دے سکے۔"

پس تیمور نے علمار سے ایک ایک کر کے اسی قسم کے سوال کئے اور خود جواب دئے جو اس کے عقیدہ اور طرز فکر کا ثبوت ہیں۔ چنانچہ اسی سوال وجواب میں حافظ کا ذکر بھی آیا۔ تیمور لکھتا ہے کہ "علمائے شیراز سے گفت وشنود کا مقصد خدانخواستہ ان کو شرمندہ کرنا نہیں ہے بلکہ اُن کے حضور سے استفادہ کرنا ہے۔ چنانچہ شیخ حسن قربتا نے (جن کی خستہ خالی دیکھ کر تیمور نے ان کو ہزار دینار عطا کئے تھے) چپکے سے کہا: اے امیر: شیراز میں عالم ہیں لیکن اس شہر کے اصل علمار گوشہ نشین ہیں اور عرفا میں شمار ہوتے ہیں اور علمائے شیراز اُن کو پلید سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اشعار میں مے ومیخانہ

معشوق اور دف و چنگ کا دم بھرتے ہیں۔"

امیر تیمور کا کہنا ہے کہ "میں نے حسن قربت کی نصیحت قبول کی کہ علمائے شیراز سے مسجدوں کے بجائے اُن کے گھر پر ملوں۔"

تیمور نے تین مشاہیر عرفا کا نام لیا ہے :

۱۔ زکریای فارسی معروف بہ وامق

۲۔ صباح الدین سنبلی معروف بہ عارف

۳۔ شمس الدین شیرازی معروف بہ حافظ

تیمور کا بیان ہے : ان لوگوں کے درمیان جو اس مجلس میں تشریف فرما تھے اُن میں سے ایک کی غزلیں میں نے پڑھی تھیں اور وہ شمس الدین محمد شیرازی معروف بہ حافظ تھے۔ دوسروں کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ شمس الدین محمد شیرازی معروف بہ حافظ اس وقت پیر و مسنی تھے اور ان کی بصارت کمزور ہو چکی تھی۔ انھیں عارفوں کی ملاقات کے درمیان میں نے شمس الدین محمد شیرازی معروف بہ حافظ سے پوچھا کیا یہ شعر تمھارا ہے ؟

ساکنان حرم و ستر عفاف ملکوت

با من راہ نشین بادۂ مستانہ زدند

حافظ نے جواب دیا : اے امیر، چونکہ میری آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں تم کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی ہیں مگر تمھاری آواز بخوبی سن رہا ہوں۔ ہاں یہ شعر میرا ہے۔ میں نے کہا اس شعر میں تم نے کفر بکا ہے اس لئے کہ خدا کا تعارف اس طریقے سے کرایا ہے جیسے وہ ایک حرم رکھتا ہے اور کفر کے ساتھ خدا کی بڑی توہین بھی کی ہے کیونکہ تم نے کہا کہ خدا کی حرم اس کے حرم سے باہر نکلیں اور راستے کے کنارہ پر تمھارے ساتھ ہو لیں اور تمھارے ساتھ شراب پی اور مست ہوئیں۔ حافظ نے جواب دیا : اے امیر، میں نے کلمۂ کفر نہیں کہا ہے اور خدا کی توہین بھی نہیں کی ہے۔ میں نے مصرعۂ اول میں یہ کہا ہے ساکنان حرم و ستر عفاف ملکوت اور یہ

دو کلمہ ستر و عفاف ثابت کرتا ہے کہ خدا کے حرمخانہ سے مُراد ایک عمومی حرمخانہ نہیں ہے اور خدا کا حرمخانہ پوشیدہ ہے اور اس کا راز آشکارا نہیں ہے اور وہاں عفت و پاکی حکم فرما ہے اور میں نے یہ بھی نہیں کہا ہے کہ خدا کے حرمخانہ میں عورت کا وجود ہے اور میرے شعر میں لفظ عورت نہیں آیا ہے اور میں نے کہا ہے "ساکنانِ حرم" نہ کہ زنہای حرم ۔ میرے شعر میں حرمخانہ بھی نہیں آیا ہے بلکہ جو کچھ میں نے کہا ہے حرم ہے اور حرم کا مطلب ہے مکان جو اس قدر مقدس ہے کہ وہاں کسی بیگانے کا گذر نہیں اور میں نے یہ شعر بہار کی ایک صبح کو کہا تھا، اس وقت موسم خوشگوار تھا اور موسم شیراز پھولوں کی خوشبو دماغوں میں بسا رہا تھا اور میں اپنے دل میں وجد و سرور کی کروٹیں لے رہا تھا، بلبلوں کا نغمہ سن رہا تھا۔ پھر میں ہیجان و سرور میں ایسا ڈوب گیا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کائنات کی تمام موجودات میں غرق ہو گیا ہوں اور فرشتے بھی میرے وجود میں داخل ہو گئے ہیں اور میں خود ان کے زمرہ میں شامل ہو گیا ہوں اور اسی وجد و سرور کی سرشاری میں بے ساختہ یہ شعر میری زبان سے نکل گیا۔ میں نے پوچھا پھر مصرعہ دوم میں بقول تمہارے فرشتوں نے تمہارے ساتھ شراب پی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ شراب حرام ہے؟ حافظ نے جواب دیا اے امیر شراب پینا عرفانی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب شراب نوشی ہرگز نہیں ہے بلکہ کسب علم معرفت ہے۔ اُن لوگوں کے نزدیک جو اہل کمال ہیں اور جس طرح حرام شراب انسان کو پست کر دیتی ہے جو کوئی ارباب کمال میں سے کسب معرفت کرتا ہے وہ بیخود ہو جاتا ہے۔ عرفا کی اصطلاح میں لفظ میخانہ بھی ایک مکان ہے جہاں یہ شراب پیتے ہیں یعنی کسب معرفت کرتے ہیں اور اس صبح میں بہار کے لطف میں وجد و سرور کے عالم میں اتنا غرق تھا کہ تصور کر رہا تھا کہ فرشتے میرے ہم صحبت ہیں اور خلقت کے راز مجھ پر کھول رہے ہیں اور اسی مناسبت سے میں نے یہ کہا کہ میرے ساتھ شراب نوشی کی۔ میں نے پوچھا وہ راز جو انھوں نے تم پر فاش کئے کیا تھے؟ ان کی تفصیل مجھے سناؤ۔

حافظ نے کہا: اے امیر، اس صبح میں سوچ رہا تھا کہ فرشتے مجھ پر خلقت کے راز کھول رہے ہیں لیکن جو کچھ میں محسوس کر رہا تھا صرف تخیل تھا اور میں اس تخیل کو زبان پر نہیں لا سکتا تھا اور اس لئے اسے شعر کے قالب میں ڈھال دیا اور ہر عارف جب تخیل کی دنیا میں ڈوبتا ہے، وہ چیزیں جنھیں محسوس کرتا ہے انھیں زبان پر نہیں لا سکتا۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ محسوسات کے وہ اجزا بیان کر دیں جو سردی، گرمی، نرمی اور سختی جیسی کیفیت کے حامل ہوں اور جو کوئی اسے سنتا ہے اسے سمجھتا ہے لیکن ہم اس پر قادر نہیں کہ معنوی محسوسات کو بیان کریں اور اگر اظہار کر بھی دیں تو سننے والا انہیں نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی عارف نہ بھی ہو بہار کی ایک صبح جب مشام جان گلہائے بہار کی خوشبو سے معطر ہو اور بلبل نغمہ خواں ہوں، موسم خوشگوار ہو اور اذان کی صدا کانوں میں گونج رہی ہو تو وہ ان عوامل کو محسوس کرتا ہے کہ کوئی انداز بیان اس کیفیت کے اظہار پر قادر نہیں ہے اور اسی سبب کی بنا پر میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ فرشتوں نے اس کیف کے عالم میں مجھ سے کیا کہا اور خلقت کے جو اسرار مجھ پر فاش کر رہے تھے ان کا متن اور مطلب کیا تھا۔ ورنہ جو کچھ اپنے تصور اور خیال میں میں نے ان سے سنا تھا اسے شعر کے قالب میں ڈھال دیتا۔"

دانشمند گرامی آقای سید محمد علی جمالزادہ کا کہنا ہے کہ جہانکشا تیمور اور لسان الغیب کی گفتگو کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ یہ پہلا اتفاق ہے جب کہ حافظ کی زبان سے شعر سننے کے بجائے یہ نثری کلمات سنے گئے ہیں اور اسی لئے ان دونوں کی گفتگو دنیائے ادب کی طویل تاریخ میں ایک گرانقدر ادبی میراث کا درجہ رکھتی ہے۔

امیر تیمور ابھی اپنی گفتگو کا سلسلہ ختم نہیں کرتا ہے اور آگے بیان کرتا ہے۔

"میں نے کہا اے شاعر شیریں سخن تم نے صحیح کہا اور مجھے تشفی بخش جواب دیا جس نے مجھے معتقد بنا دیا لیکن کیا درست ہے کہ تم حافظ قرآن ہو۔ حافظ نے جواب دیا:

ہاں اے امیر۔ میں نے کہا کہ سورہ عرفات کو آخری طرف سے شروع کرو اور ایک ایک آیت پڑھو۔ حافظ نے کہا، اے امیر! کیا تم یہ کہتے ہو کہ میں آیات کو انتہائے سورۃ سے شروع کروں اور ابتدا کی طرف لوٹوں۔ میں نے کہا: اگر تم حافظ قرآن ہو تو آیات کو آخر سے شروع کر سکتے ہو۔ حافظ نے اپنی معذوری ظاہر کی تو میں نے کہا اب تم میرا امتحان لو اور قرآن کی کسی سورۃ کو منتخب کر کے مجھ کو بتاؤ تاکہ میں آیات کو انتہائے سورۃ سے ابتدا کی طرف پڑھوں۔ حافظ نے کہا: اے امیر، میں یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ جیسے انسان کو امتحان میں ڈالوں۔ میں نے کہا، میں اپنی طرف سے تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ حافظ نے سورہ بقرہ کا انتخاب کیا اور میں نے سورۃ کو آخر سے پڑھنا شروع کیا اور سات آیات کی قرأت کے بعد حافظ اور تمام موجود حاضرین نے تحسین و آفرین کے کلمات کہے اور حافظ نے کہا: "اے امیر، میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ جیسے دانشمند شخص کی موجودگی میں میں اپنے آپ کو حافظ قرآن نہیں سمجھتا۔"

تیمور نے لکھا ہے کہ میں عرفائے شیراز کی صحبت سے اور لطف اندوز ہونا چاہتا تھا مگر لرستان کے سلطان کو سزا دینے کے لئے روانہ ہونا تھا اس لئے اپنے گھر آئے ہوئے تمام عرفائے شیراز کو ایک ایک ہزار دینار عطا کئے۔ تیمور نے شیراز پر دوسری بار اُس وقت حملہ کیا جب حافظ کا انتقال ہو چکا تھا اور صرف شیخ حسن قربت اور زکریای فارسی حیات تھے۔ ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء میں حملہ شیراز کے دوران تیمور نے یہ بات کہی ہے کہ وہ حافظ جو قرآن کی سورۃ کو انتہا سے ابتدا کی طرف نہ پڑھ سکے اور میں نے پڑھا تھا وہ حافظ دنیا کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ حافظ ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء میں وصال پا چکے تھے اور اُن کا مادہ تاریخ "خاکِ مصلیٰ" ہے۔ ہمایوں فرخ نے مارشل براؤن کے تُزکِ تیمور جہاں کشا کے مذکورہ بالا مفصل بیان کو مجعول بتایا ہے لیکن صرف اس بنیاد پر کہ یزدی کے ظفرنامہ میں

اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دراصل یزدی کا ظفر نامہ اس قدر ضخیم ہے کہ ان تمام تفصیلات کا اس میں ہونا ضروری نہ تھا۔ ہاں تیمور کی یادداشت تاریخوں سے خالی ہے اور سمرقند وبخارا والے شعر سے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں دو اور باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ بقول ابن عربشاہ، تیمور فارسی زبان سے اچھی طرح واقف تھا۔ سیرت انبیاء، تاریخ اور سلاطین کے سوانح سے دلچسپی تھی۔ سفر ہو یا حضر علما اس کے ساتھ ہوتے تھے اور وہ اپنے خیمے میں ان سے گفتگو کرتا، یہ کتابیں پڑھوا کر سنتا اور جہاں جاتا اہل فن سے ملتا، چنانچہ حافظ سے ملاقات کا قصہ عام ہے اور "سمرقند بخارا" والے شعر کا لطیفہ تو دولت شاہ کے علاوہ حسین واعظ کاشفی معروف بہ بیہقی کی کتاب "لطائف الطوائف" اور شجاع شیرازی کی تصنیف "انیس الناس" میں بھی بیان کیا گیا ہے اور اگر بالفرض یہ لطیفہ بھی ہو تو تاریخ میں بڑے بڑے علما وفضلا سے واقعات منسوب کئے جانے کی روایت رہی ہے۔ مولانا شمس الدین محمد حافظ اپنے عہد کے اشراف واکابر میں سے تھے۔ اگر ستر برس کی عمر میں انھوں نے اپنے شعر کی تشریح پر یہ دلچسپ نکتہ پیدا کر دیا تو خدانخواستہ ان کے مرتبہ میں فرق نہیں ہوتا۔

اسی سلسلے میں دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یقیناً حافظ کے کلام کی شہرت دور دراز تک پہنچ چکی تھی اور تیمور نے ان کے اشعار کسی موقع پر پڑھے تو حیرت کی بات نہیں اور دونوں کی ملاقات اور گفتگو کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حافظ صرف شاعر نہ تھے۔ وہ اپنے گرد وپیش اور زمانہ میں پیش آنے واقعات سے باخبر بھی تھے۔ خاص طور سے ایران اور خود اپنے شہر شیراز میں ہونے والی تباہی اور بربادی کا ذکر ان کے اشعار میں بکثرت ملتا ہے۔ چنانچہ تیمور نے شیراز سے پہلے فارس، عراق اور کرمان کو اپنی اطاعت میں لے لیا تو حافظ نے اپنا مشہور قطعہ لکھا جو گیارہویں صدی ہجری کے دو نسخوں میں ذرا اختلاف کے ساتھ ملتا ہے۔

پہلا قطعہ :

نیم تنی ملک سلیماں گرفت　　چشم کشا قدرت یزدان ببیں
پای نہ و خنگ فلک زیر ران　　دست نہ و ملک بزیر نگیں
این ہمہ او میکند و می دہد　　کیست کہ گوید کہ چناں یا چنیں

(آدھے جسم نے ملک سلیماں فتح کر لیا۔ قدرت خداوندی کو آنکھ کھول کر دیکھ۔ بغیر پاؤں کے آسمان کا گھوڑا سواری میں ہے، ہاتھ غائب اور حکومت اس کے تحت۔ یہ سب خدا کرتا ہے اور دیتا ہے۔ کون ہے جو کہے کہ کیسے اور کس طرح؟)

دوسرا قطعہ :

نیم تنی ملک سلیمان گرفت　　کرد مسخر ہمہ روی زمین
پنبہ غفلت بدر آور زگوش　　چشم کشا رحمت رحمان ببین
این ہمہ او میکند و می دہد　　کیست کہ گوید کہ چنان یا چنین

(آدھے جسم نے اتنا بڑا ملک فتح کر لیا اور سارا روے زمین تسخیر کر لیا۔ بے خبری کی روئی کانوں سے نکال اور آنکھ کھول کر اللہ کی رحمت دیکھ۔ یہ وہی کرتا اور دیتا ہے اور کون ہے جو کہے کہ ایسے یا ویسے۔)

حافظ کے مذکورہ بالا قطعہ میں تیمور کی نصف بے دست و پائی کا ثبوت مشہور مورخ ابن عربشاہ کی کتاب عجائب المقدور فی نوائب تیمور میں بھی ملتا ہے۔ واقعات کے درمیان عربی کا یہ شعر لکھتا ہے :

لئن کانت یدی فی الحرب شلا
فرجلی فی الھزیمۃ غیر عرجا

اس مقالہ کا خاتمہ حافظ کی ایک مشہور غزل پر ہوتا ہے جس میں ایک طرف شہر شیراز کی بینوائی اور بدبختی کا ماتم ہے اور دوسری طرف اس دور ابتلا کے بعد تیمور

کی آمد آمد کا خیر مقدم ہے۔ دیکھئے حافظ کا حساس دل کس طرح تڑپتا ہے:

سینہ مالامال در دست ای دریغا مرہمی — دل ز تنہائی بجان آمد خدا را ہمدمی

زخموں سے چھد دل ہاتھوں میں ہے اے کاش کوئی مرہم ہو — تنہائی سے جان پر آبنی ہے براہ خدا کوئی ہمدم ملے۔

چشم آسائش کہ دارد از سپہر تیز رو — ساقیا جامی بمن دہ تا بیاسایم دمی

اس برق رفتار آسمان کی بنا پر کس کی آنکھ لگتی ہے۔ — اے ساقی مجھے ایک ایسا جام پلا کہ میں ایک لمحہ آرام کر لوں

زیرکی را گفتم این احوال بین خندید و گفت — صعب روزی بوالعجب کاری پریشان عالمی

میں نے خرد سے کہا یہ حالات دیکھ، وہ ہنسی اور بولی — عجیب مشکل کے دن اور کام ہیں کہ ایک دنیا پریشان ہے۔

سوختم در چاہ صبر از بہر آن شمع چگل — شاہ ترکان فارغ است از حال ما کو رستمی

اس خوبصورت شمع کے لئے میں صبر کے گڑھے میں جلا۔ — ترکوں کا بادشاہ میرے حال سے بے نیاز ہے، رستم کہاں ہے؟

در طریق عشق بازی امن و آسایش بلاست — ریش باد آن دل کہ با درد تو باید مرہمی

عشق بازی کی راہ میں سکون و اطمینان مصیبت ہوتا ہے۔ — وہ دل زخمی ہی رہے جس کا علاج تیرا درد ہے۔

اہل کام و ناز را در کوی رندی راہ نیست — رہروی باید جہان سوزی نہ خامی بیغمی

مطلبی اور ناز والے لوگوں کو پینے والوں کے کوچے میں گذر نہیں۔ — ایسا رہرو چاہیئے جو دنیا پھونک دے نہ کہ ناتجربہ کار لاپروا۔

آدمی در عالم خاکی نمی آید بدست — عالمی دیگر بباید ساخت وز نو آدمی

اس دنیائے آب و گل میں انسان میسر نہیں ہے — ایک نئی دنیا بنانا چاہیئے اور ایک نیا آدم

خیز تا خاطر بدان ترک سمرقندی دہیم　　　کز نسیمش بوی جوی مولیاں آید ہمی
اُٹھ تاکہ اپنا دل ہم اس سمرقندی معشوق کو　　　کہ جس کی ہوا سے نہر مولیاں کی خوشبو چلی آرہی ہے۔
دیں۔

گریۂ حافظ چہ سنجد پیش استغنائے عشق
عشق کی بے نیازی کے سامنے حافظ کا گریہ کیا وزن رکھتا ہے
کاندریں دریا نماید ہفت دریا شبنمی
کیونکہ اس سمندر میں سات دریا بھی شبنم کے برابر ہے

## حوالہ جات :


۱۔ شرف الدین علی یزدی　ظفر نامہ قلمی،　ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ دہلی
۲۔ دکتر قاسم غنی　بحث در آثار و افکار و احوال حافظ　انتشارات زوار　تہران
۳۔ سید محمد علی جمالزادہ　رواج بازار شعر و شاعری　مجلہ ارمغان　اُردی بہشت　〃
۴۔ 〃　〃　〃　〃　〃　〃　〃　〃　〃 اسویں قسط 〃　〃　خرداد ماہ　〃
۵۔ رکن الدین ہمایوں فرخ　دربارہ ملاقات حافظ با امیر تیمور گورگانی　مجلہ ارمغان
خرداد ماہ　تہران


(شعبہ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ کے اسٹڈی سرکل میں یہ مضمون پڑھا گیا)

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

# ناول کا آغاز

ناول کی وہ خصوصیات جو بادی النظر میں اسے داستان سے ممتاز کرتی ہیں، حقیقت نگاری، کردار کی اہمیت اور فلسفیانہ گہرائی ہے۔ حقیقت اگرچہ کسی نہ کسی شکل میں داستان میں بھی موجود ہوتی ہے اور تخیل کی جولاں گاہ سے ناول بھی محفوظ نہیں ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے داستان میں محیر العقول واقعات و کردار پیش کئے جاتے ہیں جن کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح وہاں عام حقیقتوں کو بھی تخیلی دنیا کے پس منظر میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ نہ صرف ان کی اصلیت مجروح ہو جاتی ہے بلکہ ان کا ایک ہی رُخ سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس ناول میں تخیل اسی دنیا کی حقیقتوں کی بازیافت یا ممکنہ ترتیب و تشکیل کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مزید داستان میں تمام تر اہمیت واقعات کو حاصل ہوتی ہے اور عمومیت و حقیقت سے عاری طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والے مافوق البشر طاقت اور اعلیٰ صفات کے حامل مثالی کردار صرف واقعات کو وقوع میں لانے کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔ جبکہ ناول میں توجہ کا مرکز کردار ہوتے ہیں جن کا تعلق اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتا ہے۔ اس میں واقعات اگرچہ کردار کے تابع ہوتے ہیں لیکن ان کے مابین ایک ناقابل شکست رشتہ بھی موجود رہتا ہے۔ داستان میں

---

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکچرر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ، دہلی۔

واقعات و کردار کے صرف خارجی رخ کو پیش کیا جاتا ہے اور ان کے اسباب و علل پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جاتی ہے جبکہ ناول میں خارجی رشتوں کے ساتھ باطنی حقیقتوں کا بھی فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے۔

ناول اور داستان میں ان تضادات کے باوجود بیان واقعہ، افراد قصہ، ماحول اور اظہار بیان کی ایسی فنی مماثلتیں بھی موجود ہیں جنھیں قصہ کے اجزائے ترکیبی میں ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ البتہ ناول میں ان روایات کی توسیع شدہ اور نکھری ہوئی شکل پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ خصوصیات جن میں مذکورہ تضادات اور امتثالات بھی شامل ہیں۔ استدلالی و اشتمالی فکر کی چھلنی میں چھن کر بھی کسی بیانیہ نثر پارے کو ناول کہلائے جانے کا استحقاق عطا نہیں کرتے۔ اسے ناول کا پیراہن حاصل کرنے کے لئے ان طوفانوں، تضادات، تصادم، کشمکش اور ارتعاشات سے گزرنا پڑتا ہے جو کائنات اور اس کی مخلوق انسان کے ظاہر و باطن میں جاری و ساری ہیں۔ اسی لئے ڈی۔ ایچ۔ لارنس ناول کو زندگی کی ایک روشن کتاب اور ایتھر میں ایسے ارتعاشات سے تعبیر کرتا ہے جو پورے زندہ انسان کے اندر لرزش پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن ان ارتعاشات سے ہم آغوش ہونے کے بعد بھی ناول کا سفر ختم نہیں ہوتا بلکہ ناآسودگی کا احساس اسے مزید تلاش کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اور اس سفر میں اکثر ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں کوئی دلیل کام نہیں آتی اور صرف وجدان ہی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن کیا حقیقی دنیا کے پس منظر میں تعقل و حرکت، ارتعاشات اور کشمکش سے لبریز کسی بیانیہ نثر پارے کو مکمل ناول کہہ سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے اور نہ ہی ناول کے موجودہ سفر میں ابھی وہ منزل آئی ہے۔

بیانیہ نثر کے یہ تمام اجزا اپنی تمام تر اہمیت اور افادیت کے باوجود ناول میں تلاش کا ذریعہ تو بن سکتے ہیں لیکن مقصد نہیں ہیں۔ یہ مقصد کیا ہے۔ وہ مکمل حقیقت یا تکمیل کی خواہش ہے جو ہمیشہ سے انسان کا مطمح نظر رہی ہے جس کو پانے کے لئے ناول کا سفر اپنے جملہ

عناصر اور ان کی قطع و برید نیز رد و قبول کے ساتھ آج بھی جاری ہے، اس اعتبار سے ناول بھی ایک نامیاتی حقیقت ہے جو زندگی کے ساتھ برابر تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن یہ نامیاتی حقیقت فکر و عمل، جذبہ و خیال، تجسس و تحیر، کثافت سے لطافت اور ظاہر سے باطن کی طرف سفر کس کے جمال جہاں آرا کا پرتو ہے۔ یہ اسکا دنیا کے جیتے جاگتے انسان کا عکس ہے جو کائنات کی دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں زیادہ توانا اور لطیف لیکن فطرت سے زیادہ قریب اور اسی کی طرح پیچیدہ بھی ہے۔ اسی پیچیدہ انسان کے جذبات و تخیل کی سرگذشت کو جب بیانیہ نثر میں پیش کیا جاتا ہے تو وہ ناول کہلانے لگتا ہے اور چونکہ پیچیدگی اس کے موضوع و مواد کی فطرت میں شامل ہے اس لیے ناول کو بھی ادب کی پیچیدہ صنف قرار دیا گیا ہے۔ ناول میں چونکہ انسان کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے گرد واقعات کا تانا بانا بُنا جاتا ہے اور اسی کے تعلق سے زندگی کی معنویت اور اس کی داخلی قوتوں اور خارجی رشتوں نیز کائنات کی دیگر حقیقتوں کی تلاش کی جاتی ہے اس لیے اکثر ناول کو NOVI L OF CHARACTERS بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس منزل پر ناول کی یہ اور اس طرح کی دیگر تعریفات و تشریحات اور حدود کا تعین ناول کے باطن میں باطن سے جھانکنے کی ایسی کوشش ہوگی۔ جیسے پانی کی گہرائی کو ناپنے کے لئے خیالات کی گہرائی کو بطور پیمانہ استعمال کیا جائے جبکہ خود ناول کا فن باطنی حقیقتوں کی تلاش کے لئے بھی خارجی حقیقتوں کا سہارا لیتا ہے۔ یہ خارجی حقیقتیں کیا ہیں جو فکر انسانی اور عقل کو اس منزل پر لے آتی ہیں اور شعور کو اس حد تک متحرک کر دیتی ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے راز حقیقت پسندی اور مثالیت پسندی اور زندگی کی طرح ادب پر حکمرانی کرنے والے قانون قدرت عمل و ردعمل کو معلوم کر لیتا ہے۔ یہ سب وہ سائنسی حقیقتیں اور جدید علوم ہیں، جن کی دریافت کے لیے انسان کو وسائل کی محرومی نے مجبور کیا تھا۔

ان مادی اور فکری حقیقتوں کی نشاندہی بظاہر سہل ہے لیکن ان کی روح تک رسائی

اس وقت ممکن ہے جبکہ ان اسباب وعلل پر بھی نظر ڈالی جائے جو زندگی کو حرکت میں لاتے ہیں۔
یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ انسان اپنی تمام تر اخلاقی اور روحانی ترقی کے باوجود خود کھادے سے آزاد نہیں کر سکا ہے۔ وہ اب بھی روٹی، کپڑا، مکان اور زندگی کی دیگر مادی ضروریات و آسائش کا محتاج ہے۔ ان ہی مادی وسائل کے ذریعہ وہ روحانی سکون اور جسمانی آرام بھی حاصل کرتا ہے لیکن اس کی یہ مادی ضروریات اس کے عہد کے پیداواری وسائل سے پوری ہوتی ہیں جن کی تبدیلی کے ساتھ خوراک، پوشاک، معاشرت، فکر، سماجی و تہذیبی رشتے، جذباتی وفاداریاں، عقائد و تصورات اور مذاق ہی کیا ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ جاگیردارانہ عہد کے آغاز میں مادی ضروریات کی تکمیل کا واحد ذریعہ زمین تھی لیکن زمین اپنی تمام تر زرخیزی کے باوجود دیگر قدرتی وسائل، بارش، ہوا اور روشنی کی محتاج تھی جن پر انسان کو کوئی قدرت حاصل نہیں تھی۔ لیکن جب مسلسل استعمال کے باعث زمین کی زرخیزی میں کمی آنے لگی اور کثرت آبادی کی وجہ سے ضروریات زندگی میں اضافہ ہو گیا تو نئے وسائل کی تلاش شروع ہوئی اور زمین کی زرخیزی میں بحالی، بغیر بارش کے فصل اگانے میں کامیابی نیز پانی اور ہوا کی طاقت کے انکشاف نے اسے خلیفۃ اللہ فی الارض بنا دیا تو اس کے قصول میں بھی خلافت کا زنگ جھلکنے لگا۔ لیکن یہ کوشش ابھی ادھوری تھی۔ اور دریافت شدہ حقیقتوں کے امتزاج و اختلاط کے عمل سے ایک نئی حقیقت کا اظہار ہنوز باقی تھا۔ چنانچہ جب انسان کو بحر و بر پر دسترس حاصل ہو گئی تو اسے ایسے تہذیبی مراکز اور شہروں کے قیام کا موقع مل گیا جس کے دامن میں دنیا کی تمام نعمتیں سمٹ کر آجائیں اسی کوشش نے شہروں کو عالموں اور فن کاروں کی ملکیت بنا دیا۔ اور ایسے خواب دکھائے جو انسان کے وسائل اور اس کی طاقت سے باہر تھے لیکن تجسس جو انسان کی فطرت میں شامل ہے وہ برابر تکمیل کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

ان شہروں کی سب سے بڑی دین وہ سیاسی وسماجی شعور اور تہذیبی و تمدنی برکات

اورعلوم وفنون تھے جن کی داغ بیل اس زمانہ تک کی دریافت شدہ حقیقتوں اور ان کے امتزاج پر رکھی گئی تھی اور جن کا مقصد خدمت خلق تھا لیکن ملکیت کے حقوق نے اس خدمت کو اس طرح غلامی میں بدل دیا کہ گنتی کے چند افراد نے انسانوں کی بڑی تعداد کو ان کے پیدائشی حقوق آزادی ومساوات سے محروم کردیا ۔لیکن انسان نے اس طرح کی پابندیوں کو کب برداشت کیا ہے چنانچہ اس محرومی نے رفتہ رفتہ تصادم وکشمکش کی شکل اختیار کرلی ۔چونکہ زندگی کی ضروریات ابھی پرانے پیداواری وسائل سے وابستہ تھیں جن پر طبقۂ اعلیٰ کا قبضہ تھا اس لئے یہ کشمکش وتلاش منظم بغاوت کے بجائے فکری سطح تک محدود رہی جس کا اظہار ان قصوں و داستانوں میں ہوتا رہا جو طبقۂ اعلیٰ کی مثالیت پسندی اور آمریت کا جواز پیش کرنے کے لئے تصنیف کی گئی تھیں ۔ ان میں تخیل کی بے لگامی، مادی رشتوں سے انقطاع، خیالی دنیا کی تخلیق، انتشال اور محکومی کی قیود سے بے نیازی، محیر العقول واقعات اور مافوق الفطرت مثالی کردار سب اسی جنت ارضی کے خواب تھے جن سے اس زمانے میں حاکم اور محکوم دونوں لطف اندوز ہوسکتے تھے ۔لیکن انسان کی حقیقت پسندی ہمیشہ اس طرح کے خوابوں کو مسمار کرتی رہی ہے اور اس کا تجسس ہمیشہ نئی اور ٹھوس حقیقتوں کا متلاشی رہا ہے حرکت وتغیر اگرچہ زندگی کا خاصہ ہے لیکن اس کا عمل میدانوں کی طرح سپاٹ اور پہاڑوں کی طرح ڈھلوان نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ وار زینہ بہ زینہ ارتقائی عمل ہے اور جب ایک سلسلہ کی متعلقہ حقیقتیں اپنی تلاش کے جملہ امکانات ختم کردیتی ہیں تو زندگی نئے دور میں داخل ہوجاتی ہے چنانچہ جب پرانے زرعی وسائل مزید تلاش کے امکانات سے محروم ہوجاتے ہیں اور سیاسی وتہذیبی انتشار نیز بڑھتی ہوئی ضروریات کے باعث نئے پیداواری وسائل کی تلاش ایک ناگزیر حقیقت بن جاتی ہے ۔بھاپ کی طاقت کی دریافت اور دیگر سائنسی حقیقتوں کے انکشافات اس ضرورت اور تلاش کا نتیجہ تھیں جن کے باعث انسان کو ایسی مشینیں اور کلیں ایجاد کرنے پر قدرت حاصل ہوجاتی ہے جو اس کو نہ صرف

مشیت کے جبر اور جاگیر دارانہ عہد کے وسائل کی محرومی و محکومی سے نجات دلاکر زندگی کو زیادہ خوشگوار اور بااختیار بنا سکتی تھیں بلکہ وقت اور فاصلہ پر بھی اس کی حاکمیت کا جواز پیش کر سکتی تھیں۔ ان ہی حقیقتوں کی دریافت، مشاہدے، مطالعہ اور تجربے نے اسے فطرت کے قانون حرکت و ارتقا اور عمل و ردعمل سے واقفیت بہم پہنچائی جس کے اتحاد شعور اور عمل در آمد نے اسے نئی دنیا کا خالق بنا دیا۔ تخلیق کا یہ عمل ہی انسان کے تعقل کی نئی منزل تھی جس نے اس کے فکر کو اس طرح بدل ڈالا کہ وہ قدیم علوم و افکار، عقائد و اعتبارات شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جانے لگے جس کی بنیاد محکومی و مجبوری اور تقلید و روایت پر تھی اور ایسے علوم جدیدہ کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ جو نہ صرف آزادی و مساوات، خود مختاری و خود شناسی اور انسانی ہمدردی کی دولت سے مالامال تھے بلکہ تدبیر منزل میں بھی اس کی راہنمائی کر سکتے تھے۔

پیداواری وسائل کی اس تبدیلی اور جدید علوم کے فروغ نے نہ صرف مشیت کے جبر، جاگیردارانہ نظام کی آمریت، تہذیبی جمود، کلیسائی رہبانیت اور مذہبی عصبیت کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیا جس نے صدیوں سے مظلوم انسان کو اپنے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بلکہ وہ اقدار اور رشتے بھی کمزور ہونے لگے جن کا تعلق پرانے وسائل سے تھا اور نئے پیداواری وسائل کے ساتھ قدیم طبقاتی نظام و اقدار، حد بندیوں اور رشتوں کو توڑ کر ایک ایسا متوسط طبقہ بھی وجود میں آنے لگا جس کے مسائل و مصائب کی طرح جذبۂ تعمیر و ترقی بھی سماج کے دیگر طبقات سے نہ صرف مختلف تھا بلکہ اس کی اقدار اور رشتوں کا بھی ہنوز تعین نہیں ہوا تھا۔ اس پر مستزاد جذباتی وفاداریاں، وقت کے تقاضے اور ترقی کے لامحدود امکانات تھے جنھوں نے فرد اور سماج کو اس طرح حلقوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ ہر حلقہ دوسرے سے منفرد اور توانا نظر آتا تھا۔ چنانچہ اقدار اور رشتوں کی اس شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل کی خواہش نے سماج کو تہذیبی بحران، ذہنی انتشار اور فکری تضاد اور تصادم میں اس طرح مبتلا کر دیا کہ زندگی بے معنی اور مضحکہ نظر آنے لگی اور انفرادی

اجتماعی سکون نیز سماجی استحکام کے لئے اس امر کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اور فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ فرد اور سماج کی داخلی وخارجی قوتوں کے پس منظر میں زندگی کی نئی معنویت، اقدار اور رشتوں کو اس طرح تلاش کیا جائے کہ انسان کے پیدائشی حقوق آزادی ومساوات کا بھی تحفظ ہو سکے اور زندگی کے امکانات بھی روشن ہو جائیں چنانچہ جب اس تلاش کے لئے شعوری طور پر دیگر شعبہ ہائے علم وادب کی طرح بیانیہ نثر کو بھی استعمال کیا جانے لگا تو اس طرح کے نثر پارے چونکہ اپنے موضوع ومواد، طرز فکر واحساس اور انداز بیان کے اعتبار سے سابقہ قصوں اور داستانوں سے مختلف تھے اس لئے ان کی ندرت اور تنوع کے باعث انھیں جدید یا ناول کہا گیا۔

بیانیہ نثر میں یہ تبدیلی کوئی اچانک چھلانگ نہیں تھی جو کہ داستانوں کے تختہ زقند سے لگائی گئی تھی بلکہ اس تبدیلی کا اظہار ناول سے قبل دیگر شعبہ ہائے زندگی اور اصناف ادب میں ہوتا رہا تھا جس کا ثبوت ان پکارسک میں ملتا ہے جو سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں قدیم تہذیبی مراکز میں جاگیردارانہ نظام اور اس کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرنے کے لئے تصنیف کئے گئے تھے۔ ڈان کوئکزوٹ (DON QIUXOTE) ۱۶۰۵-۱۵ء میں یہ تبدیلی زیادہ واضح نظر آتی ہے اس کے مصنف نے داستانوں کے خیالی واقعات کو حقیقی دنیا کے پس منظر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ پرانے نظام کے تضادات نمایاں ہو کر مضحکہ خیزی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں لیکن تبدیلی کی رفتار چونکہ ابھی سست تھی اس لیے یہ پکارسک صرف فکری، تبدیلی کا احساس دلا پاتے ہیں۔ البتہ عقائد وتصورات، سماجی ومعاشی اور تہذیبی رشتوں میں عملی تبدیلی اور جدید سائنسی علوم وصنعتوں کے فروغ کا اظہار ان ڈائریوں، سفرناموں، سوانح عمریوں، تمثیلوں اور مضامین وغیرہ میں ہوتا ہے جو اس زمانے کے مسائل حیات اور کائنات پر حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالتے ہیں لیکن سماج اور نوزائیدہ متوسط طبقہ کے جذبات اور تخیل، جدید وقدیم کے مابین تصادم

اور تضاد۔ زندگی میں نئی معنویت کی جستجو اور نئے رشتوں اور اقدار کی تلاش نیز جذبہ تعمیر و تشکیل کا زیادہ جامع اور مکمل اظہار بیانیہ نثر ہی میں ممکن تھا۔ چنانچہ جب ان مقاصد کے حصول اور حقیقی زندگی کی عکاسی کے لئے بیانیہ نثر سے بھی کام لیا جانے لگا تو سابقہ بیانیہ نثر، قصوں اور داستانوں سے ممتاز کرنے کے لیے اس طرح کے نثر پاروں کو ناول کے نام سے پکارا گیا۔

تبدیلی کے اس ابتدائی دور میں چونکہ کشمکش کی نوعیت واضح نہیں تھی اس لئے عام طور پر مسائل و مصائب کا سبب مذہب و اخلاق سے بُعد اور علم و عمل سے محرومی تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جان بنیسن اپنی تصنیف پلگرمس پروگریس ۸۴-۱۶۷۸ء میں اور ڈینیل ڈیفو اپنی تصنیف رابنسن کروسو ۱۷۱۹ء میں زندگی کی نئی معنویت اور فرد اور سماج کی داخلی و خارجی قوتوں کو فطرت، مذہب اور اخلاق کے پس منظر میں تلاش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان تصانیف میں اکثر واقعات خیالی ہیں لیکن ان کو قرین قیاس حد تک حقیقی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ البتہ رچرڈسن اور فیلڈنگ کی تصانیف میں جدید فکر، حقیقت نگاری، تلاش و کشمکش اور داخلی قوتوں اور خارجی رشتوں کا احساس زیادہ واضح اور ہمہ گیر ہے اس لیے انھیں انگریزی کے اولین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رچرڈسن کے ناولوں میں اگرچہ مذہب اور اخلاق غالب رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن وہ نیک کرداری کے مادی انعام پر یقین رکھتا ہے اس کے برعکس فیلڈنگ نیکی کو خود نیکی کا انعام اور ذہنی سکون کا ذریعہ تصور کرتا ہے اور زندگی کی نئی معنویت اور رشتوں کی تلاش فرد اور سماج کی داخلی و خارجی زندگی کے پس منظر میں اس طرح کرتا ہے کہ اس کے خصوصیات اور امتیازات واضح ہو جاتے ہیں فیلڈنگ رجائیت اور حرکت پسند ہے اور زندگی کو ایک مضحکہ خیز جہد مسلسل سے تعبیر کرتا ہے اور اسی جدوجہد میں مصروف زندگی کو اپنے ناولوں میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناول کو ایک ایسا مضحکہ خیز رزمیہ کہتا ہے جو نثر میں لکھا گیا ہے A COMIC APIC IN A PROSE یہاں نثر کی شرط نہ صرف ناول کو قدیم ایپک کی منظوم روایت سے ممیز کرتی ہے بلکہ اسے زندگی سے زیادہ قریب لے آتی ہے۔

رچرڈسن اور فیلڈنگ کے زمانہ ہی میں ناول کے ابتدائی فنی نقوش ادوار ابھی متعین ہو جاتے ہیں اس کی مزید تعمیر و تشکیل کا کام بعد میں انجام پاتا ہے اور فرد اور سماج کی داخلی و خارجی قوتوں رشتوں اور زندگی کی نئی معنویت کی تلاش مذہب و اخلاق تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ تحقیق و تلاش کا یہ سلسلہ زندگی کے دیگر شعبہ ہائے علم و عمل کو بھی اپنے حصار میں اسیر کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں تاریخی، نفسیاتی، علمی، سائنسی، سماجی، رومانی، گھریلو، دیہاتی، عصری، بحری اور اسراری وغیرہ مختلف اقسام کے ناول ظہور میں آتے ہیں اور ناول کے دامن کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ تلاش کا یہ سفر آج بھی جاری ہے جس نے ناول کو ادب کی دیگر اصناف سے ممتاز کر دیا ہے۔

---

اعلیٰ ناول نگار زندگی کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اس لئے وہ زندگی کی بابت کچھ نہ کچھ نتائج پر ضرور پہنچ جاتا ہے، جن سے ہم بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ناول میں کردار کی خصوصیات کا تجزیہ، انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ، باہمی تعلقات کی پیچیدگیاں وغیرہ اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ ان سے ہم ضرور کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ محبت ایک ایسا مضمون ہے جو قریب قریب ہر ناول میں آتا ہے اور شادی بیاہ سے اس کو جو تعلق ہے اس پر ناول نگار کی رائے الگ الگ نظر آتی ہے، کیونکہ زندگی کے ہر اہم معاملے میں ہر فرد بشر اپنی رائے الگ رکھتا ہے اور چونکہ ناول نگار عام آدمی سے زیادہ باخبر اور حساس ہوتا ہے، اس لئے اس کی رائے زیادہ موثر ہوتی ہے۔"

(ڈاکٹر محمد حسن فاروقی و ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی۔ "ناول کیا ہے؟" صفحہ ۴۹)

سبط محمد نقوی

# چند دن دار المصنفین میں

اُترپردیش کے 'پورانچل' یعنی دیارِ شرق کی اقتصادی پسماندگی اور معاشی درماندگی میں کوئی شک نہیں۔ "تین آنے بنام پندرہ آنے" کی بحث میں ڈاکٹر لوہیا کی معرکہ آرا تقریر اور غازی پور کے نمایندے شری وشوناتھ سنگھ گہمری کی لوک سبھا ہی میں یادگار تقریر، پٹیل کمیشن کے قیام اور اس سلسلے کے اور اقدامات کے باوصف صورت حال میں کوئی نمایاں بہتری نہیں۔ ریاست کے موجودہ وزیر اعلا رام نریش یادو اور حکمراں جنتا پارٹی کے نیشنل چیرمین چندر شیکھر اسی خطے کے سپوت ہیں۔ ان کی محنت و ریاضت سے کچھ ہو جائے تو بڑی مبارک بات ہے۔ لیکن اسی پورانچل کے دامن میں، اس مادی درماندگی کے نعم البدل کے طور پر، وہ جہانِ معنی آباد ہے جسے ہم یوپی کا ہی نہیں ہندوستان کا بلکہ پورے دیارِ شرق کا ایک معمور علمی گنجینہ کہہ سکتے ہیں اور جس کی دھاک مغرب تک ہے۔ آپ کا ذہن ملتفت ہو گیا ہو گا کہ میں اعظم گڈھ کے دار المصنفین —— جسے آسانی کی خاطر اور عصریت کے تقاضے سے شبلی اکاڈمی بھی کہتے ہیں —— کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ ـ ۱۹۱۴) یہ نقش جاوید سرزمین دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ پر ثبت فرمانا چاہتے تھے۔ خداوند رحیم حاسدوں کی اُس جماعت پر رحم فرمائے جس

---

جناب چودھری سبط محمد نقوی، اکبر پور (ضلع فیض آباد۔ یوپی) کے رہنے والے، قدیم تعلیم کے فارغ التحصیل اور متعدد کتابوں کے مصنف۔

کو شبلی مرحوم اپنے اس شعر کی معرفت اردو ادب میں زندہ کر گئے ہیں :

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

اس جماعت کے فیضان سے شبلی نہ صرف ندوہ کی معتمدی سے الگ ہوئے بلکہ یہ بھی طے کرنا پڑا کہ اپنے تعلیمی، تصنیفی اور تحقیقی منصوبے لے کر "بشہر خود روم و شہر یار خود باشم" شاید اس فیصلے کے نفاذ میں دیر لگتی مگر شبلی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحٰق کی نا وقت موت نے شبلی کو اعظم گڑھ کی طرف ڈھکیل دیا یا یوں سمجھ لیں کہ آب و دانہ اور خاک گور انھیں یہاں کشاں کشاں لے آئی اور اس طرح شبلی کا دیرینہ خواب ستمبر ۱۹۱۴ء میں مشرف بہ تعبیر ہوا اور شبلی کے اپنے باغ میں دار المصنفین کی بنیاد پڑ گئی اور یہ تخم ریزی ایسے برگ و بار لائی کہ اگرچہ اس کی عہد بہ عہد ترقی کی بہت کچھ داستان حیات شبلی اور حیات سلیمان میں بکھری ہوئی ہے پھر بھی اگر یہ لذیذ حکایت مختصر طریقے سے بھی ترتیب وار کہی جائے تو ہزارہا صفحات کے مجلے میں سمٹے نہ سمٹے گی۔ لیکن مجھے اس حکایت سے یہاں مطلب نہیں۔

مجھے تو اس معمورۂ معانی میں چار دن بسر کرنے کا ابھی حال ہی میں موقع ملا اور مولانا صباح الدین عبد الرحمان، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولوی عمیر الصدیق کی علمی تواضع اور مولوی محمد طیب آزاد ناظم کتب خانہ کی نوازش اور دیگر رفقا و ارکان دار المصنفین کی عنایتوں سے لطف اندوز ہوا۔ جناب صباح الدین عبد الرحمن اس وقت اس کاروان دین و دانش کے سربراہ ہیں اور اب ناظم علمی اور ناظم انتظامی کی وہ دوعملی بھی رفع ہو چکی ہے، جس کے ہاتھوں علامہ سید سلیمان ندوی کو ناقدری کا تلخ تجربہ ہوا اور انھیں عمر کا آخری حصہ دیار غیر میں بسر کر کے اپنی بے کسی کی شرم رکھنی پڑی۔

حاصل گزارش یہ ہے کہ مولانا صباح الدین صاحب اب ادارے کے نظم و نسق کے بھی ذمہ دار ہیں اور علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے نگراں بھی۔ جس وقت میں حاضر ہوا وہ

اپنے قلم سے امیر خسرو پر ایک تصنیف میں منہمک تھے اور وقتی طور پر صفائی کے نظام میں خلل کی وجہ سے پریشان۔ معارف پریس میں کاتبوں کی غیر معمولی قلت، رفتار کا بھی بقدر ضرورت نہ ہونا اور روزمرہ کے دوسرے مشکلات و مسائل کے ساتھ صفائی مزدوروں کی شرارت نے انھیں وقتی طور پر بہت دق کر رکھا تھا۔ کتب خانے کے مغربی شمالی بازو میں، دارالمصنفین کے اپنے خاص طرز پر ایک قطعۂ عمارت کی تیزی سے تعمیر ہو رہی ہے، مولانا کو اس کی دیکھ بھال کے لئے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے لیکن ان سب کے باوجود مولانا نے راقم کی نہ صرف کتب خانے میں اعانت بلکہ مہمان خانے میں اکرام کے لئے بھی روزانہ پابندی سے سرفراز فرمایا۔

مشہور ہے کہ افراط کرم گستاخ بنا دیتا ہے، یہ کیفیت مجھ پر بھی طاری ہوئی اور جی میں آئی کہ مولانا سے کچھ ان کے بارے میں سنا جائے۔ یہ خواہش عرض کی، فرمایا کہ "اس کو پوچھ کے کیا کیجئے گا۔" عرض کی کہ "قلم بند کرنے کا خیال ہے اگر کچھ بن پڑا تو شائع کراؤں گا۔ محسوس کرتا ہوں کہ دارالمصنفین اور ارباب دارالمصنفین کے لئے جو ہمارے اہل قلم کو کرنا چاہئے تھا، وہ کیا نہیں گیا۔ مولانا نے کسی قدر قطعیت کے ساتھ فرمایا "ہمارا اور اسلاف کا یہ مسلک نہیں ہے کہ شہرت کے وسیلے جمع کریں"۔ لیکن مولانا میرے اصرار کی تاب مقاومت نہ لا سکے از راہ مہمان نوازی سپر انداختہ سے ہو گئے۔ مہمان خانے کے کمرے میں جہاں کتب خانے کے نیم بیضاوی سبزہ زار اور کنارے کنارے اشوک، آم اور یوکلپٹس کے درختوں کے پس منظر نے "فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے" کے شاعرانہ تخیل کو مادی قالب میں ڈھال دیا تھا۔ مولانا نے تین چار نشستوں میں گفتگو کا موقع دیا، جو پوچھا اس کا جواب شرح صدر، بسط خاطر اور دل آویز خندہ پیشانی کے ساتھ دے کر ممنون فرمایا۔

پہلی بات جو دریافت کی گئی وہ مولانا کی ولادت اور خاندان اور ابتدائی حالات سے متعلق تھی فرمایا کہ رہنے والا آبائی طور پر بہار کے ایک گاؤں دیسنہ کا ہوں، جو پہلے

ضلع پٹنہ میں تھا اور اب ضلع نالندہ میں ہے، بہار شریف سے آٹھ میل پورب — وہیں ۱۹۱۱ء میں ولادت ہوئی۔" پھر ایک مختصر سے وقفے کے بعد بولے "خاندان میں انگریزی تعلیم ۱۸۵۰ء سے شروع ہوئی۔ پر دادا کے والد سید ریاض علی صاحب وکیل تھے، پر دادا حاجی سید وزیر الدین جونیئر کیمبرج پاس تھے۔ سینئر کیمبرج کی تعلیم کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ان کے ٹیچر مسٹر ہینوی (HENVY) ۱۸۵۷ء کی انقلابی شورش میں مارے گئے اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا مگر پر دادا مرحوم ایک اسکول میں انگلش ٹیچر مقرر ہو گئے۔ میرے دادا سید محمد احسن صاحب نے ۱۸۸۴ء میں میٹرک پاس کیا اور کچہری میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ میرے والد سید محی الدین صاحب ۱۹۰۹ء میں بی اے پاس ہوئے۔ میرے دادا کا انگریز افسران پر بہت مہربان تھا۔ والد مرحوم اس کی سفارش پر ڈپٹی کلکٹر نامزد ہوئے مگر نامزدگی کے ساتھ ہی ان کی وفات ہوگئی۔"

"میری تعلیم بھی مغربی طرز پر ہوئی، پٹنہ سے اردو فارسی اور تاریخ میں ایم اے کیا اور مسلم یونیورسٹی سے معلمی کی سند لی۔" میں نے عرض کیا کہ "پھر آپ نے سرکاری ملازمت کا شاندار مستقبل کیوں نظر انداز کر دیا۔" فرمایا کہ "معلمی کے پیشے میں میرا جی نہیں لگا اور پھر تعلیم ختم ہوتے ہی میرے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ نے مجھے دارالمصنفین طلب کر لیا ۱۹۳۵ء میں اور جو کچھ میں نے حاصل کیا، انھیں کی صحبت میں اور گزشتہ بیالیس ۴۲ سال سے دارالمصنفین کا ادنیٰ خادم بنا ہوا ہوں۔" میں نے قدرے تامل کے ساتھ دریافت کیا کہ "دارالمصنفین آنے کے بعد آپ کا سب سے پہلے کس موضوع سے سابقہ ہوا؟" مولانا نے بتایا کہ "جس زمانے میں یہاں تاریخ ہند کا کام بڑے پیمانہ پر شروع ہوا تھا۔ اس کی ایک جلد "ہندوستان میں مسلمانوں کا فوجی نظام" مجھے لکھنے کے لئے سونپی گئی، موضوع بہت ہی خشک اور صبر آزما تھا لیکن سید صاحب کے ارشاد اور ان کی ہمت افزائی سے اس کام میں لگا رہا۔ تقریباً چوبیس سال کی محنت صرف ہوئی تب کہیں جا کر یہ کتاب مکمل اور شائع ہو سکی لیکن کم ہی لوگ تھے جو

اس کتاب کے قدرداں تھے۔" میں نے کسی قدر استعجاب کے ساتھ عرض کیا "مولانا! چوبیس سال اور موضوع ایسا ٹھس!" کہنے لگے "جی ہاں! اسی اثنا میں ڈاکٹر زبیر احمد صدیقی صدر شعبہ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ، ڈی کے لئے ہندوستان میں صوفیائے کرام کے کارنامے کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی پیش کش کی۔ میں نے تعمیل فرمائش کی، مگر مقالہ تیار ہونے کے بعد میں سخت بیمار پڑ گیا۔ خیال ہوا کہ ان بزرگان دین کو دنیاوی کام کے لئے استعمال کرنا مناسب نہیں اس لئے مقالہ داخل نہیں کیا اور پھر اس میں ترمیم کر کے بزم صوفیہ کے نام سے مدون کیا اور یہ دار المصنفین کی طرف سے شائع ہوئی اور میری توقع کے خلاف یہ کتاب علمی حلقوں میں کثرت سے پڑھی گئی۔" میرا اب سوال تھا کہ علمی حلقے میں کثرت سے تو پڑھی گئی لیکن ردعمل کیا ہوا؟" مولانا اس سوال پر ہنس پڑے، کہنے لگے "بھئی! ردعمل تو طرح طرح کے ہوئے۔ میرے ایک پرانی طرز کے تعلیم یافتہ بزرگ نے فرمایا کہ "تمہاری یہ کتاب مجھے پسند نہیں آئی۔ نہ اس میں بزرگوں کے اوراد و وظائف ہیں، نہ ان کے کرامات وخوارق عادات کا ذکر ہے۔ یہ کیا کتاب ہے۔" لیکن اس کے ساتھ میرے چچا کے ایک دوست جو ریٹائرڈ کلکٹر تھے، انھوں نے کہا "تمہاری اس کتاب کی بدولت میں نے بہت سی عادتیں چھوڑ دی ہیں۔ تم نے اس کتاب میں ان بزرگوں کے کام اور پیام کو جس طرح پیش کیا ہے، یہ اس کا اثر ہے۔" تو یہ ملا جلا ردعمل تھا۔ ایک طرف وہ، دوسری سمت یہ۔ لیکن جس ردعمل کو آپ علمی نقد یا تبصرہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ ارشاد ہے کہ "یہ حضرات جا رہے تھے، لیکن آپ نے یہ کتاب لکھ کر واپس بلا لیا۔" دراصل خواجگان چشت کے ملفوظات کے سلسلے میں ایک نزاع یہ ہے کہ وہ فی الحقیقت اُن کے ملفوظات ہیں بھی کہ نہیں اور ان کے عہد میں قلم بند ہوئے تھے کہ نہیں؟

میں نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ملفوظات انھیں کے زمانے میں قلم بند ہوئے اور ہر زمانے میں مستند تذکرہ نگاروں نے اس کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔" اس

عاجز نے اپنی لاعلمی کا راز برملا فاش کیا اور عرض کی "کتاب کے مطالعہ کا مجھے موقع نہیں ملا ہے اس لئے اگر آپ تھوڑی روشنی ڈالیں تو میں زیادہ مستفید و محظوظ ہوں گا۔" جناب مولانا نے قدرے تامل کے بعد فرمایا کہ "دوسرے نقطۂ نظر والوں کے سرخیل پروفیسر حبیب مرحوم (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) تھے۔ مگر وہ حضرات اس پر توجہ نہیں فرماتے کہ خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بختیار کاکی، حضرت فریدالدین گنج شکر کے حالات و تعلیمات کا ماخذ یہی ملفوظات ہیں۔ اگر انھیں رد کر دیا جائے تو پھر نہ ان کے حالات معلوم ہو سکیں گے اور نہ تعلیمات۔ اب تک سب سے مستند تذکرے، سیر الاولیاء اور اخبار الاخیار کہے جاتے ہیں اور ان دونوں تذکروں میں ان ملفوظات سے کافی استفادہ کیا گیا ہے اور ان تذکروں کے استناد کو حبیب صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ملفوظات کسی حال میں اولیں ماٰخذ کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ اگر ان کو رد کر دیا جائے تو ان اولیا کے حالات نظر سے یکسر اوجھل ہو جائیں گے۔"

یہ فرما کے مولانا نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی لیکن مجھے یہ تجسس ہوا کہ اس بحث کا اثر کیا ہوا۔ اس تجسس کو میں نے مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ فرمایا کہ "منادی دہلی نے خواجگان چشت نمبر میں میرا مضمون اور دوسرے مکتبہ فکر کا نقطۂ نظر ایک ساتھ شائع کر دیا تاکہ قارئین یہ فیصلہ خود کر لیں کہ استدلال و احتجاج میں وزن کس طرف زیادہ ہے۔ چنانچہ ان ملفوظات کو الحاقی اور وضعی سمجھنے والے مکتبہ فکر کو اپنا نقطہ نظر مشکوک ہوتا نظر آ رہا ہے۔"

اب نماز مغرب کا وقت آ چکا تھا۔ مولانا نے معذرت کی اور یہ صحبت بعد نماز کے لئے ملتوی ہو گئی۔ مسجد سے واپسی پر مولانا نے فرمایا کہ "اس وقت بعض دوسرے ضروری کام کرنا ہیں۔ آپ بھی میرے ساتھ گفتگو میں مشغول رہے ہیں۔ اب کچھ اپنا کام بھی کر لیجئے۔" السلام علیکم کہہ کر، میرے جواب کا انتظار کئے بغیر مولانا اپنی قیام گاہ کی طرف چل پڑے۔ جو مہمان خانے سے متصل شمالی بازو میں ہے۔

دوسرے روز حسب معمول خبر گیری کے لئے مولانا میرے پاس تشریف لائے۔ مولانا

عبدالسلام صاحب قدوائی بھی ساتھ تھے۔ تھوڑی دیر کچھ عصری مسائل پر گفتگو رہی اور اس کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب تشریف لے گئے۔ مولانا کی قیام گاہ مہمان خانے کے جنوبی بازو میں ہے۔ ان حضرات سے گھر میں آتے جاتے، اوقات کتب خانہ کے علاوہ بھی، میری صاحب سلامت اور مختصر بات چیت ہو جاتی تھی۔ پھر بھی قدیم وضع داری اور اعلیٰ مہمان نوازی کی وجہ سے مولانا بھی کبھی کبھی کچھ دیر کے لئے کرم فرماتے تھے۔

اب میں نے پھر مولانا صباح الدین صاحب سے کل کی بات آگے بڑھانے کی استدعا کی۔ مولانا نے سکوت سے رضامندی دی اور پھر میں نے پوچھا "مسلمانوں کا فوجی نظام لکھتے وقت آپ نے پی، ایچ، ڈی کے لئے مقالہ لکھا۔ لیکن جب مقالے کو بزم صوفیہ کے نام سے تصنیفی شکل دی تو کوئی اور کام ہاتھ میں نہیں لیا!" ارشاد ہوا کہ بھئی! میں تو اسے اپنی بڑی کمزوری سمجھتا ہوں کہ دو تین کتابوں پر ساتھ کام کرتا ہوں، جب ایک سے طبیعت اوب جاتی ہے، دوسری شروع کر دیتا ہوں، جب اس سے بھی گھبرا جاتا ہوں تو تیسری شروع کر دیتا ہوں۔ جب بزم صوفیہ لکھ رہا تھا تو شاہانِ تیموریہ کا علمی ذوق کے عنوان پر معارف میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جو اتنا بڑھا کہ بزم تیموریہ جلد اول کی شکل میں شائع ہوا۔ یہ موضوع علمی حلقے کے لئے نیا سمجھا گیا اسی لئے شوق سے پڑھا گیا۔ ان حکمرانوں کی علمی دلچسپیوں، سرگرمیوں اور سرپرستیوں پر غلاف پڑا ہوا تھا۔ اس کتاب میں اس غلاف کو اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو علمی حلقے میں کافی مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ دہلی یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ایران جا کر، میری اطلاع و اجازت کے بغیر اس کا فارسی ترجمہ کیا اور کوئی سند بھی حاصل کی۔ اتفاق یہ کہ دہلی کے ایرانی سفارت خانے میں میرا ان کا اچانک سامنا ہو گیا اور وہ بڑی معذرت کرنے لگے۔ اس کتاب کی اشاعت پر میرے استاد محترم سید صاحب نے فرمایا تھا کہ بزم تیموری تو مجھے پسند نہیں رہی، لیکن بزم تیموریہ پسند آئی۔ اُن کے خیال میں اس بزم کی علمی مرقع آرائی اچھی طرح سے کی گئی تھی مگر مجھ کو خود

یہ کتاب کئی حیثیتوں سے تشنہ نظر آئی۔ اس لئے اس میں کچھ نہ کچھ برابر اضافہ کرتا رہا۔ اور اب یہ تین جلدوں میں پھیل گئی ہے۔ پہلی جلد تو شائع ہوگئی ہے، دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ ان میں بعض شعراء، علماء، فضلا کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جو علماء و فضلاء عام نظروں سے اوجھل تھے ان کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

مولانا نے سکوت فرمایا تو میں نے عرض کی کہ جب گفتگو تصنیفات و تخلیقات کی چل نکلی ہے تو آپ اسے مکمل فرما دیں۔" مولانا نے فرمایا کہ "اپنے بارے میں یا اپنے کاموں کے بارے میں دیر تک باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا لیکن چونکہ یہ ساری خدمت دارالمصنفین کے آستانے سے ہوئی ہے اس لئے بہرحال منظر عام پر اگر آجائے تو بے جا بھی نہیں ہے۔" پھر فرمایا کہ "بزم تیموریہ کے بعد خیال آیا کہ سلاطین دہلی کے دربار کی علمی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا جائے تو یہ بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ خیال تھا کہ غلام، خلجی، تغلق اور لودی سلاطین کے درباروں کی علمی مرقع آرائی ایک جلد میں ہو جائے گی لیکن جب لکھنے بیٹھا تو غلام سلاطین کے دربار کی علمی سرگرمیاں اتنا پھیل گئیں کہ ان کو الگ ایک جلد میں شائع کرنا پڑا اور یہی کوشش بزم مملوکیہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس میں اس زمانے کے علماء و فضلا کے کافی حالات آگئے ہیں لیکن شمس دبیر، تاج الدین ریزہ اور شہاب مہرہ کے شاعرانہ کمالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ میرا اپنا خیال تو یہی ہے کہ بزم تیموریہ جس شوق سے پڑھی گئی، بزم مملوکیہ نہیں پڑھی گئی لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال یہ ہے کہ میری سب سے اچھی تصنیف یہی ہے۔ میرا قصد بھی تھا اور پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کا اصرار کے ساتھ یہی مشورہ تھا کہ یہ سلسلہ جاری رکھا جائے مگر میرے قلم کا مسافر بڑا آوارہ گرد ہے اور وہ تاریخ ہند کے دوسرے کاموں کی طرف چل پڑا۔" مولانا نے خاموش ہو کر میری طرف اس طرح دیکھا کہ جیسے بہ زبان بے زبانی یہ فرما رہے ہوں کہ بھئی اب تو پنڈ چھوڑو، میں نے ان سنی سی کرتے ہوئے پوچھ لیا کہ "حضور والا! تاریخ ہند کے وہ دوسرے کام کون سے ہیں؟"

اب مولانا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کچھ توقف کے بعد بولے "ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کو ہر طرح بدنام و رسوا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ میں نے مسلمانوں کی تاریخ کچھ غیر مسلموں کے خیالات کے آئینے میں دکھانے کی کوشش کی اور انھیں کی انگریزی تحریروں کے ترجمے اور اقتباسات "معارف" میں شائع کرنے شروع کئے تو علمی حلقوں کا اصرار ہوا کہ ان چیزوں کو کتاب کی شکل میں شائع کردیا جائے چنانچہ ہندوستان میں عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک کے نام سے یہ مجموعہ شائع ہوا۔ میری تمام تصنیفوں میں بزم صوفیہ اور بزم تیموریہ کے بعد یہی کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں وہ ہندو مورخوں کی تحریروں کی روشنی سے بڑی حد تک دور ہوگئیں۔ اگرچہ یہ میری تحقیقی کتاب نہیں ہے لیکن جو تاریخی لٹریچر جمع کیا گیا ہے اس کی اپنی افادیت ہے۔ اس کتاب کو یو پی گورنمنٹ نے بھی پسند کیا۔ چنانچہ اس سال یو پی گورنمنٹ کا اول انعام پروفیسر مسعود حسن رضوی کو دیا گیا اور دوسرا انعام اس کتاب پر مجھے۔ میری ایک اور تصنیف ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام پر بھی یو پی سرکار نے دوسرا انعام مجھے دیا۔ اس بار پہلا انعام نواب مرزا جعفر علی خاں اثر کو ملا تھا۔ اس وقت انعام کی خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ اکابر علم و ادب کے ساتھ ہم بھی شامل ہو جاتے تھے۔"

اب مغرب کی اذان شروع ہوگئی تھی۔ مولانا السلام علیکم کہہ کے کچھ اور کہے سنے بغیر تسبیح گردانی کرتے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔ دوسرے دن میں نے عرض کیا، "شاید میں کل تک چلا جاؤں اس لئے آپ اس سلسلۂ گفتگو کو مکمل فرمادیں تو بڑا کرم ہوگا۔" اس کے لئے مولانا نے نماز مغرب کے بعد کا وقت پسند فرمایا اور نماز مغرب سے فراغت کے بعد میرے کمرے میں رونق افروز ہوئے۔ میں نے عرض کی کہ ہندوستان کے سلاطین اور علماء و مشایخ کے تعلقات پر ایک نظر مجھے بہت پسند آئی اور میں اس سے کافی متاثر ہوا ہوں

میں کچھ اس کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ آپ کی زبان سے سننا چاہوں گا" مولانا کا ارشاد ہوا کہ "دیباچہ میں آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ یہ پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لئے توسیعی لکچر لکھا گیا تھا، مگر لکچر کے وقت تو یہ مختصر طور سے پڑھا گیا مگر بعد میں پھیلا کر کتابی شکل دے دی گئی۔ اس کتاب میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں اسلام کے نمائندے قرار دیئے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ میری رائے ہے کہ ان حکمرانوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی زندگی اسلامی و شرعی نہیں کہی جا سکتی لیکن وہ اپنی حکومت کے زمانے میں اسلامی حمیت وغیرت کے ضرور نگراں و محافظ رہے، اس حیثیت سے وہ قابل قدر سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے معاشرے کے ضروری اجزا سلاطین، علماء اور صوفیائے کرام تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں زیادہ تر ہم آہنگی نہیں رہی۔ اگر ہم آہنگی ہوتی تو مسلمانوں کے دور کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ کتاب میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ سلاطین کی ذمہ داری حکومت کرنے کی تھی، مسلمانوں کی سیرت و کردار سازی کی نہ تھی، یہ ذمہ داری علماء و صوفیاء پر تھی۔ صوفیاء نے تو بڑی حد تک اس فرض کو پورا کیا۔ لیکن علماء کی طرف سے تصور ہوا۔ اسی زمانے میں دہلی میں امیر خسرو اکاڈمی قائم ہوئی تھی جس کے سرپرست حافظ محمد ابراہیم تھے اور پروفیسر محمد اجمل خاں اہم اراکین میں سے تھے۔ اجمل خاں مرحوم نے مجھ سے فرمائش کی کہ خسرو اکاڈمی کے لئے خسرو کے کلام یعنی مثنویات میں سے ایسے اقتباسات جمع کر دوں جن کا تعلق ان کی وطن دوستی سے ہے۔ میں نے فرمائش پوری کی لیکن اکاڈمی کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لئے ایک مقدمہ لکھ کر کتاب دارالمصنفین سے شائع کرا دی گئی۔ یہ کتاب پاکستان میں خسرو کے سات سو سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۷۵ء میں ایسی مقبول ہوئی کہ اس کی قیمت پانچ روپے تھی، لیکن اس کے نسخے وہاں پچاس روپے میں خریدے گئے۔"

مولانا نے بات پوری کر دی، مجھے پھر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانا پڑا، مولانا نے بتانا

شروع کیا۔ اس کے بعد حکومت ہند سے درخواست کی گئی کہ دارالمصنفین کو تاریخ ہند کی ۸ جلدیں شائع کرانے کے لئے مدد دی جائے۔ ڈاکٹر سید محمود، صدر مجلس انتظامیہ نے یہ درخواست وزیر اعظم نہرو کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے یہ معاملہ وزیر تعلیم مولانا آزاد کو سونپ دیا۔ مگر ۱۹۵۲ء میں حکومت ہند نے ساٹھ ہزار کی جو مدد دی تھی، اس پر لوک سبھا میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے بڑا ہنگامہ کھڑا کیا تھا اس لئے مولانا آزاد نے اس درخواست کی منظوری میں بڑا پس وپیش کیا۔ انھوں نے پانچ ہزار سالانہ کی مدد حکومت کشمیر سے تو دلوادی مگر اپنی وزارت سے کوئی رقم دینا گوارا نہیں کیا۔ مگر وہ درخواست دفتر میں چکر کاٹتی رہی، یہاں تک کہ مولانا آزاد کا وصال ہوگیا۔ ان کے جانشین پروفیسر ہمایوں کبیر نے اس درخواست پر ضروری کارروائی کی جس کے بعد تین قسطوں میں تیس ہزار کی مدد ملی۔ اس رقم سے ہندوستان کی تاریخ پر آٹھ جلدیں تیار ہوئیں اور شائع کی گئیں۔ یہ آٹھ کتابیں ہیں:

۱۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں ج ۱

۲۔ 〃 〃 〃 ج ۲

۳۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

۴۔ عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مورخوں کی نظر میں ج ۱

۵۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

۶۔ سلاطین کشمیر

۷۔ گجرات کی تمدنی تاریخ

۸۔ مقالات سلیمان

"ہندوستان عربوں کی نظر میں" کا زیادہ تر کام مولوی ضیاء الدین اصلاحی کا ہے، مگر ان دونوں جلدوں میں ترجموں کی حک و اصلاح کا کام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے

انجام دیا اور بڑی محنت سے انجام دیا۔ ان کی اشاعت پر ماہر ہندوستانیات (انڈولوجی) پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے دارالمصنفین کو مبارکباد دی اور لکھا کہ "یہ بڑی خدمت ہے، یہ دونوں کتابیں ہر لائبریری میں موجود رہنی چاہئیں" ان میں عربوں کی اصل تحریریں مع ترجمے کے جو ہندوستان سے متعلق ہیں پیش کر دی گئی ہیں۔ تمدنی کارنامے میں پروفیسر محمد حبیب، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوظفر ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے مختلف دلچسپ واہم موضوعات پر مضامین ہیں۔ سلاطین کشمیر ڈاکٹر محب الحسن کی کتاب ہے اس کا ترجمہ حماد حسن عباسی نے کیا ہے، گجرات کی تمدنی تاریخ جو دراصل مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تاریخ ہے یہ مولانا ابوظفر کی تحقیقی کوششوں اور قلم کی رہین منت ہیں۔ باقی کتابیں میری ناچیز کوشش ہیں۔ استاذ مرحوم سید صاحب کے مضامین کو مدون کرنے کا شرف بھی مجھی کو ملا۔ یہاں اتنا اور سن لیجئے کہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ سرہنری الیٹ نے جس طرح دس جلدوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کی کہانی ان کے معاصر مورخوں کی زبانی بیان کی ہے، اسی طرح میں بھی عہد مغلیہ کی کہانی ان کے معاصر مورخوں اور بعد کے ہندو مورخوں کی زبانی قلم بند کروں پہلی جلد ظہیرالدین محمد بابر کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں فارسی تاریخوں میں بابر کے متعلق جو لکھا گیا ہے، اس کا اردو ترجمہ ہے، اس کے ساتھ موجودہ دور کے ہندوؤں نے جو کچھ اس کے بارے میں کہا تھا، ان کے اردو ترجمے اس میں شامل کر دیئے یہ کتاب بعض علمی حلقوں میں بہت مفید قرار دی گئی۔ یہی عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مورخوں کی نظر میں، کے نام سے شائع ہوئی، اسی طرح ہمایوں سے لے کر آخری مغل فرماں روا تک، ہر ایک پر علحدہ علحدہ ایک جلد لکھنے کا ارادہ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کام تنہا انجام نہ پاسکے گا اس کے لئے پوری ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ اور یہ جماعت نہ مل سکی اور شاید یہ ارادہ آئندہ بھی پورا نہ ہوسکے، اس کا بے حد افسوس ہے۔ یہ سلسلہ تو ٹھپ ہوگیا مگر تاریخ ہند کے میدان میں میرے قلم کا مسافر رہ نوردی کرتا رہا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی رواداری

ج ۱۱، ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، موخر الذکر کتاب کی ۲ جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ بابر تک ۲۷ جلدیں نکل چکی ہیں۔ پہلے خیال تھا کہ ہندوستان کے اہل قلم اس کی تدوین میں مدد دیں گے مگر یہ تعاون نہیں مل سکا تو حضرت سید صاحب نے وصیت کی تھی کہ میں اس سلسلے کو جاری رکھوں، جتنا بن پڑ رہا ہے، میں یہ سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہوں۔"

مولانا نے بات ختم کرنی چاہی۔ میں نے دریافت کیا کہ "تاریخی کتابوں کی تصنیف میں کس بات پر آپ حضرات زور دینا چاہتے تھے" مولانا نے میری غلطی کی اصلاح کے لئے فرمایا "چاہتے تھے" نہیں زور دینا چاہتے ہیں" اب مولانا کی دلچسپی کچھ بڑھ گئی اور قدرے جوش کے ساتھ بولے اس سلسلے کی تدوین میں سیاسی پہلو پیش کرنے کے بجائے مسلمانوں کے دور کے تمدنی، مذہبی، علمی اور معاشرتی پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ تاریخی مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لکھنے میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ مواد کی فراہمی میں 'نوک سوزن' اور 'نلیش خار' نہ پیدا ہونے پائے اور فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے کی ساری کتابیں آگے چل کر ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان جذباتی یک جہتی پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ ہندوستان کی تاریخ لکھتے وقت استاد مرحوم نے یہ وصیت کی تھی کہ تاریخ ایسی لکھی جائے کہ دل جوڑے جائیں، توڑے نہ جائیں، یہ ہدایت برابر پیش نظر رہتی ہے۔"

مولانا کے اس ارشاد پر معاً میرا ذہن اُن کی قابل قدر کتاب ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشایخ کے تعلقات پر ایک نظر، کی طرف منعطف ہوا اور مجھے یاد آیا کہ مولانا نے شیعہ سنی امراء کے تنازعے میں بہت صفائی سے لکھا ہے کہ "مغلوں کے آخری دور میں شیعہ اور سنی امرا کے جھگڑے بھی تکلیف دہ رہے، لیکن شیعہ اور سنی علماء ان جھگڑوں کو اب تک جس رنگ میں پیش کر رہے ہیں، اس سے ایک مورخ متفق نہیں ہو سکتا ..."

مولانا کی خدمت میں تائیدی فقرے پوری طرح عرض بھی نہیں کئے تھے کہ انداز گل افشانی گفتار" دیکھنے کے لائق ہوگیا اور مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔
"میں ایک مورخ کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے شیعوں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ اس لئے کہ میں مغلیہ سلطنت کا بانی ایک شیعہ ہی کو سمجھتا ہوں، ہیمو کے خلاف پانی پت کی لڑائی جیتنے والا اکبر نہ تھا، بلکہ خان خانان بیرم خان ہی تھا، جو شیعہ تھا۔ اس کے علاوہ میری نظر سے گزرا ہے کہ اکبر کی ماں حمیدہ بیگم شیعہ ہی تھی۔ ہندوستان کو اکبر کی رواداری پر فخر ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا روادار مسلمان حکمراں ایک شیعہ عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوا۔ تیموری دربار میں ایرانی تمدن کے عناصر ایسے پیدا ہوتے گئے کہ یہ بعد میں اسلامی تمدن کہلانے لگا۔ یہ ایرانی تمدن، نور جہاں، عماد الملک اور آصف الملک کی وجہ سے پیدا ہوا یہ شیعہ تھے۔ جہانگیر کہا کرتا تھا کہ مغلوں کی فوج کی ریڑھ کی ہڈی سادات بارہہ رہے، جو سب کے سب شیعے (مولانا یہی تلفظ فرماتے تھے) تھے۔ کشمیر سے اراکان تک جن فوجی سرداروں نے مغلیہ سلطنت کے حدود بڑھائے وہ زیادہ تر شیعے تھے۔

آج کون کہہ سکتا ہے کہ درس نظامیہ کے بانی میر فتح اللہ شیرازی نہیں تھے۔ وہ تو شیعہ ہی تھے۔ پھر اگر ہم ہندوستانی فارسی شاعری پر ناز کر سکتے ہیں تو غزالی، عرفی، شکیبی، قدسی، طالب، کلیم، صائب، عاقل خاں رازی وغیرہ کون تھے۔ شیعہ ہی تو تھے۔ اورنگ زیب بڑا مذہبی بادشاہ گزرا ہے۔ وہ بھی تو ایک شیعہ ہی عورت کے بطن سے تھا۔ مغلوں کے دور کا یہ دلچسپ پہلو ہے کہ وزارت اور فوج تو زیادہ تر شیعوں ہی کے ہاتھوں میں رہی مگر قضاۃ و احتساب سنیوں کے سپرد رہے۔ شیعی وزراء اور فوجی سرداران سنی قاضیوں کے فیصلوں کے آگے جھکنے میں پس و پیش نہ کرتے۔ یہ اس زمانے میں رواداری کی کیسی عمدہ مثالیں ہوتی رہیں۔ اسی لئے مغلیہ سلطنت اپنے زمانے کی طاقتور ترین حکومت سمجھی جاتی رہی۔ یہ

رواداری ختم ہوئی تو سلطنت کے بنچے بھی اُدھڑ کر رہ گئے۔"

مولانا کی اس تقریر میں میرے لئے کچھ مقامات آہ و فغاں بھی تھے، مگر مجھے مولانا کے اپنے اخلاص و فراخ دلی نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اس موقع پر قاضی نوراللہ شوستری کی یاد تازہ کروں۔ اب میں نے گفتگو کا رخ تاریخ سے موڑ کر ادب کی سمت کر دیا۔

مولانا نے اپنی ادبی خدمات کے سلسلے میں فرمایا کہ "جی ہاں! میرا تھوڑا بہت ادبی کام بھی ہے۔ ہمارے دارالمصنفین کے بزرگوں کا یہ مسلک رہا ہے کہ جب ٹھوس چیزیں لکھتے لکھتے کچھ اکتا سے جاتے ہیں تو زبانِ قلم کے چٹخارے کے لئے کچھ ادبی چیزیں لکھا کرتے ہیں، اس کی پیروی مجھے کرنی پڑی۔ چنانچہ اشرف علی فغاں کے دیوان کو میں نے ایڈٹ کیا۔ یہ کام ڈاکٹر عبدالحق کو پسند آیا اور انھوں نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔ غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تو بعض حلقوں کے اصرار پر میں نے غالب پر کچھ لکھنا شروع کیا تو یہ دو جلدوں کی کتاب ہو گئی، غالب کی مدح و قدح کی روشنی میں، ان کے علاوہ متفرق کام بھی ہیں، جیسے مقالات سلیمان کی تدوین۔ انگریزی میں بھی تھوڑی بہت خامہ فرسائی کرتا رہتا ہوں۔ اسلامک کلچر حیدر آباد، انڈو ایرانیکا کلکتہ اور دوسرے انگریزی رسالوں میں میرے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات شائع ہوئے ہوں گے۔ سید صاحب مرحوم کی کتاب، عرب اور جہازرانی کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جسے لاہور کے مشہور ناشر شیخ محمد اشرف نے اپنے ادارے سے شائع کیا۔ مرحوم کے ایک اور رسالے، خواتین اسلام کی بہادری کا بھی میں نے ترجمہ کیا، اسے بھی شیخ محمد اشرف نے شائع کیا۔ مولانا شبلی کے مضمون اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر اور بہت سے دوسرے مضامین کے ترجمے کئے۔ سید صاحب کے تاریخ ہند سے متعلق مضامین کو بھی میں نے انگریزی کے قالب میں ڈھالا مگر یہ سب ابھی مسودے ہی کی شکل میں پڑے ہیں، میں نے جو کچھ حاصل کیا حضرت سید صاحب کی نگرانی اور تربیت میں، ان کے بعد میری علمی روح جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی

بنے رہے، جن کے ساتھ چالیس سال ہمہ وقت ساتھ رہنے کا موقع ملا، انھوں نے جس طرح میری حوصلہ افزائی کی وہ میری زندگی کا راس المال ہے۔ مرحوم زبان کی ناہمواری کسی حال میں برداشت نہیں کرسکتے تھے، اگر میری زبان میں ہمواری پائی جاتی ہو تو یہ سراسر شاہ صاحب کا ہی فیض ہے۔ ان کو میں نے اپنا بڑا بھائی، اپنا دوست، اپنا مربی، اپنا ہمدم، اپنا ہمراز برابر سمجھتا رہا ہماری مجلس انتظامیہ کے حضرات کہا کرتے تھے کہ ہم اور وہ دونوں مل کر شخص واحد بنتے تھے اب وہ نہیں ہیں، میں اپنی علمی زندگی میں خلا ہی خلا محسوس کرتا ہوں۔ زندگی کے ہر لمحے میں میرے ذہن پر وہی چھائے رہتے ہیں۔ ان کی وفات پر میری آنکھوں سے ہفتوں آنسو جاری رہا اور اب آنکھیں تو خشک ہوگئی ہیں دل برابر رویا کرتا ہے۔ ان کی سوانح عمری لکھ رکھی ہے لیکن اب تک جس طرح چاہتا تھا وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔ اُن سے جو جذبات وابستہ تھے، ان کو تحریر میں منتقل کرنے میں قلم ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ دارالمصنفین کے انتظامی امور کا بار میرے ہی سر پر ہے۔ شاہ صاحب کی زندگی میں بھی یہ سارے امور میرے ہی ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ وہ بیٹری تھے، میں خول تھا، ہر لمحے محسوس ہوتا ہے کہ ٹارچ موجود ہے سیل نہیں ہے"

مجھے محسوس ہوا کہ اس ذکر میں مولانا کو بڑے تحمل و برداشت سے کام لینا پڑ رہا ہے، اس لئے موضوع بدلتے ہوئے میں نے دارالمصنفین کے مالیات کے بارے میں سوال کر دیا۔ مولانا نے فرمایا:

پہلے دارالمصنفین کو امداد بھوپال اور حیدرآباد سے ملتی رہی، اس امداد اور مطبوعات کی تجارتی آمدنی سے ادارہ اپنے مصارف پورا کرتا رہا۔ لیکن ہمارا اصل سرمایہ یہاں کے بزرگوں کا جذبۂ ایثار و قربانی تھا۔ مثلاً جناب سید صاحب نے ۳۲ سال تک خدمت کی۔ لیکن ان کا وظیفہ ڈھائی سو سے زیادہ نہ ہوسکا۔ شاہ صاحب نے ۵۱ سال تک خدمت کی لیکن ان کا ماہانہ وظیفہ اس ہوش ربا گرانی میں بھی چار سو ساٹھ روپے سے زیادہ نہ ہوا۔ نہ

ان بزرگوں نے زیادہ لینے کی خواہش کی۔ ان کے ایثار کی بدولت دوسرے وابستگان دار المصنفین چھوٹی چھوٹی تنخواہوں پر کام کرنے میں خوشی محسوس کرتے رہے اس لئے ادارہ بخیر و خوبی چلتا رہا۔ برطانوی حکومت سے مدد لینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب قومی حکومت قائم ہوئی تو مولانا آزاد اور پنڈت نہرو ادارے سے بخوبی واقف تھے، جدوجہد آزادی میں ادارے کی قربانیوں سے بھی خوب واقف تھے، لیکن یہاں کے بزرگوں نے حکومت سے ایسی مدد لینا پسند نہیں کیا جس میں شرطیں اور پابندیاں ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے حکومت ہند کا ایک وفد آیا تھا اور اس ادارے کو بھی دائرۃ المعارف حیدر آباد، رضا لائبریری رام پور، اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کی طرح قومی اہمیت کا ادارہ بنانے کی پیشکش کی اور دو سے تین لاکھ سالانہ تک کی مدد کی بھی پیش کش کی۔ لیکن اسے قبول کرنا مجلس انتظامیہ نے مناسب نہیں جانا۔ مگر کتابوں کی تجارتی آمدنی اتنی ہو جاتی ہے کہ سرمایۂ محفوظ کا منافع ملا کر اس کا کام کسی نہ کسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اب جب کہ اس ادارے نے ۱۱۵ مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اس سے ادارے کو مالی فراغت حاصل ہو گئی ہے مگر اخراجات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ رفقا کے وظیفے کا معیار گرانی کی وجہ سے بڑھانا پڑا۔ پریس اور دفتر کے کام میں بھی توسیع ہو رہی ہے۔ اس لئے وہاں کچھ ملازم بڑھائے گئے ہیں۔ اس وقت دار المصنفین کا بجٹ الحمد للہ دو لاکھ سالانہ کا ہوتا ہے جو کتابوں کی تجارتی آمدنی سے سرمایۂ محفوظ کے منافع سے کسی طرح پورا ہو جاتا ہے۔"

عرض کی کہ اگر ہندی میں اشاعت کا کام چلے تو شاید تجارتی آمدنی میں اضافہ ہو سکے اور کام خاطر خواہ فراغت سے چل سکے۔ مولانا نے فرمایا:

"ہندی میں کام چلنے کے آثار و قرائن نہیں ہیں، استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک کتاب رحمت عالم کا ترجمہ ہندی میں کرایا گیا، مگر اس کی مانگ مطلق نہیں ہوئی۔ بعض حلقوں کی تحریک پر سیرۃ النبی کی چھ جلدوں کے ہندی ترجمے اور اشاعت کا خیال ہوا تھا۔ ایک

سرسری تخمینے میں اس وقت تقریباً آٹھ لاکھ کے خرچ کا اندازہ ہوا تھا اور کوئی حلقہ اس رقم کی فراہمی پر کمربستہ نہ ہوسکا۔ پھر یہ محض تجارتی ادارہ نہیں ہے، مقصدی ادارہ ہے۔ جو ہمارے مقاصد و نصب العین ہیں ان کے تحفظ کا سوال بنیادی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ جو چیز جس طرح جن لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے، وہ پیش ہوتی رہے، تجارتی اعتبار سے منافع نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔

انگریزی کا میدان بیرونی ممالک میں وسیع ہے، مگر اس نئے کام کے لئے بھی جس سرمایہ کی ضرورت ہے، وہ کہاں ہے! پھر بھی انگریزی میں کچھ چیزیں شائع کرنے کا پروگرام ہے۔"

اب عشاء کی اذان ہوگئی تھی، مولانا نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس لئے یہ گفتگو اسی منزل پر تمام ہوگئی۔ ابھی بہت سے سوال دریافت طلب تھے۔ مولانا قدوائی صاحب اور دوسرے رفقا سے بھی اس طرح کے تبادلۂ خیال کی ضرورت ہے۔ بشرط صحت و حیات کسی اور موقع پر دارالمصنفین اور ارباب دارالمصنفین کے ذہنی مرقع منظرِ عام پہ لائے جاسکیں گے۔

ڈاکٹر ماجد علی خاں

# برصغیر کے ممتاز صوفیا و مبلغین

## (ساتویں تا گیارہویں صدی عیسوی)

(۱)

تصوف کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے صوفیا کے پہلے طبقہ کا زمانہ ۶۶۱ء (۴۱ھ) سے ۸۵۰ء (۲۳۰ھ) تک مقرر کیا ہے۔ صوفیا کے اس طبقہ میں حضرت اویس قرنیؓ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت مالک بن دینارؒ، حضرت محمد واسعؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ اور حضرت ابراہیم بن ادہم وغیرہ شامل کئے گئے ہیں۔ صوفیا کے پہلے طبقہ نے اپنے مراکز بصرہ و کوفہ میں قائم کئے اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کی سعی کی۔

برصغیر ہند و پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کے ذہن میں یہ سوال فطری طور پر اٹھتا ہے کہ صوفیا کے پہلے دور میں نیز اس کے بعد آنے والے زمانے میں کیا یہاں بھی کوئی بزرگ آیا یا نہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ---------------

---کہ اس برصغیر میں سب سے پہلے صوفی بزرگ شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش (المتوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) ہیں اور سب سے پہلا صوفی سلسلہ چشتیہ ہے جو خواجہ معین الدین چشتیؒ (المتوفی ۶۲۷ھ/۱۲۳۵ء) کے ذریعہ شروع ہوا۔ اس مضمون میں اُن بزرگوں کے

---

ڈاکٹر ماجد علی خاں، لکچرر شعبۂ اسلامک و عرب و ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

نام اور مختصر حالات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو شیخ علی ہجویریؒ کے زمانے تک اس ملک میں تشریف لائے اور تبلیغ دین نیز تزکیۂ نفس و اصلاح باطن میں مصروف ہوئے۔

## جنوبی ہند میں صحابہؓ کی آمد:

مورخین کے بیان کے مطابق مسلمان ہندوستان میں تین راستوں سے داخل ہوئے۔ بحری راستے سے؛ ایران سے براہ مکران و سندھ اور درۂ خیبر سے۔[۱] تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلام سب سے پہلے عرب تاجروں کے ذریعہ جنوبی ہند کے مالابار ساحل پر پہونچا۔ یہ عرب باشندے نہ صرف کامیاب تاجر ہی تھے بلکہ اسلام کے بہترین مبلغ بھی تھے جن کے عزم کی بلندی اور عمل کی پختگی سے مقامی باشندے متاثر ہوئے۔ روایتیں اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ نہ صرف ساحل ہند پر بلکہ اطراف کے ممالک میں بھی صحابہؓ تشریف لائے تھے۔ چنانچہ کنٹون (چین) میں وہاب (عبدالوہاب) نامی ایک صحابیؓ کی قبر؛ پورٹ محمود میں عکاشہ نام کے ایک صحابیؓ کی قبر اور میلا پور (مدراس کے جنوب میں تقریباً ۱۲ میل کے فاصلہ پر) تمیم انصاریؓ نامی ایک صحابیؓ کی قبر کے بارے میں بکثرت روایات ملتی ہیں۔[۲] اس طرح ساتویں صدی ہجری میں اسلام مالابار کے ساحل اور لنکا (سیلون) تک پہونچ گیا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس علاقہ کے کئی قدیم بزرگوں کا نام لکھا ہے۔ جس کے مطابق

---

Murray T. Titus, "Islam in India & Pakistan", P. 31 — ۱
Bishop John A. Subhan, "Sufism: Its Saints and Shrines", P. 119

Bishop John A. Subhan, "Sufism, Its Saints and Shrines", P. 119 — ۲
بحوالہ "آئینۂ حقیقت نما" از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (عبرت پریس نجیب آباد) ص ۱۲۶

لنکا (سیلون) میں اُس دور کے شیخ عبداللہ حنیف، شیخ عثمان اور بابا طاہر کی قبریں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کرنگا نور (Karanganore) مالابار کے راجہ نے حضور اکرم صلعم کے زمانے میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔[۳]

## سندھ اور محمد بن قاسم :

کچھ مورخین کے مطابق مکران و سندھ کے راستے سے بھی مسلمان ابتدائی دور سے ہی آنا شروع ہو گئے تھے[۴]۔ ایک روایت کے مطابق حضور اکرم صلعم کے وصال کے تیس سال بعد ہی ۶۶۲ء میں حضرت امیر معاویہؓ نے فتح کابل کے بعد ایک فوج اس علاقے کی طرف بھیجی تھی جس نے علاقہ سرحدی مقام کنکان (Kankan) کو فتح کر کے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے تک پیشقدمی کی تھی۔ اس لشکر کے امیر کا نام المحلب بتایا جاتا ہے[۵]۔ البتہ اس علاقے میں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادکاری ۷۱۱ء سے یعنی امام الدین محمد بن قاسم ثقفی کی فتوحات کے بعد ہی شروع ہوئی۔ اس وقت سے اب تک اس علاقے میں برابر مسلمانوں کا اثر رہا ہے۔ محمد بن قاسم ثقفی ایک صالح اور نیک نوجوان تھا جن کے عمل و یقین کے نور سے ہزاروں قلوب روشن ہوئے اور لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس طرح ابتدائی دور میں اس علاقے میں اسلام دراصل محمد بن قاسم اور

---

۳ M.T. Titus, "Islam in India & Pakistan", P. 38.

۴ ایضاً

۵ Bishop John A. Subhan, "Sufism Its Saints and Shrines", P. 120
M.T. Titus, "Islam in India and Pakistan", P. 4
بحوالہ فتوح البلدان لبلاذری

ان کے جانشینوں کی دعوت و تبلیغ سے ہی پھیلا۔

محمد بن قاسم ثقفی کی واپسی کے بعد ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصے تک کسی مسلمان مجاہد کی نظریں اس عظیم ملک کی طرف نہیں اٹھیں یہاں تک کہ ایک ترک سردار محمود غزنوی کو اللہ نے اس کی توفیق دی کہ وہ یہاں ایمان و عمل کے لئے راستہ ہموار کریں۔ محمود غزنوی کے مجاہدانہ کارناموں کی ابتدا ۱۰۰۱ء سے ہوتی ہے۔ ۱۰۰۱ء سے لیکر ۱۰۲۷ء تک محمود غزنوی نے ایک درجن سے زیادہ جہاد کئے جس کے نتیجے میں مغربی ہندوستان میں گجرات تک اور شمالی مشرقی ہندوستان میں قنوج تک کے علاقے اس کے زیر نگیں آگئے تھے لیکن اس کا باقاعدہ کنٹرول صرف لاہور (پنجاب) کے علاقے پر ہی ہو سکا تھا۔ محمود کے بعد اس کے جانشینوں اور دیگر مسلمان مجاہد سلاطین نے ۱۲۰۲ء تک سندھ، ہندوستان (یعنی شمالی مشرقی ہندوستان)، راجپوتانہ، گجرات، بندیلکھنڈ، بہار اور بنگال کے علاقوں کو مملکت اسلامیہ میں شامل کرلیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں علاء الدین خلجی نے ڈھاکہ (مشرقی بنگال یعنی موجودہ بنگلہ دیش) کو بھی اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا، اور شاہان مغلیہ بالخصوص اکبر تا اورنگ زیب کے دور میں یعنی سولھویں صدی کے اختتام سے اٹھارویں صدی کے شروع تک (۱۵۵۶ء تا ۱۷۰۷ء) اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت اپنے بام عروج پر تھی۔

سندھ کے علاقے میں سب سے پہلے آٹھویں صدی کے آخر میں صوفی بزرگ کا پتہ چلتا ہے جن کا نام ابوعلی السندھی تھا اور یہ بایزید بسطامیؒ سے ۸۷۴ء میں ملے تھے[۶]۔ ان کے

---

[۶] Aziz Ahmad, "Islamic Surveys"-7 (Intellectual History of Islam in India), Edinburg uni. Press. 1969, P. 34

Ref: Abu-Nasr as Sarraj, Kitab al-lum'fit-Tasawwuf, ed R.A. Nicholson, Leiden 1963, 177. 325, 337

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علاوہ شیخ ابوتراب المعروف بہ حاجی ترابی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دوسری صدی ہجری (۱۷۱ھ/۷۹۳ء) میں تشریف لائے تھے۔ ان کا مزار ٹھٹھ سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر ہے[۴]۔

## پنجاب کے ابتدائی صوفیا :

**بابا رتن :** جہاں تک لاہور (علاقہ پنجاب) میں صلحاء و اصفیاء کی آمد کا سوال ہے اس کی روایات ملتی ہیں کہ اُس علاقے کے ایک ہندو یوگی بابا رتن رضؓ نے دو بار مکہ مکرمہ کی زیارت کی۔ پہلی بار انھوں نے حضور اکرم صلعم سے اس وقت ملاقات جبکہ آپؐ نے نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا۔ دوسری ملاقات حضور اکرمؐ صلعم کی بعثت کے بعد کی اور آپؐ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ ہندوستان واپس تشریف لے آئے۔ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ پہلے صحابیؓ تھے جنھوں نے سرزمین ہند میں قدم رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تیرھویں صدی عیسوی تک حیات رہے اور اُن کی وفات ۱۲۳۴ء میں ہوئی۔ ان کی قبر طبرہند (یہ جگہ اب نامعلوم ہے) میں بتائی جاتی ہے[۵]۔ ابن حجر العسقلانی نے اپنی مشہور تصنیف

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

H. Ritter, Abu Yazid al-Bistami in EI², i, 162; L. Massignon, Essai sur les Origines du lexique de la mystique musulmane Paris, 1922, 243; A. J. Arberry, Revelation and Reason in Mysticism London, 1960, 94-5

[۴] تذکرہ صوفیائے سندھ، از اعجاز الحق قدوسی، ص ۳٦

[۵] Bishop A. Subhan, "Sufism: Its Saints and Shrines", P. 121.

اصابہ فی معرفۃ الصحابہؓ میں اور امام الذہبیؒ نے تجرید میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن حجرؒ نے اُن کو صحابہؓ میں شمار کیا ہے[9]

**پاکیزہ بیبیاں** : کہا جاتا ہے کہ کربلا کے واقعہ کے بعد ۶۱ ہجری-۶۸۰ء میں حضرت علیؓ کی اولاد میں چھ یا سات مستورات امام حسینؓ کی حسب ہدایت لاہور آئیں۔ ان کو پاکیزہ بیبیوں یا بی بی پاک دامناں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے القاب اس طرح بتائے جاتے ہیں : (۱) بی بی حاج (۲) بی بی تاج (۳) بی بی حور (۴) بی بی نور (۵) بی بی گوہر (۶) بی بی شہباز[10] لاہور میں انھوں نے پردے میں بیٹھ کر درس و تدریس و تبلیغ کا کام کیا۔ وہاں کے ایک ہندو راجا (برمانتری یا مہابرن[11]) کے لڑکے نے ان کی کرامت سے اسلام قبول کیا۔ بی بی صاحبان نے اس کا نام عبداللہ رکھا[12] کچھ روز بعد عبداللہ بابا خاکیؒ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بی بی پاک دامناں کا روضہ لاہور میں "پاکدامن روضہ" یا "خانقاہ" کے نام سے مشہور ہے۔ بابا خاکیؒ کی قبر بھی خانقاہ کی ڈیوڑھی کے اندر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا خاکی کا انتقال ۷۱۹ء یا ۷۲۰ء میں ہوا[13] سلطان محمود غزنوی نے "خانقاہ" کے ارد گرد پختہ چہار دیواری اور خانقاہ کے اندر چند دالان تعمیر کرائے۔ بعد ازاں

---

[9] Bishop A. Subhan, "Sufism: Its Saints and Shrines," P. 121

[10] اولیائے لاہور از محمد لطیف ملک ص۱۱۱

[11] ایضاً ص۱۱۲

[12] ایضاً ص۱۱۳

[13] Bishop A. Subhan, "Sufism: Its Saints and Shrines," P. 123

بعہد اکبر بادشاہ یہاں بہت سی عمارات تعمیر ہوگئیں اور اکبر نے ایک مقبرہ بھی تعمیر کرایا یہ پوری آبادی اب "محلہ بی بی پاک دامناں" کے نام سے موسوم ہے۔[۱۴]

**راجہ عُسیفیان :** بلاذری کے بیان کے مطابق مسلم تجار کے اثر سے خلیفہ معتصم (۸۳۳ — ۸۴۲ ء) کے زمانہ میں ملتان اور کشمیر کے درمیان کسی جگہ کا راجا جس کا نام عسیفیان (Usayfan) تھا مسلمان ہوا ۔ بعد قبول اسلام اُس نے اسلام کی کافی تبلیغ واشاعت کی۔[۱۵]

**امام نصیر الدینؒ اور صفی الدین گازرونیؒ :** پنجاب کے ابتدائی صوفیا میں امام نصیر الدینؒ کا نام بھی آتا ہے ۔ ان کا مزار جالندھر میں ہے جس پر ان کی تاریخ وفات ۹۴۵ء درج ہے۔[۱۶]

کچھ مورخین کے مطابق محمود غزنوی کے حملوں سے قبل صوفیا ، درہ بولان سے ہوکر ملتان اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں تبلیغ دین کی خاطر تشریف لائے۔[۱۷] ۹۶۲ء میں گازرون کے شیخ ابو اسحاق نے اپنے نوعمر خلیفہ صفی الدین گازرونیؒ (جن کی عمر اس وقت ۱۷ سال تھی) کو ہندوستان جانے کا حکم دیا ۔ شیخ صفی الدین ملتان تشریف لائے اور پھر اوچ کے

---

۱۴ ملاحظہ ہو : "اولیائے لاہور" ص۱۱۳-۱۱۵

۱۵ Murray. T. Titus Islam in India and Pakistan, P.41
(بحوالہ فتوح البلدان از البلاذری ص۱۲۹-۱۳۰)

۱۶ S.R. Sharda, "Sufi Thought," New Delhi 1974, P.61

۱۷ ایضاً

مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ وہاں پر اپنی وفات یعنی ۱۰۱۰ھ تک مقیم رہے[۱۸]۔

(باقی آیندہ)

---

[۱۸] S.R. Shardu, "Sufi Thoughxt, P. 61

بحوالہ "تذکرۂ اولیائے پنجاب" از اعجاز الحق قدوسی، ص ۳۹۔ نیز ملاحظہ ہو

Islamic Surreys (NO.7) by Aziz Ahmed, P. 34

اس کتاب میں شیخ صفی الدینؒ کی آمد کا سال ۹۶۲ھ لکھا ہے جس کو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ سارہ معاصر نے ان کی آمد کا سال ۹۷۵ھ بتایا ہے۔

---

"صوفی جب بولتا ہے تو اس کا کلام اس کی حقیقت حال سے بالکل واضح ہوجاتا ہے اور جب خاموش ہوجاتا ہے تو اس کے اعضا اس کی طرف سے قطعِ تعلقاتِ دنیاوی کو بیان کرتے ہیں۔"

(حضرت ذوالنون مصریؒ)

"صوفی وہ ہیں جن کی ارواح بشریت کی تاریکیوں اور نفسانی خواہشوں سے پاک صاف ہوگئی ہیں اور دنیا کی حرص و ہوا سے نجات پاکر حق تعالیٰ کے حضور صفِ اول میں کھڑے ہونے کی سعادت حاصل کرچکی ہوں ـــ صوفی وہ ہے کہ کوئی چیز اس کی مِلک (قبضہ) میں نہ ہو اور نہ وہی کسی (غیر اللہ) کی مِلک میں ہو۔"

(حضرت ابوالحسن نوریؒ)

# جامعہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# جامعہ

| جلد ۴۷ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۷ء | شمارہ ۱۲ |
|---|---|---|

## فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

---

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی • مطبعہ: جمال پریس دہلی ۶ • ٹائٹل: دیال پریس دہلی ۶

# شذرات

صدر جمہوریۂ مصر انور سادات ۱۹ نومبر کو شام کو ۷ بجکر ۵۹ منٹ پر تل عفیف کے بن گوریوں ہوائی اڈے پر اترے تو گویا انہوں نے اسرائیل کو ایک مملکت کی حیثیت سے عملاً تسلیم کرلیا اور جب انہوں نے یروشلم میں اسرائیلی پارلیمنٹ کو خطاب کیا تو گویا یہ بھی مان لیا کہ یروشلم جو یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں تینوں کا مقدس شہر ہے، اسرائیل کا دار السلطنت ہے۔

سادات نے اسرائیلی پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "زمین کا یہ ٹکڑا آپ لوگوں کا ہے۔ میں ساری دنیا سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں پائیدار اور منصفانہ امن پسند اور مطلوب ہے۔

اسرائیل کے وزیر اعظم بیگن نے اپنی جوابی تقریر میں کہا "پائیدار امن کے قیام کے لئے ہمیں، صدر سادات، آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اہل مصر کے لئے ہمارے ملک کے دروازے غیر مشروط طور پر کھلے ہوئے ہیں"۔

صدر سادات نے عید اضحیٰ کی نماز ۲۰ نومبر کی صبح کو مسجد اقصیٰ میں پڑھی۔ امام نے اپنے خطبہ میں فلسطینیوں کے لئے انصاف کا مطالبہ کیا اور کہا کہ مقبوضہ فلسطین میں فلسطینی باقی رہیں گے اور اسے واپس لیں گے۔ سرزمین فلسطین اور خاص طور سے یروشلم ایک مقدس امانت ہے جو انھیں سونپی گئی ہے"۔

قاہرہ میں مصر کے ایک سرکاری افسر ٹی وی پر سادات کو اسرائیلی پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے دیکھ کر تقریباً چیخ سے پڑے: "یہ منظر ایسا ہی ہے جیسے کہ چاند پر آدمی کے قدم پہلی بار پڑ رہے ہوں اور ہم اہل زمین اسے دیکھ رہے ہوں، ایک مقام حیرت!"

"یروشلم میں نوجوان فلسطینیوں کے ایک ہجوم نے موقع پاکر نعرہ لگایا "سادات غدار ہے۔ سادات، مصر واپس جاؤ اور اپنے ساتھ اپنے کتوں کو بھی لے جاؤ!"

---

اسماعلیہ سے تل عضیف کا ہوائی جہاز کا فاصلہ ۴۰ منٹ کا ہے لیکن ۳۰ برس سے یہ راستہ طے نہیں ہو پارہا تھا، سادات کی ایک باہمت ہمت نے یہ فاصلہ طے کرادیا۔ یہ واقعہ خواہ مستقبل قریب میں اس "جست" کا کوئی خاطرخواہ نتیجہ نہ نکلے، اپنی جگہ بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ میں سادات اور بیگن کی جو تقریریں ہوئیں ان میں دونوں طرف سے امن پسندی، دوستی اور خیرسگالی کے جذبات کے بھرپور اظہار کے باوجود دونوں کے معلوم و معروف موقف میں بظاہر تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ (یہ اور بات ہے کہ پس پردہ کچھ اور راہ وسط پائے ہوں، لیکن اس بات کا علم تو رفتہ رفتہ، جستہ جستہ ایک مدت میں ہوگا)

صدر سادات نے کہا کہ

"میں یہاں اس عزم اور مضبوط ارادے سے آیا ہوں تاکہ ہم امن و سلامتی کی بنیاد پر تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز کریں امن و سلامتی تمام بنی نوع انسان کے لئے جو خدا کی زمین پر بستے ہیں۔ ہم نے اپنے دلوں کے دریچے تمام عالم کے لئے کھول دیئے ہیں تاکہ دنیا ہمیں اس حیثیت سے جانے کہ ہم امن اور انصاف کے حامی ہیں ...

"جہاں تک فلسطینیوں کے کاز کا تعلق ہے، کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ پورے مسئلے میں سب سے اہم اور بڑی گتھی یہی ہے۔ اسرائیل میں اس سلسلے میں جو پروپیگنڈا کیا جارہا ہے اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ فلسطینیوں کے وجود کو کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ [illegible]

"فلسطینیوں کے وجود سے انکار کیا جائے اور یہ نہ مانا جائے کہ انھیں اپنے ملک میں واپس ہونے اور اپنی مملکت قائم کرنے کا حق ہے ..... "

ایک آزاد فلسطینی مملکت کے نظریے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا ہے، صدر سادات نے کہا

" اسرائیل کو کسی ایسی فلسطینی مملکت سے خائف نہیں ہونا چاہئیے جسے اپنی بقا کیلئے تمام دنیا سے اشتراک و تعاون کی ضرورت ہو گی۔ جب امن کی گھنٹیاں بجیں گی تو پھر کسی میں ہمت نہ ہو گی کہ وہ جنگ کے طبل پر ہاتھ مارے۔"

سادات نے اسرائیلیوں کے سامنے جو پانچ نکاتی فارمولا رکھا وہ اس طرح ہے۔

ا۔ فلسطینی قوم کے حقوق کو تسلیم کیا جائے، ان میں یہ حق بھی ہے کہ وہ اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے ہیں۔

۲۔ تمام مملکتوں کے اس حق کو مان لیا جائے کہ انھیں اپنی محفوظ سرحدوں میں امن و سلامتی کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع ملے گا۔

۳۔ تمام مملکتوں کو یہ عہد کرنا چاہئیے کہ ان کے باہمی روابط اقوام متحدہ چارٹر کی بنیاد پر قائم رہیں گے۔

۴۔ مغربی ایشیا میں جنگ کی فضا ختم کر دی جائے گی۔ جو مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں، وہ اس صورت حال سے دستبردار ہو جائیں گی۔

۵۔ مصر کو اس بات پر اصولاً کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ اسرائیل محفوظ سرحدوں کے اندر اپنی کوئی دفاعی لائن بنا لے لیکن یہ سرحدیں کہاں ہوں گی یہ ابھی طے نہیں ہے۔

---

نوٹ: اسرائیل سمجھوتے کے لئے یہ نکات پہلی بار نہیں بیان کئے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی اسرائیل کے سامنے یہ باتیں رکھی گئی ہیں اور اس نے ہر بار انھیں مسترد کیا ہے۔ بظاہر یہی

معلوم ہوتا ہے کہ اس بار بھی یروشلم میں سادات سے بیگن نے اس سلسلے میں کوئی ہمت افزا بات نہیں کہی ہوگی۔ اس لئے تل عضیف کے ہوائی اڈے پر جب اسرائیلی وزیراعظم نے صدر جمہوریہ مصر سے یہ کہا ہوگا کہ جو گفتگو شروع ہوئی ہے اسے آئندہ جاری رہنا چاہئے تو سادات کچھ بہت زیادہ پُر امید نہ ہوئے ہوں گے اور انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ فلسطینیوں اور عربوں کی اکثریت کی ناراضگی اور غصہ کی قیمت اگر صرف یہی ہے تو سودا خسارہ کا رہا۔ پھر بھی اس قیاس آرائی کے باوجود ہمیں با لکل نا امید ہونا چاہیئے کیونکہ بند کمرے میں دونوں لیڈروں کے مابین جو گفتگو ہوئی ہے وہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔

قاہرہ پہنچکر مصریوں کے پرجوش استقبال کے بعد صدر سادات نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی قاہرہ میں جنیوا کانفرنس کی تیاری کے لئے متعلقہ ممالک کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ دوسرے تیسرے دن ہی امریکہ، سوویت یونین، اسرائیل، شام، اردن، لبنان اور پی ایل او۔ (تنظیم آزادیٔ فلسطین) کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ پی ایل او نے تو دعوت نامہ واپس کر دیا ہے یعنی وہ اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوگا۔ شام، اردن اور لبنان کے جواب کا انتظار ہے۔ اسرائیل نے ایک سوالنامہ بھیجا ہے اس کے جواب پر وہ یہ طے کریگا کہ کیا فیصلہ کرے۔ سوالنامے میں خاص طور پر مجوزہ کانفرنس کے ایجنڈے سے متعلق تفصیلات طلب کی گئی ہیں۔ امریکہ نے اپنی رضامندی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے اور آج یکم دسمبر تک کی اطلاع کے مطابق وہ اپنے وفد کی تشکیل کر رہا ہے۔ سوویت یونین کی طرف سے تا این دم خاموشی ہے، لیکن امریکہ اور سوویت یونین کے مابین رابطہ قائم ہے۔ یاد رہے کہ سوویت یونین کو صدر سادات کا اسرائیل جانا نہ صرف یہ کہ پسند نہیں آیا بلکہ وہاں ان کے اس اقدام کی مذمت بھی کی گئی۔ صدر سادات نے یو۔این۔ او کے سکریٹری جنرل کو بھی اپنا نمائندہ بھیجنے کی دعوت دی ہے اور وہ اس کے لئے تیار بھی ہوگئے ہیں لیکن ان کی طرف سے ایک تجویز یہ آئی ہے کہ چونکہ اس کا قوی امکان ہے کہ مجوزہ قاہرہ کانفرنس میں بوجوہ تمام مدعو ممالک شریک ہوسکیں اس لئے اس کانفرنس کے کوئی دو ہفتہ بعد جنیوا میں یا کسی اور مناسب جگہ پر متعلقہ ملکوں کی کانفرنس ہوجائے تاکہ باضابطہ جنیوا کانفرنس کے انعقاد کے لئے پہلے ہی سے ضروری تیاری کرلی جائے۔

صدر سادات نے بہت سے کام لے کر اتنا بڑا اقدام کیوں کیا، اس کے متعلق طرح طرح کے خیالات سامنے آرہے ہیں اور ان کے اس رویے کی امریکہ اور سوویت یونین کی طاقتی سیاست یا رجعت پرست اور ترقی پسند رجحانات کی باہمی آویزش کی روشنی میں دلچسپ تاویلیں کی جارہی ہیں ان تمام باتوں میں کچھ کچھ صداقت بھی ہوسکتی ہے لیکن سب سے بڑی صداقت اور سب سے زیادہ واضح اور تلخ

(باقی شذرات رسالہ کے آخر میں ص ۶۹۵ پر ملاحظہ ہو)

ڈاکٹر سید حامد حسین

# کلامِ اصغر کا صوتی حسن

اصغر گونڈوی اُن شعراء میں سے ہیں جنھوں نے تغزل کو نے نوازی کے آداب سے ہم کنار کیا ہے۔ غزل کو صوتی اور صوری خوبیوں سے آراستہ کرنے کا کام اصغر کے پیش رو شعرا نے بھی کیا ہے، لیکن اصغر نے اپنے شعروں کی فضا بندی کے لئے ایک خاص لہجہ متعین کرنے اور اس کے تحت الفاظ، تراکیب اور اُن کے صوتی اثرات منتخب کرنے کا جو انداز اختیار کیا ہے اُس کے حریف بہت کم ہیں۔ اکثر غزل گو شعرا کے بارے میں بحث کرتے وقت کلاسیکی تنقید میں "شاعر کے رنگ" کا ذکر کیا گیا ہے جس سے شاعر کے خصوصی فکری اور فنی انداز مراد لیا جاتا رہا ہے لیکن اس انداز کا تعین بسا اوقات شاعر کے صرف منتخب اور نمائندہ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے کیونکہ ان شعراء کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے جس کو برائے بیت کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے اور اس میں شاعر کے خصوصی انداز کی جھلک برائے نام ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی وجہ سے ناقدین کو ان شعرا کے متبادل رنگوں اور ذیلی خصوصیات وغیرہ کا ذکر کرنا ہوتا ہے۔

اصغر گونڈوی کے کلام کی خصوصیت اس کی حیرت انگیز یک رنگی ہے "نشاطِ روح" اور

---

ڈاکٹر سید حامد حسین، ایم اے (انگریزی)، ایم اے (معاشیات)، پی ایچ ڈی (انگریزی)، روسی اور جرمن زبانوں میں ڈپلوما، متعدد کتابوں کے مصنف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ انگریزی۔ گورنمنٹ حمیدیہ کالج۔ بھوپال

"سرود زندگی" میں شامل پورا کلام ایک نرم، رنگین اور تجلیات اور امید سے بھرپور فضا میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اصغر کی تقریباً تمام شاعری ایک مدھم لے اور نرم لہجے کی شاعری ہے۔ بہت کم مواقع ایسے ہیں جہاں شاعر کے لہجے میں خروش یا لے میں تندی آتی ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اصغر نے اس دھیمے لہجے میں مترنم تنوع پیدا کرنے اور صوتیاتی زیر و بم کا تاثر حاصل کرنے کے لئے آوازوں کی ترتیب اور ان کے توازن پر خصوصی توجہ دی ہے۔

اصغر نے اپنے اشعار کے لئے آوازوں کا جس طرح انتخاب کیا ہے اور انھیں جس ترتیب سے اشعار میں داخل کیا ہے ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اصغر نے اپنے اشعار کی نرم، پرسکوت فضا کی تعمیر کے لئے خصوصی طور پر "س" "ش" اور "ز" (یا ان کے ہم آواز حروف "ص"، "ث" یا "ذ"، "ظ"، "ض") کی آوازوں کو استعمال کیا ہے۔ ان آوازوں سے اصغر کے اشعار کی زیریں موسیقی ترتیب پاتی ہے اور اس کی مدد سے اصغر کی شاعری میں موجود رجائیت، پاکیزگی اور حسن کے عناصر اپنا واضح تاثر پیدا کرتے ہیں۔

اس بنیادی صوتی تاثر کے ساتھ جو "س" "ش" اور "ز" کی آوازوں سے پیدا ہوتا ہے، اصغر دوسری آوازوں کی تکرار یا تضاد کے ذریعے اپنے اشعار کے آہنگ میں تنوع اور اپنے بیان میں تاثراتی مراکز کے تعین میں مدد لیتے ہیں۔

کلام اصغر کے صوتیاتی نظام کا صحیح اندازہ اُن کے بعض اشعار کے صوتی تجزیے کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ "نشاط روح" کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے:

گلوں کی جلوہ گری، مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

گذر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں، نہ ثریا، نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے، یہی اصل علم و حکمت ہے
جمالِ دوست و شبِ ماہ و بادۂ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسم بلالی و طرزِ بولہبی

ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا
کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی

سرشتِ عشق طلب اور حسن بے پایاں　　حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں　　جہاں سے تونے لئے خندہ ہائے زیرِ لبی

کشش نہ جامِ نگاریں کی پوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

اس غزل کے ہر شعر میں "ش" کی آواز کو شامل کیا گیا ہے بلکہ دوسرے، چوتھے، ساتویں، اور آٹھویں شعروں میں ایک سے زیادہ بار اس آواز کو استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح "س" اور "ز" کی آوازوں کو مختلف ترکیبوں میں استعمال کیا گیا ہے اور کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں ان میں سے کوئی آواز یا مختلف آوازیں موجود نہ ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ اصغر کے پہلے مجموعۂ کلام "نشاطِ روح" میں صرف دو اشعار ایسے ہیں جن میں ان آوازوں کا التزام نہیں رکھا گیا اور دوسرے مجموعے "سرودِ زندگی" میں ایسے اشعار کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہے۔

"س"، "ش" اور "ز" کی ان آوازوں کی ان تکراروں سے اصغر کی شاعری میں ایک خاص سرگوشی کا سا لہجہ پیدا ہوا ہے جس میں نسیمِ صبح جیسی لطافت اور برگِ گل جیسے نازک لمس کا احساس ہوتا ہے۔ اصغر کے اشعار کا مجموعی تاثر ایک ہمہ گیر سکون اور عدمِ اضطراب کی کیفیت ہے جو یہ احساس پیدا کرتی ہے گویا ساری شورشیں تمام ہو چکی ہیں اور سارے ہنگامے خاموش ہو گئے ہیں۔ اصغر کی پوری شاعری اسی پرسکون سیٹنگ سے ابھرتی ہے۔ ان کے کلام میں شدتِ اظہار اور زورِ گفتار کے بھی مواقع آتے ہیں لیکن بسا اوقات یہ مواقع اپنے اظہار کے لئے قاری کی شعوری کوشش کے مرہونِ منت نہیں ہوتے بلکہ اصغر یہ کام ان آوازوں سے لیتے ہیں جو شعر کے عمومی سرگوشی کے لہجے سے تضاد پیدا کر کے نمایاں ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

صہبائے تند و تیز کو ساقی سنبھالنا
اُچھلے کہیں نہ شیشہ و ساغر لئے ہوئے

یہاں "اچھلے" کی صوتی اور معنوی اہمیت پر غور فرمائیے جو کہ شعر کی "ص" "ز" "س" اور "ش" کی تکرار سے پیدا ہونے والی دھیمی موسیقی میں سے ایک دم اُبھر کر نمایاں ہوجاتا ہے۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائیں
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

ان مصرعوں میں "اٹھالیں" اور "بیٹھ کے" الفاظ صوتی اعتبار سے مصرعوں کی عام صوتی فضا میں ان مقامات پر تضاد پیدا کرتے ہیں جہاں شاعر کو زور دینا مقصود ہے۔

جو دل سے تیر کوئی پار ہوا تو کیا
تڑپ رہا ہوں ابھی تک تری نظر کیلئے

ان مصرعوں میں "پار" اور "تڑپ" کے الفاظ جس طرح شعر کے پس منظر سے اُبھرتے ہیں وہ ان کیفیات کا صوتیاتی اظہار بھی پیش کرتے ہیں۔ لفظ "پار" میں حرف "پ" اور حرف "ر" کی آوازیں پیوست ہوکر نکل جانے کی کیفیت کو اسی طرح ظاہر کرتی ہیں جس طرح لفظ "تڑپ" میں حرف "ت" اور حرف "ڑ" چوٹ کھانے اور حرف "ڑ" اور حرف "پ" کی مشترکہ آوازیں صدمے سے الٹ جانے کی کیفیت کا اظہار کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اصغر کی ایجاد نہیں لیکن اصغر کا شعری کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مصرعوں میں آوازوں کو وہ ترتیب دی ہے جن کی وجہ سے یہ الفاظ ان مصرعوں میں تاثراتی مراکز کی حیثیت سے ابھر کر آئے ہیں اور ان الفاظ کا صوتیاتی تاثر پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔

کس قدر پرکیف ہے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
اصل نغمہ ایک آوازِ شکستِ ساز ہے

اِن مصرعوں میں الفاظ "ٹوٹے" اور "شکست" کا صوتیاتی تضاد، ان کی معنوی مماثلت کے باوجود، شعر میں ان کے کیفیاتی تضاد کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔ لفظ "ٹوٹے" کی کرختگی، دل شکنی کی ناگواری اور لفظ "شکست" کی نرمی ساز ٹوٹ جانے سے پیدا ہونے

والے بے شورش تاثر کا کامیابی کے ساتھ اظہار کرتی ہے۔

اصغر کے اشعار میں ایک اور آواز جس کی فراوانی نظر آتی ہے وہ حرف "ت" (یا "ط") کی ہے۔ اس قسم کی آواز رکھنے والے الفاظ کے انتخاب میں اس شعوری ترجیح کے امکانات نسبتہً کم ہیں جو "س"، "ش" اور "ز" کی آواز رکھنے والے الفاظ کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں کئی قسم کی لسانی ضرورتوں کے تحت حرف "ت" کی آواز والے الفاظ کو استعمال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً افعال کے بعض صیغوں میں "تا"، "تی"، "تے" لگایا جاتا ہے یا "تھا"، "تھی"، "تھے" لانا ہوتا ہے۔ یہ "تو" اور "تم" کی ضمیروں کی مختلف شکلیں جو کہ کثرت سے مستعمل ہیں۔ اس کے باوجود اصغر نے اس آواز کو بڑے اہتمام سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

---

کبھی سنتے تھے ہم یہ زندگی ہے وہم و بے معنی
مگر اب موت کو بھی خطرۂ باطل سمجھتے ہیں

---

تری شوخی، تری نیرنگ ادائی کے نثار
اک نئی جان ہے تجدیدِ تمنا ہونا

"ت" کی آواز سے اصغر نے اس شعری فضا کو تقویت بخشی ہے جو انھوں نے "س" "ش" اور "ز" کے مشترکہ تاثر سے تعمیر کی ہے۔ "ت" کی یہ آواز ایک ہلکی تھپکی کی طرح اصغر کی شعری موسیقی کو ایک دھیمی تال مہیا کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اصغر اکثر حرف "د" کی آواز کو بھی استعمال کرتے ہیں اور ان دونوں آوازوں کے اشتراک سے ان کے اشعار کا ایک دلکش اندرونی

آہنگ ترتیب پاتا ہے۔ مثلاً

اب تو یہ تمنا ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں — صورت جو دکھادی ہے تو لے جلوۂ نظر کا

---

دشت غربت کی طرف اک آہ بھر کر جست کی — گرد کو پھر دل مری اہل وطن دیکھا کئے

دوڑتے پھر ... تھے جلوے اُن کے موج نور میں — دور سے ہم سازِ شمع انجمن دیکھا کئے

---

پردۂ دہر کچھ نہیں اک ادائے شوخ ہے — خاک اٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

اصغر کی تقریباً ہر غزل میں ایسے مصرعے موجود ہیں جن میں انھوں نے کسی آواز کی تکرار سے فائدہ اٹھایا ہے اور صوتی تکرار کا حسن اس انداز سے پیدا ہوا ہے کہ وہ بالکل فطری اور غیر ارادی معلوم ہوتا ہے۔ ایک ہی غزل کے ایک ساتھ تحریر تین شعر ملاحظہ ہوں :

جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہئے — وگرنہ عشوہ طرازئ نقشِ پا معلوم

نکھر کے اسی پردے میں جلوہ آرا ہے — بہارِ لالہ و گل شوخئ صبا معلوم

ستم جو چاہے کرے مجھ پہ عکسِ ذوقِ نظر — بساطِ آئینۂ حسنِ خودنما معلوم

پہلے شعر میں "ش"، دوسرے میں "ر" اور "ل" اور تیسرے میں "س" کی تکرار نے ہر شعر کو ایک جداگانہ صوتی لطف عطا کیا ہے، چند دوسرے حروف کی تکرار کی مثالیں پیش ہیں :

(ب) ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ اک برق بلا ہے
آنکھوں کا اشارہ ہے کہ سیلاب فنا ہے

(پ) شاید کہ پیام آیا پھر وادئ سینا سے
شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوتِ مینا سے

(ج) ترجمانی کی مجھے آج اجازت دیدے
شجر طور ہے ساکت لب منصور خموش

(د) میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

(ر) بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا

(ز، ذ، ظ) ہزار عذر ہیں اک لذتِ نظر کے لئے

(ک، ق) قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق کی

آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

(گ) اِدھر وہ خندۂ گلہائے رنگیں صحنِ گلشن میں

اُدھر اک آگ لگ جانا وہ بلبل کے نشیمن میں

(ل) کون تھا اس کے ہوا خواہوں میں جو شامل نہ تھا

اب ہوا معلوم مجھ کو دل بھی میرا دل نہ تھا

(م) لب پہ موجِ حسن جب چمکے تبسم نام ہو

(ن) تیری شوخی، تیری نیرنگ ادائی کے نثار

اک نئی جان ہے تجدیدِ تمنا ہونا

(ہ) ہجومِ شوق میں اب کیا کہوں میں کیا نہ کہوں

اصغر نے اپنے اشعار میں ایک ہی قبیل کی آوازوں کو مختلف ترتیبوں کے ساتھ یکجا کر کے اپنے صوتی آہنگ میں بڑا خوبصورت تنوع پیدا کیا ہے۔ کبھی کبھی انھوں نے قریب المخرج حروف کے اشتراک سے یہ تاثر پیدا کیا ہے جیسے ان مصرعوں میں "غ"، "ق" اور "خ" کو ایک ساتھ استعمال کیا ہے:

نقابِ رُخ اُلٹ کر آج کیوں گرمِ تبسم ہو شعاعیں مجھ پہ کیوں پڑتی ہیں خورشیدِ قیامت کی

خروشِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ الفت بن

مجھ کو خبر رہی نہ رُخِ بے نقاب کی

موسیٰ ظہورِ برقِ تجلی سے غش ہوئے

یا کبھی انھوں نے "ج" اور "چ" کو پاس پاس رکھ کر ایک صوتی تاثر پیدا کیا ہے۔ مثلاً

لب پہ موجِ حسن جب چمکے تبسم نام ہو

کہیں انھوں نے "ق" اور "ک" کی آوازوں سے یہی فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز کہاں

کسی شعر میں انھوں نے "ک"، "کھ"، "خ"، "ق"، "گ" ساری آوازوں کو یکجا کر دیا ہے، مثلاً

تقدیر کس کے خرمنِ ہستی کی کھل گئی.....

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری....

شعر میں صوتی آہنگ پیدا کرنے کے لئے عام طور پر الفاظ کی تکرار، مماثل تراکیب یا مصرعوں کی مماثل اور متوازن اجزا میں تقسیم سے مدد لی جاتی ہے آصغر نے ان مروجہ اسالیب کو جس خوبی سے استعمال کیا ہے اس میں تصنع کا بہت کم شائبہ معلوم ہوتا ہے اور شعر کا صوتی آہنگ معنی میں اس طرح پیوست ہوجاتا ہے کہ آواز اور خیال اکثر ایک دوسرے کا جز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں :

اک عالمِ حیرت ہے، فنا ہے نہ بقا ہے — حیرت بھی یہ حیرت کہ کیا جانئے کیا ہے

اس شعر میں "حیرت" اور "کیا" کے الفاظ کی تکرار نے شعر کو نہ صرف صوتی اعتبار سے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی ایک تاثراتی گیرائی بخشی ہے۔

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے — ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے

یہاں "سو بار جلا ہے" اور "سو بار بنا ہے" جیسے مماثل فقروں نے پہلے مصرع میں ایک موثر اور دلآویز شکل اختیار کر لی ہے۔

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

دوسرے مصرعے کے مماثل اجزا کی تکرار نے شعر کے معنوی تاثر کو دوبالا کر دیا ہے یا یہ شعر دیکھئے :

عظمتِ تنزیہہ دیکھی شوکتِ تشبیہ بھی
ایک حالِ مصطفیٰ ہے ایک قالِ مصطفیٰ

پہلے مصرعے میں "عظمتِ تنزیہہ" اور "شوکتِ تشبیہ" کی مماثل تراکیب میں "ز" جیسی اور "ش" کی آوازوں کے اہتمام اور دوسرے مصرعے میں "حالِ مصطفیٰ" اور "قالِ مصطفیٰ" کی متوازی تراکیب میں صرف ایک حرف کے فرق سے بڑا خوشگوار صوتی تاثر پیدا ہوا ہے۔

دنیائے شعر میں آصغر نے خود کو ایک باکمال صوتی فنکار کی حیثیت سے ثابت کیا ہے۔ انھوں نے شعر کو نغمہ کی صورت میں ڈھالا ہے اور خیال کو ترنم بخشا ہے۔ ان کی غزل میں حروف گنگناتے اور الفاظ بول اٹھتے ہیں۔ آصغر کی پوری شاعری ایک متین نغماتی فضا میں ڈوبی ہوئی ہے جس کا سرچشمہ ان کا پاکیزہ تخیل اور عارفانہ وجدان ہے۔ آصغر کے کلام کی اس ہمہ گیر متانت اور پرسکون فضا میں زیروبم اور تنوع کا احساس تو ہوتا ہے لیکن کہیں کسی تلاطم یا شورش کا تجربہ نہیں ہوتا۔ آصغر کی شاعری معنوی اور صوتی اعتبار سے آصغر کی متین عارفانہ شخصیت کا عکس ہے۔ اس شخصیت میں جس طرح فکر و جذبہ، احساس و خیال ایک بسیط معنویت میں حل ہو کر یک جان ہو گئے ہیں۔ اسی طرح آصغر کی شاعری میں لفظ و معنی، صوت و ساز، رنگ و آہنگ نے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک غیر معمولی تخلیقی و فنی تجربے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی

# امیر خسرو — ہندوستان کا مایۂ ناز سپوت

چنگیز خاں کے حملوں نے وسطی ایشیا کے رہنے والوں کو اپنے وطن اور اپنے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، اس علاقے میں بہت سے قبائل آباد تھے جو امن وسکون کی زندگی بسر کرتے تھے، انھیں میں ایک قبیلہ لاچین بھی تھا، یہ لوگ بڑے جری اور باہمت تھے، جب یہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان میں داخل ہوئے تو بادشاہ وقت التمش نے ان کی عزت افزائی اور خیر مقدم کیا — خسرو کے والد امیر سیف الدین اسی قبیلہ لاچین کے سردار تھے، یہ ہندوستانی فوج میں شامل ہو گئے اور اس کے استحکام میں بادشاہ کے مددگار بنے۔ بادشاہ نے ان کی گذر اوقات کے لئے سالانہ وظیفے کے ساتھ پٹیالی[۱] کا علاقہ عنایت کیا۔ خسرو کی پیدائش یہیں ۱۲۵۳ء میں ہوئی[۲] ان کی والدہ بلبن کے وزیر جنگ عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ جس وقت خسرو پیدا ہوئے ان کے والد ان کو چادر میں لپیٹ کر ایک مجذوب کی خدمت میں لے گئے جو پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ مجذوب نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ "امیر لاچین تم میرے پاس اس بچے کو لائے ہو جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے

---

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ریڈر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ دہلی۔

[۱] پٹیالی ضلع ایٹہ میں دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے، اسے مومن پور بھی کہا جاتا ہے۔

[۲] ان کے سنہ پیدائش میں اختلاف ہے، لیکن عام طور سے مورخین نے اسی کو صحیح مانا ہے۔

حاشیہ کا سٹہ

کم عمری ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا، لیکن گھرانا خوشحال تھا اس لئے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ دی گئی، خاص طور سے ان کے نانا عماد الملک نے ان کا بہت خیال رکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کو اس وقت کے علوم وفنون میں خاص مہارت حاصل ہوگئی۔

بچپن ہی سے ان کا میلان طبع شاعری کی طرف تھا، یہ جذبہ اور شوق انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، اور شاید یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ان کے کسی استاد کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ عام طور سے بڑے بڑے شعرا کو دنیاوی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی نازک مزاجی انھیں کشاکش دنیا سے الگ ہوجانے پر مجبور کرتی ہے، کیونکہ اس میں رواداری، نرمی اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی شرط ضروری ہے جو عام طور سے ان شعرا کے یہاں نہیں ملتی ——— مگر خسرو اس قسم کے شعرا سے الگ تھلگ تھے، ان کے مزاج میں لوگوں سے مل جل کر رہنے کا مادہ تھا، وہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک ہمدرد، ملنسار اور معاملات دنیا پر نظر رکھنے والے انسان بھی تھے، بدلتی ہوئی حکومتوں کے ساتھ وہ برابر اپنے کو ہر معیار پر پورا ڈھالتے رہے، ہر بادشاہ اور بڑے امیر نے ان کی قدردانی کی اور دربار کے اہم ترین لوگوں میں ان کا شمار ہوا۔ خسرو نے بادشاہوں کی محفلوں سے لے کر غریب مزدوروں کی ٹولیوں تک، خانقاہوں سے خرابات تک سماج کے تمام گوشوں کا گہرا مطالعہ کیا اور بڑی ذہانت کے ساتھ اس مطالعہ اور مشاہدہ کے نتائج کو اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے۔

خسرو کا خاندان سماج کے اونچے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، ان کے والد خود امیر تھے

---

سه مورخین نے اس واقعے کو نقل کرتے وقت مجذوب کا نام نہیں لکھا ہے۔

نانا دربار شاہی سے نہ صرف مدتوں منسلک رہے بلکہ بادشاہوں کو تخت شاہی تک پہونچانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہتا تھا، خسرو میں بھی یہ خاندانی خُو بُو موجود تھی اور ان کی فطری خواہش تھی کہ حالات ہمیشہ ان کے موافق رہیں اور وہ مالی طور پر کبھی پریشان نہ ہوں۔ اس دور میں اہل علم اور شعراء کی بڑی قدردانی ہوتی تھی اور ہر دربار اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ فنکار اس کے یہاں موجود ہوں۔ خسرو بھی درباری شاعر بن گئے، پرانے زمانے میں شعراء کا کم و بیش وہی رول ہوتا تھا جو اس دور میں اخباروں کا۔ شاعر اپنے اشعار سے جادو جگاتا اور اپنے ممدوح کو عوام میں ہر دلعزیز بناتا تھا۔ خسرو کو اس فن میں خاصی مہارت حاصل تھی، وہ بہت تیزی سے قصیدے اور غزلیں کہا کرتے تھے، جس محفل میں بیٹھتے اس کی جان بن جاتے، ان کی شخصیت بڑی دلکش تھی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور معاملہ فہمی ان کے مزاج کا جزو تھی، وقت کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتے تھے، ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے درباری چشمک اور ملکی سیاست سے اپنے کو الگ رکھتے تھے، اپنے مربی کی مدح کرتے اس کے بدلے دولت پاتے اور خوش و مطمئن رہتے، شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ایسا ہو جسے ان کی سی پرمسرت زندگی نصیب ہوئی ہو، انھوں نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور تقریباً ہر دور میں ان کے شیریں نغمات نے یکساں معجزے دکھائے۔

خسرو کا پہلا مربی و محسن ملک چھجو[۲۸] تھا، جو بہت ہی نیک اور فیاض سردار تھا، سلطان غیاث الدین بلبن کا بھتیجا اور دربار کے اہم لوگوں میں سے تھا، خسرو دو سال تک اس کی ملازمت میں رہے، ایک روز شعر و شاعری کی محفل جمی تھی، غیاث الدین بلبن کا بیٹا بغرا خاں بھی شریک تھا، خسرو نے اپنی زمزمہ سنجی کا کچھ ایسا سماں باندھا کہ بغرا خاں بے حد متاثر اور خوش ہوا اور ایک لگن بھر روپے انعام میں دیئے، خسرو نے اسے قبول کر لیا، ملک چھجو کی خودداری

---

[۲۸] پورا نام علاء الدین محمد کشلی خاں تھا۔

کو یہ بات گراں گذری کہ اس کا ملازم دوسروں سے انعام لے، خسرو نے بہت کوشش کی کہ اس کی خفگی دور ہو جائے مگر وہ مطمئن نہ ہو سکا، آخر خسرو اس کی ملازمت چھوڑ کر بغرا خاں کی طرف منتقل ہو گئے۔

بغرا خاں سامانہ کا گورنر تھا، اس نے خسرو کی خوب قدر و منزلت کی اور اپنا ندیم خاص بنایا۔ اسی زمانے میں لکھنوتی کے گورنر طغرل خاں نے بغاوت کی، سلطان بلبن بذات خود اسے فرو کرنے کے لئے نکلا، بغرا خاں کو بھی ساتھ لیا اور اس بغاوت کا قلع قمع کر دیا، اس علاقے کی گورنری بغرا خاں کو ملی، خسرو تھوڑے عرصے تک لکھنوتی میں رہے، لیکن یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی اس لئے بغرا خاں کی اجازت سے دہلی آ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات سلطان کے بڑے بیٹے محمد سے ہوئی اور اس نے خسرو کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔

سلطان محمد علماء کا بڑا قدر دان تھا، بہت سخن شناس اور فیاض تھا، بہادری، اخلاق اور تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ فنون لطیفہ کا قدر دان تھا، علماء و شعراء کی مجلسوں میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوتا اور گھنٹوں بیٹھتا، اس کا ملتان کا دربار علماء و شعراء سے بھرا رہتا تھا، پانچ سال تک خسرو اس کے دربار سے وابستہ رہے، یہی وہ شہزادہ ہے جس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ شیخ سعدی بھی اس کے دربار کو زینت بخشیں مگر شیخ نے عمر کی زیادتی کا عذر کر کے معذرت کر لی ـــــ شہزادہ محمد کے سپرد سرحد کی حفاظت کا کام تھا اور اسی سلسلے میں وہ مغل فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کی شہادت کا مختلف مورخوں نے دردناک پیرایے میں ذکر کیا ہے، خسرو شہزادہ کے ندیم خاص ہی نہیں اس کے ایک فوجی افسر بھی تھے اس لئے وہ خود بھی اس معرکے میں شریک تھے، شہزادے کی شہادت کے بعد گرفتار ہوئے لیکن قسمت سے ان کو فرار کا موقع مل گیا، شہزادے کی شہادت پر انھوں نے پرسوز اور غم انگیز مرثیہ لکھا، جس میں اس پورے واقعہ کا تذکرہ ہے، ان کا یہ مرثیہ ان کے قلبی تاثرات کا آئینہ دار اور دلی جذبات کا اظہار ہے، بہت دنوں تک ہر گھر میں پڑھا جاتا

تھا جو سنتا بے اختیار آنسو بہاتا۔ اب تک خسرو خواص کے شاعر تھے، اس مرثیے نے ان کو عوام سے روشناس کرایا اور وہ بھی اس انداز سے کہ انھوں نے ایک ہی مرثیہ سے لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر قائم کرلیا ـــــ یہ مرثیہ تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ شہزادہ محمد کی فوج کشی، مغلوں کا حملہ، اس کی شہادت، امیر خسرو کی گرفتاری اور رہائی یہ سب ایسے واقعات ہیں جن کا مفصل تذکرہ اس مرثیہ کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔

اس کے بعد خسرو کو خاں جہاں نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا (یہ شاہی محافظوں کے دستہ کے سردار تھے بعض لوگوں نے ان کا نام حاتم خاں لکھا ہے) اور جب وہ اودھ کے گورنر مقرر ہوئے تو خسرو کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ دو سال تک یہ اودھ میں رہے، پھر ان کو دہلی اور والدہ کی یاد نے بے چین کردیا، آخر خان جہاں کی اجازت سے دہلی واپس آگئے، اس وقت کیقباد بادشاہ تھا، چند ہی روز بعد دربار میں ان کی طلبی ہوئی، انھوں نے بادشاہ کی شان میں قصیدہ پڑھا اور انعام و اکرام سے نوازے گئے، چند ہی ماہ بعد کیقباد کا انتقال ہوگیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا جس نے ایک نئے خاندان اور ایک نئے انداز کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

سلطان جلال الدین خلجی خسرو کا پہلے ہی سے قدردان تھا اس نے ان کو باپ کا منصب امیر لاچین دیا تھا، اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد ان کو مصحف دار کے عہدہ سے بھی نوازا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کو ندیم خاص بھی بنایا، یہ دونوں ہی عہدے اس زمانے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، مصحف دار کے پاس شاہی قرآن مجید رہتا تھا اور ندیم خاص بادشاہ کے پاس ہر وقت حاضر رہتا تھا اور خالی اوقات میں اس کی دلبستگی کرتا تھا۔ بادشاہ نے ان کو وہ خلعت اور پٹکا بھی عطا کیا جو اس زمانے میں بڑے سے بڑے امیر کو دیا جاتا تھا۔ خسرو نے بادشاہ کی مجلسوں کے لئے بہت سے قصائد اور غزلیں لکھیں اس کے علاوہ سلطان کی مہموں کی منظوم تاریخ مفتاح الفتوح کے نام سے تیار کی اور بادشاہ کو پیش کی۔

جلال الدین خلجی کا دور امن و عافیت کا تھا، لیکن حکومت اور اقتدار کی ہوس عجیب عجیب رنگ دکھاتی ہے۔ اس کا بھتیجا علاء الدین کڑہ مانک پور کا حاکم تھا، جلال الدین کو اس سے بڑی محبت اور بھروسہ تھا، اس نے بڑے مدبرانہ انداز سے چچا کو کڑہ بلایا اور دھوکہ سے اسے قتل کر دیا۔ تاریخ میں اس سفاکانہ قتل کی مثال شاید ہی مل سکے۔ چچا جس نے بھتیجے کو بیٹے کی طرح سے پالا تھا، سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک ہوگا۔ علاء الدین خلجی نے بعد میں اپنی اصلاحات اور داد و دہش سے خون کے دھبوں کو مٹانے کی بہت کوشش کی مگر یہ نشانات اس کی ہزار کوششوں کے بعد بھی نہ مٹ سکے۔

سلطنت پر قابض ہونے کے بعد علاء الدین نے اپنی انتظامی لیاقت سے حکومت کو مستحکم کر لیا، لوگوں نے اسے نذریں گذاریں اور مبارکباد دی، خسرو بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ اس خود غرضی اور قتل ناحق پر خسرو کو ضرور شدید صدمہ ہوا ہوگا مگر ان کی زبان پر اس قسم کا کوئی ذکر نہ آسکا ــــ علاء الدین نے ان کی درباری حیثیت کو باقی رکھا، لیکن چونکہ اسے علم و ادب اور شعر و شاعری کا ذوق نہ تھا اس لئے اس کی نظر میں جہاں دربار کے اور سامان آرائش تھے وہاں خسرو بھی اس کا ایک جزو تھے۔ خسرو نے علاء الدین کی مدح و ستائش پوری صداقت اور ایمانداری سے کی اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ خسرو پر علاء الدین کے انتظام و تدبر اور اصلاحات کا بہت اثر تھا، اس کی مدح میں جو قصائد ہیں ان میں جتنی تاثیر اور زمزمہ سنجی ہے اس سے پہلے نہیں ملتی۔ لیکن علاء الدین کو اس کا کوئی خاص ذوق نہ تھا اس لئے وہ دوسروں کی طرح داد و دہش اور انعام و اکرام سے ان کو نواز نہ سکا۔ دوسرے یہ کہ وہ اسے فضول خرچی بھی تصور کرتا تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ علاء الدین کا اکیس سالہ دور حکومت خسرو کا سب سے اہم اور بڑا تخلیقی دور گذرا ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے بے شمار مثنویاں، قصائد اور غزلیں کہیں۔ ان کا پنج گنج جسے انھوں نے نظام الدین اولیاء کے نام معنون کیا تھا اور جس میں پانچ عشقیہ مثنویاں، شیریں خسرو، مجنوں لیلیٰ، مطلع الانوار،

آئینہ سکندری اور ہشت بہشت شامل ہیں سب اسی دور کی یادگار ہیں۔

اب تک خسرو کا رجحان صرف شاعری ہی کی طرف تھا اور جو کچھ وہ اب تک کہہ چکے تھے ان کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کرنے اور ان کی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر ان کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی صلاحیتوں سے سرفراز کیا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی توجہ نثر کی طرف مبذول کی۔ اس دور میں انھوں نے دو کتابیں نثر کی بھی تصنیف کیں، ایک تو علاء الدین کی جنگوں سے متعلق جس کا نام خزائن الفتوح ہے اور جو تاریخی حیثیت کی حامل ہے دوسری اعجاز خسروی جو معانی و بیان اور بلاغت کے فن سے متعلق ہے اور بڑے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے، یہ کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔ علاء الدین کی حکومت کے آخری دور میں انھوں نے مثنوی دیول دیوی و خضر خاں لکھی جو اپنے انداز بیان اور اثر انگیزی کے لئے مشہور ہے۔

امیر خسرو کی زندگی پر حضرت نظام الدین اولیاء کی روحانی اور ذہنی تربیت کا گہرا اثر تھا، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ امیر خسرو آٹھ سال کی عمر میں مرید ہوئے تھے لیکن زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق حضرت نظام الدین سے جلال الدین کے عہد سے شروع ہوا اور برابر بڑھتا رہا۔ امیر خسرو ان کے خاص ارادتمندوں میں سے تھے، حضرت نظام الدین بھی ان کی ذہانت اور خوبیوں سے پوری طرح واقف تھے اس لئے جب خسرو مرید ہونے کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے بہت لطف و کرم سے انھیں اپنے پاس بٹھایا اور باتیں کیں اور بیعت لی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد آپ امیر خسرو سے بے حد مانوس ہو گئے اور ترک اللہ کا انھیں لقب دیا۔ اکثر کہا کرتے تھے میں سب سے اکتا جاتا ہوں مگر خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جو آگ خسرو کے دل میں سلگ رہی ہے اس کی گرمی سے میرا نامۂ اعمال پاک ہو جائے گا۔ انس و محبت اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ایک بار یہ بھی فرمایا کہ اگر ایک قبر میں دو آدمیوں کو دفن کرنے کی اجازت ہوتی تو میں کہتا کہ خسرو کو بھی میری قبر ہی میں دفن کیا جائے۔ وصیت کی تھی کہ خسرو کی قبر میرے پہلو میں ہو۔

امیر خسرو کو بھی حضرت نظام الدین سے بے حد لگاؤ تھا، اس کا اظہار جا بجا ان کے کلام میں موجود ہے، بیعت کے بعد کوئی ایسی تصنیف نہیں جس میں پیر و مرشد کی کرامت کا ذکر اور اپنی ارادت مندی کا اظہار نہ کیا ہو اور اسی جذبہ سے امیر خسرو نے ایک مختصر سا رسالہ افضل الفوائد کے نام سے لکھا اور اپنے مرشد کے اقوال کو جمع کیا۔ امیر خسرو چونکہ مختلف درباروں اور امراء سے منسلک رہ چکے تھے اس لئے وہ بے بدل شاعر اور بلند پایہ ادیب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ امیر کبیر بھی تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ساری دولت و ثروت کو قربان کر دیا تھا اور اپنے مرشد کے ساتھ خادم بن کر رہتے تھے، اکثر اپنی غزلیں سناتے اور جو شعر مرشد کو پسند آتا بار بار بے خود ہو کر اسے گاتے۔ خسرو اپنی تمام خوبیوں اور کمالات کو مرشد کا فیض سمجھتے تھے۔ ایک بار ایک فقیر نے حضرت نظام الدین کے آگے دست سوال دراز کیا، اتفاق سے اس وقت خانقاہ میں کچھ بھی نہ تھا، حضرت نے اپنی جوتیاں دے کر فقیر کو رخصت کیا۔ راستہ میں اس کی ملاقات امیر خسرو سے ہوگئی، امیر خسرو پیر کی جوتیاں دیکھ کر بے قرار ہوگئے اور کثیر رقم دے کر خرید لیا اور ان کو سر پر رکھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت نظام الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو شاہی لشکر کے ساتھ بنگال میں تھے، جب دہلی واپس آئے اور یہ اندوہناک خبر سنی تو غم والم سے پاگل ہوگئے، کپڑے پھاڑ ڈالے اور چہرے پر سیاہی مل کر اپنے مرشد کی قبر پر پہونچے اور یہ دوہا پڑھا اور بیہوش ہوگئے ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھی سب دیس

اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد خسرو زیادہ دن زندہ نہ رہے، رنج و غم سے طبیعت افسردہ و طول ہو چکی تھی، خود کہتے تھے کہ اب میں زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور آخر

وہی ہوا، حضرت نظام الدین کی جدائی کا صدمہ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور چند ماہ بعد ہی ان کی روح اپنے مرشد کی روح سے جا ملی۔

حضرت نظام الدین کی وصیت تھی کہ خسرو کی قبر میرے پہلو میں ہو اس لئے کہ وہ میرا محرم اسرار ہے، کچھ لوگوں نے ان کی اس خواہش کو پورا کرنا چاہا مگر بعض کو خیال ہوا کہ اس طرح سے دونوں قبروں میں تفریق نہ ہو سکے گی اس لئے خسرو کو پائنتی دفن کیا گیا۔ بہرحال جو قرب اور خصوصیت خسرو کو اپنے مرشد سے اپنی زندگی میں تھی وہ مرنے کے بعد بھی باقی رہی، دونوں کے نام ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئے اور اب بھی زائرین اور عقیدت مند اپنے دل کی مرادیں خسرو ہی کے توسل سے مانگتے ہیں۔

خسرو کی بے شمار تصانیف کا تذکرہ لوگوں نے کیا ہے، بہت سی ایسی چیزوں کو بھی ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے جو ان کی تصنیف نہیں ہیں۔ لوگوں نے ان کی تصانیف کی تلاش و جستجو کر کے بینتالیس[۴۵] کتابوں کی فہرست تیار کی، ان میں سے بعد میں کچھ کتابوں کو ایک ہی کا حصہ اور کچھ کو ان کی تصانیف سے خارج مانا گیا اور آخر میں اکیس[۲۱] ایسی تصانیف قرار دی ہیں جن کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو ہی کی تصنیف ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ ممکن ہے جو بہت سی کتابیں ان کے نام سے منسوب ہیں زمانہ کی دستبرد کی نذر ہو گئی ہوں۔

خسرو کی تصانیف نظم و نثر دونوں میں ہیں، ان کو ادب کے ان دونوں صنفوں پر پوری دسترس تھی، انھوں نے ہندی زبان میں بھی شاعری کی ہے اور اس میں انھوں نے بہت سی پہیلیاں اور مکرنیاں وغیرہ کہی ہیں۔ خسرو کو اس وجہ سے اردو کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے، انھوں نے ہی سب سے پہلے فارسی اور اردو کو ملا کر استعمال کیا، ان کا بیشتر ہندی کلام تلف ہو گیا اور جو کلام ان کی طرف منسوب ہے اس کا بیشتر حصہ بعد میں لوگوں

نے اضافہ کر دیا ہے۔

خسرو کو علم موسیقی میں بھی پوری مہارت تھی، یہ نہ صرف موسیقی کے ماہر بلکہ موسیقی کے بہت سے راگوں کے موجد بھی تھے۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ شاہی درباروں اور امراء کی محفلوں میں گذرا تھا جہاں موسیقی لازمی جزو کی حیثیت رکھتی تھی اور درباروں کی رونق اور شان و شکوہ کو بڑھاتی تھی، اس زمانہ میں ہندی موسیقی غالباً مسلمانوں کے مذاق کے خلاف تھی اور بڑی حد تک ناقابل فہم بھی۔ حمد و ثنا اور نعت و غزل وغیرہ کے لئے ان راگوں میں گنجائش نہ تھی۔ درباروں میں ایرانی اور عرب فنکار موجود ہوتے تھے جو عربی اور ایرانی موسیقی کے ماہر ہوتے تھے، خسرو نے اپنے ذہن رسا اور رواں طبیعت کی وجہ سے ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے راگوں کو سیکھا اور پھر اپنی خداداد صلاحیت اور ذہنی اپج سے کام لے کر مختلف راگ ایجاد کئے جو اپنی خوبیوں اور شان کے اعتبار سے ان بیرونی راگوں سے کسی طرح کم نہ تھے لیکن جن کا خمیر ہندوستانی تھا۔ خسرو نے نہ صرف راگ ہی ایجاد کئے بلکہ ان کے لئے مختلف قسموں کے ساز بھی بنائے جن میں بعد کے لوگ زیادہ رد و بدل نہ کر سکے۔

ڈاکٹر ماجد علی خاں

# برصغیر کے ممتاز صوفیا و مبلغین

## (ساتویں تا گیارہویں صدی عیسوی)

## (۲)

### گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور صوفیاء :

**سید سالار مسعود غازی میاںؒ :** ابتدائی گیارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں ایک اور مشہور صوفی بزرگ کا پتہ چلتا ہے، وہ ہیں سید سالار مسعود غازیؒ عرف بالے میاں ابن سالار ساہو۔ مرآۃ المسعودی کے مطابق سید سالار مسعود غازیؒ سلطان محمود غزنوی کی بہن ستر معلیٰ کے صاحبزادے تھے[1]۔ سید سالار مسعود غازیؒ سلطان کی فوج کے ساتھ کئی جہادوں میں شریک ہوئے تھے۔ ۱۴ جون ۱۰۳۳ء کو وہ بہرائچ کے ایک جہاد میں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ بہرائچ میں ہی ان کا مزار ہے۔ لوگ ان کے روحانی فیوضات کے آج بھی قائل ہیں۔

**شاہ اسماعیل محدثؒ :** گیارہویں صدی کے اوائل میں ہی ایک اور صوفی بزرگ

---

1. Bishop A. Subhan, "Sufism: Its Saints and Shrines, P. 124
نیز: Elliots History of India Vol II, PP. 513–49
(بحوالہ مرآۃ المسعودی)

شیخ محمد اسمٰعیل محدث و مفسر بخارا سے تشریف لائے[۱] ان کا سنہ آمد ۱۰۰۵ء بتایا جاتا ہے۔ اس وقت تک لاہور میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے مواعظ اتنے پر اثر ہوتے تھے کہ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں اسلام قبول کرتے تھے۔ پہلے جمعہ کو ان کے وعظ سے دو سو پچاس، دوسرے جمعہ کو تین سو پچاس اور تیسرے جمعہ کو پانچ سو افراد نے اسلام قبول کیا[۲] لاہور میں ہال روڈ پر ان کا مزار ہے۔

**شیخ حسین زنجانیؒ**: اسی صدی کے اوائل میں (یا دسویں صدی کے اواخر میں) شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ کے پیر بھائی شیخ حسین زنجانیؒ بھی لاہور تشریف لائے۔ بزم صوفیہ میں فوائد الفواد (ص ۳۵)، ملفوظات حضرت شیخ نظام الدینؒ کے حوالہ سے درج ہے:

> "شیخ حسین زنجانیؒ اور شیخ علی ہجویریؒ دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور ان کے پیر اپنے عہد کے قطب تھے، حسین زنجانیؒ عرصہ سے لہاور (لاہور) میں سکونت پذیر تھے، کچھ دنوں کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویریؒ سے کہا کہ لہاور میں جاکر قیام کرو، شیخ علی ہجویریؒ نے عرض کیا کہ وہاں شیخ زنجانیؒ موجود ہیں، لیکن انھوں نے پھر فرمایا کہ تم جاؤ۔ جب علی ہجویریؒ حکم کی تعمیل میں لہاور آئے تو رات تھی صبح کو شیخ حسینؒ کا جنازہ باہر لایا گیا۔"[۳]

کچھ تذکرہ نگاروں کے مطابق شیخ حسین زنجانیؒ کے ساتھ سید یعقوب زنجانیؒ المعروف

---

[۱] حدیقۃ الاولیاء میں ان کا نام "شیخ محمد اسماعیل محدث و مفسر لاہوریؒ" لکھا ہے۔

[۲] "اولیائے لاہور"، ص۲۵

[۳] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، "بزم صوفیہ"، ص۱

حضرت صدر دیوان صاحبؒ، سید اسحٰق زنجانیؒ اور شیخ علی لاحقؒ بھی تشریف لائے تھے۔[۴] لیکن اکثر مورخین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ بالخصوص شیخ علی لاحقؒ کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ وہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں تشریف لائے تھے۔ ان کا مزار سیالکوٹ میں بتایا جاتا ہے۔ اسی طرح شیخ یعقوب صدر دیوانؒ کی تاریخ وفات ۱۲۰۸ء بتائی جاتی ہے اور اکثر مورخین اسی کو مستند تسلیم کرتے ہیں۔

شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ: ہندوستان کے ابتدائی صوفیاء میں جن صوفی بزرگ کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کتب تواریخ میں ملتا ہے وہ ہیں مخدوم سید ابوالحسن علی ہجویریؒ معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری (م ۱۰۷۲ء/۴۶۵ھ) جناب مخدوم صاحب کا اسم گرامی علی ہے اور کنیت ابوالحسن۔ آپ کا خاندان غزنی کے قریب ایک قصبہ ہجویر میں رہتا تھا۔ آپ کا نسب ۹ واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔ پورا سلسلہ نسب یہ ہے۔ علی بن سید عثمان بن سید عبدالرحمٰن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حسن بن علی مرتضیٰ۔[۵] مشرب کے لحاظ سے آپ حضرت امام اعظمؒ کے مسلک پر تھے اور تصوف میں آپ کا طریقہ جنیدیہ تھا۔ طریق تصوف کی سند اس طرح ہے: شیخ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ عن ابوالفضل غزنویؒ عن علی حصر مکیؒ عن شیخ شبلیؒ عن شیخ جنید بغدادیؒ عن شیخ سری سقطیؒ عن معروف کرخیؒ عن داؤد طائیؒ عن شیخ حبیب عجمیؒ عن سید حسن بصری عن سید علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ عن حضرت سید محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے آپ اپنے شیخ ابوالفضل غزنویؒ کے حکم سے ۱۰۳۰ء میں لاہور تشریف لائے اور شہر کے مغربی بیرونی حصہ میں دریائے راوی کے قریب قیام پذیر ہوئے۔

---

[۴] اولیائے لاہور ص۲۹

[۵] بزم صوفیہ ص۱

**صدورِ کرامات**: لاہور کے دوران قیام میں آپ سے بہت سی کرامات صادر ہوئیں اور لوگوں نے کثرت سے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ ایک دن ایک غریب بڑھیا تازہ دودھ کی مٹکی لئے جا رہی تھی۔ آپ نے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ یہ دودھ قیمت لیکر ہمیں دے جاؤ۔ اس نے کہا کہ یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر رائے راجو جوگی رہتا ہے اور یہ دودھ اسی کو پہنچایا جاتا ہے اور اگر نہ پہنچایا جائے تو جانوروں کے تھنوں سے بجائے دودھ کے خون آنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے تبسم فرما کر کہا کہ یہ دودھ ہمیں دے جاؤ تو تمھاری گائے کے دودھ میں خدا اضافہ کر دے گا۔ اس پر اس نے وہ دودھ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے اس میں سے بقدر ضرورت نوش فرما کر باقی بچا ہوا دریا میں پھنکوا دیا۔ بڑھیا نے گھر آ کر جب شام کے وقت دودھ دوھنا شروع کیا تو تمام برتن دودھ سے بھر گئے اور دودھ تھا کہ کسی طرح تھنوں میں ختم نہیں ہوتا تھا۔ جب اس بات کی خبر اس کے ہمسایوں کو ہوئی تو دوسرے دن وہ بھی اپنی اپنی مٹکیاں لے کر آپ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ آپ ہر مٹکی میں سے تھوڑا دودھ لے لیتے اور باقی دریا میں پھنکوا دیتے۔ اس طرح ان سب کے مویشیوں کے دودھ میں بھی افزائش ہوتی چلی گئی اور تمام گرد و نواح سے لوگ آپ کے پاس دودھ لانے لگے۔ اور رائے راجو جوگی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ جب اُس کو اس بات کا علم ہوا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہا تم نے ہمارا دودھ تو بند کرا دیا اب کوئی اور کمال بھی دکھاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ میں شعبدہ گر نہیں بلکہ اللہ کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ اگر تم میں کوئی کمال ہو تو دکھاؤ۔ چنانچہ اس نے اپنے استدراج کے کئی کرشمے دکھائے جن میں سے آخر میں یہ تھا کہ وہ ہوا پر اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی نعلین میں اُس کی طرف پھینک دئے جو ہوا میں اس کی کفش کاری کرتے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ واپس آ کر آپ کی خدمت میں پہنچا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس نے آپ کے ساتھ ہی رہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ آپ نے اس کو شیخ ہندی کا خطاب دیا

اور آپ کی روحانی تربیت فرماتے رہے ۔ وہ بھی آخر دم تک آپ کے نہایت مخلص مریدوں میں شامل رہا۔[ؔ] اور بھی متعدد کرامات کا تذکرہ کتب میں مذکور ہے جن کو اختصار کی وجہ سے چھوڑا جارہا ہے ۔

**تعمیر مسجد :** مخدوم سید علی ہجویری رحؒ نے اس مذکور حلقہ کے نزدیک جہاں آپ قیام پذیر ہوئے تھے اپنے صرف خاص سے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی ۔

**وفات :** سال وفات ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء بتایا جاتا ہے ۔ مزار لاہور میں ہے۔

**تصنیفات :** آپ کی سب سے بلند پایہ تصنیف کشف المحجوب ہے ۔ اس کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں :

(۱) منہاج الدین ۔ جس میں آپ نے اہل صفہ کے مناقب لکھے ہیں ۔

(۲) کتاب الفنار و البقار

(۳) اسرار الحزق والمؤنات

(۴) کتاب البیان لاہل العیان

(۵) بحر القلوب

(۶) الرعایۃ لحقوق اللہ

ان تمام کتابوں میں صرف کشف المحجوب ہی اب دستیاب ہے ۔ کشف المحجوب کا شمار علم تصوف کی بلند پایہ تصانیف میں ہوتا ہے ۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحؒ کا ارشاد ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا ۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحؒ اپنے مکتوبات میں جابجا اس کتاب کا ذکر فرماتے ہیں ۔ جہانگیر اشرف

---

ؔ بیان المطلوب ترجمہ کشف المحجوب ص۸۷

سمنانیؒ کے ملفوظات لطائف اشرفی میں اس کا حوالہ بکثرت موجود ہے[۸] ملا جامی رقمطراز ہیں: "کشف المحجوب از کتب معتبرہ مشہورہ دریں فن است و لطائف و حقائق دراں کتاب جمع کردہ است"[۹] مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم اس کتاب کا تعارف اس طرح کراتے ہیں: "عربی میں تصوف کی قدیم ترین معلوم و موجود کتاب کا نام "کتاب اللمع" ہے۔ اس سے ہم پچھلے باب میں روشناس ہو چکے، فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب "کشف المحجوب" ہے، "کتاب اللمع" چند سال قبل دنیا کے لئے معدوم تھی اور اب بھی مشرق کے لئے اس کا وجود اس کے عدم سے کچھ ہی بہتر ہے۔ خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں، داتا گنج بخش لاہوریؒ کا نام تو اس سے زیادہ عوام کی زبان پر ہے۔ پنجاب کے اکثر گھرانے ان کی عقیدت کے مسکن ہیں، لاہور میں مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہو چکا ہے اور ترجمہ بھی لاہور ہی سے نکل چکا ہے، انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے گب میموریل سیریز میں شائع کیا ہے۔ چند سال ہوئے روس (سینٹ پیٹرز برگ) کے پروفیسر جوکوودسکی کے زیر اہتمام اصل کتاب یورپ میں بھی چھپنے کی اطلاع آئی تھی[۱۰]"

اس کتاب کے بارے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن تحریر کرتے ہیں: کشف المحجوب کی تصنیف کا سبب ابو سعید ہجویری کا ایک استفسار

---

۸ "بزم صوفیہ" از سید صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۱۲، ۱۳۔

۹ "نفحات الانس" قلمی نسخہ دارالمصنفین۔ جیسا کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے "بزم صوفیہ" ص ۱۳ پر اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے "تصوف اسلام" ص ۵۲، ۵۳ پر درج کیا ہے۔

۱۰ "تصوف اسلام" ص ۵۳۔

ہے جو تصوف کے رموز و ارشادات کو حضرت شیخ ہجویریؒ سے سمجھنا چاہتے ہیں، اسی کے جواب میں شیخؒ نے تصوف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، جس سے کشف المحجوب تصوف کی قابل قدر کتاب بن گئی ہے۔ اس کے ذریعہ گویا پہلی مرتبہ اسلامی تصوف کو ہندوستان میں پیش کیا گیا[۱۱]۔"

---

۱۱ "بزم صوفیہ" ص ۱۳

---

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:

"شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص، ان کا حصول اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ اور یہی رضا دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں سے بڑھ کر ہے۔ کوئی ایسا مطلب نہیں جس کے حاصل کرنے کے لئے شریعت کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت پڑے۔ طریقت اور حقیقت شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کے خادم ہیں یعنی ان دونوں کی تکمیل سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے نہ کوئی امر اس کے علاوہ مطلوب ہے۔ احوال اور مواجیہہ اور علوم و معارف، جو صوفیا کو اثنائے راہ میں حاصل ہوتے ہیں، اصلی مقصود نہیں بلکہ وہم و خیالات ہیں جن سے طریقت کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔ ان سب سے گذر کر مقام رضا تک پہنچتا ہے جو جذبہ و سلوک کا منتہا ہے تاکہ اخلاص حاصل ہو جائے اخلاص مقام رضا کا آخری نتیجہ ہے۔"

(مکتوبات دفتر اول، مکتوب ۳۷ بنام ملا حاجی محمد لاہوری)

محمد ابرار حسین فاروقی

# دہلی کی دوسری سترھویں
# یعنی عرس حضرت امیر خسرو

دہلی میں ہر سال ۶ ماہ کے فصل سے دو عرس ہوتے ہیں، پہلا عرس حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس الدسرہ العزیز اور دوسرا عرس حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ۔ پہلا عرس ۱۷ ربیع الثانی کو ہوتا ہے اور دوسرا چھ ماہ کے بعد ۱۷ شوال کو ہوتا ہے اسی لئے دہلی والوں کی اصطلاح میں یہ دونوں عرس "سترھویں" کہلاتے ہیں۔ چنانچہ امسال ۱۷ شوال ۱۳۹۶ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو حضرت امیرؒ کا عرس روایتی شان کے ساتھ منایا گیا اور بہت بڑی تعداد میں نہ صرف دہلی والوں نے شرکت کر کے عقیدت کے پھول چڑھائے بلکہ باہر کے معتقدین اور زائرین نے بھی حاضر ہو کر فیض حاصل کیا۔

حضرت امیر خسرو کی پیدائش کا سال ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) اور وفات کا سال ۷۲۵ھ (۱۳۲۷ء)۔ اس طرح سے امتداد زمانہ کے اعتبار سے یہ عرس چھ سو انہتر واں (۶۶۹) عرس ہے۔ میں اس موقع پر حضرت امیر خسرو کا ہمہ جہتی حیات باسعادت کا مختصر مرقع ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس میں ان کی شاہانہ، عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ زندگی

---

مولانا الحاج محمد ابرار حسین فاروقی صاحب، علی گڑھ

کی صرف جھلکیاں ہیں۔

## حضرت امیرؒ کے نام کا معمہ

حضرت امیر خسرو جن کا اسم مبارک ابوالحسن یمین الدین اور خسرو تخلص جو بطور نام امارت کے لقب کے ساتھ مشہور ہوگیا۔ حضرت امیر خود اپنا نام بہ شکل معمہ بہت ہی پر لطف اور پر معنی انداز میں اس رباعی میں تحریر فرماتے ہیں:

مرا نام نیکوست و خواجہ عظیم
دو شین و دو لام و دو قاف و دو جیم
اگر نام یابی ازیں حرف ہا
بدانم کہ ہستی تو مرد فہیم

(ترجمہ: میرا نام اچھا ہے اور خواجہ (حضرت سلطان المشائخ) بہت بڑے ہیں۔ دو شین، دو لام، دو قاف اور دو جیم یہ میرا نام ہے۔ اگر ان حروف سے تو میرا نام سمجھ لے گا تو میں سمجھوں گا کہ تو آدمی دانشمند ہے۔)

حروف جمل کے حساب سے ان حروف کے اعداد کو اگر دو چند کیا جائے تو "خسرو" ہو جاتا ہے یعنی "دو شین" کے اعداد چھ سو جو "خ" کے ہیں، "دو لام" کے اعداد ساٹھ ہیں جو "س" کے ہیں اور "دو قاف" کے اعداد دو سو جو "ر" کے ہیں اور "دو جیم" کے اعداد چھ جو "و" کے ہیں۔ اس طرح سے خسرو ہوگیا۔ یہ معمہ بھی ہے اور ادبیت کا شاہکار بھی۔

## حضرت امیرؒ کی پیدائش، تربیت اور تعلیم

حضرت امیر خسروؒ جو امیر زادے تھے کم سنی میں ہی یتیم ہو گئے تھے ان کے والد بزرگوار امیر سیف الدینؒ ایک معرکے میں شہید ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت امیر خسروؒ کی عمر صرف

۸ سال کی تھی۔ حضرت امیرؒ نے اپنے والد کی شہادت کا جو مرثیہ لکھا اس کا آخری شعر انتہائی پُر معنی اور درد انگیز ہے۔ ساتھ ہی ان کے والد بزرگوار کے نام کا گویا سجع بھی ہے:

سیف از سرم گذشت و دل دو نیم ماند
دریائے خوں رواں شدہ دُرِّ یتیم ماند

سوانح نگاروں نے بالاتفاق لکھا ہے:

"۶۵۱ھ میں جب امیر پیدا ہوئے تو ان کے باپ نے ایک کپڑے میں لپیٹ کر قصبہ پٹیالی (جو ضلع ایٹہ یوپی میں ہے اور جو وطن تھا) کے ایک مجذوب کی خدمت میں لے جاکر پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ "تو ایسے شخص کو لایا ہے جو خاقانی سے دو قدم آگے نکل جائے گا۔"[۱]

سوانح نگاروں کا یہ بھی بیان ہے کہ ۸ سال کی عمر میں باپ کی تعلیم نے ان کو کمالات کا مخزن بنا دیا تھا۔ فطری استعداد موجود تھی پھر حصولِ کمالات میں کیا دیر لگ سکتی تھی۔ باپ نے نہ صرف علم ظاہری پر اکتفا کیا تھا بلکہ اسی کم سنی میں علم باطنی کی درس گاہ میں بھی لے جاکر داخل کر دیا تھا:

"باپ نے حضرت امیرؒ کو ان کے دونوں بھائیوں کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر کر کے مریدی کی عزت سے بھی سرفراز فرما دیا تھا۔"[۲]

بہر حال والد بزرگوار نے جلد سے جلد اپنی اولاد کو دینی اور دنیوی تعلیم سے فراغت حاصل کرا کے جام شہادت نوش فرمایا اور اب حضرت امیرؒ اپنی ماں اور اپنے نانا (نواب

---

[۱] نتائج الافکار صفحہ ۲۱۰
[۲] ایضاً صفحہ ۲۱۱

(عماد الملک بہادر مرحوم) کے زیر سایہ دنیاوی اور دینی ترقی کرنے لگے اور آناً فاناً علوم ظاہری و باطنی میں کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔

## دنیا اور دین اور حضرت امیرؒ

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(ترجمہ: دنیا کیا ہے۔ خدا سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے۔ گھر والوں کی پرورش اور دیکھ بھال دنیا نہیں ہے۔)

یہ شعر حرف بہ حرف حضرت امیر رحمۃ اللہ علیہ کی حیات باسعادت پر صادق آتا ہے جو ایک ساتھ حضرت پیر و مرشد کی شیدائیت میں والہانہ مصروفیت تھی تو دوسری طرف شاہزادوں و بادشاہوں کی قصیدہ گوئی میں مشغولیت گویا مریدی میں مست تھے اور مدح گوئی میں سرشار۔ اسی سلسلہ میں حضرت امیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد کا واقعہ بھی نقل کیا جاتا ہے جو بے محل نہیں ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

"امیر کی وفات کے بعد دہلی کے ایک بزرگ شیخ رکن الدین ابو الفتح سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں سے فرمایا: چلو امیر خسرو کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرکے ان کے لئے دعائے مغفرت کریں کیونکہ وہ بادشاہوں کے قصیدہ گو تھے۔

یہ کہا ہی تھا اور جیسے ہی جنازہ کے پاس پہونچے تو میت نے فوراً اُٹھ کر یہ اعلان کیا: کہ میں بفضل خدا و بہ طفیل پیر مرشد بخش دیا گیا ہوں مجھکو دعائے مغفرت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دو جملے کہہ کر میت

حسب سابق دراز ہوگئی۔"[۳]

## حضرت سعدی شیرازی اور حضرت امیر

حضرت امیر خسرو کا تقابل حضرت سعدی شیرازی سے کرنا اس لئے بے معنی ہے کہ بقول حضرت جامیؒ سعدی شیرازی غزل کے بادشاہ تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ابیات و قصیدہ و غزل را

فردوسی و انوری و سعدی

لیکن امیر رحمۃ اللہ علیہ تقریباً چھ زبانوں کے شاعر اور فنون کے اعتبار سے ہمہ داں تھے اس لئے حضرت سعدیؒ سے بہت آگے تھے۔ حضرت سعدیؒ نے جو عمر میں حضرت امیرؒ سے بہت بڑے تھے ملتان کے ایک گورنر سلطان محمد شہر کے بلانے پر جو جواب دیا تھا وہ خسرو کی ہمہ دانی پر دلالت کرتا ہے جواب کا خلاصہ یہ ہے:

"میں بوڑھا ہوں اس لئے ہندوستان نہیں آسکتا ہوں۔

تمہارے پاس خسرو موجود ہے جس کے کلام کی کافی شہرت

ایران میں ہے اور میں بھی اس کے کلام کو پسند کرتا ہوں۔"[۴]

سعدیؒ کا ایک جواں صالح شاعر کی فارسی شاعری پر یہ تحسینی تبصرہ حضرت امیر کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

## حضرت امیر کی ہمہ دانی

حضرت امیرؒ کی تقریباً ۹۹ شعری اور نثری تصانیف کے اشارے ملتے ہیں جس میں عربی

---

[۳] نتائج الافکار صفحہ ۲۱۴ [۴] نتائج الافکار صفحہ ۲۱۵

فارسی اور ہندی شاعری کے علاوہ جس کے متعلق اوحادی نے اپنی کتاب عرفات میں لکھا ہے:

"امیر کے ہندی کلام کی تعداد اتنی ہی بتائی جاتی ہے جتنی کہ فارسی کی۔[ش]"

اس قول میں ذرا مبالغہ نہیں ہے کیونکہ ان کا جو ہندی کلام اس وقت لوگوں کے سینوں میں یا کچھ سفینوں میں ہے وہ اس قول کی تصدیق کرتا ہے۔ شاعری کے علاوہ وہ مورخ بھی تھے محدث بھی تھے اور ادیب بھی اور فنون کے اعتبار سے وہ مجتہد تھے فی الحقیقت ان کی ہمہ دانی کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے متعلق ہر قول کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔

## علی گڑھ اور حضرت امیرؒ کی مثنویاں

ایک زمانے میں جب کہ علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کا وجود نہیں تھا بلکہ وہاں صرف ایم۔او۔ کالج تھا جس کے سکریٹری اس وقت نواب محمد اسحاق خاں مرحوم تھے، انھوں نے حضرت امیر خسرو کی مثنویوں پر کالج کے علماء سے اردو شرحیں لکھوائیں اور شائع کیں۔ کاش کہ یہ کام بعد میں بھی جاری رہتا اور محض مثنویوں کی شرحوں پر ختم نہ کیا جاتا بلکہ ہندی کلام پر بھی کام کیا جاتا اور تلاش و جستجو کر کے اس کو بھی اکٹھا اور شائع کیا جاتا اور شرحیں لکھوائی جاتیں۔

## عارفانہ تربیت اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی توجہ خصوصی

جیسا کہ آغاز مضمون میں اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ اگر ایک طرف بادشاہوں

---

ش پریم رس صفحہ ۷

کے درباروں میں قصیدہ گوئی کر کے صلے پاتے تھے تو دوسری طرف پیر و مرشد کی خدمت گذاری کر کے ریاض و مجاہدے سے بھی غافل نہیں رہتے تھے اور جو نقد صلہ ملتا تھا وہ پیر و مرشد کے قدموں پر قربان کر دیتے تھے اور جو فقراء وہاں موجود ہوتے تھے ان پر تقسیم کر دیتے تھے اپنے لئے کچھ نہ رکھتے تھے۔

## پیر سے والہانہ عقیدت

اگر مرید اپنے پیر پر فدائی تھا تو پیر بھی اس کے نفس مرید پر شیدا تھے۔ طرفین کی محبت لامثال تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر مرید اپنے پیر کا خادم اور پیر اپنے مرید کا مخدوم ہوتا ہے کیونکہ روحانی رشتہ کا تقاضہ یہی ہے لیکن حضرت امیرؒ اور حضرت سلطان الاولیاء محبوب الٰہیؒ کا روحانی رشتہ اوروں کی طرح سے نہیں تھا بلکہ بقول امیرؒ یک جان دو قالب کا معاملہ تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

یہ سنتے ہی حضرت پیر و مرشد تحسیناً جواب میں فرماتے ہیں:

تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اللہ اللہ یہ منزلت یہ مرتبہ کسی مرید کو کسی پیر کی بارگاہ سے نہ ملا جو حضرت امیر کو ملا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے شاعرانہ قول کی توثیق کرتے ہوئے ایک مرتبہ اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا: ”اگر شرعاً جائز ہوتا تو میں وصیت کر جاتا کہ خسرو کو میرے ساتھ میری قبر میں دفن کیا جائے۔“

## ”ترک اللہ“

حضرت محبوب الٰہی اپنے اس مرید کو اپنے جذبۂ محبت میں ”ترک اللہ“ فرمایا کرتے

یہ لقب صرف اس لئے نہیں تھا کہ وہ نسلاً ترک تھے بلکہ ترک کے معنی حسین و خوبصورت کے بھی ہیں اس لئے اس لقب سے مراد اللہ کا محبوب تھا۔ اسی لئے ایک بار آپ نے اپنے محبوب مرید سے یہ ارشاد فرمایا :

گر برائے ترک ترکم ارہ برتارک نہند
ترک تارک من بگیرم من نگیرم ترک ترک

(ترجمہ : اگر میرے سر پر آرا چلا یا جائے اور یہ کہا جائے کہ میں ترک (امیر خسروؒ) کو چھوڑ دوں تو میں سر کو چھوڑ سکتا ہوں ترک کو نہیں چھوڑ سکتا)

"ترک۔ ترک۔ تارک" ان ہم شکل الفاظ نے شعر میں صنعت تجنیس کا لا مثال لطف پیدا کر دیا اور ساتھ ہی مرید کے مرتبہ کی بلندی کو بھی ظاہر کر دیا۔

ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی خانقاہ کے بالاخانہ پر تشریف فرما تھے ۔ یہ خانقاہ قصبہ عرب سرا میں تھی جہاں سے جمنا کا پورا منظر سامنے تھا، حضرت امیر حاضر خدمت تھے۔ پیر و مرشد نے جمنا کے نظارے کو جہاں اشنانی اشنان کر رہے تھے دیکھ کر حضرت امیر کو خطاب کر کے فرمایا :

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

حضرت امیر خسرو نے دست بستہ سامنے حاضر ہو کر عرض کیا

ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہے

حسن اتفاق کہ اس وقت پیر و مرشد کے سر پر جو کلاہ رکھی ہوئی تھی وہ ٹیڑھی تھی اس لئے مرید نے اس کجی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "کج کلاہ" کے لقب سے اپنی عقیدت کو ظاہر فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے :

"ہم نے اپنا قبلہ اس ہستی کو قرار دیا جو ہمارے سامنے کج کلاہ ہے یعنی ٹیڑھی ٹوپی رکھے ہوئے ہے۔"

## حضرت محبوب الٰہی کا وصال حضرت امیر خسرو کی بے تابی اور وصال

حضرت امیر خسرو کچھ عرصہ سے تغلق شاہ گورنر بنگال کے ساتھ لکھنوتی (بنگال) میں تھے پیر کی یاد نے حاضری بارگاہ کا تقاضہ کیا، وہاں سے اجازت لیکر چلدیئے۔ بنگال اور دہلی کی مسافت اور ان کی بے قراری کیسی بلا خیز ہوگی، اتنا لمبا سفر جب کہ سفر کی کوئی آسانی نہ تھی، کس والہیت سے طے ہوا ہوگا۔ یہ کیسا المناک واقعہ ہے کہ امیر کا سفر ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت پیر و مرشد کا سفر ختم ہو چکا۔ مزار پر عالم مدہوشی میں گر پڑے اور یہ الا پنے لگے۔

کچھ جگ مگ جگ مگ ہووت ہے کوئی اُڑا ہے چندریا سووت ہے
من مورت کی ایک صورت ہے وہ صورت یا ایک مورت ہے
ٹک دیکھت ہے کچھ کہہ نہ سکت کچھ جگ مگ جگ ہووت ہے

یہ تو وہ مرثیہ تھا جس میں مدح بھی ہے سوگ بھی ہے اور سوز بھی ہے لیکن حضرت سوگوار کے لئے جس کو نہ صرف یہ غم تھا کہ دیدار کے لئے آیا لیکن قدرت نے طوالت سفر کے ذریعہ اس سے محروم رکھا اور اب جدائی ناقابل برداشت تھی اب تو وصل پیر کی خواہش کے لئے بیقراری تھی اس طرح سے پھر مزار مبارک کو خطاب کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اپنے وصال کی پیش گوئی بھی کر دی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
خسرو چل گھر آپنے رین بھئی چو دیس

پہلا مصرعہ حضرت امیر کے سوگ اور سوز کی عکاسی کرتا ہے اور دوسرا مصرعہ اپنے وصل کی خواہش کا اعلان کرتا ہے کیونکہ بقول ممدوح:

اُس وصال نے چاروں طرف اندھیرا کر دیا

لہٰذا خسرو تو اپنے گھر (جنت الفردوس) چل

"موت العالِم موت العالَم"

اسی کا نام ہے۔ کیا چھ ماہ کے بعد ۱۸ شوال المکرم کو دوسرا مصرعہ حقیقت بن گیا اور حضرت امیر شیدائے پیر وصل پیر سے سرفراز نہ ہوئے۔

## پیرومرشد کی توجہ مرید کی منزلت

صوفیاء کا قول ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے، چنانچہ ایک صوفی شاعر (حضرت مولانا روم) فرماتے ہیں:

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سراست

عاقبت مارا بہ آں شہ رہبراست

دوسرے صوفی شاعر کا قول ہے کہ عشق ہی تو سب کچھ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

عشق درماں و درد عشاق است

گاہ زہر است گاہ تریاق است

عشق مسجود کرد آدم را  عشق مخلوق کرد آدم را

زد انا الحق سرود مستانہ  عارف از روئے عشق جانانہ

بہرحال اولیائے کرام نے جو عشق بادیا پیا تھے اس دامن کو اپنے اعمال و کردار سے ایسا سجایا جس کے لئے یہ کہنا بے جا نہیں ہے

در و دیوار من آئینہ شد از کثرت شوق

ہر کجا می نگراں روئے ترا می بینم

اسی کو ایک سادھو درویش خدا رسیدہ اپنی زبان میں اس طرح سے سراہتا ہے:

دردلیور درمن بھئے جست۔ دیکھوں تت توئے
کانکرپا تھر ٹھیکری بھئے آرسی موئے۔

حضرت امیرؒ کو پیرِ مرشد قدس سرہ العزیز نے اپنی توجہ خاص سے اس مرتبہ پر پہونچا دیا تھا کہ امیر رحمۃ اللہ علیہ خود اس کے اظہار پر مجبور ہو گئے تھے۔ فرماتے ہیں:

ایوانِ مرادِ لیش بلند است — درو سے کہ ہوش رسید نہ تواں
ایں شربت عاشقی است خسرو — بے خونِ جگر چشید نہ تواں

حقیقت میں یہی وہ سوز ہے جو ہر وقت قلب انسانی کو جو گذرگاہ جلیل اکبر ہے گرماتا رہتا ہے۔ یہی وہ سوز ہے جو ماحصل زندگی ہے۔ یہی وہ چلن ہے جو سرمایۂ حیات ہے۔ ہر صوفیٔ باصفا اور ہر درویش بے ریا نے اپنی تمام زندگی اسی چلن کے لئے وقف کر دی۔ اسی کے لئے ریاض و مجاہدہ کے لئے اولیاء کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ حضرت مولانا رومؒ کا قول فیصل سن لیجئے جو فرماتے ہیں:

یک زمانِ صحبتِ با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اسی صحبت نے حضرت امیر کو اس زینہ پر پہونچا دیا تھا جس کو انھوں نے اپنی ایک غزل میں باندازِ قوالی ظاہر فرمایا۔ ان کی ایک مشہور غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

سبحان اللہ لامکاں کا منظر — رسول کریم صلعم کا دیدار باجلاس اور حضرت امیر کی حاضری۔

ڈاکٹر شعیب اعظمی

# عبدالرزاق قریشی مرحوم

جناب عبدالرزاق قریشی صاحب کا جولائی کی آخری تاریخ کو انتقال ہوا، اسی وقت متعدد احباب سے ان کے بارے میں مضمون لکھنے کیلئے درخواست کی گئی مگر ان میں سے صرف ڈاکٹر شعیب اعظمی صاحب نے ایک مختصر مضمون لکھ کر عنایت فرمایا۔ ہماری طرح شعیب صاحب کو بھی اس کا احساس ہے کہ مرحوم کی خدمات اور ان کے علمی و ادبی کاموں کا تقاضا ہے کہ کوئی بھرپور مضمون لکھا جائے۔ امید ہے کہ مرحوم کے قدردانوں میں سے کوئی نہ کوئی صاحب ادھر توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

عبدالرزاق قریشی چپکے سے رخصت ہو گئے۔ نہ تو تعزیتی جلسے ہوئے اور نہ ماتمی تجویزیں پاس ہوئیں، اور تعزیت کیجئے تو بھی کس سے! اظہار ہمدردی و غم کرنا ہو تو جایئے کس کے پاس! یوں تو کہنے کو بھائی، بھتیجے، بھانجے، احباب کی اولادیں، اعزہ اور اقارب سبھی تھے مگر دنیاوی حیثیت سے قریشی صاحب تن تنہا تھے، ان کی معنوی اولاد اُن کی کتابیں تھیں، ان کا خلوص ہزاروں کے دلوں میں موجود تھا، ان کی تواضع، خاکساری، سادگی، حسن سلوک اور سادگی نے بہتوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اب ان کی موت کا صدمہ انھیں کو ہوا ہوگا جنھوں نے ان کی علمی اور تحقیقی صلاحیت سے فیض حاصل کیا ہوگا، ان کی تحقیقات اور آثار کی قیمت محسوس کی ہوگی۔ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر ان کے دلچسپ اور علمی لطائف کا مزہ پایا ہوگا، کسی مصیبت اور پریشانی میں ان سے دستگیری پائی ہوگی اور دور دراز رہ کر بھی ان کی پاکیزہ تحریریں بے پایاں خلوص کی جھلک دیکھی ہوگی۔ یہی نہیں گا ہے گا ہے ان کے تحائف کی دولت سے مالا مال بھی ہوا ہوگا۔

عبدالرزاق قریشی اوائل عمر میں عروس البلاد بمبئی چلے گئے تھے، تعلیم و تربیت کے
زمانے میں نہ جانے کس کی زندگی سے متاثر تھے کہ وہاں کی پُرکشش زندگی میں کھو جانے کے
بجائے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا اور وہ بھی فارسی پڑھانے کا۔ انجمن اسلام میں آنے والے
طلبار کی بڑی تعداد قریشی صاحب کی لگن اور ایمانداری کی معتقد تھی، حالانکہ کاپیاں جانچنے
میں بڑے سخت تھے، کم نمبر دیتے تھے اور بیک وقت بارہ بارہ کاپیاں سامنے پھیلائے
رہتے تھے کہ کسی کو بے ضرورت نمبر نہ مل جائے یا کوئی خواہ مخواہ خسارے میں نہ رہ جائے۔
یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قریشی صاحب کے پڑھائے ہوئے طالب علم کثیر تعداد میں ہندوستان،
پاکستان، مسلم ممالک سے نکل کر یورپ کے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں اساتذہ، ڈاکٹر
انجنیر، بیرسٹر، تاجر پیشہ اور عام شعبوں میں کام کرنے والے لوگ شامل ہیں۔ بیرسٹر عبدالرحمان انتولے
تازہ مثال ہیں۔

فارسی کے استاد تھے، قدیم پر ہی نہیں، جدید پر اچھی نظر تھی اور اسی شوق نے ان کے اندر
فارسی میں بھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کر دیا اور وہ بھی اتنا صاف ستھرا کہ رشک آئے۔ تحقیق
سے متعلق مغربی مفکرین کی کتابیں نہ صرف خود پڑھی تھیں بلکہ لوگوں کو مشورہ دیتے کہ یہ کتابیں
ضرور پڑھو۔ اردوئے قدیم کے متون کی ترتیب، جدید کی یکجائی دونوں میں دسترس اُن
کو حاصل تھی۔ شروع شروع میں انھوں نے درسی اور نصاب کی تدوین میں نمایاں حصہ
لیا اور آگے چل کر تحقیق و ترتیب کا میدان وسیع ہوا تو ان کے جوہر اور زیادہ کھلے۔ نوائے
آزادی، ۱۹۵۷ء میں ترتیب دی، میرزا مظہر جان جاناں پہلی تحقیقی کاوش ثابت ہوئی، دیوان
عزلت کی ایڈیٹنگ نے انھیں مستند مقام بخشا۔ ۱۹۶۶ء میں میرزا مظہر جان جاناں کے فارسی
مکاتیب کی ترتیب اور اشاعت ان کی شہرت کا باعث بنی، راگ مالا کی آمد ان کی خاموشی
کے باوجود، علمی و ادبی حلقوں میں انھیں سنجیدہ اور زیادہ بھاری بھرکم بناتی گئی۔ اور
مبادیات تحقیق کا مطالعہ کرنے کے بعد ادب کا کون شیدائی یہ نہ کہے گا کہ تحقیق کے

میدان میں عبدالرزاق قریشی کی یہ کاوش بے شبہ سنگ میل کا مرتبہ نہیں رکھتی ہے۔
تاثرات پڑھئے تو جتنی شخصیتوں کو آپ پائیں گے اُن میں خود قریشی صاحب جھلکیں گے۔ مولوی فتح محمد ہوں یا منشی دیا نرائن نگم، یا سیف طیب جی، مدرس، محقق اور سیاست داں کے خدمت گاروں کے کرداروں میں قریشی صاحب کا سادہ مسکراتا ہوا چہرہ نظر آئے گا۔ آخری کتاب سیف طیب جی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مرحوم قریشی اور مرحوم سیف طیب جی میں کتنی مماثلت تھی، "آخری مضمون کی کئی قسطیں" اُردو میں تمدنی جلوے بھی" ان کی محققانہ صلاحیت کا بہترین نمونہ ہیں۔
قریشی صاحب ذہنی طور پر علامہ شبلی سے متاثر تھے، سید سلیمان ندوی مرحوم کے عاشق تھے۔ نجیب اشرف ندوی مرحوم کے شاگرد تھے اور مولانا شہاب مالیر کوٹلوی کی شخصیت، شرافت، علمیت اور مطالعہ کی گہری چھاپ اُن پر تھی علم و ادب کے متعدد قدیم و جدید زندہ اور مُردہ اہل کمال سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ یہی عقیدت اور محبت قریشی صاحب کی زندگی کا سرمایہ تھی۔ جو بھی ان کا قرب پاتا تھا ناممکن تھا کہ علم و ادب کی دنیا سے بے بہرہ رہتا۔ کتابیں بتائی جارہی ہیں انھیں پڑھو، موضوعات منتخب کئے جارہے ہیں ان کو پڑھو اور لکھو، تم ایم اے کر ڈالو۔ آپ پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیں اور بمبئی اس پر کام کرنے کی کافی گنجائش ہے اور فلاں صاحب کی کتاب پر تبصرہ لکھو تو ذرا نوک جھونک رہے گی۔ انھوں نے سیکھو اور کھلانے پر عمل کرکے علمار اکابر صوفیا اور بزرگان دین کی اتباع کی۔

عام زندگی میں ان کے سلوک کا مقابلہ کم لوگ کرسکتے ہیں۔ مرحوم دوست کے صاحب زادوں کی فیس نہیں، کپڑے نہیں، شادی کرنا ہے، ملازمت دلوانا ہے کسی کا داخلہ کروانا ہے۔ بھانجی نے فلاں چیز کی فرمائش کی ہے، ان صاحب کو بمبئی کی یہ چیز پسند ہے ذرا پارسل بنا کر بھیج دو کوئی دہلی، اعظم گڑھ، پٹنہ جارہا ہے تو ان کے ساتھ کسی نہ کسی کے لئے تحفہ بھیجا جارہا ہے۔ کوئی مہمان کہیں سے آرہا ہے، قریشی صاحب ٹھہرانے، کھلانے

اور کھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ خود سادہ شوربہ دال کھا رہے ہیں چائے پی رہے ہیں مگر احباب اور مہمانوں کو نئے کھانے کھلانے کے لئے ہوسٹل کے طباخ عبداللہ استاد کو احکامات دیئے جا رہے ہیں، صابریاں کھانے کی میز پر نئی ڈشز لگا رہے ہیں۔

ساری عمر بمبئی میں گذار دی، تنہا کمرہ تھا شاید کسی نے دیکھا ہو۔ صبح سے شام تک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر اور مغرب کے وقت وی۔ ٹی سے میرین لائنس تک کی چہل قدمی ادھر کئی سال سے بلڈ پریشر کا اثر تھا پرہیز اور زیادہ ہو گیا تھا۔ شاہ معین الدین مرحوم کی خواہش تھی کہ قریشی صاحب دار المصنفین میں آجائیں گذشتہ سال انہوں نے بمبئی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور دار المصنفین میں ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کا کمرہ اور لکھنے کی میز سب کچھ طے ہو گیا مگر پھر بھی قریشی صاحب کو آنے میں تکلف تھا۔ پوچھا گیا آ کیوں نہیں جاتے! سوچتا ہوں دار المصنفین کا حق ادا نہ کر پاؤں گا طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور ابھی ذرا ایک بڑا کام باقی ہے انکساری سے فرمایا۔

یہ بڑا کام زیارت بیت اللہ تھا ادھر کئی سال سے برابر نماز پڑھتے تھے احباب کی درخواست دیدی تھی قرعہ میں نام بھی آگیا تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اپریل سے بسبہم آگئے تھے اور جولائی کے پہلے ہفتہ میں دار المصنفین آکر لوگوں سے مل گئے تھے ۹ ر اگست کو بمبئی کے لئے روانگی تھا۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی اور دوسرے متعلقین کو دادر اسٹیشن پہونچنے کی اطلاع دیدی تھی مگر ۱۸ جولائی اتوار کے دن گیارہ بجے قلب پر گرانی محسوس ہوئی کوئی فوری طبی امداد نہ مل سکی اور ساڑھے بارہ بجے دن میں اللہ اللہ کرتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

قریشی کی موت ایک پڑھے لکھے مہذب اور مخلص انسان کی موت ہے جس نے کبھی ان کی ملاقات کا چند منٹ ہی پا لیا وہ ان کو کبھی نہیں بھلائے گا وہ حج کو نہ جاسکے گا مگر ان کا ارادہ اور سلوک حج اکبر سے کم نہیں خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ •••

# امیر خسرو - ایک نظر میں

## حیاتِ امیر خسرو کی اہم تاریخیں

۱۲۵۳ء ولادت بمقام پٹیالی (ضلع ایٹہ - یوپی)

۱۲۶۰ء - مکتب میں داخلہ - والد امیر سیف الدین محمود کی وفات

۱۲۶۷ء - شاعری کی ابتدا -

۱۲۷۳ء - علاؤالدین محمد کشلی خاں عرف ملک چھجو کے دربار سے وابستگی - (مدت ، ۴ سال)

۱۲۷۶ء - لغرا خاں (حاکم سامانہ (نزد ملتان) کے مصاحبین میں شمولیت -

۱۲۷۹ء - لکھنوتی کے حاکم ملک طغرل کی بغاوت کو فرد کرنے کے لئے لغراں خاں کے ساتھ مہم میں شرکت -

۱۲۸۱ء - سلطان بلبن کے بڑے فرزند سلطان محمد قاآن ملک کے ساتھ ملتان کو روانگی -

۱۲۸۵ء - منگولوں کے ہاتھوں گرفتاری اور بڑی تکلیفیں اٹھانے کے بعد رہائی -

۱۲۸۶ء - ملک امیر علی سرجاندار حاکم اودھ کے مصاحبوں میں شمولیت -

۱۲۸۸ء - اودھ سے واپسی اور دہلی دربار سے وابستگی -

۱۲۹۱ء - دہلی دربار میں مصحف دار کے عہدے پر فائز ہوئے ،

۱۲۹۷ء فرزند عین الدین خضر کی پیدائش

۱۲۹۹ء - والدہ ماجدہ کی وفات

۱۳۰۲ء - دختر عفیفہ کی پیدائش

۱۳۰۳ء - چتوڑ کی فتح کشی میں شرکت

۱۳۱۰ء - حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے وابستگی

۱۳۲۲ء۔ شہزادہ الغ خاں کی معیت میں دیوگڑھی کی مہم میں شرکت

۱۳۲۴ء۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے ساتھ اودھ کی مہم میں شرکت

۱۳۲۵ء۔ ۲۷ ستمبر ۱۸ شوال ۷۲۵ ھ کو وفات

# عہد خسرو کے سلاطین دہلی

| | |
|---|---|
| ۱۔ محمد غیاث الدین بلبن۔ | ۱۲۶۵ - ۱۲۸۷ء |
| ۲۔ معزالدین کیقباد | ۱۲۸۷ - ۱۲۹۰ء |
| ۳۔ جلال الدین فیروز خلجی | ۱۲۹۰ - ۱۲۹۵ء |
| ۴۔ محمد علاء الدین خلجی | ۱۲۹۵ - ۱۳۱۵ء |
| ۵۔ مبارک شاہ قطب الدین خلجی | ۱۳۱۶ - ۱۳۲۰ء |
| ۶۔ غیاث الدین تغلق | ۱۳۲۰ - ۱۳۲۴ء |
| ۷۔ محمد بن تغلق | ۱۳۲۴ - ۱۳۵۱ء |

# علمی وادبی کارنامے

امیر خسرو کی تخلیقات اور نثری تصانیف کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے، ان میں سے جن کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو سکی ہیں، وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

## دواوین

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ پہلا دیوان بنام تحفۃ الصغر | ۱۲۷۲ء | بہ عمر ۲۰ سال |
| ۲۔ دوسرا دیوان " وسط الحیاۃ | ۱۲۸۴ء | " ۳۲ |
| ۳۔ تیسرا دیوان " غرۃ الکمال | ۱۲۹۴ء | " ۴۲ |
| ۴۔ چوتھا دیوان " بقیہ نقیہ | ۱۳۲۱ء | " ۷۰ |

۵- پانچواں دیوان بنام نہایت الکمال آخر عمر

## تاریخی مثنویاں

۱- قران السعدین ۱۲۸۹ء بعمر ۳۷ سال

۲- مفتاح الفتوح ۱۲۹۱ء " ۴۰

۳- عشیقہ یا دول رانی خضر خاں ۱۳۱۵ء " ۶۴

۴- نہ سپہر ۱۳۱۷ء " ۶۶

۵- تغلق نامہ آخر عمر

## خمسہ یا مثنویات پنج گنج

۱- مطلع الانوار

بجواب مخزن الاسرار از نظامی گنجوی ۱۲۹۸ء

۲- شیریں و خسرو بجواب خسرو و شیریں ۱۲۹۸ء بعمر ۴۴

۳- مجنوں و لیلیٰ بجواب لیلیٰ و مجنوں ۱۲۹۹ء " ۴۷

۴- آئینہ سکندری بجواب سکندر نامہ ۱۲۹۹ء " ۴۷

۵- ہشت بہشت بجواب ہفت پیکر ۱۳۰۱ء " ۵۰

## نثری تصنیفات

۱- تاریخ علائی (خزائن الفتوح) ۱۳۱۱ء

۲- اعجاز خسروی (رسائل الاعجاز) ۱۳۱۹ء

۳- افضل الفوائد

بہ تقلید فوائد الفواد از حسن سجزی

(مرتبہ: عبداللطیف اعظمی)

عبداللطیف اعظمی

# تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

## ترقی اردو بورڈ کی چند مطبوعات

### معاشیات کے بنیادی اصول (حصہ اول) از سراج الحسن

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۹۸ صفحات، غیر مجلد، قیمت: سوا بارہ روپے، سنہ اشاعت ۱۹۷۷ء

زیر تبصرہ کتاب کے مولف سراج الحسن صاحب بمبئی کے انجمن کالج آف کامرس اینڈ اکنامکس میں سینیئر لکچرر ہیں اور چونکہ تعلیم و تدریس ہی ان کا کام ہے، اس لئے یقین ہے کہ کتاب لکھتے وقت انھوں نے طالب علموں کی ضروریات کا اور زبان و بیان میں آجکل کے طالب علموں کی سمجھ بوجھ اور ذہنی معیار کو پیش نظر رکھا ہوگا۔ یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں علم معاشیات کی تعریف، بنیادی اصطلاحات، طلب و رسد، پیداوار، لاگت، مبادلہ اور اجارہ داری وغیرہ پر تفصیل سے بحث و گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی اچھی ہے، چونکہ تالیف ہے ترجمہ نہیں اس لئے عبارت میں روانی ہے البتہ اصطلاحات کے سلسلے میں معلوم ہوتا ہے کہ ترقی اردو بورڈ کی وضع کردہ اصطلاحات سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے دونوں میں خاصا فرق ہے، مثلاً کتاب میں CONVENTIONAL NECESSARIES کا ترجمہ "رسم و رواج کی ضروریات" کیا گیا ہے (صفحہ ۷۴) اور ترقی اردو بورڈ کی وضع کردہ اصطلاحات کے مطابق "رسمی ضروریات" ہونا چاہئے۔ MARGINAL کا ترجمہ کتاب میں "حاشیائی" ہے اور ترقی اردو بورڈ کی گلاسری (جلد دوم) میں "مختتم" ہے۔ کتاب میں SCARCE GOODS کا ترجمہ "قلت والی اشیا" کیا گیا ہے (صفحہ ۱۰۷) اور گلاسری کے مطابق "کمیاب اشیا" ہونا چاہئے۔ کتاب میں RATIONAL

کا مرادف" مناسب" ہے (صفحہ ۲۸۲) اور گلاسری میں "منقلی"۔ کتاب میں PAIDUP CAPITAL کا ترجمہ "جمع شدہ سرمایہ" اور CUBSCRIBED CAPITAL کا ترجمہ "اداشدہ سرمایہ" چھپا ہے، (صفحہ ۱۹) حالاں کہ ایک دوسرے کے برعکس ہونا چاہیے۔ یعنی "پیڈ اپ کیپٹل کا" اداشدہ سرمایہ" اور سبس کرائبڈ کیپٹل کا "جمع شدہ سرمایہ"۔ غالباً انگریزی الفاظ کے چربوں کو چسپاں کرتے وقت الٹ پھیر ہوگیا ہے۔

## ہند آریائی اور ہندی۔

مصنف: سُنیتی کمار چٹرجی

مترجم: عتیق احمد صدیقی

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۲۸۰ صفحات، غیر مجلد، قیمت ساڑھے تیرہ روپے۔ سنہ اشاعت: ۱۹۷۷ء

اس کتاب کے مصنف سُنیتی کمار چٹرجی، جن کا اسی سال ۲۹ مئی کو انتقال ہوا اور جن کے بارے میں ماہنامہ جامعہ میں ایک مفصل مضمون اگست کے شمارے میں شائع ہوا ہے، ایک ممتاز ماہر لسانیات تھے اور ان کی یہ کتاب بڑی شہرت اور اہمیت کی حامل ہے اس کے مترجم مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں اور اُردو زبان و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اس لئے یہ ترجمہ یقیناً اچھا ہوگا۔

یہ کتاب موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے، نمبر ایک "ہندوستان میں آریائی زبان کا ارتقا" نمبر دو "نئی مشترک ہند آریائی زبان ہندی کا ارتقا"۔ پہلے حصے میں چار خطبے ہیں جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) ہند یوروپی، ہند ایرانی (آریائی) ہند آریائی (۲) ہند آریائی کا غیر ہند آریائی پس منظر اور ہند آریائی کی ابتدائی تاریخ (۳) ہندوستان اور عظیم تر ہندوستان میں سنسکرت، وسطی ہند آریائی کا ارتقا (۴) اصوات، حرف اور فرہنگ میں جدید ہند آریائی کا ارتقا۔

دوسرے حصے میں بھی "ابتدائیہ" کے علاوہ چار خطبے ہیں جن کے عنوانات حسب ذیل تھیا:

(۱) جدید ہندوستان کی نمائندہ بولی۔ ہندی (۲ ، ۳) ہندی (ہندوستھانی) کی نشوونما (۴)، ہندکا (ہندوستھانی) کے مسائل اوران کا حل۔

علاوہ ازیں ضمیمے کے تحت (۱) قبل ہندیورپی (۲) ہندآریائی میں کثیراللسانیت (۳) ہندرومی حروف تہجی پر بحث وگفتگو کی گئی ہے اور آخرمیں چھ صفحے کی فرہنگ شامل ہے۔

## مفتاح التقویم: از حبیب الرحمٰن خاں صابری

بڑا سائز۔ حجم ۲۸۸ صفحات۔ غیر مجلد قیمت: ۲۸ روپے۔ سنہ اشاعت: ۱۹۷۷ء

تحقیقی کام کرنے والوں کو ہجری اور عیسوی سنوں اور تاریخوں کی مطابقت کی اکثر ضرورت پڑا کرتی ہے۔ اس موضوع پر انگریزی میں بھی چند کتابیں ہیں اور برصغیر ہندوپاک میں اُردو میں بھی دو ایک کتابیں شائع ہوئی ہیں، مگر ان میں سے کوئی کتاب آسانی سے بازار میں نہیں ملتی بڑی خوشی کی بات ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے زیر تبصرہ کتاب چھاپ کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی جنتری بھی شامل ہے، جسے اصطلاح میں "شک تقویم" کہتے ہیں اور جو ۲۲ مارچ ۱۹۵۷ء مطابق یکم چیت ۱۸۷۹ سنہ تک سے ہندوستان کے سرکاری مراسلات میں جاری ہے اور سرکاری کلنڈروں میں عیسوی تاریخوں کے ساتھ ہندوستانی تاریخیں بھی درج ہوتی ہیں۔

ان تینوں تاریخوں کی مطابقت کے طریقے بھی اس کتاب میں درج ہیں مگر زبان بہت مشکل ہے۔ یہ موضوع کچھ ایسا ہے کہ شاید بہت زیادہ آسان زبان میں اس پر لکھا نہیں جاسکتا تھا، مگر پھر بھی اگر کوشش کی جاتی تو کسی حد تک آسان اور عام فہم زبان ہوسکتی تھی۔ مثلاً صفحہ ۴ پر ہے "سنہ عیسوی کے شیوع سے کچھ ہی پہلے ..." یہاں "شیوع" کی جگہ آغاز لکھا جاسکتا تھا اس کا پورا نام ہی خالص عربی میں ہے یعنی "مفتاحُ التقویم لتطبیق الیومِ والسّنینْ" معروف بہ مفتاحُ التقویم۔ ایک بات اور مجھے کھٹکی۔ کتاب خالص علمی ہے، مذہبی نہیں، ناشر حکومت ہند کا ایک ادارہ ہے کوئی نجی ادارہ نہیں، مگر کتاب کا آغاز کلام پاک کی آیات سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی